آمنہ جنید کے قلم سے تحریر شدہ

MH370 کے واقعات پر مبنی

گمبوط

ھبوط

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

از قلم آمنہ جنید

All Rights Reserved

Copyright: Aamna Junaid (Author)

Published by: Safar-e-Adab

Published On: safareadab.com

To get published with us, contact us via email or website:

safareadab.com

safareadab@gmail.com

khanumaira@safareadab.com

adab@safareadab.com

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

Note: We don't charge anything to publish online. If anyone charges any kind of fee in order to publish your write-ups in the name of Safar-e-Adab, please don't try to go ahead with them and immediately report them using the contact us button on our website. Thank you

ضروری بات

ھبوط کے تمام جملہ حقوق لکھاری " آمنہ جنید " کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے پلیٹفارم یا سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہو گی۔ بغیر اجازت کہانی کا استعمال کرنے والوں پر سخت کاروائی کی جا سکتی ہے۔

اس کہانی اور اس میں موجود کردار محض تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

ھبوط کا سفر طے کرنے سے پہلے اس ناول کی مصنفہ کے طور پر میں چند اہم نقاط پر چرچہ کرنا چاہوں گی۔ اولاً اس کہانی کا خیال میرے دل میں ڈالنے اور اسے ایک کتاب کی صورت تشخیص دینے میں میں اپنے رب کی تہ دل سے مشکور ہوں۔ اس نے مجھے ہمت دی اور کڑی سے کڑی راتوں اور لمبے سے لمبے دنوں میں بھی مجھے اپنے عزم کے لیے ثابت قدم رکھا۔

'ھبوط' کا آئیڈیا مجھے گزشتہ سال جولائی میں نصیب ہوا تھا۔ ایک دن میری نظروں کے سامنے MH370 پر مشتمل ڈاکیومنٹری فلم کا ٹریلر سامنے رینگ گیا۔

"The plane that disappeared".

ایسا جہاز جو غائب ہو گیا۔ جس کی گمشدگی کو ایک دہائی بیت چکی ہے لیکن سوراغ کے نام پر ایک ہنٹ، ایک کلو تک سامنے نہیں؟ کوئی مجرم، کوئی مشکوک نہیں؟ اور یہاں پر میرا دماغ کام کرنا شروع ہو چکا تھا۔ ان دنوں سے چند روز قبل ہی مجھے ہوائی جہاز کے اندر ایک نامعلوم شارٹ اسٹوری لکھنے کا بھوت سوار تھا، لیکن اس کا پلاٹ مجھے کچا پکا تھا۔ لیکن جس روز ایم ایچ تھری سیون ابھر کر واضح ہوا، وہ شارٹ اسٹوری یہ ناول بن گئی اور نامعلوم 'ھبوط' بن گیا۔

اس کہانی کو میں نے نو ماہ لگا کر لکھا ہے۔ اس میں کی گئی ریسرچ کمر توڑ تھی اور وہی اس کے رائٹنگ پراسیس کا سب سے خوبصورت اور مشکل حصّہ ہے۔ اپنے گھر کی چار دیواری میں دنیا گھوم لینا کوئی چھوٹی بات

تھوڑی ہی ہے۔ کوالالامپور سے لے کر پہانگ اور جینٹنگ ہائی لینڈز کی دلکش وادیاں، دبئی کی نارنجی مغرب، انڈمان ونکوبار کے ساحل اور نیویارک کی ہولی ووڈ لائف، ہر جگہ، حقیقی یا فرضی میرے دل کے بہت قریب ہے اور یقیناً وقت کے ساتھ قارئین کے بھی ہو جائے گی۔

میرے لیے 'ھبوط' لکھنے کا مقصد ایک نارمل کتاب لکھنے سے منفرد ہے۔ یہ کہانی سو فیصد فرضی نہیں ہے۔ اس کے کور (core) میں ایک ایسی حولناک داستان چھپی ہے جسے کئی دہائیوں بعد بھی انسان فراموش نہیں کر سکتا۔ آٹھ مارچ ۲۰۱۴ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان ہے۔ ایک رات میں دو سو انتالیس جانیں ایک نقطے کی طرح صفحہِ ہستی سے مٹ گئیں۔ انسانیت نے یہ کب اور کہاں دیکھا ہے؟ ایسی کہانی کس نے تشکیل دی ہے؟

بغیر کسی ثبوت اور گواہوں کے یہ انہونی آج تک ہر فرد کا دماغ چکرا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ ہماری جدید دنیا میں ایک بوئنگ 777 کا طیارہ غائب ہو جائے اور کسی کو خبر نہ ہو؟ دنیا بھر میں بھگ دڑ مچ گئی تھی۔ ہر اتھارٹی رکھتا آدمی اپنی کرسی کا جواب دہ تھا۔ انجینئرز، ایوی ایشن ایکسپرٹ، سمندری ماہرین، صحافی، مہم جوئی، اور شہداء کے لواحقین نے مل جھل کر اس پزل کو حل کرنا چاہا ہے۔ کئی سرے ملے، کئی سرے بگڑے، اور ہم آج وہی ہیں جہاں 08 مارچ کو تھے۔

اسکرین کے پیچھے چھپے ہر فرد کے پاس دماغ ہے، اور کی بورڈ پر ٹائپ کر کے اپنا پیغام دنیا تک پہنچانے کی آسائش بھی۔ پچھلے دس سالوں میں میڈیا اس درگھٹنا پر کئی تھیوریز نکال چکا ہے۔ انھیں ایک فراخ حد تک کھوجا اور مانا بھی گیا ہے، لیکن آفیشل نوٹس ہمیشہ کچھ اور رہا ہے۔ آدھا، ادھورا اور ڈھیروں سوالات اٹھاتا۔ کچھ لوگ جہاں اس سے متفق ہیں، باقیوں کی بھوک اس محدود معلومات سے نہیں مٹتی۔

'ھبوط' بھی ایسی ہی ایک تھیوری پر لکھا گیا ہے۔ پلاٹ کا بنیادی نقطہ MH370 سے نسبت میں ایک جانی پہچانی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

اس کتاب میں ظاہر ہونے والے تمام کردار، یہاں تک کہ وہ جو حقیقی لوگوں پر مبنی ہیں، مکمل طور پر فرضی ہیں۔ زندہ یا مردہ حقیقی افراد سے کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔ یہ کتاب مکمل طور پر افسانوی ہے۔

یہ ناول لکھ کر میں ہر اس شخص کا خسارہ آپ تک پہنچانا چاہتی ہوں جس نے اس دردناک حادثے میں اپنی یا اپنے کسی پیارے کی جان کھو دی۔ اس کتاب کا ہر ہر لفظ ان لوگوں سے دل جوئی کرتا ہے۔ میرا مقصد اس پزل کو ایک بار پھر منظر عام پر لانا ہے۔ اسے بھولنے دینا انسانیت پر تہمت ہو گی۔ یہ ناول پڑھنے والے ہر ایک شخص سے میری گزارش ہے کہ وہ کچھ نہ کرے تو سوچے، اور آٹھ مارچ کی رات فنا ہو جانے والے اس طیارے کو کبھی نہ بھولے۔ وہ ہم میں سے ہی تھے جو چلے گئے۔

اگر میں اس کہانی کو لے کر کسی کی احسان مند ہوں تو وہ میری سب سے پرانی دوست اور الفا ریڈر (alpha reader) حفصہ حسنی ہیں۔ انھوں نے مجھے اس کہانی کے جھول پرکھنے میں مدد کی، مجھے اپنے آپ میں مضبوط محسوس کروایا اور ایک لکھاری کے طور پر اپنی خوبیوں اور خامیوں سے تعارف کروایا۔ میری رائٹنگ جرنی کو شروع دن سے بڑھاوا دینے والی یہ پہلی ہیں۔ 'ھبوط' جتنا میرا ہے، اتنا ہی تمھارا ہے، ڈیئر شکتی۔ میری دوسری الفا ریڈر گُل ہیں۔ اپنی مصروف تر زندگی کے درمیان انھوں نے مجھے اپنی دوستی، وقت اور محبت سے نوازا۔ ھبوط پر سب سے لمبی ڈسکشن بھی انہی سے ہوا کرتی تھی اور اپنی کہانی سے ہونے والے ایک نئے طور پر عشق کا باعث بھی یہی خاتون ہیں۔ جس خوبصورتی سے گُل کی آنکھ نے اس کہانی اور اس کے کرداروں کو دیکھا ہے، میری دعا ہے آپ لوگ بھی دیکھ پائیں گے۔ میرے لیے اپنی راتیں برباد کرنے کا شکریہ، میم! The journey doesn't end here.

میری دوست آمنہ مناہل جنھیں انسٹاگرام پر اکثر عوام pensaurlens کے لقب سے جانتی ہے، ان کی موجودگی ہی میرے دل پر قرض ہے۔ آمنہ میرے رائٹنگ کریر سے لے کر کبھی پیچھے نہیں ہٹیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

'ھبوط' کا پہلا ڈرافٹ تمھیں نہیں پڑھوا سکی تھی، اس کے لیے معاذرت خواہ ہوں۔ تحفے میں پوری آمنہ جنید قبول فرمالو۔

میری ساتھی رائٹر دوست اور 'بخت' کی مصنفہ مہر النساء شاہمیر نے بھی میری کتاب کو میری نظر میں بہتر بنایا ہے۔ آپ کی باریک بینی نہ ہوتی تو کہاں جاتی میں، پریزیڈنٹ صاحبہ؟ پچھلے دس ماہ تمھیں تنگ کرنے پر شرمندہ تو نہیں صرف پرجوش ہوں۔

اس کے ساتھ ہی کئی لوگ جو اس سفر کا حصّہ تھے، میرے انسٹامیوچیول دوست اور فالوورز، جنھوں نے مہینے کاٹے، کچھ نے دن اور کچھ جو یہ ناول بغیر کچھ سوچے اٹھا رہے ہیں۔

میں 'ھبوط' پڑھنے والی ہر آنکھ کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔

اس سفر میں میرے ساتھ جڑے رہنے کے لیے شکریہ!

آمنہ جنید

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

انتساب

ہر اس شخص کے نام جس نے بے باق خوشی اور اطمینان کے بعد اپنا نزول دیکھا۔

ایک بار پھر، اڑان آپ کی منتظر ہے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

مرحلہ نمبر ۱۰

خروج

(روانگی)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

۷ مارچ، ۲۰۱۴

کوالالمپور انٹرنیشنل ائیرپورٹ، ملائیشیا

PM11:15، ٹرمینل ون

ہر طرف زندگی تھی۔

ہوا کا رخ اس گھنٹے شمال سے جنوب کی طرف تھا۔ مدھم لیکن نم ہوا۔ آسمان میں پورے دن گھنے بادلوں کا پہرا رہا تھا، اور رات ہوتے ہی سارے تارے ان کے پیچھے روپوش ہو گئے تھے۔

یہ کوالالمپور میں بہار کا وقت تھا، جب سرخ رنگے ہیبسکس اور انڈین یاسمین کے پھولوں کی ٹولیاں ہر گھر کے باہر کسی تھال کی طرح سجی ہوتیں۔ جب ہوا میں ہر سانس کے ساتھ ایک تازگی ہوتی۔ ایسی تازگی جو جگا جاتی، بہلا جاتی، کسی پیارے کی یاد دلا جاتی۔

یہ سماں تھا کوالالمپور انٹرنیشنل ائیرپورٹ کا، جہاں اس لمحے ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ خیر، اس لمحے کی کیا کہیں؟ وہاں ہر لمحے ہی ایک ایسا جادو بچھا ہوتا تھا کہ جانے انجانے میں ہر مسافر اس کی حل چل کا حصہ بن جاتا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

ٹرمینل ون اس وقت مسافروں کے ہجوم میں ڈوب رہا تھا۔ سفید چمکتے ٹائلز پر جوتے چپلیں گھسیٹتے، اپنے بھاری بھر کم سامان کو برا سا منہ بنائے کھینچتے، کھانے پینے کی اشیاء سے چہرے کے نقوش خراب کرتے لوگ ہر جگہ ٹہل رہے تھے۔ یہاں ہر ثقافت، ہر جات پکش کے لوگ سانجھے تھے، ان کا مقصد متفق۔ وہ سب کسی مسافرت کے درمیان میں تھے، انت اور شروعات دونوں ہی سے بہت دور۔ ان کا سہارا وقت تھا، وعدے تھے اور وہ دعائیں تھیں جو ان کی خیر اور عافیت کے لیے لمحہ بالمحہ کوئی عزیز نہایت شدت سے مانگ رہا تھا۔

لیکن ہر کوئی اتنا خوش نصیب نہ تھا کہ اس کے پیچھے دعائوں کے پل بندھے جاتے۔ کچھ کہ پیچھے صرف لعنت، ملامت اور سراپ کے ستون انشاء تھے۔ وہ جو کہیں سے بھاگ کر کہیں پہنچنا چاہتے تھے۔ بغیر کسی منزل کی آس میں، بغیر کسی کے منتظر۔

وہ بھی ان ہی چند بدبختوں میں سے ایک تھی۔

سر سے پیر تک اس کا وجود سیاہ رنگ کے عبائے میں ملبوس تھا۔ ہلکی گندمی رنگت ٹرمینل کی روشنیوں میں پسینے سے تمتما رہی تھی۔ اس کے نوڈلز جیسے بالوں کا رنگ اس کے لباس کا تھا، سیاہ، جو کہ سر کے گرد ڈھیلے بندھے شیفان اسکارف سے آدھے چھپے ہوئے تھے۔

وہ درمیانے قد و قامت کی لڑکی تھی، لیکن اس کی چال پھرتیلی تھی۔ اپنے ساتھ گہرے سرخ رنگ کا سوٹ کیس چلاتی وہ اس ہی لمحے ٹرمینل کے دروازوں سے داخل ہوئی تھی۔ کندھے پر اس کا سنہری زنجیر والا پرس جھول رہا تھا اور پیروں میں چپکانے والے اسنیکرز تھے، جو ماضی کی کسی گھڑی میں بلاشبہ مرمری سفید ہوتے ہوں گے لیکن اب ان کا رنگ اور شکل دونوں ہی دیکھ کر دکان دار کو چکر آ جانے تھے۔

وہ تیز قدموں سے ٹرمینل کا ہال عبور کر رہی تھی۔ ماتھے پر بہتا پسینا جگہ کی گہما گہمی میں ذرا اور ہی واضح ہو گیا تھا۔ گہری بھوری آنکھیں، جن کے نیچے ہلکے اس قدرتی کے لگتا سالوں سے اسے کسی نے بتایا نہیں تھا کے رات سونے کے لیے ہوتی ہے، زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ ہونٹ اچھے تھے، بھرے بھرے اور گلابی، لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا وہ صرف بھرے ہوئے نہیں، بلکہ سوجے ہوئے تھے۔ لال اور سوجے ہوئے۔

ایک کونے پر بنی برگر کنگ کی لال دکان کو دیکھ کر اس کے قدم ذرا برابر سست ہوئے۔ گہری بھوری آنکھوں نے جگمگاتی بتیوں میں روشن دکان کے نام سے لے کر آس پاس بیٹھے مسافرین تک سفر کیا جو

کبھی کاغذ میں لپٹے برگر سے نوالہ توڑتے تو کبھی ہاتھ میں موجود کوکا کولا کی بوتل سے گھونٹ باگھونٹ اپنی پیاس بُجھاتے۔

اس کے پیٹ میں بھوک نے پھر ایک گٹھاں لگائی۔ صبح سے کوئی چوتھی بار تھا، اور وہ بھی ڈھیٹوں کی طرح ہر بار اپنے جسم کی التجاء کو دھتکار کر پیچھے کر دیتی۔ کھانے کا وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ کھانے کے بارے میں سوچنے کا بھی نہیں تھا، اور وہ یہی کر رہی تھی۔ وقت ضائع۔

اچانک خود پر غصے کا ایک بے قابو غبار اٹھتا محسوس ہوا تو اس کی گرفت سوٹ کیس کے ہینڈل پر مضبوط ہوئی۔ اس نے سر جھٹکا۔

ایک بار یہاں سے نکل جائے، کھالے گی برگر کنگ، کوئین، رُخ، سب۔

ایک بار پھر چلنے کے لیے اس نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ کچھ محسوس ہوتے وہ ٹھٹک کر رکی۔

گردن دائیں سے بائیں گھماتے اس نے اپنے پیچھے دیکھا۔ مسافرین، رش، شور، لائوڈ اسپیکر سے گونجتی اعلان کاروں کی آواز، جگہ جگہ رکھالوگوں کا سامان، متحرک سیڑھیوں سے اوپر نیچے جاتے لوگ، کھانے کی خوشبو، یہاں وہاں بھاگتے بچے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

اس نے ایک بھاری سانس اندر اتارتے اپنا سر گرایا، عبائے کی آستین سے ماتھے پر چمکتا پسینہ صاف کیا۔

کوئی بھی نہیں، خود سے دہرایا۔

لائوڈ اسپیکر پر ایک اور بار اعلان ہوا تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ جلدی جلدی اپنے اکلوتے سوٹ کیس کو ساتھ دھکیلتے اس نے رخ چیک ان کاونٹر کی جانب کیا۔ وہ پہلے ہی مقررہ وقت سے کافی تاخیر سے وہاں پہنچی تھی۔ اگر اب بھی پھرتی نہ دکھاتی تو اس نے کہیں کا نہیں رہنا تھا۔

★★★

جگہ:ڈیپارچر گیٹ

PM11:57

ساری مشقتوں اور پھرتیوں میں پون گھنٹہ لگانے کے بعد اب وہ کچھ مطمئن سی خارجی دروازے کی طرف روانہ تھی جہاں سے اس نے اپنی فلائٹ میں بیٹھنا تھا۔ گہری بھوری آنکھیں خوشی اور حتیٰ کے تھوڑے بہت سکون میں ٹکٹ کو تک رہی تھیں جہاں اس کا اور فلائٹ کا نام درج تھا۔

Malaysian Airlines

Flight: MH370

.Zabia Yameen

اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹکٹ کو تہ لگائی۔ برسوں پہلے مردہ ہوئی خود اعتمادی اس کے اندر موجوں کی صورت جاگ رہی تھی۔ ایک عرصہ ہوا تھا اسے بھولے کے اپنے کام کیسے کرتے ہیں، کیسے کسی اور کے نقشِ قدم ناپنے کے بجائے اپنے پتھر آپ ہتاتے ہیں۔ ظبیہ یمین، جو کبھی کسی سے پانی کا ایک گلاس تک نہیں مانگتی تھی، اپنی ہر چیز خود کرنے کی عادی تھی، اپنی زندگی بغیر کسی پابندیوں کے جیتی تھی، چار لوگوں کے درمیان اپنا نام تک بتانے میں جھجھکنے لگی تھی۔ لیکن اب نہیں۔

ایک ہفتہ پہلے بیتی رات کے بعد ماضی اور حال کے درمیان وہ خود لکیر کھینچ چکی تھی۔

اور ظبیہ اپنا حال یا ماضی نہیں، وہ اپنا مستقبل تھی۔ وہ مستقبل جسے وہ اپنے ٹوٹے قلم اور خشک ہوئی سیاہی سے حرف با حرف زندگی دے گی۔ وہ مستقبل جسے وہ یہ فلائٹ لے کر یقینی بنائے گی۔

ہال میں پہنچ کر اس نے ایک خالی بینچ دیکھی تو فوراً سوٹ کیس کو ساتھ لگاتے وہاں بیٹھ گئی۔ اب بورڈنگ کا انتظار تھا۔ وہ دونوں ہاتھ چہرے تک لے کر گئی اور ماتھے پر چپکتے بالوں کو پیچھے ہٹایا، اسکارف کو ذرا ڈھنگ سے لپیٹا جو گھما گھمی میں سرک کر گرنے کو تھا۔

اس سارے عمل میں اسے وہ احساس ایک بار پھر ہوا۔

دیکھے جانے کا احساس۔

ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسنی اتری تو ظبیہ نے گردن آہستہ سے موڑتے اپنے پیچھے دیکھا۔ ٹرمینل میں پھرتے لوگ اس کی گہری، جانچتی نظر سے غافل تھے، ایک ایک، سوائے اس کے۔

ظبیہ کا دل اس کے ہلک تک اچھلا اور وہ یک ٹک دور کھڑے نامعلوم شخص کو دیکھتی رہی۔

وہ واقعی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کا قد چھ فٹ کے ہندسے سے ذرا اوپر تھا، قامت دبلی لیکن راسخ۔ سر تا پا اس نے سیاہ رنگ کا لباس تان رکھا تھا۔ لیدر جیکٹ میں چھپا اس کا کندھا ٹرمینل کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ ظبیہ کی نظروں سے ترچھا ہوا کھڑا تھا، برگر کنگ کے اسٹال پر کہنی ٹکائے۔

یہاں سے تو وہ اس کا چہرہ چاہ کر بھی نہیں دیکھ سکتی تھی، لیکن تعاقب کارنے پہلے ہی حافظتی اقدامات کے تحت منہ ماسک سے چھپایا ہوا تھا، اور بال تھے یا نہیں اس کا اندازہ بھی کرنا مشکل تھا۔ سر پر بیس بال کیپ جو تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے جھٹکے کے ساتھ چہرہ موڑا، دل پھٹ کر باہر آنے کو تھا۔ اپنے سوٹ کیس کو قریب کھینچتے اس نے اندر ہی اندر آیات الکرسی پڑھنا شروع کی۔ اس کا اعمال نامہ اسے کیسے ڈسنے آئے گا یہ سوچ سوچ کر ہی وہ پچھلے ایک ہفتے کے عرصے میں خود کا آدھا دماغ ضائع کر چکی تھی۔ اگر اس کی موت کسی نقاب پوش تعاقب کار کے ہاتھوں ہونی تھی تو بہتر تھا وہ خود کو آپ پولیس کے آگے کر دے۔

اس سے تھوڑے فاصلے پر نشست چند مہینے کے بچے کو سینے سے لگائے ایک عورت گھونٹ باگھونٹ Sunquick کی بوتل سے جوس پی رہی تھی۔ بال ڈھیلے پونی میں تھے اور بچہ نرم کمفرٹر میں لپٹا تھا۔ ظبیہ

نے ایک پل کے لیے سوچا اگر وہ اس عورت سے مدد مانگے تو کیا وہ اس کی مدد کرتی۔ شاید ہاں، شاید نہیں۔ لیکن وہ کسی سے مدد نہیں مانگ سکتی تھی۔ مدد مانگنا اپنی سیچیوشن مزید خراب کرنا تھا۔

اس نے اس عورت کا چہرہ دیکھا، کتنا سکون تھا وہاں۔ کیا وہ اس لیے تھا کیونکہ وہ ماں تھی؟ کیا ظبیہ اسی لیے محروم رہی تھی اس امن سے، کیونکہ وہ ماں نہیں بن پائی تھی؟

بھوری آنکھیں کسی خمار میں ڈوبتی گئیں۔ انگلیاں اس کی ہتھیلیوں کے اوپر دائرے کھینچتی گئیں۔ کوالالمپور ایئرپورٹ کی بھگ دڑ میں اچانک ایک اور آواز شامل ہو گئی۔ ظبیہ نے دانت پیس کر اسے خود پر حاوی ہونے سے روکا، مگر وہ اس کے ضبط سے کئی زیادہ قوی تھی۔

سنسان راہداریاں اس کے منظر میں ابھریں اور پھر ایک ساتھ کئی ساری رونے کی آوازیں۔ دودھ پیتے، نوزائیدہ بچے سینے کے دم پر چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ اس کے دل میں چھبن اٹھی اور اس نے سوٹ کیس کے ہینڈل کو پکڑ کر قریب کھینچا، مگر وہ آنکھیں نہیں کھول پا رہی تھی۔ ہانک پر جوش تھی، ایسی کے اس کی اپنی سانس روک دے۔

یکایک سفید دیواریں اس کی بصارت سے غائب ہو گئیں۔ ان کی جگہ ایک اور منظر واضح ہوا۔ دھندلا، ناکافی۔ اس کے کانوں میں پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ کپکپاتی انگلیاں۔ چڑھتی سانسیں۔

اس نے خود کو کسی دیوار کے ساتھ ٹکتے محسوس کیا۔ کوئی باہر دروازہ پیٹھ رہا تھا۔ اس نے کراہ کر سر دیوار سے ٹکایا، اور جب ہی اس کی نظر اپنے گر بنتے سرخ تلاب پر بنی۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے ڈھیروں خون رس رہا تھا۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سب دھواں ہو گیا۔

وہ حال میں تھی۔ کوالالمپور ایئرپورٹ کے ٹرمینل ون میں، اپنی فلائٹ ایم ایچ تھری سیون زیرو کے انتظار میں۔ اس نے بے ضابطہ سانسیں بحال کیں، چہرے سے پسینہ پونچھا۔

جرم اور ناکامی کے بادل پھر سے اس کے اوپر سیاہ ہوئے۔ اپنی نظریں ہاتھوں تک گراتے اس نے زبان سے ہونٹ تر کیے۔ آہ، وہ اب بھی سوجے ہوئے تھے۔ اور اس جلن کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کے قصور اس کا نہیں تھا۔

صرف اس کا نہیں تھا۔

"خواتین و حضرات، یہ بیجنگ، چین کے لیے ملائیشیا ایئرلائنز کی پرواز MH370 کی ابتدائی بورڈنگ کال ہے۔ ہم تمام مسافروں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ بورڈنگ کے لیے گیٹ C1 پر آجائیں۔۔۔"

جیسے ہی اعلان کار کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے، ظبیہ تیزی سے اپنا سامان سمیٹتی کھڑی ہو گئی۔

وہ گیٹ پر پہنچی تو پہلے ہی ایک طویل قطار اس کی منتظر تھی۔ بورڈنگ پاس اور دیگر دستاویزات ہاتھوں میں سنبھالتی وہ تیز قدموں سے قطار میں شامل ہو گئی۔ جب اس نے ساری چیزوں کو ترتیب دے دی تو ایک پُراطمینان نگاہ سامنے ڈالی۔ اس کے آگے کم از کم سات لوگ اور تھے۔

دانتوں کے بیچ ہونٹ کو دباتے، اس نے سر یہاں وہاں گھمایا۔ کالے سراپے میں ملبوس شخص اب کہیں نہیں تھا، شکر۔ لیکن ایک اور منظر اس کی سانس اٹکا گیا۔ زمین نے جیسے ہچکولے کھائے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

گہرے نیلے کوٹ اور سفید بٹن شرٹ پر مشتمل وہ اپنے یونی فورم میں ملبوس تھا۔ بازو کے ساتھ ہی پائلٹ کی مخصوص ٹوپی بھی پھنسا رکھی تھی۔ برابر چلتے اپنے ساتھی پائلٹ کی بات وہ مسکراتا ہوا سنتا جا رہا تھا۔

اس کے ہر ہر قدم میں سلیقہ تھا، ہر ہر لفظ میں مہارت۔

گہرے بھورے بال ماضی کی طرح چھوٹے کر کے ماتھے سے پیچھے کو سیٹ تھے، لیکن شیو بڑھی تھی۔

ظبیہ نے خود کو بمشکل کھڑا رہنے پر مجبور کیا۔ اس کے پیروں میں سے جان نکل رہی تھی، گھٹنے کمزور پڑ رہے تھے، لیکن وہ اسے دیکھے گئی۔

وہ وہی تھا، ویسا ہی تھا۔ ہر مسکراہٹ کے ساتھ اس کے گال پر واضح ہوتا وہ آدھا چاند، ٹرمینل کی روشنیوں میں دمکتی اس کی ہلکی ہیزل آنکھیں، اور ہاتھ ہلا ہلا کر اپنا نقتہ منوانے کی عجیب عادت۔

ظبیہ کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ اس نے نظریں نیچے کرتے اپنی انگلیوں کو آپس میں مروڑا۔

ائیر پورٹ کی دیواریں اس کے اوپر تنگ ہو رہی تھیں۔ وہ کہاں بھاگے، کہاں اپنا منہ چھپائے؟

پھر اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا تو اس نے کمر اکڑائی۔

وہ کیوں بھاگے، اس نے کیا کیا تھا جو اتنا قبیح تھا؟ وہ کیوں منہ چھپائے؟ ظبیہ نہیں تھی جو وعدے نہیں نبھا سکی تھی، وہ وہ تھا۔

بھوری آنکھیں زمین سے اٹھاتے، اس نے ایک مستحکم نگاہ سے اس کی طرف دیکھا، اور اس ہی لمحے، نیلے کوٹ میں ملبوس شخص نے بھی کسی احساس کے تحت اس کی جانب گردن موڑی۔

ان کی آنکھیں ملیں تو ساری روشنیاں مدھم پڑھ گئیں، ساری آوازیں دم توڑ گئیں۔ اس کی ہیزل آنکھوں میں پہلے تو الجھن کے رنگ ڈھلے پھر شناسی اور آخر کار، حیرت۔

لیکن ظبیہ کا اپنے تاثرات پر مکمل قابو رہا۔ قطار آگے بڑھی تو وہ چہرہ پھیرتے سب کے ساتھ دو قدم آگے آئی۔ اب کہ اس سے آگے بس دو لوگ اور تھے۔

اس نے دوبارہ اس کی جانب دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ خدایا، ایک یہی پائلٹ رہ گیا تھا پورے ملائیشیا میں؟

اگرچہ وہ دیکھ نہیں رہی تھی، لیکن نیلے کوٹ میں ملبوس آدمی اب اس ہی قطار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند لمحات قبل والی نرمی اس کے چہرے پر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ ابرو سختی سے بھنچے ہوئے تھے، گہری آنکھیں سارے نور سے خالی تھیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کے ساتھی پائلٹ، جو اس سے عمر میں خاصا سینیر نظر آتے تھے، اس سے کچھ کہہ کر وہاں سے واپس مڑ گئے تھے اور اب وہ اکیلا چیک اپ کاؤنٹر کے عملہ کے ساتھ کھڑا بات چیت کر رہا تھا۔ ہاتھ جیبوں میں تھے اور ٹوپی سر پر۔ بائیں ہاتھ کی پاکٹ پر پروئی ہوئی چاندی کے ونگ پن لائونج کی ہلکی نیم روشنی میں چمک رہی تھی اور کندھے پر سنہرے پٹیوں والا بیج (badge) تھا جو اس کے درجے کی نشاندھی کر رہا تھا۔

ظبیہ نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اثر نہ لیتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتی رہی۔

اس کے آگے موجود آدمی نے اپنی جگہ چھوڑی تو وہ سوٹ کیس کھینچتے دو قدم آگے آئی۔ اب وہ بالکل اس کے عین مقابل تھا۔

"شب بخیر، میم۔ ملائیشیا ایئرلائنز کی پرواز MH370 میں خوش آمدید۔ کیا میں آپ کا بورڈنگ پاس دیکھ سکتی ہوں؟" گلے میں لال آئی ڈی کارڈ لٹکائے لڑکی نے اس سے نہایت گرم جوشی سے اس کے دستاویزات مانگے۔

ظبیہ نے ہلکا سا سر ہلاتے اسے اپنا سامان تھمایا۔ اس پورے عمل میں ان ہیزل آنکھوں کا بوجھ اس پر کسی پہاڑ سے بھی زیادہ تھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا، اس کا ہر ہر عمل گن رہا تھا۔

ویری فیکیشن کے بعد وہ لڑکی اسے کاغذات واپس کرنے ہی والی تھی کہ نیلے کوٹ والے نے ہاتھ بڑھا کر یہ عمل روکا۔ "مجھے دیکھائیں۔" بے ساخت، ٹھنڈی آواز۔

ظبیہ ہی نہیں بلکہ اونچی پونی والی لڑکی نے بھی گربڑا کر گردن موڑے پائلٹ کو دیکھا۔ "جی، سر؟" لیکن آواز کا رعب ایسا تھا کہ ہاتھ پہلے ہی کاغذات کا پلندہ اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔

سر جھکاتے، بھورے بال والے نے اس کی ایک ایک چیز کو خوب وقت لگا کر پڑھنا شروع کیا۔ ظبیہ کو سمجھ نہیں آیا وہ یہ کیوں کر رہا ہے۔ اس سے پہلے تو کسی شخص کو نہیں روکا۔

اندر ہی اندر اس کا دل پھٹ رہا تھا۔ اللہ، کسی کو پتا تو نہیں چل گیا؟

"کچھ ہوا ہے؟" اس نے اپنا وزن ایک سے دوسرے پیر پر منتقل کیا۔ آنکھوں میں بے چینی اور شک کے بادل تیر رہے تھے۔

ہیزل آنکھوں نے ایک لمحہ اسے دیکھا پھر واپس سر گرا کر پڑھتی گئیں۔ "سیکیورٹی چیکنگ۔"

ظبیہ کی پریشان نظروں نے اس سے لے کر اس کے ہاتھ میں قید اپنے ویزا تک سفر کیا۔ وہ اتنا غور سے ہر چیز پڑھ رہا تھا کہ اگر کچھ مسئلہ نہیں بھی ہوتا تو بھی نکل ہی آتا۔

"مجھ سے پہلے تو کسی کو نہیں روکا۔" وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی۔

حالاں کہ وہ زیادہ بولنے والی نہیں تھی، حالاں کہ اسے لڑائی جھگڑوں سے حول اٹھتا تھا، کچھ تھا اس شخص کی موجودگی میں جو اسے عجیب کر دیتا تھا، ہمیشہ سے۔

"آپ سے پہلے کوئی اتنی مشکوک حالت میں بھی نہیں آیا۔" نظریں اس کے سرخ ہوئے ہونٹ اور بے ڈھنگے سے عبائے تک گئیں۔ "دوبارہ مہر لگوانی ہو گی۔" اس کا بورڈنگ پاس اس کی طرف بڑھاتے اس نے علان کیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ کی تو سانس ہی بند ہو گئی۔ آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ "ہیں!؟"

دوبارہ مہر لگوانے کا مطلب تھا دس منٹ (یا اس سے بھی زیادہ) کی واک، ایک اور قطار میں لگنا، دس اور گالیاں کھانا، پسینے میں اور شرابور ہونا، اور سب سے مزے کی بات، فلائٹ بھی مس کر دینا، کیونکہ بورڈنگ میں اب بس آخری پچیس منٹ رہتے تھے۔

"ایسے کیسے۔۔۔" اس نے اپنا پاس اس سے چھینتے اسے جانچا۔ "سب ٹھیک تو ہے۔ آپ دوبارہ دیکھیں، پلیز۔ میں واپس کیسے جائوں گی؟"

اس نے رخ لال آئی ڈی کارڈ والی لڑکی کی جانب کیا۔ ”آپ بتائیں ناں۔ سب ٹھیک نہیں ہے کیا؟“ مگر وہ لڑکی مجبور سی اپنے ساتھ موجود شخص کو دیکھ کر ہونٹ سئے کھڑی رہی۔

نیلے کوٹ والا اب ایک قدم آگے آیا۔ ”آپ باتوں کے بجائے اگر مہر لگوالائیں تو آپ کے لیے بھی آسانی ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ پچیس منٹ رہ گئے ہیں۔ مجھے وہاں پہنچنے تک ہی فلائٹ اڑن چھو ہو جائے گی۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمھارا، رابح؟“

آخری فکرہ کہنے کا نہ تو اس کا کوئی ارادہ تھا نہ ہی سننے کی رابح کی تیاری.

اور کیونکہ وہ جملہ کہتے اس کی آواز پہلے سے مقابلتاً تیز تھی، لال آئی ڈی کارڈ والی لڑکی اور ظبیہ کے پیچھے کھڑے لوگوں نے بھی یہ کاروائی کھلے کانوں سے سنی تھی۔

چند ثانیے وہ اسے دیکھتا رہا، ہیزل آنکھوں میں چھبن سی اٹھی تھی۔ ظبیہ شرمندگی سے ایک سانس بھرتی رہ گئی۔ اس نے پلکیں جھپکیں اور اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ ”آئی ایم سوری، لیکن میں واپس نہیں جاسکتی۔ یہ تو زیادتی ہے۔ میں نے ساری چیزیں چیک کروائی ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں میں...“

”میڈم۔“ رابح نے اس کی بات کاٹی۔ اب وہ پھر سے وہی تھا۔ سخت، کٹھور، بے رحم۔ ”میں کہیں نہیں جا سکتا۔ یہ فلائٹ مجھے اڑانی ہے۔ آپ کو دوبارہ مہر لگوانی ہو گی۔“ اس نے ایک لاپرواہ نگاہ اپنے گھڑی بندھے ہاتھ میں قید ظبیہ کے پاسپورٹ پر ڈالی۔ ”مجھے تو یہ بھی فورج لگتا ہے۔“

ظبیہ کے پیچھے کھڑے لوگ اب مشغول، لیکن اپنی باری کے انتظار میں بے چین ہو رہے تھے۔ ان کی آپس میں کردہ سرگوشیاں ظبیہ کے کانوں میں پڑیں، تو اسے اپنا آپ کوئلوں پر دہکتا محسوس ہوا۔ گندمی رنگت غصے میں لال پڑ رہی تھی۔ وہ شخص انسانیت کے سارے ناطے بھول چکا تھا۔

اس نے جبڑا کستے رابح کو گھور کر دیکھا۔ ”اب آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔“

حریف نے جواباً شانے اچکائے۔ "میں اپنا کام کر رہا ہوں۔"

ظبیہ ایک قدم آگے آئی، اتنا کہ وہ اس کی آنکھوں میں بنتے اپنے عکس کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ جب بولی تو آواز آدھے سیکنڈ کے لیے لرزش کا شکار ہوئی تھی، اور پھر روح کی طرح ساکن۔

"مجھے نہیں لگا تھا کہ میں کبھی تم سے اور نفرت کر سکتی ہوں۔" وہ سانس لینے کو ٹھہری اور رابح کی سانسیں ہی ٹھہر گئیں۔ "لیکن مجھے آج تم سے گھن آ رہی ہے۔"

اس لمحے اس کی آنکھیں بدلی تھیں۔ ظبیہ کو لگا جیسے ان میں نمی بھی جھلکی تھی۔ وہ چند ثانیے اسے ایسے ہی دیکھتا رہا۔ ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھل بند ہوئے لیکن الفاظ نہ تھے۔ مقابل گرے اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ تاری ہوئی لیکن کوئی حرکت نہ ہوئی۔

مسافر کی بھوری آنکھوں سے نظر چراتے، رابح نے دو انگلیوں کے اشارے سے قریب کھڑے نیلی وردی میں ملبوس ایک گارڈ کو بلایا۔

ظبیہ یہ سارا عمل آنکھوں میں ڈھیروں شبہ لیے دیکھتی گئی۔ اسے کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیپٹن رابح آدم پر تو بالکل نہیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"جی، سر؟" رابح کو سلام کرنے کے بعد گارڈ بلائے جانے کی وجہ مطلوب کر رہا تھا۔

رابح نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ٹھوڑی سے ظبیہ کے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کا لگیج چیک کریں۔ ایک ایک چیز، ایک ایک جیب، اچھے سے۔ کتنا اچھے سے کیا ہے اس کا فیصلہ میں کروں گا۔ مہر نہ سہی اتنا تو کر ہی سکتے ہیں۔"

گارڈ نے سٹپٹا کر رابح کو دیکھا پھر ساتھ کھڑی کالے عبائے میں ملبوس مسافر کو۔ کوئی بھی اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ سکتا تھا کہ یہ ایک غیر متوقع حکم تھا۔

"ایک منٹ!" ظبیہ فوراً آگے آئی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور دل بند ہونے کے دہانے پر تھا۔ اپنے سوٹ کیس کو تو وہ مر کر بھی اسے ہاتھ نہ لگانے دے۔

اُس کے اندر۔۔۔ نہیں۔ ظبیہ نے خود سے بھی یہ بات تسلیم نہیں کی۔

"یہ ہو کیا رہا ہے؟ پہلے مجھے سکیورٹی لائن میں اتنی دیر روکا گیا، میرے وقت کی قدر نہیں کی اور اب، اب آپ میرے سامان میں ہاتھ ڈالیں گے؟!" اس کے آنکھوں کی سفیدی سرخی میں تبدیل ہو رہی تھی۔

"میڈم، یہ بس سیکیورٹی چیکنگ ہے۔ ہمارا آپ سے کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ It's purely random." گارڈ نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔ اسے تو رانج پر تعجب ہوا۔ مسائل سلجھانے والا نمبر ایک انسان آج خاموش تھا؟

"یہ کیسی سکیورٹی چیکنگ ہے جس میں سو ہزار لوگوں کے درمیان صرف مجھے پکڑ کر ذلیل کیا جا رہا ہے؟ اکیلی عورتوں کے ساتھ آپ یہ سلوک کرتے ہیں!؟" ظبیہ کو سانس مشکل سے آ رہی تھی۔ سوٹ کیس پر اس کی گرفت آہنی تھی، اس قدر سخت کہ اس کے بند انگشت سفید پڑ رہے تھے۔

آس پاس اور ظبیہ کے پیچھے کھڑے لوگ بھی اب تماشہ دیکھ رہے تھے لیکن خلل کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

رانج کی بس ہو گئی تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ظبیہ کو گھور کر دیکھا۔ "آپ کو ہمارے حفاظتی اقدامات سے مسئلہ ہے، ہمارے طریقہ کار سے مسئلہ ہے، authorities کو بتائیں، مجھے نہیں۔ رہی بات چیکنگ کی تو میرے پاس پورا حق ہے اپنے مسافرین کی سلامتی لازم کرنے کا۔" وہ رکا، لمبی، مڑی ہوئی پلکیں جھپکیں۔ "آپ سمیت۔"

ظبیہ کو لگا تھا اس کے پاس بہت الفاظ تھے، لیکن اب وہ چپ تھی۔ رانج نے گارڈ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس بار اس نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

گارڈ گھٹنوں پر بیٹھا اب اس کا بیگ کھولے سامان ادھر اُدھر کر رہا تھا۔ ظبیہ اسے دیکھ رہی تھی، ساتھ ہی اس کی سانسیں کم ہو رہی تھیں۔ اسے یہاں سے بھاگنا تھا۔ اسے ملائیشیا سے بھاگنا تھا۔ اس سب سے دور کہیں بھاگنا تھا۔

گارڈ کے ہاتھ ایک موٹی کتاب لگی تو ظبیہ نے پہلا کلمہ یاد کیا۔ ہاتھوں کی مٹھی بنائی اور اپنے خوف کو اندر ہی اندر پینے کی کوشش کی۔ اب وہ گئی تھی۔ ان لوگوں کو پتا چل جانا تھا۔ اس کی موت تھی۔ ملائیشیا کیا وہ تو یہ ایئرپورٹ بھی ہتھکڑی لگے بغیر نہیں چھوڑ پائے گی۔

فائیو منٹ کرافٹس والوں، اللہ الگ سے حساب لے گا تمھارا۔

بیپ۔ بیپ۔ بیپ۔

میٹل ڈیٹیکٹر چیخ رہا تھا۔ ظبیہ کا دل کیا وہ بھی چیخے۔

بند آنکھوں سے اس نے زمین پھٹنے کی دعا کی اور آہستہ سے کلائیاں آگے بڑھا دیں۔ لگا دو ہتھکڑی۔ دے دو مجھے پھانسی۔

"محترم، پیچھے ہٹیے! آپ آگے نہیں جا سکتے!"

ایک منٹ! ہاتھ سے چیکنگ میں میٹل ڈیٹیکٹر کہاں سے؟

ظبیہ نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہاتھ خالی تھے، ہتھکڑی سے پاک۔ نیچے دیکھا تو گارڈ کھڑا ہو رہا تھا۔ سامنے رائج گردن ترچھی کیے برابر والی قطار میں ہوتی ہلچل کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس نے نیچے کھلے اپنے سامان کو دیکھا۔ وہ بچ گئی تھی؟

"کیا ہوا ہے بھئی؟ کہہ تو رہا ہوں بس جیکٹ ہے۔" برابر والی قطار میں کھڑا کالی بیس بال کیپ پہنا مرد شکایت کر رہا تھا، لیکن ظبیہ کے کانوں نے دماغ سے رابطہ توڑ رکھا تھا۔ اس کا دل اب بھی بے قابو تھا،

ہتھیلیاں پسینے میں چکنی ہو چکی تھیں۔ اگر وہ اتنی بد حواس نہ ہوتی تو یقیناً پہچان جاتی کہ وہ اس کا تعاقب کار ہی تھا۔

اس کے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی سوال تھا۔ وہ واقعی بچ گئی تھی؟

ساتھ کھڑے گارڈ نے برا سا منہ بنایا اور کالی بیس بال کیپ والے مرد کو گھورا، جواب سستی سے اپنے کندھوں سے لیدر جیکٹ سرکا رہا تھا۔ جیکٹ کے بازو پر پانچ کے سکے جتنا بڑا میٹل بیج badge تھا جس پر کسی کارٹون مووی کے کردار کی شکل واضح تھی۔ کوئی چالاک سا لومڑ کالا چشمہ چڑھائے مسکرا رہا تھا۔ شاید اس ہی کی وجہ سے اسے میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

نیچے اس نے آدھی آستینوں کی سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جیکٹ اتار کر اس نے دوبارہ میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے کی کوشش کی، لیکن مشین ایک بار پھر 'بیپ بیپ' کی آواز کے ساتھ چنگھاڑنے لگی۔ اب کی بار گارڈ نے اسے باقاعدہ دھکا دیتے پیچھے کیا۔

"میں نے کہا آپ نہیں جا سکتے! تلاشی دیں!"

"میرے پاس نہیں ہے!" کیا کہنے تھے۔ ظبیہ تھوڑا سا تو ہنس ہی دیتی اگر وہ ہارٹ فیلیئر سے مرنے کے دہانے پر نہ ہوتی۔

گارڈ نے ایسا منہ بنایا جیسے بریانی کے دوسرے نوالے پر ہی نیمو نگل لیا ہو، وہ بھی چھلکا سمیت۔ معاملہ بگڑ رہا تھا۔ بیس بال کیپ والا مرد بد تمیز تو تھا ہی، لیکن اس کا ضرورت سے زیادہ پرُسکون ہونا گارڈ کو اور مشکوک کر رہا تھا۔ اب گارڈ پھولتے نتھنوں کے ساتھ اس کی جیبوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کے پیچھے مسافرین بے قرار ہو رہے تھے۔ انھیں اپنی فلائٹ کی فکر تھی۔

MH370 کی بورڈنگ میں اب بس آخری دس منٹ تھے۔

رائج نے بگڑتے حالات دیکھے تو دخل دینا پڑا۔ ظبیہ پر ایک آخری، دیرپا نگاہ ڈالتے وہ قدم قدم چلتا سفید ٹی شرٹ والے مسافر تک گیا۔

شیطان چلا گیا، تو ظبیہ نے سانس لیتے اپنا سامان بیگ میں واپس ڈالنا شروع کیا۔ بد تمیز گارڈ ساری تہ کھول چکا تھا۔ سیدھی ہوئی تو لال آئی ڈی کارڈ والی لڑکی نے ایک شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا بورڈنگ پاس تھامتے جانچا۔ سب صحیح تھا، صحیح ہی ہونا تھا۔ رائج آدم تو بس شیطان کا چیلا تھا۔

بار کوڈ اسکین ہو گیا تو اس نے ظبیہ کو اس کا پاس واپس تھمایا۔ "ہم معاذرت خواہ ہیں، میم۔ کیپٹن رائج حادثے کے بعد سے—"

"محترم اکائرز مورا صاحب، آپ اپنی جیبوں مین چلّر کیوں لیے ہوئے ہیں؟" رائج گرج رہا تھا۔ "پہلے کبھی ایئرپورٹ نہیں آئے آپ؟"

آدھا چہرہ کیپ سے چھپا تھا، آدھے پر ماسک تھا، پھر بھی کمینی مسکراہٹ آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ "آپ نے کبھی بلایا ہی نہیں۔"

توبہ، رائج ہکا بکا اسے دیکھے گیا۔

گارڈ نے رائج کے مائگرین کی شعاعیں اٹھتیں محسوس کیں تو فوراً معاملہ سنبھالنے آگے بڑھا۔ "آپ اپنی جیبیں خالی کریں، مسٹر زمورا۔ بیلٹ بھی اتاریں۔"

لال آئی ڈی کارڈ والی لڑکی کے منہ سے وہ لفظ سن کر ظبیہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہی لفظ جو پانچ سال پہلے ان کی زندگیوں کا کُل بن گیا تھا، جس نے اسے اٹھتے بیٹھتے ڈسا تھا۔ وہی لفظ جس نے رشتے چبا کھائے تھے اور خوابوں پر خون تھوکا تھا۔ وہی لفظ جس کی بنا پر رائج آدم نے اپنے اور اس کے درمیان انگنت فاصلے پرو دیے تھے۔

حادثہ۔ وہ حادثہ۔

حادثے کے بعد رائج بدل گیا تھا؟ حادثے کے بعد اس نے سب کھو دیا تھا؟ ظبیہ اپنی کون سی رگ دباتی جو وہ ہنس پاتی۔

اس دن رائج آدم خود تو زندہ بچ کر آیا تھا، لیکن اس نے ظبیہ یمین کی موت پر قلم بلا جھجک توڑ دیا تھا۔ اس شخص سے اگر اس کا کوئی بھی رشتہ تھا تو وہ تھا ظالم اور مظلوم کا۔ فاسق مجرم اور کند ذہن مقتول۔

"D25"

"ہوں؟" ظبیہ نے گردن موڑے فلائٹ اٹینڈنٹ کو دیکھا۔ وہ ہلکا سا مسکراتی اس کے پاس کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ "آپ کا سیٹ نمبر۔ سیدھا چلتے دائیں ہاتھ کی طرف، تھوڑا آخر میں۔ میں دکھا دوں؟"

"نو، اٹس اوکے۔ تھینکس۔" وہ ہڑبڑا کر کہتی کنارے سے کٹ کے نکل گئی۔ رائج کا کچھ بھروسہ نہیں تھا۔ وہ کہیں سے بھی پرکٹ ہو کر اس کی فلائٹ رکوا سکتا تھا۔ ظبیہ کا دل کیا تھا اس کا منہ توڑ آئے، لیکن زندگی بھر کے جرائم وہ کر چکی تھی۔ اب تعزیز کا وقت تھا، معافی اور توبہ کا۔

پیچھے کالی جیکٹ والا مرد بیزار سا کھڑا گارڈ کو دیکھ رہا تھا، جو جھک کر اس کا بیک پیک کھول کھول کر تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے سینے پر بازو لپیٹے، ہیزل آنکھوں میں ڈھیروں شبہ لیے، کیپٹن رائج تھا۔ اس حکم کا صادر۔ اللہ، کوئی اس شخص کو اندر بھیجتا۔ جہاز اس نے اڑانا تھا۔

"تم نے جو اس لڑکی کے ساتھ کیا۔۔۔" اکائر نامی مرد بولا، آواز بے ساخت تھی اور ماسک کے پار سے جھانکتی سیاہ سرمئی آنکھیں رائج پر۔ "اس کے لیے تم پر کیس ہو سکتا ہے۔ ہراسمنٹ کا۔"

اس کا بیگ چھانٹتا گارڈ ایک دم رکا۔ اس ایک سیکنڈ میں اسے اپنا آپ سلاخوں کے پیچھے نظر آیا تھا، اور وہ منظر ڈراونا تھا۔ رائج آدم، تم مجھ سے کیا کروا رہے ہو؟ خدا پوچھے تمھیں۔ اس نے برا سا منہ بناتے ایک زپ بند کرتے دوسری کھولی۔

رانج نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا ہمارے درمیان ایک لیگل ایکسپرٹ بھی موجود ہیں۔ شکریہ، مجھے یقین ہے ہمارے پلین کو آپ کی ماہر رائے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑے گی۔" نگاہ گارڈ کی طرف موڑتے نہ تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی نہ ہی آواز میں طنز۔ "ہو گیا؟"

"جی، سر۔ All clear." گارڈ نے اکائر کی معصومیت کی گواہی دی، حالاں کہ انگلی بھی سب سے پہلے اسی نے اٹھائی تھی۔ اکائر اسے گھور تا رہ گیا۔ اب زندگی بھر اسے بڑی مونچھیں اور مرجان کی انگوٹھی پہنے ہاتھ اپنی بددعائوں میں یاد رہنے تھے۔

"گڈ۔" رانج اس کی طرف گھوما۔ "Have a safe flight, Mr Zamora." اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

اکائر اس کی پشت کو دور جاتا دیکھتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس نے رانج کو بہت دور جا کر رکتا دیکھا تھا۔ شاید وہ کسی دیوار سے ٹیک لگائے ہوا تھا۔ شاید اسے سانس نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ اوندھا ہوا فرش پر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ یا شاید وہ رو رہا تھا اور آنسو بہانے کو اس نے زمین چنی تھی۔

لیکن پھر اس نے سر جھٹکا۔ رانج آدم کیوں رونے لگا؟ آنکھیں چھوٹی کرتے اس نے وہاں اسے ڈھونڈنا چاہا، لیکن اب وہ راہداری خالی تھی۔ شاید ہمیشہ سے ہی خالی تھی۔ اکائر کو دھوکا ہوا ہو گا۔ سب کو ہوتا ہے۔

اس نے گردن موڑتے قدم فلائٹ اٹینڈنٹ کی جانب بڑھائے۔ تقریباً سارے مسافر جہاز میں سوار ہو چکے تھے اور آخری کے چند افراد تفری میں اپنا سامان اوپر چڑھا رہے تھے۔

فلائٹ اٹینڈنٹ اسے دیکھ کر مسکرائی اور اس کا پاس لیتے اسکین کرنے لگی۔ اتنے میں اکائر اپنا ماسک اور کیپ اتارنے لگا۔ اس کی سرخ و سپید رنگت جہاز کی بتیوں میں دمک اٹھی۔ ٹھوڑی پر گھنی شیو اور نرم کالے بال، جو کناروں سے ذرا بڑھے تھے اور پچھلی طرف نفاست سے جمے ہوئے۔ وہ ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ عمر لگ بھگ اٹھائیس انتیس کے عنقریب۔

"آپ کا نام؟" فلائٹ اٹینڈنٹ اپنی ٹوٹی پھوٹی مالائی انگریزی میں پوچھ رہی تھی۔

"اکائرز مورا۔" اس نے ٹھنڈی آواز کے ساتھ جواب دیا۔ لڑکی کے برعکس اکائر کی انگریزی صاف تھی اور حروف صریح۔ وہ ملائیشیا کا رہائیشی تھا، لیکن کوئی بھی بتا سکتا تھا اس کی جڑیں کسی غیر ملکی کی تھیں۔

لڑکی نے پریشان سی شکل بنا کے اس سے اسپیلنگ پوچھی، تو وہ مسکرا دیا اور جیکٹ بازو پر ڈالتے دروازے کے ساتھ ٹک کر لہک لہک کر بتانے لگا۔

"A-c-a-i-r." آگے جھکتے لڑکی کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھا، کہ لکھ بھی رہی ہے یا نہیں، پھر بند آنکھوں سے بولتا گیا۔ "Z-a-m-o-r-a."

لڑکی نے اسے اس کی سیٹ بتائی تو وہ ایک منٹ کے لیے رکا، نظریں سامنے دوڑائیں جہاں قطار در قطار لوگ بیٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے درمیان اس کی سیاہ سرمئی آنکھیں صرف ایک کو تلاش رہی تھیں۔ جیسے ہی کالے عبائے کا سرا اسے نظر آیا وہ چہرہ موڑتے واپس اس سے مخاطب ہوا۔

"میری سیٹ تبدیل کر دیں۔"

"جی؟" اٹینڈنٹ گڑبڑا کر اسے دیکھنے لگی، تو اس نے ایک معصومانہ مسکراہٹ سمیٹتے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "وہ، میری ٹانگیں لمبی ہیں۔ فلائٹ میں مسئلہ ہوتا ہے۔ میری نسیں چڑھ جاتی ہیں۔ تو اگر کوئی خالی سیٹ جس میں لیگ روم ذرا زیادہ ہو تو۔۔۔"

"اوہ اوہ، جی، ضرور۔ میں دیکھتی ہوں۔ ملائیشیا ایئرلائنز اپنے مسافرین کا جوڑ توڑ کر خیال رکھتی ہے!" فلائٹ اٹینڈنٹ پرجوش سی بول رہی تھی۔

اکائر دل کھول کر مسکرا دیا۔ "How sweet."

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

فلائٹ اٹینڈنٹ آگے بڑھ کر گر معلومات کرنے لگی اور وہ ادھر ہی ٹک گیا، آنکھیں اب اس پر تھیں جو اپنا بیگ سر کے اوپر والے خانے میں جمارہی تھی۔ سوٹ کیس ضدی بچے کی طرح باہر کو سرکنے لگا، تو اس نے پوری قوت سے اسے ٹھوکر مارتے اندر کیا۔ اکائر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرادیا۔

اور مسکراتے ساتھ ہی اپنے آپ کو روکا اور گڑبڑا کر ماسک پھرتی کے ساتھ واپس چہرے پر چڑھایا۔

کچھ چیزوں کا پوشیدہ رہنا ہی سب کے لیے مفید ہوتا ہے۔

★★★

جگہ: بورڈنگ گیٹ کے باہر

AM12:15

رانج گردن پیچھے کیے آسمان کو تک رہا تھا۔

گہرے سیاہ بادل چاروں طرف تھے۔ آج نہ آسمان میں کوئی ستارہ تھا نہ ہی چاند۔ سب جیسے چھپ سے گئے تھے۔ وہ بورڈنگ کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کا ساتھی پائلٹ اسامہ عامر اپنی بیوی کی دو کالز اگنور کرنے کے بعد تیسری اٹھانے ذرا دور گیا تھا۔

ویرانے میں اڑتی ہوائیں مدھم تھیں۔ آس پاس ٹیک آف کرتے پلین، کار گو کے لوڈ ہونے کی آوازیں، دور ٹرمینلز کی روشنیاں وہاں سے دور تھیں۔ رانج یہاں پر کھل کر سانس لے پا رہا تھا۔ اسے بند جگہوں سے ویسے بھی خار اٹھتی تھی۔

اسامہ اس سے عمر میں بلاشبہ بڑا تھا، لیکن ایئر لائنز کا کوئی بھی فرد بلا جھجک یہ کہہ سکتا تھا، کہ کامیابی کے پہاڑ سر کرنے میں اور اس پھرتی کے ساتھ کرنے میں، رانج آدم کا نام سر فہرست تھا۔ بائیس سال کی عمر سے شروع ہوا اس کا کریئر صرف اونچائیوں کی نذر ہوا تھا۔ وہ ہر درجہ، ہر مقام پر ایک مثال رہا تھا۔

ملائیشیا ایئر لائنز کا قابل ترین پائلٹ رانج آدم۔

پھر کچھ ہوا تھا۔

کہانی نے ایک موڑ لیا تھا، جیسے سب لیتی ہیں، لیکن وہ موڑ رائج آدم کی زندگی کا بن جائے گا، اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔

"بادلوں میں کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اسامہ کال ختم کر کے اب اس کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ رات کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے کھچڑی جیسے بال ماتھے سے پیچھے اڑ رہے تھے۔ اس نے بھی رائج جیسا ہی یونی فارم تان رکھا تھا، سفید شرٹ، نیلا کوٹ، البتہ رائج جیسی قامت اس کے پاس نہیں تھی۔

رائج نے اسے دیکھا اور کچھ سوچ کر ہلکا سا مسکرا دیا۔ "میں سوچ رہا ہوں شادی کر لوں۔"

اسامہ اس کے قریب آ کر رکا، آنکھوں میں حیرت تھی اور چہرے پر بڑی ساری مسکراہٹ۔ "نہ کرو۔ تم میرا پوپٹ بنا رہے ہو۔"

رائج ابرو اٹھائے مسکراتا رہا۔ اسامہ نے ڈرامائی سانس خارج کی اور پھر سر دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ "مجھے پتا تھا۔ یہ ایک محبوب کی نظر ہے۔ لیکن ایک بات میری کان کھول کر سن لو، کپتان۔ اگر اس بار میرا دل توڑا تو الگ سے ساتے کی دعوت لوں گا تم سے۔" (ساتے ایک مالائی پکوان ہے جس میں مرغ یا گوشت کو گرل یا میرینیٹ کر کے پینٹ ساس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔)

رائج ہنس دیا، گال پر آدھا چاند واضح ہوا۔ آسمان کا چاند شاید اسی نے چرایا تھا۔ "نہیں، اس بار ارادہ پکا ہے۔"

اسامہ کو تو بہت مزہ آ رہا تھا۔ رائج آدم اپنی لولائف پر روشنی ڈال رہا تھا، وہ بھی بغیر پوچھے۔ ایسا دن روز روز کہاں آتا تھا بھلا؟

"تو میں نورین کو بولوں لڑکی دیکھے؟ کچھ بتا رہی تھی وہ ہفتہ پہلے۔ کسی رشتے دار کی بیٹی ہے اس کے۔" اسامہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے فوری رشتے ڈھونڈنے لگ گیا تھا اور وہ ساتھ کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔

اس نے سر نفی میں ہلایا اور ہاتھ اٹھا کر اسامہ کو روکا جو اسے چوہتار شتا گنوا رہا تھا۔ ”تم اپنا سوٹ ریڈی کرواؤ۔ لڑکی میں ڈھونڈ چکا ہوں۔“

اور یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھتے اوپر چل دیا۔ اسامہ اس کے پیچھے ’ہیں ہیں‘ کرتا لپکا۔ دروازے کے پار فلائٹ اٹینڈنٹ نے انھیں خوش آمدید کہا۔ لورا ووڈس۔ رائج اسے جانتا تھا۔

وہ سر کو خم دیتے برابر سے نکل کر کاکپٹ کی جانب بڑھا۔ پیچھے اسامہ لورا کو رائج کی شادی کی تازہ دم خبر سنا رہا تھا اور لورا اس کی آواز کا وولیوم کم کرنے کی کوشش میں تھی۔

جلد وہ بھی کاکپٹ میں آ چکا تھا۔ رائج اپنی ٹوپی، فون، چابیاں وغیرہ پائلٹ کے مخصوص خانے میں ڈال رہا تھا، ہیزل آنکھیں پینل اور سیٹ اپ جانچ رہی تھیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو warning lights اپنا رنگ بدل کر پائلٹ کو اطلاع دے دیتی ہیں۔ وہ بھی عادتاً ایسے ہی کسی جھول کو ڈھونڈ رہا تھا۔

چیزیں سمیٹ کر اس نے آگے ہو کر بائیں ہاتھ والی اپنی سیٹ سنبھالی۔ اسامہ نے بھی اپنی جگہ لے لی اور صفحات پلٹ پلٹ کر فلائٹ پلان پڑھنے لگا۔

”چائنہ پہنچ کر اگر تم نے مجھے تصویر نہیں دکھائی تو میری تیری دوستی ختم۔“ اسامہ سنجیدہ آواز کے ساتھ بولا، تو وہ ایک منٹ کے لیے چونکا پھر تھوڑا سا مسکرا دیا۔

اپنی سیٹ برابر کی اور اپنے گرد بیلٹ کسی۔ ”اسے پسند نہیں آئے گا اگر میں اس کی تصاویر بانٹوں گا۔“

پھر سامنے رکھا ہیڈ سیٹ اٹھا کر کانوں پر لگایا۔ ساری آوازیں ایک لمحے کے لیے بند ہو گئیں۔ اس کے کانوں کے پردے سہم گئے، دماغ خالی ہو گیا۔ رائج کو لگا جیسے اب وہ آوازیں پھر کبھی نہیں آئیں گی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ شاید سب صحیح ہو گیا تھا۔ پانچ سال پہلے چلا طوفان سمٹ رہا تھا۔ شاید وہ ماضی کے اس عذاب سے نکل آیا تھا۔

اور پھر سکوت کا بچھا تخت ایک آواز کے ساتھ پلٹا۔

وہ آواز کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔ وہ رائج آدم کے حوش و غوش سے آتی ایک ہی کلکاری تھی جس سے اس کے کان تو غافل رہ سکتے تھے، لیکن اس کا دماغ نہیں۔

ہنسی۔ ایک معصوم ہنسی۔ جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے کان کی لو کو چھو کر گزر جاتی، اپنے بھولے بھالے قہقہوں سے اس کے روح کے ذرے ذرے کو سال دیتی۔

ہیزل آنکھوں کے سامنے ایک منظر دھندلا رہا تھا۔ وہ اس کے حواسوں پر قابو چاہتا تھا، اسے اپنے ساتھ ماضی کی اس آزاردہ گھڑی میں لے کر جانا چاہتا تھا جہاں سے مخروج اسے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بھنچیں۔ ساتھ بیٹھا اسامہ ریڈیو فریکوئنسی درست کرتے اس سے کچھ کہہ رہا تھا، لیکن وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ سن ہی نہیں پا رہا تھا۔ ہنسی کی آواز اس کے کانوں سے ہو کر کندھوں پر چڑھ رہی تھی، ہر قہقہے کے ساتھ اور تیز، اور ہنگم اور بھی زیادہ خوش۔

اور یہاں اس کی سانس اٹک سی گئی۔ "Abby (ابی)!"

وہ منظر اب پہلے سے زیادہ تیزی سے ہوا میں جذب ہو رہا تھا۔ رائج کی ہتھیلیاں ٹھنڈی ہو رہی تھیں اور چہرہ دہک رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں کی مٹھی بنا کر خود کو قابو کرنا چاہا، لیکن اس کے آس پاس سب بہہ رہا تھا، اور وہ اس خون شار میں اوندھے منہ ڈوب رہا تھا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ وہ سیدھا ہوا۔ اسامہ نے گردن موڑ کر اس پر ایک نگاہ ڈالی، لیکن شاید اسے اس کی اندرونی جنگ کا اندازہ نہ ہوا۔

کاش ہو جاتا۔

رائج بمشکل کپکپاتی انگلیاں نیوی گیشن پینل Navigation panel تک لے کر گیا۔ ایک دو بٹن سیٹ کرنے کے بعد اس نے ہیڈ سیٹ کے ساتھ لگا مائک درست کیا اور ہونٹوں کے قریب لایا۔ شہادت کی انگلی سے کنارے پر لگا سوئچ آن کیا۔ اگلے الفاظ جو کاکپٹ میں گونجے وہ اس کے اپنے تھے۔

"Ground, Malaysian 370. Good morning. Charlie one. Requesting push and start".

اس نے طیارے کی جگہ اور روانگی کے لیے ضروری مخصوص تیاری کی اطلاع دی۔

دوسری طرف گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اسامہ فریکوئنسی چیک کرنے کے لیے آگے ہوا۔ رانج ہیڈ سیٹ کے اوپر انگلیاں لگائے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اور پھر ATC نے اس کی بات کی تصدیق کی۔

"Malaysia 370, Lumpur Ground. Good morning. Pushback and start approved. Runway 32 Right. Exit via Sierra 4".

اجازت مل چکی تھی۔ رانج مائک میں ہامی بھر کر سیدھا ہوا۔

اس کے انتظار کے پل اپنے انت کے بہت قریب تھے۔

اور یہیں پر ہم کیپٹن رانج آدم اور ان کے کو پائلٹ اسامہ عامر کو اس بد طالع طیارے کی کاکپٹ میں چھوڑ کر وقت کے چابک پیچھے چلاتے ہیں۔ پانچ سال پیچھے!

جب رانج آدم کے ستارے پھٹ پڑے تھے اور آسمان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جب فضاء میں ہوتے ہوئے بھی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ جب اس کے سراپ کا پہلا بیج بویا گیا تھا، وہ بیج جو ذرا سی ہوا اور پانی سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی شاخ بنا تھا۔ ایسی شاخ جس کا سایہ چھاؤں کے بجائے آگ برساتا تھا۔

جب ہماری کہانی نے وہ موڑ لیا تھا جس کے بغیر کلائمکس ناممکن تھا۔

★★★

۱۸ نومبر، ۲۰۰۹

متحدہ عرب امارات، دبئی

دبئی انٹرنیشنل ائیرپورٹ

گارھود کا علاقہ مغرب کی نارنجی روشنی میں پرنور تھا۔

قریب کسی مسجد سے آتی اذان کی آواز نے ایئرپورٹ کی مسلسل ہلچل میں وقتی تور پر ایک سکوت پیدا کیا تھا۔ کچھ مسافرین اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے احترام وعزت کے ساتھ اذان سن کر اس کا جواب دے رہے تھے، کچھ کو ابھی بھی دنیاوی چیزیں جیسے ٹکیٹنگ اور اپنی فلائٹ کی فکر کھائے جارہی تھی اور کچھ جائے نماز ہاتھ میں دبائے نمازہال کا رخ کیے ہوئے تھے۔

ٹرمینل کے اندر ہی جگہ جگہ قد آور ناریل کے درخت اور جگماتے سفید ستون نصب تھے، جن کے اوپر لگی LED اسکرینز پر دنیا جہاں کے نامی گرامی برینڈز کی نمائش ہورہی تھی۔ پرفیوم، گھڑی، چاکلیٹس۔ نظر گھمائو تو ذرا فاصلے پر (Dubai International Airport) DXB کا لوگو بھی مخصوص پیلی اور نیلی بتیوں میں واضح تھا۔

ذرا آگے بڑھو تو لفٹ اور اسکیلیٹر سے اوپر نیچے جاتے لوگ دکھائی دے رہے تھے، آنکھوں میں ایک نئے سفر کا جوش لیے۔ کھانے پینے اور خرید وفروخت کی دکانوں کے باہر تو الگ ہی رش نمایاں تھا۔ کیونکہ یہ وہ دور تھا جب موبائل فون اور آن لائن شاپنگ کس چڑیا کا نام ہے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

زندگی آسان تھی، سیدھی سی۔ محبتیں بھی آسان تھیں۔

مرمری ٹائلز رات کی بڑھتی تاریکی میں ایسے ہی تھے جیسے سیاہ آسمان پر سجا تاروں کا تھال۔ ماضی کی اس گھڑی میں دبئی انٹرنیشنل ائیرپورٹ کا ٹرمینل ون ویسے ہی جشن منارہا تھا جیسے پانچ سال بعد ہزاروں کلو میٹر دور کوالالمپور ائیرپورٹ کا ٹرمینل ون۔

دونوں ہی دو آزاردہ حادثات سے پہلے کے لمحات تھے۔ کاش کوئی وقت موڑ دیتا، کاش کوئی نشانی چھوڑ دیتا۔

یہ منظر تھا اس ہی ائیر پورٹ کے ایک کنارے پر بنے کیفے Costa Coffee کا۔ سرخ رنگ کی دیوار پر یہ نام بڑے بڑے انگریزی اور عربی حروف میں درج تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا اربن اسٹائل کیفے تھا، لکڑی اور اینٹوں سے آرائش، لال، کتھئی اور ہلکے نارنجی رنگوں میں ڈوبتا ہوا۔

جگہ کے محدود ہوتے ہوئے بھی بیٹھنے کے انتظام کو پوری طرح سے آرام بخش بنایا گیا تھا۔ لکڑی کی سیٹوں پر نرم گدیاں سجائی گئی تھیں اور ساتھ ہی کائوچ اور چھوٹے صوفوں کا بھی بھرپور استعمال فراہم تھا۔

"Bila Abby datang؟" ابی کب آئیں گے؟

یہ معصوم آواز سرخ رنگ کے صوفے پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ایک چھوٹی بچی کی تھی۔ اس کے بال ہلکے سنہرے تھے جنہیں کناروں پر دو بن (Bun) میں باندھا گیا تھا۔ رنگت سپید اور گال بھرے بھرے گول۔ آنکھیں اس کی جانی مانی تھیں۔ ایسی آنکھیں آپ اس کہانی میں دیکھ چکے ہیں۔ ہیزل۔ لیکن ان میں سبز رنگ ذرا زیادہ تھا۔

وہ ہونٹوں کا گول دائرہ بنائے سر یہاں وہاں گھما رہی تھی، سامنے رکھے چاکلیٹ کروسینٹ کو بری طرح اگنور کرتے۔ اگر کروسینٹ کوئی عزت دار آدمی ہوتا تو اب تک اپنی ناقدری پر اٹھ کر چلا گیا ہوتا۔

"Dia akan datang." وہ آجائے گا۔

"Jom, makan dulu." چلو، پہلے کھانا کھالو۔

یہ آواز بچی کے سامنے کرسی پر بیٹھی تیس بتیس سال کی عورت کی تھی، احتمالاً اس کی ماں۔ اس نے ہلکے بھورے رنگ کی ٹرٹل نیک پہنی ہوئی تھی، سبز آنکھیں بڑی اور کالے رنگ کے لائنر میں کھل رہی تھیں۔ کندھوں تک آتے بال گہرے سنہرے اور ہلکے بھورے کے درمیان ایک خوبصورت رنگ کے تھے۔ چہرے پر تھوڑا بہت ہی میک اپ تھا، کثیر اس کی اپنی نیچرل بیوٹی تھی۔

وہ بار بار ہاتھ میں پکڑے اپنے فون کو دیکھتی، چھوٹی اسکرین والا بٹن فون، لیکن وہ بجھا رہتا۔ کیا وہ نہیں آ رہا تھا؟

اس کے سرخ و سپید چہرے پر ناخوشی کی ایک جھلک واضح ہوئی پھر فوراً فون سائڈ رکھتے وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور اپنی بیٹی کو گھورا جو اب بھی کروسینٹ میں خالی پیلی انگلیاں مار کر اسے تنگ کر رہی تھی۔

"ادا، کھانا کھاؤ یار۔ کیا مذاق ہے؟ تمھارا باپ میرا سر کھائے گا ورنہ۔" وہ فرفر مالائی میں بولتی چلی گئی۔ بچی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، آنکھوں میں نہ ماں کا خوف تھا نہ کھانے کا شوق۔

"ابی۔" ہلکی سی سرگوشی میں بس ایک لفظ کہا اور سر واپس گرا لیا۔ اس کی ماں اسے دیکھتی رہ گئی۔ تو یہ طے تھا کہ اس نے کچھ نہیں کھانا تھا جب تک ابی نہ آ جاتا۔

رباب نے بٹنوں والا فون کھولا اور ایک دو کلک کے بعد ایک نمبر ملانے لگی۔ پہلے فون اپنے کان سے لگایا اور جیسے ہی رنگ جانے لگی تو آگے بڑھ کر ادا کے کان سے جوڑ دیا۔

ادا پہلے تو پریشان ہوئی لیکن دوسری طرف کی آواز سن کے اس کا سارا چہرہ کھل اٹھا۔ "کہاں ہیں آپ؟" وہ فون میں ہنسی۔

"بہت دور۔ میں نہیں آ سکتا شاید۔" اس کی آواز فون سے آئی تو ادا پوری کی پوری مرجھا گئی۔ اس ہی لمحے رباب نے اس کے پیچھے امڈتے سر کو دیکھا۔ آہ، وہ آ گیا تھا۔ تنگ کر رہا تھا بچی کو۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"ایسے کیسے؟ ہمیں کٹ کیٹ پارٹی کرنی تھی!" ادا کے آنسو تو بن کر بہنے والے تھے۔ آج اس کا دل ٹوٹا تھا۔ ابی، اس کی پہلے محبت، اسے کٹ کیٹ پارٹی کا لارا دے کر بھاگ گیا تھا۔ اس پر تو چار راتوں کا سوگ بنتا تھا۔ گھر جاتے ہی ساتھ اس نے Jerry&Tom کے چار سیزن دیکھنے تھے اور دو ہفتوں کے لیے اسکول سے لیو پر جانا تھا۔ محبت میں دھوکا ہوا تھا، بھئی۔

"او، ڈیم اٹ! ادا کے آنسو تو بن کر بہنے والے تھے۔ آج اس کا دل ٹوٹا تھا۔ ابی، اس کی پہلے محبت، اسے کٹ کیٹ پارٹی کا لارا دے کر بھاگ گیا تھا۔ اس پر تو چار راتوں کا سوگ بنتا تھا۔ گھر جاتے ہی ساتھ اس نے Jerry&Tom کے چار سیزن دیکھنے تھے اور دو ہفتوں کے لیے اسکول سے لیو پر جانا تھا۔ محبت میں دھوکا ہوا تھا، بھئی۔

"او، ڈیم اٹ! میں تو اسنیکرز لے آیا۔" وہ ناٹک چھوڑ کر ٹھیک اس کے پیچھے کھڑا بولا تو ادا ایک چیخ کے ساتھ اس سے جا لپٹی۔

"ابی!" آنسو اب اس کے گالوں سے بہہ رہے تھے لیکن وہ خوشی کے تھے۔ کٹ کیٹ ہو یا اسنیکرز، اسے اس کا ابی مل گیا تھا۔

رابح نے ادا کو فرش سے اٹھا کر گلے سے لگایا، ہونٹوں پر اتنی ہی بڑی مسکراہٹ تھی جتنی بچی کے چہرے پر۔ ہاتھ کی پشت سے اس کے آنسو صاف کیے اور پھر گال پر بوسہ دیا۔ "ابی کی جان۔ اتنے موٹے موٹے آنسو؟ پتا ہے ملائیشیا میں پانی کی کتنی قلت ہے؟"

ادا ہنس کر اس کے گال پر پیار کرنے لگی، باہیں پوری طرح سے اس کے گردن کے گرد لپیٹ لیں۔ اس لمحے سے رابح اس کا اپنا پرائیوٹ ہگ بیئر بن چکا تھا۔

رباب بھی مسکراتے ہوئے اس سے ملی اور وہ تینوں ایک بار پھر سرخ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اب گارھو دمیں مغرب ڈھل کر رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ آسمان میں چاند بڑا اور سفید تھا لیکن ائیر پورٹ کے ٹرمینل سے وہ نظروں سے اوجھل تھا۔

رابح نے رباب کے سامنے والی کرسی سنبھالی۔ ادا فوراً سے بھی پہلے اس کی گود میں چڑھ گئی۔

پانچ سال بعد کے مقابلے اس کے چہرے پر ایک ٹھنڈک تھی جو وہ اب شاید کہیں بھول آیا تھا۔ گہرے بھورے بال ہمیشہ کی طرح چھوٹے اور نفاست سے پیچھے جمے ہوئے تھے، البتہ اس کی شیو ہلکی

تھی۔ ایک چیز جو حال سے بالکل مختلف تھی، جس میں اس کی جوانی کی لاپرواہی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، وہ تھا اس کے دائیں کان میں چمکتا چاندی کا چھوٹا سا موتی۔

اس نے مالائی پائلٹ کا وہی مخصوص یونی فورم تانا ہوا تھا، لیکن کھال کو کاٹتے جاڑے سے بچنے کے لیے ایک کالی پفر جیکٹ اس کے اوپر پہن رکھی تھی۔ ادا اس ہی جیکٹ میں گھسنے کی کوشش میں تھی۔ رابح نے ہنس کر اس کو اور قریب کر لیا۔

"مجھے لگا تھا تم نہیں آؤ گے۔" رباب نے بات شروع کی اور خاص اس کے لیے منگوایا گرلڈ چیز سینڈوچ آگے بڑھایا پھر پیچھے ہو کر ایک نرم مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے بھی تو اس کا ابی سال بعد دکھا تھا۔

"آپ نے مجھے جھوٹا سمجھا ہے؟" برا سا منہ بنایا اور سینڈوچ اٹھا کر ادا کی طرف کیا۔ اس نے خوشی خوشی لے لیا تو متکلم نے ہاتھ جھاڑتے بات جاری رکھی۔ "پری فلائٹ بریفنگ چل رہی تھی۔ سیل فون آف تھا۔ ورنہ میں تو شام سے تیار ہو رہا ہوں اپنی شیطان بھانجی سے ملنے کے لیے۔" اس نے ادا کا گال کھینچا تو وہ کھکھلا اٹھی۔ رباب کا دل بھر آیا۔ کتنا پیارا تھا وہ۔ ہاں، لیکن منہ پر تو وہ یہ کبھی نہ بولتی۔

"شیطان بھانجی، بس؟ بڑی بہن کی یاد نہیں آئی تمھیں، غدار؟ جاؤ دفع ہو۔" اس نے منہ بگاڑ کر سیٹ سے ٹیک لگایا تو رابح ہنس پڑا۔

"آتی ہے، بھئی، آتی ہے۔ لیکن آپ کے 'سنیں' ہیں ناں میرے حصے کا یاد کرنے کے لیے۔ ایئر پورٹ پہنچ کر اطلاع کر دی تھی ناں؟ ڈٹر جنیٹ نہ پی لیا ہو کہیں اب تک۔" اس نے چھیڑا تو رباب بے پرواہ ہنس دی۔

"کیسے بے شرم ہو تم۔ اب تو تمھاری 'سنیں' بھی آنے والی ہے۔ میں بتاؤں گی اسے۔"

جہاں رابح کی ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے وہیں ادا کے ابرو تنے۔ اس نے رابح کے گرد ہاتھ اور مضبوطی سے لپیٹتے اپنا ماتھا اس سے ٹکرایا۔

رانج نے اس کی پشت سہلائی اور رباب کو دیکھا جو اب بھی کمینی مسکراہٹ لیے اسے تنگ کرنے کے پورے موڈ میں تھی۔ آگے جھک کر اپنا کافی کا کپ اٹھایا جو ابھی ابھی ویٹر رکھ کر گیا تھا اور گھونٹ بھرتے بات بدلنا چاہی۔ "مرتضیٰ بھائی کیوں نہیں چل رہے؟"

لیکن رباب بھی اس کی آدھی ماں تھی، اس کی رگ رگ سے واقف۔ "بچے تم اپنی بات کرو۔ مرتضیٰ بھائی کو یہاں کوئی یاد نہیں کر رہا۔" دانت دکھاتے اپنا کپ اٹھایا اور ہاٹ چاکلیٹ کا سپ بھرا۔ "باتیں ہو رہی ہیں ہونے والی منکوحہ سے؟"

"توبہ۔" رانج ہنس دیا۔ "میں شریف مرد ہوں۔" چھوٹی انگلی میں پھنسی چاندی کی انگوٹھی کو مروڑا۔

رباب نے 'باہ' کی آواز کے ساتھ ہنسی دبائی۔- "سیدھا سیدھا کہو منہ نہیں لگایا ظبیہ نے۔"

رانج منہ کھولے اسے دیکھے گیا۔ "آپ کو شک ہے مجھ پر؟ فون دیکھ لیں میرا۔ ایک کال نہیں کی اسے۔"

رباب کے چہرے کے تاثرات بدلے اور وہ ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی۔ "واقعی؟ اللہ، رانج آدم تم کتنے بونگے ہو۔ کال کر دیا کرو اسے یار۔ پتا تو رہے زندہ بھی ہو یا ٹپک گئے۔ اب اتنی بھی کوئی سختی نہیں۔ اچھا لگے گا اسے، کہ تم نے اسے یاد رکھا۔" وہ سمجھانے والے انداز میں اسے بتا رہی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر سر ہلاتا سیٹ میں پیچھے ہوا اور ادا کے کندھے پر ٹھوڑی رکھی۔ "ویسے کی تھی میں نے ایک دو بار۔۔۔"

رباب چونک کر ہنس دی۔ "دیکھا! پتا تھا مجھے۔ بالکل سیدھے نہیں ہو تم!"

اس نے اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھائے۔ "مزے نہیں کر رہا تھا۔ اماں کال نہیں اٹھاتیں۔ ظبیہ کا گھر ایک گھر چھوڑ کے ہے۔ بس، اماں سے بات کرنی ہوتی ہے فلائٹ سے پہلے۔"

"شیور، شیور۔" رباب نے آنکھیں گھمائیں۔

چند اور منٹ وہ لوگ ایسے ہی باتیں کرتے رہے۔ کبھی رباب اس کو چھیڑ دیتی تو کبھی وہ اس کی ٹانگ کھینچتا۔ پھر وہ دونوں ادا کی اسکول کے قصے سننے لگے۔ رانج نے تو ساتھ مل کر کسی پانچ سالہ فاطمہ کی خوب غیبت کی۔ توبہ، اس کا گناہ تو الگ ہی ہونا تھا۔ اس میں جب آدھے گھنٹے سے اوپر گزر گیا تو وہ لوگ علان کاروں کے الفاظ کا خاصِ خیال رکھتے کھڑے ہو گئے۔ رانج نے اس کا ہینڈ کیری اور باقی سامان اٹھایا تو رباب اش اش کرتی اس کا کندھا چومنے لگی۔ وہ ہنس کر اسے دور ہٹانے لگا۔

مرتضیٰ سے شادی کے بعد رباب آدم ملائیشیا سے UAE شفٹ ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں یہ تبدیلی اس کے لیے مشکل تھی، حد سے بھی زیادہ، اور وہ پورا پورا دن رانج کے ساتھ فون پر چپکی رہتی۔ ان دنوں میں رانج ہی اس کا اموشنل سپورٹ تھا۔ وہ اموشنل سپورٹ جو دس منٹ کال سننے کے بعد فون دور رکھ کر اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاتا اور ہر تین منٹ بعد ایک "اچھا؟" اور "نہ کریں" بول کر اپنی جان چھڑوا لیتا۔

جس دن رباب کو یہ راز معلوم ہوا تھا اس دن کی دھلائی رانج آدم کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی موئی بہن میں کتنی قوت تھی اس کا بہت قریب سے اندازہ ہوا تھا اسے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

آج وہ لوگ واپس ملائیشیا جا رہے تھے۔ ادا کی موسم سرمہ کی چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں اور رباب تو رہتی ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اور بھی زیادہ جب سے اسے معلوم ہوا تھا اس کی غیر موجودگی میں ہی اکلوتے بھائی کی شادی کی تاریخ پکی کر دی گئی ہے۔ مرتضیٰ ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنی ایجنسی میں مصروف تھا۔ نہیں بھئی، جاسوس نہیں تھا کوئی۔ ایڈورٹایزنگ ایجنٹ تھا، غریب سا۔ سو اس نے بیوی اور بیٹی کی ٹکٹ کروا دی تھیں۔ البتہ رباب کو زبان دی تھی کہ وہ بھی کام ختم کر کے جلد ادھر ہی ہو گا۔ زبان دینی پڑی تھی، ورنہ رباب کھینچ لیتی تھی۔

رانج ایک روز مرہ کی کمرشل فلائٹ سے دبئی آیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ بہن اور بھانجی بھی اس ہی کی فلائٹ کے مسافرین ہونے والے ہیں تو فون پر ہی رباب سے فلائٹ سے پہلے ایک کیفے میں ملنے کا پروگرام بنالیا۔ ویسے بھی فلائٹ کے دوران وہ ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ پائلٹ اور مسافرین کے تو بورڈنگ گیٹ بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔

لیکن یہ فلائٹ اس کے لیے خاص تھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کی بہن اور بھانجی پہلی بار اسے بطور پائلٹ اتنا قریب سے دیکھنے والے تھے، نہ ہی اس لیے کہ یہ اس کے شادی کے بریک پر جانے سے پہلے آخری فلائٹ تھی، بلکہ اس لیے کہ آج رانج آدم کی زندگی میں ایک اور بہت خوبصورت بدل آنے والا تھا۔

آج کے دن رانج آدم فرسٹ آفیسر سے کیپٹن بننے والا تھا۔

ٹرمینل ہال سے رباب کا ہاتھ تھامے گزرتی ادا کی ہیزل آنکھیں جوش اور تجسس میں ٹمٹمارہیں تھیں۔ وہ ہر علان کان لگا کر سنتی اور نئی نئی سیکھی اے بی سی سے اشتہار پڑھنے کی کوشش کرتی۔ البتہ اس کی ماں ہر جگہ سے تیزی سے اس کا ہاتھ کھینچتے نکل جاتی۔ کوئی جو ہیڈ لائن اس کی ماں اسے پوری پڑھنے دے۔ رانج ان دونوں کے پیچھے سوٹ کیس کھینچتا چل رہا تھا۔ اس کا اپنا تو کوئی سامان نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک دنوں کے حساب سے جانے کا عادی تھا، البتہ رباب اپنا آدھا گھر اٹھالے آئی تھی۔

وہ لوگ ٹرمینل کے دروازوں کے پاس سے گزرے تو ادارک کر اندھیری رات میں دور کھڑے جہازوں کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

"Yang mana satu yang Abby terang"?

ابی کون سا والا اڑاتے ہیں؟

رباب نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا اور اس کے بال سہلائے۔ "ہمارا ابی سب اڑاتا ہے، وہ سب کر سکتا ہے۔"

رائج پیچھے کھڑا مسکرا دیا۔ "ناٹ ٹرو، مجھ سے کاغذ والے آج تک نہیں اڑتے۔"

اس کی بات پر ادا زور سے ہنس دی۔ "میں سکھا دوں گی! اٹس سو ایزی!"

ادا کی معصومیت پر رباب اور رائج دونوں نے ہی ہتھیار ڈال دیے۔ رائج اس کے قریب آیا اور سوٹ کیس کنارے چھوڑ کر گھٹنوں پر بیٹھا۔ ماتھے پر سے اس کے بال ہٹائے اور دونوں ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔ "اب مجھے جانا ہو گا، گڑیا۔" نرمی سے کہا۔

ادا اسے دیکھنے لگی، پھر ماں کو، پھر واپس اسے۔ "ظبیہ کے پاس؟"

رباب کی کوک تو اس کے گلے میں ہی پھنس گئی اور وہ اوندھے ہو کر ہنسنے لگی۔ رائج ہونٹ دبائے لال پڑنے لگا۔ توبہ، بچے بھی کیسے ہوتے ہیں۔

"نہیں، بیٹے۔" بمشکل خود پر قابو پایا اور اس کا گال چھوا۔ "فلائٹ ابی نے اڑانی ہے۔ ہم ایئرپورٹ پر ملیں گے دوسری طرف۔"

"تو ظبیہ کے پاس نہیں؟" اس کی سوئی تو وہیں اٹکی تھی۔ رائج نے بہن کو دیکھا۔ بہن نے محظوظ سی مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکائے۔

"نہیں۔" اتنا مشکل کیوں تھا یہ کہنا؟ رائج اپنی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا، چقندر بن گیا ہو گا اس کا تو۔

"نہیں، ظبیہ کے پاس نہیں۔"

ادا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "پھر نانو کے گھر ملیں گے!"

رباب نے اس کا کندھا تھپکا۔ "اس سے پہلے ہی۔ چلو، اب ابی کو بائے بائے کہہ دو۔"

ادا نے اس سے گلے ملے اور رائج نے اس کی پیشانی چومی۔ پھر رباب اور ادا کو ان کے گیٹ کے قریب چھوڑ کر وہ واپس جانے کو مڑ گیا۔ دبئی ایئرپورٹ کے کونے کونے میں رش تھا، ہر جگہ لوگ ہی

لوگ۔ رائج اب قدم کریو چیک پوائنٹ کی طرف بڑھائے ہوئے تھا، جہاں عام مسافرین کی طرح فلائٹ کریو کی بھی سیکیورٹی چیکنگ کی جاتی ہے۔

وہ راستے میں ہی تھا جب جیب میں رکھا اس کا فون وائبریٹ ہوا۔ اس نے ہاتھ ڈال کر کالے ڈبے جیسا فون تھاما اور اسکرین آن کی۔ نام پڑھتے ہی وہ مسکرا دیا۔ ظبیہ۔ شکر خدا کا رباب چلی گئی تھی ورنہ ایک منٹ نہ لگتا اسے رائج کی آنکھوں کی چمک پکڑنے میں۔

ملائیشیا سے آیا پیغام ایک سطر پر مشتمل تھا۔ انگریزی میں لکھے الفاظ پڑھتے رائج کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"You are coming back today, right"?

سادہ جملہ، لیکن رائج پتا نہیں کیوں مسکرانے لگا تھا۔ ظبیہ نے اسے میسج کیا تھا، اس کا مطلب اس نے اسے یاد کیا تھا۔ اور یاد کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس نے اس کے بارے میں سوچا بھی تھا۔ وہ بھی اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ رائج کو خوشی ہوئی تھی۔

ایک ستون کے ساتھ رک کر اس نے انگوٹھے سے بٹن دبائے۔ انگریزی کے تین حروف۔

" Yes".

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

پھر رکا، زبان سے ہونٹ تر کیے، اور کچھ سوچ کر اگلا جملہ ترتیب دیا۔

"کچھ لے آؤں؟" اس بار مالائی میں لکھا۔

وہ ایک لمحے کے وقفے کے بعد فون بند کرنے ہی والا تھا جب فون کی اسکرین ایک بار پھر جگمگا اٹھی۔ اتنا جلدی جواب؟ رائج خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔

"کیا لائیں گے؟" سامنے سے سوال۔ رائج اس بار پوری طرح مسکرا دیا۔ بے دھیانی میں ناک کو چھوتے اس نے جواب سوچا، پھر واپس لکھنے لگا۔

"دیکھ کر فرمائش کرنا۔ پے چیک نہیں ملا ہے مجھے۔"

بھیج کر اسے لگا جواب فوراً ہی آجائے گا، لیکن دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ رائج کو لگا اس نے کچھ غلط کہہ دیا تھا۔ وہ پریشان سا ہو کر معذرت کا پیغام سوچنے لگا جب اسکرین دوبارہ چمکی۔

"آپ کی غربت کا خیال ہے مجھے۔ بے فکر رہیں کچھ نہیں مانگوں گی۔ کیپٹن رائج آدم خود ہی آجائیں تو پورا TTDI خوشی مناتا ہے۔"

TTDI کوالالمپور کا ایک کم درجہ متوسط علاقہ ہے جس کا پورا نام تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل ہے۔ رائج ہنس دیا۔ وہ واقعی فون پر زیادہ بولتی تھی، سامنے دیکھ کر تو چھپتی چھپاتی رہتی تھی۔

"پورے TTDI میں ظبیہ یمین بھی شامل ہے؟"

"سب سے اول۔"

رائج نے نظر اٹھا کر اپنے آس پاس دیکھا۔ بتیاں، رش، لاوڈ اسپیکر سے آتی آوازیں، ادھر اُدھر دوڑتے بچے اور ان کے درمیان کھڑا وہ۔ اس نے رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور فون واپس جیب میں ڈال دیا۔

چیک پوائنٹ تک جاتے اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ ادا کو بچپن سے اسی نے سکھایا تھا کہ جھوٹ بولنا گناہ ہوتا ہے، لیکن آج اس نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ پہلی دفعہ۔

وہ ظبیہ کے پاس ہی جا رہا تھا۔

کیونکہ کہیں اور جانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

★★★

مرحلہ نمبر ۰۲

در پرواز

(پرواز کے درمیان)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

حال

جگہ: پیسنجر کیبن

AM12:47

کیبن میں نیم پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

یہ ٹیک آف کے چھ منٹ بعد کا وقت تھا، جب MH370 نے خلا میں قدم جمائے ہی تھے۔ پیسنجر کیبن میں مدھم سرگوشیاں، خاموش ہنسی اور بول چال کی آواز سنائی دے سکتی تھی۔ کچھ لوگ تو ائیر پورٹ چیکنگ اور بورڈنگ میں ہی اتنا تھک گئے تھے کہ جگہ ملتے ساتھ ہی آنکھیں موند لیں تھیں۔ کیونکہ رات ہو چکی تھی تو یہ کوئی غیر متوقع عمل بھی نہیں تھا۔ نیند تو سب کو آ رہی تھی۔

کیبن میں موجود روشنی اتنی تھی کہ آس پاس دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ گردن میں تکیے پھنسائے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے با آواز بلند خراٹے لے رہے تھے تو کچھ ان سروس میل سے لطف اندوز ہو رہے رہے تھے۔ کچھ نے کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے رخ اپنے لیپ ٹاپ اور موبائل فونز کی جانب کیا تھ تو کچھ کو آپس میں دھیمی آوازوں میں بات چیت کرتے سنا جا سکتا تھا۔

ایسے میں ظبیہ خاموش نظروں سے چہرہ موڑے کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ اس بلندی پر کوالالمپور کا شہر چند بے معنیٰ بتیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے جہاز کے گرد پھیلے بادلوں کو دیکھتے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا۔ جو ایک ہفتہ ہوا تھا اس کے بارے میں، جو آج ہوا تھا، اس کے بارے میں۔

پانچ سال بعد اس کا رانج آدم سے سامنا ہوا تھا۔ پانچ سال بعد اس نے اسے اپنے اتنا پاس محسوس کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجھے وعدوں کی جھلک، اس کی زبان سے نکلتا ایک ایک لفظ جو ظبیہ کے لیے نیزے سے بھی زیادہ نوکیلا بنا تھا۔

اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ظبیہ کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی برباد ہوئی زندگی بس اسی چیز سے قاصر رہ گئی تھی کہ اس کا عرصہ پرانا محبوب اس کے سامنے کھڑا کسی ہتھیار کی تلاش میں اس کے کپڑوں اور موزوں میں ہاتھ مارے۔

رانج کی آنکھوں میں کتنا شک تھا اس کے لیے، کتنی اجنبیت۔ اس کی زبان سے خود کا نام سننا بھی خود کو دھڑ سے جدا کر دینے جتنا تکلیف دہ تھا۔

اسے کیسا لگا ہو گا مجھے دیکھ کر؟ کیا وہ بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہا ہو گا؟

اپنے خیالات کی گردشی سمت کا اندازہ کرتے اس نے فوراً سے بھی پہلے سر جھٹکا۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ نہیں سوچے گی اس شخص کے بارے میں۔ اس کے بارے میں تھا ہی کیا سوچنے جیسا؟ پانچ سال پہلے تک ظبیہ دھوکے میں تھی۔ اس کی آنکھیں وہ خود ہی تو کھول کر گیا تھا۔ اب وہ کیسے اس کے خوابوں میں دوبارہ آنکھیں موندنے کی غلطی کر سکتی تھی؟

اس نے چہرہ موڑتے اپنے ہاتھ میں قید کالے ہینڈ کیری کو دیکھا۔ یہ وہی بیگ تھا جسے رانج نے ظالمانہ طریقے سے چھانا تھا۔

وہ بے دھیانی میں بیگ کی زپ سرکانے لگی، انگلیاں سست روی سے کام کر رہی تھیں۔ نیم پیلی روشنی میں اس کی گندمی رنگت ٹمٹما رہی تھی، لیکن اس کی آنکھیں خالی تھیں۔ ایک دم سفاک۔

زپ کھلی تو سامنے اس کا سامان واضح ہوا۔ کپڑے، جوتے، برش، تھوڑا بہت بکھرا ہوا میک اپ۔ اس سب کو نظر انداز کر کے اس نے ہاتھ ایک موٹی کتاب کے جانب بڑھائے۔

بھوری نگاہیں آس پاس دوڑائیں پھر بہت احتیاط سے کتاب کو اوپر اٹھایا۔ کیبن کی سنہری روشنی میں اب اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔

War and Peace by Leo Tolstoy.

پر ظبیہ اس سے کچھ خاص متاثر نہیں نظر آ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں اب بھی حرکت کر رہیں تھیں۔ ان سے بھی زیادہ اس کی آنکھیں جو اپنے گرد گھوم رہیں تھیں۔ اس نے چند صفحات پلٹائے۔ پھر اور چند۔ کتاب اس کی آنکھوں کے سامنے کھل رہی تھی۔ چند اور صفحات اور اس کی سانس اٹک گئی۔ وہ صفحہ بالکل اس کے سامنے تھا۔

صفحات کو کاٹ کر بہت ہی نفاست سے بیچ میں ایک خالی جگہ بنائی گئی تھی۔ اس ہی جگہ میں ایک کالی چمکتی Sig Sauer دیکھی جا سکتی تھی۔

ظبیہ کی سانس ایک بار پھر تیز ہونے لگی۔ اور اس نے جھٹکے سے کتاب بند کی۔

وہ اپنے ساتھ ایک گن لیے ہوئی تھی۔ ایک ناجائز ہتھیار۔

میٹل ڈیٹیکٹر اسے اس لیے نہیں ڈھونڈ پایا تھا کیونکہ اسے ظبیہ نے موٹی ہارڈ کور کتاب کے اندر چھپایا تھا۔

اور گارڈ بازی اس لیے ہار گیا تھا کیونکہ کالی جیکٹ والا مرد ہنگامہ شروع کر چکا تھا۔

اب وہ جلدی جلدی بیگ واپس بند کر رہی تھی۔ اس کا ارادہ کسی کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا وہ یہ گن کیوں اٹھا لے آئی تھی، بس اتنا یاد تھا کہ وہ محفوظ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اگر کوئی بھی اسے اس کی منزل میں روکتا اس کے خلاف کچھ رد عمل ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس سب میں وہ یہ خونی آلہ کبھی استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک غلطی وہ کر آئی تھی، دوسری کی گنجائش وہ خود کو کبھی نہیں دے گی۔

اس کے پیٹ میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تو وہ بے اختیار اوندھی ہوئی۔ اسے لگا اس کے پیچھے بھی کوئی اپنی سیٹ میں ہلا ہے لیکن اس نے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔

ہونٹ پیستے اس نے اپنی کراہ دبانی چاہیے۔ اب یہ کیا ہو رہا تھا؟

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

پولیس سے بھاگنا، ہتھیار چھپانا، محبوب سے ملنا، اس کی علاوہ اسے کوئی جان لیوا بیماری بھی ہونے والی تھی تو اس نے سوتے لوگوں کا خیال کیے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دینا تھا۔ مطلب، حد ہوتی ہے۔

"میم، آپ ٹھیک ہیں؟" اس کی پاس سے گزرتی فلائٹ اٹینڈنٹ نے جھک کر نرمی سے سوال کیا۔ ظبیہ نے سر ہاں میں ہلایا۔

"واش روم کس طرف ہے؟"

اٹینڈنٹ نے آگے کی طرف اشارہ کیا تو ظبیہ سیٹ بیلٹ کھولتے گھبرائی ہوئی سی کھڑی ہو گئی۔

اس کے پیچھے چند سیٹ چھوڑ کر بیٹھا اکائر اسے دور جاتا دیکھتا رہا، چہرے پر فکر تھی۔ اٹینڈنٹ اس کی طرف آئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا پھر اپنی جھجھک پر قابو پاتے سوال کیا۔

"Is the woman alright"?

اٹینڈنٹ گڑبڑا کے اسے دیکھنے لگی پھر ہلکا سا مسکراتے سر ہلایا۔ "جی، سر۔ آپ ان کے ساتھ ہیں؟"

اکائر نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر مسکرا دیا۔ "ایسا ہی سمجھ لیں۔"

ساتھ ہی اس کے گال پر ایک ٹھوکر لگی۔ وہ چونک کر دوسری طرف مڑا تو اس کے برابر بیٹھی عورت اپنے گود میں لیٹے بچے کی اس حرکت پر لال پڑ رہی تھی۔ بچہ چند مہینوں کا تھا اور منہ میں انگوٹھا ڈالے ٹانگیں آگے پیچھے مار رہا تھا۔ اسی میں ایک کِک اکائر نے بھی کھائی تھی۔ وہ دل کھول کر مسکرا دیا اور بچے کا گال سہلانے لگا۔ اس کی ماں شرمندہ سا مسکرا دی۔

"معاف کیجیے گا۔ یہ پلین میں آ کر پریشان ہو گیا ہے اسی لیے اسے نیند نہیں آ رہی۔" وہ بتانے لگی۔ اکائر نے سر ہلایا اور اور بچے کے گول مٹول پیر چومے۔

"نام کیا ہے اس کا؟" جب وہ مسکراتا تھا تو اس کی سیاہ سرمئی آنکھیں مکمل طرح غائب ہو جاتی تھیں۔

عورت اس کا نام بتانے لگی۔

نام کیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔

MH370 سے بھی بھلا کون بچ کر آیا تھا؟

جگہ:لیوٹری

AM12:54

وہ بیسن کے پاس اوندھی ہوئی کھڑی تھی۔اس کی ٹھوڑی سے پانی کے قطرے ٹپک کر ضائع ہو رہے تھے۔ سر پر پہنا دوپٹہ اس نے گلے میں ڈال لیا تھا اور اب اس کے کالے بال صاف واضح تھے۔ایک دو گھنگریالی لٹیں اس کی تیوریوں پر چپک رہی تھیں۔

اس نے سانس خارج کرتے اپنی ہتھیلیاں نلکے کے نیچے کیں۔بہت سارا پانی اس کی ہاتھوں میں جمع ہو گیا تو سر گراتے اس نے اپنے چہرے پر ایک اور چھینٹا پھینکا۔

پیٹ کا درد زائل ہو گیا تھا لیکن ظبیہ اچھا محسوس تو بالکل نہیں کر رہی تھی۔اسے ڈر تھا کوئی اس کا بیگ چیر کر وہ بندوق بر آمد کر لے گا، پھر اس کی سنے بغیر اسے چلتے جہاز سے دھکا دے دیا جائے گا۔یا پھر رانج ہی پولیس کو بتا دے گا کہ وہ چین جا رہی تھی اور اسے وہاں کے ائیر پورٹ پر ہتھکڑی لگائی جائے۔

وہ ایک منٹ رکی۔رانج ایسا کیوں کرے گا؟ اسے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ پولیس سے بھاگتی پھر رہی ہے۔

ظبیہ نے ابرو چڑھائے۔ اس کی کہانیوں میں پلاٹ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔افسوس۔ لیکن پھر فوراً سیدھی ہوئی۔ نہیں۔کچھ بھی ہو سکتا تھا۔وہ کسی اندیشے کی بنا پر خود کو سکون کی گولی بالکل نہیں کھانے دے گی۔

نل بند کر کے وہ ٹشو سے ہاتھ پونچھتی باہر آئی تو راہداری ہلکی نیلی روشنی سے منور تھی۔ پلین کی گڑگڑاہٹ مستقل تھی، ارش میں پھیلا گھپ اندھیرا بھی۔

وہ اپنا بیگ کھولے کریم ڈھونڈنے لگی۔ عبائے کی آستینیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور اس کی کلائیاں اور بازو کے پہلے حصے کھلے تھے۔ بھوری جلد پر جگہ جگہ نشانات عیاں تھے۔ لال، جامنی اور کچھ تو سوکھ کر پیلے ہو گئے تھے۔ چوٹیں، خراش، جلی ہوئی جلد۔

کسی احساس کے تہت ظبیہ نے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو سامنے سے وہ گزر کر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں کچھ پکڑا ہوا تھا جو ظبیہ سے آنکھیں ملتے ہی اپنے پیچھے چھپا لیا۔ ظبیہ کو لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس کی گرفت بیگ پر مضبوط ہوئی، دانت ضبط میں پیسے۔ اب وہ شخص اس کی برداشت سے اوپر ہو گیا تھا۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑی اور رائج کو دیکھا جو اب تک ہکا بکا سا کھڑا اسے تک رہا تھا۔ شاید وہ بھی یہ راہ داری پار کر کے اندر کی جانب جانا چاہتا تھا۔ ٹو بیڈ، اب یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ظبیہ یمین پھٹ پڑی تھی۔

"مسلۂ کیا ہے تمھارے ساتھ، ہوں؟ کیوں آ رہے ہو میرے سامنے بار بار؟ کیوں آ گئے ہو تم پانچ سال بعد؟ چین نہیں آیا تھا تمھیں میرے ساتھ وہ سب کر کے کہ واپس آ گئے ہو؟ شرم نہیں ہے تم میں؟ پہلے میرا ائیر پورٹ پر اتنا مذاق بنایا، مجھے ذلیل کیا، میرا سامان کھول کر رکھ دیا اور اب دوبارہ میرے سر پر نازل ہو گئے ہو!" اس کی سانس ناہموار ہو رہی تھی اور آواز تیز۔ "تم اتنے کم ظرف، اتنے خود پرست ہو گے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا مجھے۔ شیم آن یو، رائج آدم!"

وہ اسے دیکھتا رہا، چہرے پر ایک تاثر نہیں تھا۔ اس نے ہلکا سا ہاتھ اوپر کرتے انگلی سے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"تمھاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔"

ظبیہ نے چونک کر انگلیوں کی پوریں ناک کے گرد لگائیں۔ لال۔ خون واقعی بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر بیسن پر جھک گئی اور نل کھولا۔

رائج آہستہ سے چل کر اس کے پیچھے آیا اور رول میں سے ٹشو پھاڑنے لگا۔ شیشے میں وہ اس کے عکس کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو اس نے ٹشو کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

ظبیہ نے ایک لمحہ اسے گھور کر دیکھا اور اس کے پورے وجود کو نظر انداز کرتے آگے بڑھ کر خود ٹشو پھاڑنے لگی۔ وہ ٹشو ناک کے ساتھ جوڑ کر سانس اندر کھینچنے لگی تو وہ ایک قدم آگے آیا۔ اب وہ اس کے اتنا قریب تھا کہ ظبیہ کا سارا جسم شل پڑ رہا تھا۔

اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھتے، رائج نے دھیرے سے ہاتھ اوپر اٹھاتے اس کی ناک پر رکھا ٹشو دور ہٹایا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ناک سے خون بہنے کی صورت میں سانس اندر کھینچنا مزید خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس سے خون nasal tract اور حلق میں پھنس سکتا ہے۔" وہ اتنی خاموشی سے بول رہا تھا کہ ظبیہ کے گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ دوسرا ٹشو، وہی ٹشو جو اس نے پہلے اس کے لیے نکالا تھا، اس کی ناک کے گرد دبانے لگا۔

"اسے پکڑو۔ اور آرام سے دباؤ۔ خون اندر نہیں، باہر آنا چاہیے۔"

وہ دور ہٹا تو اس کو سانس آئی۔ اس نے ٹشو ویسے ہی پکڑا ہوا تھا جیسے اس نے کہا تھا۔ اتنا بھروسہ تو کر ہی سکتی تھی۔ غلط طریقے سے ٹشو پکڑنے سے کب کس کی موت ہوئی تھی؟ وہ اس سے چہرہ موڑتے بیسن کی طرف گھوم گئی۔ رائج ایسے ہی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اس نے جھلاہٹ کا شکار ہو کر طنز کیا۔ "یہ پلین آٹو پائلٹ پر ہے؟" پانچ سال میں کیا پہلا استفسار۔

وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔ ظبیہ کا دل ایک دم بے قابو ہوا۔

"نہیں۔ کاکپٹ میں دو پائلٹ ہوتے ہیں۔"

اس نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر اسے دیکھا۔ "فی الحال تو ایک ہی ہو گا۔"

رائج مسکرا کر سر ہلانے لگا۔ وہ بھی چہرہ پھیر کر شیشے میں دیکھنے لگی۔ وہ جا کیوں نہیں رہا تھا؟ اس سے بھی بڑھ کر، وہ اسے جانے کیوں نہیں دینا چاہتی تھی؟

ٹشو بدلنے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو رائج کی ہیزل آنکھیں اس کے بازو پر جا رکیں۔ وہ اس کی نظر کے ارتکاز سے غافل رہی۔ ظبیہ کچھ کہنے کو مڑی ہی تھی کہ اس کی آواز نے اسے کاٹا۔ ٹھنڈی، خاموش آواز۔

"وہ تمھیں مارتا ہے۔"

ظبیہ کی سانس، حتیٰ کہ اس کا دل بھی بند ہو گیا۔

استفسار نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ تو اعلان تھا جو اس کے منہ پر تماچے سے بھی زیادہ قوت سے لگا تھا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور وہ لب کھولتے پیچھے گھومی۔

وہ اپنی صفائی بیان کرتی یا رائج کو دھتکار دیتی کہ اس کا اس کے ذاتی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر سامنے کھڑے شخص کے اگلے الفاظ نے اسے وہیں روک دیا۔

"مارتا ہے، ہے ناں؟ اکیلی کیوں آئی ہو؟ کہاں ہے وہ؟ بیجنگ کیوں جا رہی ہو؟ کیا کرو گی وہاں؟ ابا کیسے ہیں تمھارے؟ کہاں رہتی ہو اب؟ پڑھائی جاری رکھی تھی؟ شادی کر کے خوش ہو؟ بچے۔۔۔"

"رائج!" اس کی آنکھوں میں پانی اتر رہا تھا۔ گرم، تازہ پانی۔ وہ بدحواس سی اسے دیکھے گئی، ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں نم۔

وہ رک گیا، اس کی ہیزل آنکھیں کھل کر بند ہوئیں۔ ایک بار۔ دو بار۔ لب جدا ہوئے لیکن کوئی آواز باہر نہیں آئی۔ اسے بھی سانس نہیں آ رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ!" ظبیہ نے آستین سے آنسو رگڑتے منت کی۔ "اللہ کے واسطے، چپ ہو جاؤ۔"

سامنے کھڑے مرد کی آنکھیں لال پڑ رہی تھیں۔ ضبط سے، کرب سے۔ "تم۔۔۔ تمھیں نرس کے پاس جانا چاہیے۔" اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "چلو، میں لے چلتا—"

ظبیہ نے تیزی سے اس سے اپنا بازو دور کیا۔ اس حرکت میں اس کی کمر پیچھے بیسن سے ٹکرائی۔ درد کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اوپر سے نیچے تک دوڑ گئی، لیکن وہ درد اس تکلیف کے مقابلے بے معنیٰ تھا جو اس کے دل میں اٹھ رہی تھی۔

"دور ہٹو!" وہ غرائی۔ "میرے اندر گرم سلاخیں نصب ہوں یا میرے کانوں سے سیسا بہے، اللہ مجھے تمھارا محتاج کبھی نہ بنائے۔"

رابح کی آنکھیں اس کے چہرے کی پور پور کو چھو گئیں۔ اس کی پیشانی کی وسعت سے لے کر آنکھوں کی بھوری چمک تک، اس کے گالوں کے نرم خم سے لے کر ہونٹوں کی نامعلوم سوجن تک۔

تین سے چار دفعہ آنکھیں جھپکتے، گلے میں بنتی گلٹی کو وہ پی گیا۔ سامنے کھڑی لڑکی سے نظریں ملاتے اس کے لب ایک معصوم مسکراہٹ میں ڈھلے۔

"میری بھی یہی دعا ہے۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ایک حتمی دیرپاہ نگاہ سیاہ عبائے میں کھڑی لڑکی کے اوپر ٹھہرا کر وہ وہاں سے چل دیا۔ ظبیہ اسی راہداری میں کھڑی اسے دور جاتا دیکھتی رہی۔

کتنی بار اس نے ایسے ہی اسے خود سے دور بھیجا تھا؟ اس میں سے کتنی بار اس نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا، اور کتنی بار وہ وعدہ مکمل کیا تھا؟

وہ سب بھول چکی تھی۔ وہ سب بھول جانا چاہتی تھی۔

اب نہ وعدے تھے نہ وعدوں کو رکھنے کے دل۔ وہ دونوں زندگی کی سرخ ڈور میں لپٹے دو مسافر تھے، جن کا سفر تو ایک ہو سکتا تھا لیکن منزل نہیں۔

MH370 کی نیلی روشنی میں کھڑی ظبیہ یمین مٹ رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک اور منظر لے رہا تھا، ایک اور گھڑی، ایک اور زمانہ۔

اور اسی طرح ہم واپس آ گئے ہیں پانچ سال پہلے۔

★★★

۱۰ نومبر، ۲۰۰۹

(دبئی سے ملائیشیا کی فلائٹ سے آٹھ دن پہلے۔)

کوالالمپور میں شام کا وقت ہو رہا تھا۔

نومبر کی شروعات تھی لیکن ایشیاء کے کسی دیگرے ملک کی طرح ملائیشیا کے لیے یہ موسم گرما کا انت اور نئے سال کی سردیوں کی آمد ہر گز نہ تھی۔ یہاں کی آب و ہوا تو بارہ مہینے نم اور پر شہوت رہنے کی قائل تھی، اور اس کے زیر اثر بستے لوگ بھی اسی زندگی کے عادی بن چکے تھے۔ کوالالمپور کے چھ مہینے مونسون کا حق تھے، باقی چھ خزا کے اور کل بارہ گرمیوں کے نام۔ یہی تو تھے ایک ٹروپیکل کنٹری میں رہنے کے فوائد، اور بشیشتائی حد تک قباحت بھی۔

اس گھڑی تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل کا علاقہ نووارد تازگی کے ساتھ زندہ تھا۔ چمچماتے سورج کی تپش میں آس پاس کے بنگلے سنہری روشنی میں نہا رہے تھے۔ گلی کے کنارے پر ایک گھنا تن آور رین ٹری کا درخت بھی درسا جا سکتا تھا، جس کی شاخوں کے ساتھ جڑے پھول ہلکے گلابی رنگے تھے اور باوسعت چھاوں تلے صرف سرور ہی سرور میسر تھا۔

گھروں میں سے ایک کی جانب نظر اٹھاؤ تو وہ ایک یک منزلہ بنگلو تھا جس کی دیواریں زرد رنگ سے لیپی گئی تھیں۔ عقبی دروازے کے باہر سفید پگڈنڈی سے جڑی ایک خوبصورت کیاری واقع تھی، جہاں یاسمین کے

پھول جنم لے رہے تھے۔ گھر کی کھڑکیاں پرانی لکڑی کی تھیں اور سفید پردے شیشوں کے پار اندر جھوم رہے تھے۔

اس ہی بنگلے کی چھت پر کھڑے رابح نے آنکھیں سکیڑ کر آس پاس نظر دوڑائی۔

سنہری دھوپ اس کی ہیزل آنکھوں میں گر کر انھیں پہلے سی بھی زیادہ پرکشش نمایاں کر رہی تھی۔ اس نے ہلکا بھورا باجو کرتا پہنا ہوا تھا، (باجو کرتا ایک سنگھاسی مالائی لباس ہے جس کی لمبائی گھٹنوں سے ذرا اوپر تک ہوتی ہے) ساتھ سفید ٹراؤزر اور پیروں میں بھوری چمڑے کی چپل۔ ہاتھ جیبوں میں تھے اور نگاہیں لوہے کے زنگ آلود دروازوں سے لے کر نیچے گلی میں دوڑتے بچوں کے درمیان پنگ پونگ کھیل رہی تھیں۔

چند اور ثانیے گزرے تو وہ بے چین سا ہو کر پیر تھپتھپانے لگا۔

وہ کہاں رہ گئی تھی؟ اللہ خیر کرے، خاندان کی کسی آنٹی نے اگر اسے روک لیا تھا تو رابح کو نئے دشمن مل گئے تھے۔ ایک تو یہ آنٹیاں۔ کیسے بھاگے آدمی ان سے؟

جب وہ اپنی ہٹ لسٹ میں تین آنٹیوں کے نام ڈال چکا تھا تب اسے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ وہ سیدھا ہو کر چھت پر ہونے کا بہانہ سوچنے ہی لگا تھا (گرمی لگ رہی تھی، کپڑے سکھا رہا تھا، دماغ خراب ہو گیا تھا) کہ اس کی نظر ہاتھوں میں ٹرے سجائے، مدھم ارغوانی رنگ کے جوڑے میں ملبوس ظبیہ پر پڑی۔ اس کی سیاہ، گھنگریالی لٹیں کمر سے نیچے جھول رہی تھیں اور ہم رنگ جالی دار ڈوپٹہ کندھوں پر پھیلا تھا۔ کان میں چاندی کے چمکتے موٹے ٹاپس تھے اور ہونٹوں پر مدھم کورل پنک لپ اسٹک اپنا طلسم دکھا رہی تھی۔

رابح مسکرا دیا۔ اس کے کان میں پرویا موتی اجاگر ہوا۔

"کہاں رہ گئی تھی؟" اس نے ٹرے لیتے چبوترے پر رکھی۔

اس کے کندھوں تک آتی لڑکی نے اپنا دوپٹہ پیچھے کیا۔ "گرین ٹی بننے میں وقت لگتا ہے، صاحب۔ اوپر سے زرین کاک۔۔۔" (کاک مالائی میں بہن کو کہتے ہیں۔) زرین رانج کی خالہ زاد بہن تھی۔ کیونکہ رباب ان دنوں دبئی میں تھی تو اماں زرین اور رانج کی خالہ کے ساتھ آئی تھیں۔

بھورے باجو کرتے میں مرد نے ابرو اچکائی۔ "کچھ کہہ رہی تھیں؟"

ظبیہ کے چہرے پر ہلکی سی گلابی بکھری۔ "بس۔۔۔" آنکھوں کے سامنے سے بال ہٹائے اور نظریں چرانا بہتر سمجھا۔ "تنگ کر رہی تھیں۔"

رانج اس کا چہرہ دیکھتے تھوڑا سا ہنس دیا۔ "تم تنگ بھی ہوتی ہو؟" اپنا کپ اٹھاتے ایک گھونٹ بھرا۔ اس کی میزبان نے اسے گھوری بھری تو وہ محظوظ سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں پھیر گیا۔

"ہمیں نیچے ہونا چاہیے۔ شادی کی تاریخ رکھی جا رہی ہے۔" ظبیہ نے دروازے کی طرف دیکھتے بات دہرائی۔ اُف، زرین تک تو ٹھیک تھا لیکن اگر کوئی اور انھیں دیکھ لیتا تو مسلہ ہونا تھا۔

"مجھ سے پوچھ لو۔ اس میں نیچے جا کر کیوں بور ہونا؟" اس نے دیوار سے ٹیک لگاتے کہا۔ "تیئس نومبر سوچی تھی اماں نے لیکن ابھی آپا نے میرا کندھا بھگونا ہے اپنے آنسوئوں سے، کہ میں کتنا برا ہوں اور کیسے ہم انھیں بھول گئے ہیں۔ تو اماں نے ترس کھا کے پچیس کر دی۔"

وہ بے اختیار ہنس دی۔ "صرف دو دن کا ترس؟"

رانج نے ڈرامائی انداز میں آنکھیں بڑی کیں۔ "تو؟ میں بڈھا ہو جاؤں انھیں مناتے مناتے؟" ٹی بیگ ڈبو کر اس نے چائے کا ایک اور سپ بھرا۔

وہ مسکرا دی، اور مسکرا کر ایسے ہی اسے دیکھتی رہی۔ کچھ لمحات کی دیر میں اس کے چہرے پر ایک الگ تاثر تھا۔ گہرا، پُر فکر اور مغموم۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"میں بھی کیسی بدنصیب ہوں ناں، رانج؟ شادی کی تاریخ کے لیے نہ ماں ہے نہ باپ۔ نیچے خالہ میری طرف سے بات کر رہی ہیں۔"

وہ گردن موڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر آہستہ سے آدھی پی ہوئی گرین ٹی کا کپ واپس ٹرے میں رکھا۔

"اس میں بدنصیبی کی کوئی بات نہیں ہے، ظبیہ۔ تمھاری اماں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اللہ انھیں جنت عطا فرمائے۔ اور تمھارے ابا۔۔۔ ہاں وہ مسلۂ ہیں۔ لیکن اگر وہ اتنی پیاری بیٹی کی قدر نہیں کرتے تو اس میں صرف اور صرف ان کا قصور ہے۔"

"وہ قدر کرتے ہیں۔۔۔" اس نے ان کے درمیان اینٹوں کے فرش کو دیکھتے بولا۔ اس کا منظر دھندلا رہا تھا۔ ایک آنسو ٹوٹ کر گال پر پھسلا۔ "پیسے کی قدر کرتے تو ہیں وہ۔ اسی لیے تو رشتہ دیکھا تھا میرے لیے اس پچاس سالہ امیر تاجر کا۔"

رانج کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ "اس کی بات کیوں کر رہی ہو؟" اب کہ اس کا طرز سرد تھا۔

ارغوانی رنگ کے جوڑے میں کھڑی لڑکی نے انگوٹھے کی پشت سے گال صاف کیا۔ "کیونکہ وہ دن رات اب بھی اس کی بات کرتے ہیں۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔ وہ اب بھی چاہتے ہیں میں اس سے شادی کروں۔ اسی لیے وہ آج بھی جان بوجھ کر گھر نہیں آئے۔ انھیں پتا تھا تم تاریخ لاؤ گے۔ وہ انتظار میں ہیں کہ تم مجھے چھوڑ دو، رانج۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے ایک بھول ہو اور وہ مجھے کہیں دور کھینچ لے جائیں۔"

"میں تمھیں نہیں چھوڑ رہا، ظبیہ۔ چھوڑنے کے لیے تو نہیں لایا ناں اپنی ماں کو تمھارے گھر؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔ بھنوؤں کے درمیان ناراضی سے لکیر واضح تھی۔

"رانج، میں بس۔۔۔"

"ظبیہ۔" وہ پوری طرح سے اس کی جانب گھوما۔ سرما کی دھوپ اس کے بالوں سے ٹکرا کر انھیں ایک خوبصورت سنہرا رنگ بخش رہی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں پسند کرتا ہوں تمھیں۔ لیکن ایسے میں اگر تم بار بار مجھے یہ یاد کروائو گی کہ کیا غلط ہو سکتا ہے اور کیا چھن سکتا ہے، تو میں یہ شادی خالی محبت سے نہیں کر پاؤں گا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے نظر اپنے گرد دوڑائی۔ بھوری آنکھیں اسے تکتی رہیں۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو۔" وہ ایک قدم آگے آیا، سورج کی کرنیں اس کی پشت سے ٹکرا کر اپنی سمت موڑ گئیں۔ "میں یہ شادی خلوص اور محبت سے کرنا چاہتا ہوں، کسی ڈر میں آ کر نہیں۔" ہیزل آنکھوں میں نرمی تھی، راستی تھی۔

ظبیہ نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ "آئی ایم سوری۔"

"اب سوری کہنے کو کس کمبخت نے کہا ہے؟" اس نے گرین ٹی کا آخری گھونٹ چھانتے منہ بنایا پھر کپ دور رکھ کر واپس اس کی طرف پلٹا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ایک ہفتہ اور رک جاؤ۔ صرف آٹھ دن۔ مجھے یہ آخری فلائٹ لینے دو۔ تمھیں پتا ہے ناں یہ میرے لیے خاص ہے؟"

ظبیہ آہستہ سے مسکرا دی اور پھر اثبات میں سر جھکایا۔ "کوئی کیپٹن بننے والا ہے۔ چھ سال کی محنت کے بعد۔"

اس کی مسکان بھی گہری ہوئی۔ "کوئی نہیں، میں۔ رابح آدم۔ میں کیپٹن بننے والا ہوں۔ اور یہ تمھاری وجہ سے ہے۔"

"میری وجہ سے؟" اسے تعجب ہوا۔

اب وہ اپنے کپ میں پڑے ٹی بیگ کو اٹھائے اس کی ڈور توڑ رہا تھا۔ ظبیہ الجھی ہوئی سی اس کی کاروائی کی نگہبان بنی رہی۔ جب سفید دھاگہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تو اس نے ظبیہ کو دیکھتے بہت آرام سے اس کا ہاتھ تھاما۔

اس کے لب جدا ہوئے ہی تھے جب اس نے غور کیا کہ وہ دھاگہ اس کی چوہتی انگلی کے گرد لپیٹ رہا تھا۔

"تمھاری وجہ سے۔ تم میری کامیابیوں کا انعام ہو۔ میری زندگی کی ہر خوشی کہیں نہ کہیں جا کر تم سے جڑتی ہے، ظبیہ۔ اب میں راستہ بھی نہیں ڈھونڈتا۔ مجھے پتا ہے میرا آخر تم ہو۔"

اس کے گلے میں آنسو پھندا باندھ رہے تھے لیکن وہ بے زبان اسے دیکھے گئی۔

دھاگہ دوبار اور گھما کر رابح نے اس کی انگلی کے گرد چھوٹی سی گانٹھ باندھی، اور پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا جو ہنسنے اور رونے کے درمیان کہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ابھی اس پر گزارا کر لو۔ پچیس کو اصلی والی پہنا دوں گا۔ پکا پرامس۔"

ظبیہ نم آنکھوں سے مسکرا دی اور اپنی انگلی کے گرد بندھے سفید دھاگے کو جانچنے لگی۔ وہ پیچھے ٹیک لگا کر اسے دیکھتا رہا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

یونہی شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو گئی اور چھت پر کھڑے دو نفوس بھی وقت کی اندھیری میں گھم سے گئے۔ ماضی بیت چکا تھا۔ کون گواہ تھا ان وعدوں کا جو کیے گئے تھے، ان آنسوئوں کا جو بہائے گئے تھے؟

وقت، شاید۔ لیکن وہ گزر چکا تھا۔

کوالالمپور کے کسی گھر میں رکھی ریت گھڑی میں ہم وقت کٹتا دیکھتے ہیں۔ مٹی کے کتھئی دانے تشابی سے یک بعد دیگرے جھڑتے جاتے ہیں۔ پہلے منٹ گھنٹوں میں بدلتے ہیں اور پھر گھنٹے دنوں کی وسعت اختیار کر لیتے ہیں۔

پانچ سال پہلے اور کیا ہوا تھا؟ کہاں ہماری کہانی نے ٹھوکر کھائی تھی؟

جاننے کا وقت آ چکا تھا۔

زمانے کے باب ایک ہزار، اور ہم ایک بار پھر دستک دیتے ہیں **اٹھارہ نومبر دو ہزار نو** کے در پر۔

متحدہ عرب امارت سے ملائیشیا جاتا ہمارا طیارہ دبئی کی فضاء سے نکل چکا ہے۔ وقت ہے رات کے **دس بج کر اکیس منٹ** کا اور کردار ہیں دو۔ کیپٹن حلیزہ امانی اور ساتھ کو پائلٹ رانج آدم۔

کاکپٹ میں معمول کی حل چل تھی۔ بائیں جانب کی کرسی پر بیٹھی حلیزہ کے ہاتھ کنٹرول یوک yoke پر تھے اور آنکھیں آلاتی پینل کی انگنت جگمگاتی بتیوں پر۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا حجاب اوڑھ رکھا تھا اور رنگت گلابی سپید تھی۔ عمر تیس سے چالیس کے درمیان، اور اس کا پیشہ ورانہ علم اور تجربہ اس کے ثابت قدم رویے سے ظاہر تھا۔ حلیزہ امانی ملائیشیا ایئر لائنز کا ستارہ تھی۔

اس کے دائیں ہاتھ والی کرسی سنبھالے فرسٹ آفیسر رانج تھا۔ کانوں پر ہیڈ فون تھے اور ہیزل آنکھیں تفتیشی طرز سے کنٹرول سیٹنگز کو چھیڑ رہی تھیں۔ کالے دستانوں میں قید لمبی انگلیاں کی بورڈ پر بٹن دبا رہی تھیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

فلائٹ پلان کا دیٹا ڈال کر اس نے حلیزہ کو دیکھتے گردن اثبات میں ہلائی۔

نیلے حجاب والی کیپٹن نے اپنے ہیڈ فون میں چابی بھرتے مائک ہونٹوں کے قریب کیا۔

"New Delhi Control, this is Malaysian 405, maintaining FL350 on route to Kuala Lumpur".

رانج نے گردن ترچھی کرتے اپنے کنارے کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ اس کے نیچے انڈیا کی سرزمین روشنیوں میں نہا رہی تھی۔ بادلوں کے اوپر سے دنیا دیکھنے کا بھی الگ ہی خمار تھا، اور رانج پوری طرح سے

اس میں ڈوب چکا تھا۔ اسے بلندیوں سے عشق ہو گیا تھا، ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک ظبیہ کا چہرہ اس کے ذہن میں ابھرا تو وہ مسکراہٹ دبا گیا۔

وہ اس سے چار گھنٹے، دو ممالک اور تین بول کی دوری پر تھی۔ کاش، وقت کو پر لگ جائیں۔

"اور، اب تو دلہا بننے والے ہو، اور کیپٹن بھی۔ زیادہ خوشی کس کی ہے؟" حلیزہ نے مسکراتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی تو وہ پہلے تو ذرا چونکا پھر خاموش سا مسکرا دیا۔

"کیپٹن بننے سے زیادہ پیسے آنے ہیں اور دلہا بننے سے جانے ہیں۔ آئی تھنک آپ کو میرا جواب مل گیا ہو گا۔" ایک ہاتھ سے تھروٹل throttle کو تھوڑا آگے کیا۔ طیارے نے خفیف سی تیزی پکڑی۔

حلیزہ ہنس دی۔ "ٹرو دیٹ۔ لیکن خوشیوں کو پیسوں میں نہیں، یادوں اور احساسات میں تولتے ہیں۔ ویسے بھی رزق ہمیشہ عورت لاتی ہے۔ انشاء اللہ زوبیا سے شادی اچھی ثابت ہو گی۔"

"انشاء اللہ۔ اٹس ظبیہ بائی دی وے۔" اس نے اصلاح کی۔

"With an a."

حلیزہ نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ "اوکے اوکے، ظبیہ وداین اے۔" پھر یوک کے کنارے پر بنے ٹرم کنٹرول (trim control) کو تھوڑا سا گھمایا۔ جہاز اب پائیدار حالت میں رواں تھا۔

رائج فلائٹ پلان پڑھتے اسے موجودہ رخ پر تصدیق دے رہا تھا۔ چند منٹ ایسے ہی کٹ گئے۔ انڈیا دور ہو رہا تھا اور رات گہری۔

اس نے رباب اور ادا کے بارے میں سوچا جو پیچھے مسافرین کے کیبن میں بیٹھی ہوں گی۔ انھیں کیسا لگ رہا ہو گا اس کے ساتھ پہلی مرتبہ سفر کر کے؟ ادا تو ابی کا پوچھ پوچھ کر رباب کا کان کھا گئی ہو گی۔ اور اس کی بہن اپنی واحد خوشی، یعنی ان سروس میل، کے انتظار میں دوچار ہو رہی ہو گی۔ وہ سوچ کر ہی مسکرا دیا۔

گھر پہنچ کر اسے کتنے کام کرنے تھے۔ چھٹی تو صرف ایئر لائن سے تھی، لیکن اپنے گھر والوں کا چھوٹو تو وہ آپ تھا۔ حد ہے۔ کیٹر رسے بات، ٹینٹ کا خرچہ، دعوت نامے، ظبیہ کی شاپنگ، اس کی خود کی شاپنگ کیونکہ اب شادی تو اس منحوس نیلی وردی میں نہیں کرنی تھی ناں۔ اور کیا رہ گیا۔۔۔؟

"رانج!" حلیزہ کی آواز ناگاہ بلند ہوئی۔

وہ چہرہ موڑتے اس کی جانب پلٹا، آنکھیں بڑی ہوئیں۔ "کیا ہوا؟"

حلیزہ نے آنکھوں میں وحشت کے ہمراہ انگلی فیول گیج fuel gauge کی سمت دکھائی جہاں بنی گھڑی کا ڈائل تیز لال بھڑک رہا تھا اور ساتھ لگی سوئی اس کی نشاندھی کر رہی تھی۔ ہوا میں تحلیل طیارے کا فیول احتیاج سے پہلے ختم ہو رہا تھا۔

"We are running critically low".

حلیزہ نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے اعتراف کیا۔

رانج نے بغور لال پڑتی بتیوں کو دیکھا۔ اس کی آنتوں میں مروڑ اٹھی۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ کالے چمڑے کے دستانے اس کی انگلیوں سے چپک رہے تھے۔ اس نے آگے ہوتے فیول کنٹرول پینل کے سوئچز کو جانچا۔

"فیول ضرورت سے زیادہ جلدی برن ہو رہا ہے۔ رزرو reserves کو الالمپور تک نہیں چل پائیں گے۔ فیول ایمرجنسی اشو کریں۔ ہمیں فوری لینڈنگ کرنی ہو گی۔" کاکپٹ کی نیم سفید روشنی میں رانج نے اپنی کیپٹن کو دیکھتے پوری بات سمجھائی۔

حلیزہ نے ایک لمحے کے لیے اس سے نظریں ملائیں پھر گردن اکڑاتے سیدھی ہوئی۔ "رانج، تم میرے جونیئر ہو۔ میں اس سے بدتر صورتحال سے نمٹ چکی ہوں۔ ایمرجنسی کا اعلان نہیں کیا جاتا جب تک کہ بالکل ضروری نہ ہو۔ ہم ایئرپورٹ پہنچ جائیں گے۔"

رانج کو لگا کسی نے اس کے گلے میں پھندا ڈالا ہے۔ اس کی آنکھوں میں غصہ انگارے کی طرح بھڑکا۔ ”ہم نہیں پہنچ سکتے، کیپٹن۔ اگر ابھی لینڈنگ نہیں ہوئی تو کریش ہو جائے گا۔“

”کریش ایسے نہیں ہوتے، رانج۔“ اس نے بات ٹالی اور سیاہ آنکھیں شیشے کے باہر پھیلے بادلوں پر جما لیں۔

”تو آپ کو کیا لگتا ہے کریش پریاں کرواتی ہیں؟“ اسے سمجھ نہ آیا وہ اپنی بات اس تک کیسے پہنچائے۔

حلیزہ نے بدلتے تاثرات کے ساتھ اسے گھورا لیکن بولی کچھ نہیں۔ دانت پیستے اس نے یوک پر گرفت مضبوط کی۔

رانج آنکھوں میں لاکھ بے یقینی لیے ایک بار پھر آگے جھکا۔ ”کیپٹن—“

“Malaysian 405, this is New Delhi Control. Maintain current heading and altitude. Continue on your planned route ”.

ملائیشیا 405، یہ نئی دہلی کنٹرول ہے۔ موجودہ سمت اور اونچائی کو برقرار رکھیں۔ اپنے طے شدہ راستے پر چلتے رہیں۔

ان کے درمیان نئی دہلی ایئر ٹریفک کنٹرولر کی آواز بلند ہوئی۔ رانج کے دل میں امید کے پھول کھلے۔ بس، یہی موقع تھا۔ اس نے حلیزہ کو دیکھتے انتظار کیا کہ اب وہ فیول ایمرجنسی کی بات کرے۔

حلیزہ نے جھنجھلاہٹ میں مائک پاس کھینچا۔ ”روجر۔“ اور پھر ریڈیو خاموش پڑ گیا۔ رانج کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے غصے سے ڈیسک پر ہاتھ مارا۔ ”فیول ختم ہو رہا ہے!“

حلیزہ کی گلابی رنگت اب سرخ پڑ رہی تھی۔ ”تم میرے فیصلوں پر سوال نہیں کر سکتے، فرسٹ آفیسر آدم۔“

رانج نے اپنے ہیڈ سیٹ میں چابی ڈالتے اسے گھورا پھر ایک ایک لفظ چبا چبا کر باہر نکالا۔ ”میں کر سکتا ہوں جب میری بہن، میری بھانجی اور تین سو اور معصوم لوگوں کی جان آپ کے کسی انا پرست فیصلے پر مبنی ہے۔ آپ کو موت عزیز ہے تو کسی عمارت سے کود یں۔ یہاں تماشہ نہ لگائیں۔“

کنٹرول روم کو اس نے خود رنگ دی۔

“Control, this is Flight 405. We declare a fuel emergency. Repeat, a fuel emergency. Requesting immediate priority for landing”.

کنٹرول، یہ فلائٹ 405 ہے۔ ہم ایندھن کی ایمر جنسی کا اعلان کرتے ہیں۔ دہرائیں، ایندھن کی ایمر جنسی۔ لینڈنگ کے لیے فوری ترجیح کی درخواست ہے۔

دوسری طرف گڑگڑاہٹ ہوئی۔ حلیزہ بھی ابرو سکیڑے اسے دیکھتی رہی۔ رانج کی ہتھیلیاں بھیگ رہی تھیں۔

کنٹرول روم کو اس کا پیغام نہیں ملا تھا۔

”یا اللہ!“ رانج نے آستین سے پسینہ صاف کیا، ایک نگاہ قصرت سے گرتے فیول گیج پر ڈالی۔ وہ لال بتیاں اسے اندھا کر رہی تھیں۔ حلیزہ بھی آگے ہوئی۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ اس نے ہیڈ سیٹ میں دوبارہ چابی بھری۔ اس بار آواز میں ڈر تھا، خوف تھا، لرزش تھی۔ وہ سب تھا جو اب تک روپوش رہا تھا۔

“Control, this is Flight 405. Fuel emergency! Emergency landing required immediately”!

کنٹرول، یہ فلائٹ 405 ہے۔ ایندھن کی ایمر جنسی! فوری طور پر ہنگامی لینڈنگ کی ضرورت ہے!

گڑگڑاہٹ مستقل تھی۔ کنٹرول روم سے آتی آوازیں کاکپٹ پہنچنے سے پہلے ہی حصہ حصہ ہو جاتیں اور شاید وہاں سے جاتیں ان کی پکار بھی اسی طرح غائب ہو رہی تھیں۔

"رانج!" حلیزہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، دل آنتوں تک گر گیا تھا۔ اس نے گہری سانس بھرتے کنٹرول یوک کو سختی سے پکڑا۔

جہاز کے شیشوں کے پار اندھیری تھی اور نیچے کوسوں سے بہتا ہوا بحر الہند۔ فیول گیج سرخ بتیاں جھپک جھپک کر انھیں اپنی قلت سے آگاہ کر رہا تھا۔ چاند بڑا تھا اور خرم بھی، ان کی بدبختی پر ظالموں کی طرح دانت دکھاتا۔ حلیزہ آگے جھکی سوئچز چھیڑ رہی تھی، ریڈیو فریکوئینسی پر ہاتھ مار رہی تھی اور رانج بٹن کے اوپر اپنی انگلیاں توڑ رہا تھا۔

رابطہ، انھیں رابطہ چاہیے تھا۔ صرف ایک بار۔ بس، ایک بار۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور انتظار بھی۔

انجن خاموش پڑ گئے۔ ڈائل میں جگمگاتی سوئی سرخ زون میں جا گری۔ سیاہ سمندر کے اوپر اور نیچے صرف گمنامی تھی۔

اب طیارہ نیچے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑھ نہیں، وہ گر رہا تھا۔

حلیزہ کے بند انگشت کنٹرول یوک پر تنگ ہوئے، گھنی پلکیں نم گالوں سے جا ملیں، ہونٹ خوف سے کپکپائے لیکن زبان۔۔۔ زبان نے اپنے معبود کو یاد کیا۔ صرف اور صرف اسے۔

"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"

رانج نے اسے دیکھا۔ ایک سانس ٹوٹ کر ہوا میں گھل گئی۔ لیکن حلیزہ کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ دوبارہ بولی۔ دھیما، بھاری سانسوں کے ہمراہ۔

"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"

اب بحر الہند ان سے چند فٹ کی دوری پر تھا، اس کے سفاک سیاہ لہریں اپنے خنجر چھپائے ان کی منتظر۔

رانج نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے آہستہ سے ایک اور سانس لی۔ اسے ہوا کا ایک ایک ذرہ اپنے لبوں سے ٹکراتا محسوس ہوا۔

اور پھر کاکپٹ کی سفید بتیوں کے درمیان، رات کی اخفا تاریکی کے تابع، بحر الہند کے نمک آلود پانی کے سپرد، ان کی آوازیں ایک آخری بار ساتھ بلند ہوئیں۔

"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ"

سمندر کا پانی بے لگام اندر دھسا۔ شیشوں کے بکھرنے کی آواز ہر گوشے سے بلند ہوئی۔ پلین کا ٹکڑا ٹکڑا جدا ہو گیا۔ لہریں مالائی جہاز کا ملبہ اپنے اندر ڈوبا گئیں۔ طیارے کا ڈھانچہ اس شدت سے سمندر سے ٹکرایا کہ اس کا ریزہ ریزہ تین تیرہ ہو گیا۔ بحر الہند کی ٹھنڈی، سیاہ لہروں نے رفتاری سے کام دکھایا۔

کیبن ڈوب رہا تھا۔ نمکین پانی ناک، حلق سب موقوف کر گیا۔ مدد اور مددگار کے لیے لگائی گئیں صدائیں ضائع ہو گئیں۔

ایک ہی لمحے میں بے زبانی راج کر گئی۔

سمندر نے اس سے معاونت طلب کی تو رات نے اپنی آغوش فراخ کر دی۔ اور ایسے ہی، اٹھارہ نومبر کا دن اپنے اختتام کو پہنچا، اپنے ساتھ لاتعداد جانیں چرائے۔

اگلی شام تک آدھے ایشیا کو اس المناک واقعہ کی خبر موصول ہو چکی تھی۔ ملائیشیا ایئر لائنز نے فوری طور پر SAR آپریشن جاری کیا، کسی بھی زندہ اور بچ جانے والے شخص کی شناخت میں، اور قریبی میری ٹائم امداد سے بھی رجوع کیا تھا۔ نیوز چینلز جوش و خروش سے پلین کریش کی خبر کو ہر ہیڈ لائن میں بیچ رہے تھے۔

کیوں ہوا؟ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ جاننے کے لیے دیکھتے رہیے فلاں فلاں نیوز۔

ایسے میں ہم واپس رخ کرتے ہیں بحر الہند کے ظالم پانیوں کا۔ اس دن کی رات پچھلی رات سے مختلف تھی۔ انیس نومبر کی رات سیاہ لہریں اپنی بھوک کو اسودہ کرنے کے بعد معصومیت کا تاج سر جمائے تھیں۔

اطراف میں چاروں سمت جہاز اور کشتیاں پہرا دے رہے تھے۔ کئی گھنٹوں کی مسافت سے وہ ریسکیو ٹیمیں لہروں کے چکر کاٹ رہی تھیں، کسی غیر معمولی حرکت کی منتظر۔ رات کی سیاہی میں بے چینی تھی، بے آرامی تھی۔

تیز روشنی اور طاقتور ٹارچ لائٹس کا سہارا لیا گیا تھا۔ خصوصاًرات میں استعمال ہونے والے چشمے اور دیگر ساز و سامان کو بھی عمل میں لایا گیا تھا۔ سونار سسٹم سے پانی کی گہرائیوں تلے ہوتی حرکات و سکنات پر نظر ثانی کی جا رہی تھی۔

ایسے میں سفید روشنی کی ایک پٹی ساحل کے گرد موجود ایک ملبے کے ڈھیر پر پڑتی ہے۔ ڈھیر زیادہ بڑا نہیں تھا، لیکن اس کی صورت غیر معمولی معلوم ہوتی تھی۔ روشنی کو بڑھایا گیا، نائٹ گلاسز کو عمل میں لایا گیا۔

ایک انسانی جسم کی جھلک نمایاں ہوئی۔

ریسکیو ٹیموں نے دل تھامے۔ چوبیس گھنٹے کی لگن کے بعد انھیں اب تک زندگی کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ لاشیں بہت دریافت ہوئی تھیں لیکن وہ لاشیں تھیں، بے حرکت و عمل۔

جہاز زمین سے قریب لائے گئے، کشتیوں نے بھی چابک چلائے۔ جہاز سے تین سے پانچ مرد اتر کر اس سمت دوڑے۔

ملبے پر اوندھا لیٹا مرد ساکت تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے چر چکے تھے۔ طبی عملہ اس کے اوپر جھکا۔ اسے الٹایا گیا اور دو انگلیوں کی پوریں مرد کی شہہ رگ کے اوپر رکھیں۔

خاموشی۔

عملہ نے ہار مان لی۔ سمندر سب ہضم کر گیا تھا۔ اور پھر ایک دھڑکن۔ ٹھیک کان کے نیچے، گردن سے اوپر۔

عملہ کی آنکھیں پھیلیں۔ ایک اور، پھر ایک اور۔

دھک۔ دھک۔ دھک۔

"Alive! He's alive"!

زندہ ہے! یہ زندہ ہے!

تمام ٹیموں نے رک کر ایک لمحہ سکھ و سرور کا سانس لیا، اور پھر دوادش میں لگتے انھوں نے اسٹریچر اور دیگر طبی ضروریات کے لیے آوازیں لگائیں۔

جان بچی تھی، اب اسے بچانا ان کے زمے تھا۔

اس سب افراتفری میں دور ساکت پڑے مرد نے اپنے گرد ہوا بدلتی محسوس کی۔ لوگ، ہل چل، نمی، خنکی، شور۔

اس کے خشک پپڑی بنتے ہونٹ ایک دوسرے سے ایک بے آواز کراہ میں جدا ہوئے۔ اسے دوبارہ نمی محسوس ہوئی۔ اپنے اوپر، اپنے نیچے۔

اب کہ اس کی انکھوں نے ہمت کی۔ ہیزل نور رات کی تاریکی میں بڑھتا چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خالص شہد کی بوند بوند اس کی آنکھوں میں جما ہو۔

اس کا پہلا خیال: وہ بچ گیا تھا۔

وہ بچ گیا تھا۔ اور بھاری پلکیں اٹھاتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی جہنم شروع ہو چکی تھی۔

جب مُردوں کے شہر سے سانسوں کی آواز آتی ہے، تو گوشہ گوشہ اسے الزام دیتا ہے۔

رائج آدم کی اگلی ہر سانس ایک سرقہ تھی اور وہ گناہگار۔

اس کا جرم؟

موت سے آسان فرار۔

بحر الہند کے ساحل پر چلا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا لے آیا ہے ہمیں اپنے کہانی کے دورانیے میں۔

MH370 آپ کا منتظر ہے۔

★★★

حال

جگہ: لیوٹری کے باہر

AM01:03

اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا اور یہ فلائٹ بھی جہنمی سی لگ رہی تھی۔

غسل خانے سے نکل کر اب وہ اسی راستے چل رہی تھی جہاں سے وہ آئی تھی، یعنی مسافرین کے کیبن کی طرف، لیکن اس کی چاپ دھیمی اور قدم سست تھے۔ دماغ میں اب بھی اس ایک شخص کا چہرہ گردش کر رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اب وہ ان آنکھوں سے اس شدت سے نفرت نہیں کر پا رہی تھی۔

شاید انھیں نہیں ملنا چاہیے تھا۔

رانج سے دور رہ کر اس پر گالیاں کسنا آسان تھا، اٹھتے بیٹھتے اسے قصوروار ٹھہرانا سانس لینے جتنا چھوٹا اور یہ سوچنا کہ اس کی زندگی تو ایک موج میلہ ہے اس کا دفاعی میکانیہ۔ مگر اس کا سامنا کر کے، اس کی آنکھوں کی الجھن اتنے نزدیک سے پرکھ کر وہ یہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اور یہ خیال ہی ظبیہ کو کھا رہا تھا۔ اس کے سارے محافظات تر ہو گئے تھے۔ رانج آدم اس کی کہانی کا ولن نہ رہا تو اسکرپٹ ری رائٹ کرنی پڑے گی، اور وہ اس سپردگی کے لیے قطعاً راضی نہیں تھی۔

وہ نیلی روشنی میں قید راہداری کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ کسی نے جھٹکے سے اس کا بازو پکڑتے اسے ایک طرف کھینچا۔

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ آنکھیں پھٹ پڑیں، اور اس نے چیخنے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا تو ایک بڑی ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر بند ہوئی۔

"ڈونٹ اسکریم۔"

اسے دیوار کے ساتھ جوڑ کر سایہ اس کے سامنے واضح ہوا۔ ظبیہ خوف سے اسے تکتی گئی۔ سائے نے سر اوپر اٹھایا تو نیم نیلی بتیوں میں اس کی آنکھیں چمکیں۔ سرمئی۔ پھر ناک، پھر گال، اور آہستہ آہستہ مکمل چہرہ واضح ہوا۔

ظبیہ کی آنکھیں اس کے ہر منکشف ہوتے جزو کے ساتھ کھلتی گئیں۔ اب اکائر اس کے اتنا قریب تھا کہ وہ چاہتا تو سر مار کر ہی اسے بے ہوش کر دیتا۔ ظبیہ خوشی خوشی ہو بھی جاتی، اسے چھٹی چاہیے تھی۔

"میں ہاتھ ہٹاؤں گا، لیکن تم چیخنا مت۔ اوکے؟" اس نے اس کی رضامندی چاہی۔ ظبیہ نے تھوڑا سا سر ہلایا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر اپنی گرفت اس کے چہرے پر ڈھیلی کرتے ہاتھ دور کرنے ہی لگا تھا کہ ظبیہ نے گلا پھاڑ کر چیخنا چاہا۔ اس نے فوراً اس کا منہ دوبارہ بند کیا۔

"جھوٹ، کتنی بڑی جھوٹی ہو تم!" وہ ناراض ہوا، گویا اسے چھپن چھپائی میں پکڑ لیا گیا ہو۔

ظبیہ آنکھیں سکیڑے اسے گھورتی رہی۔

اس نے ایک سانس بھری۔ "ہاتھ ہٹانے دو تاکہ ہم دو پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بات کر سکیں۔" کچھ سوچ کر ایک لمحہ رکا۔ "ایک پڑھے لکھے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خدا پھر بھروسہ کر کے ہاتھ ہٹانے لگا۔ اب ظبیہ آزاد تھی لیکن وہ چیخی نہیں، صرف بری طرح سے اسے گھورتی رہی جیسے ابھی فرائے کر دے گی۔

اکائر نے ان کی درمیان نزدیکی پر غور کرتے دو قدم پیچھے لیے۔ "سنو—"

"تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟" پہلا گرینیڈ۔ "یہاں کیسے پہنچے تم؟ تمھیں۔۔۔ تمھیں پتا کیسے لگا میں یہ فلائٹ لوں گی؟ پولیس کو تو نہیں لے آئے تم؟" آخری وار ظبیہ نے اپنی پیشتر سے تباہ ہوئی خود اعتمادی پر کیا۔

اکائر ابرو اُٹھائے اسے دیکھنے لگا۔ "اور کچھ؟ یہ بھی پوچھ لو میں جیمس بانڈ تو نہیں بنتا کہیں فری ٹائم میں۔"

"اکائر!" وہ جھنجھلائی۔ "کیا کر رہے ہو تم یہاں؟"

وہ دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے پیچھے ہوا۔ "سفر۔"

وہ ہاتھوں کا مکا بنائے اس کی جانب لپکی تو اکائر ہاتھ اٹھاتے سنبھلا۔ "اچھا ناں۔ ایک منٹ! تشدد پسند عورت، صبر رکھو۔" ڈرامائی انداز میں اپنی گھڑی چیک کی جیسے وزیر اعلیٰ ہو جس نے قوم سے خطاب کرنا ہے۔

"ایک ایک کر کے پوچھو۔"

ظبیہ نے صبر کا آخری گھونٹ چٹ کیا۔ "آپ، شری مان، کیا کر رہے ہیں یہاں، اس فلائٹ میں؟"

وہ مسکرا دیا۔ "چائنہ جا رہا ہوں۔"

"کس خوشی میں؟ تمھارے گھر والے تو اسپین میں ہیں۔" اکائر نے اس کی معلومات پر محظوظ سے ابرو چڑھائی تو اسے اچانک عجیب لگا۔ "مطلب..."

"دبئی جانا ہے۔ کنکٹنگ فلائٹ ہے میری۔" وہ لاپرواہ سا بولا پھر اسے دیکھا۔ "تم۔۔۔ اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہو؟"

ظبیہ کو تھوڑا دھچکا لگا یہ سن کر کہ اسے علم تھا، اور یاد بھی۔ لیکن کیونکہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے تو یقیناً گھر کے معاملات اس سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ اکائر اس کے مالک مکان کا بیٹا تھا، جو ان ہی کے گھر میں اوپری حصے میں رہائش پذیر تھا۔ 'ان' میں شمار ہوتا ہے ظبیہ اور اس کے شوہر، غزار احمد، کا۔

یہ وہی تاجر ہے جس کا ذکر آپ ماضی کے چرچوں میں سن چکے ہیں۔

"ہمم، خالہ بیمار ہیں۔۔۔ بہت۔" وہ خاموش ہو گئی اور ہاتھ میں قید ہینڈ کیری کو ذرا اور سختی سے قبض کیا۔ اکائر نے اس کی جھکی نظروں کو دیکھتے کمر سیدھی کی اور ایک قدم آگے آیا۔ "ٹھیک تو ان کی بھانجی بھی نہیں ہے۔" صاف گو اعلان۔ ظبیہ نے ہڑبڑا کر اوپر دیکھا تو وہ اس کے عین سامنے تھا۔

"ایک بات کہنی ہے۔ پورا سچ کہوں یا آدھا؟" اس نے پوچھا تو ظبیہ کی بھنویں تن گئیں۔ وہ اور پورے سچ نہیں سن سکتی تھی۔

"آدھا۔" سرمئی آنکھوں والا مرد اس کے انتخاب پر زیادہ پرجوش نہیں لگا۔ ہاتھ جیبوں میں ڈالتے اس نے سر یہاں وہاں گھمایا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"تم ایک عورت ہو۔"

ظبیہ کو سمجھ نہیں آیا اس دانائی کا کیا کرے۔ "اور پورا؟" اس بونگے آدھے سچ نے اسے تھوڑی ہمت بخشی تھی۔

وہ اس کی طرف مڑا۔ "تم ایک احمق عورت ہو! سیریسلی ظبیہ!؟ تم گن اٹھا لے آئی اپنے سامان میں؟" اس بار ظبیہ کی باری تھی اس کو دیوار میں دھنسنے کی۔ اس کا گریبان پکڑتے اس کی آنکھیں دہشت سے کھل گئیں۔ "تمھیں کیسے پتا!" وہ سرگوشی میں چلائی۔

اکائر نے کمال دھیرج سے اپنی جیکٹ اس کے پنجوں سے آزاد کروائی۔ "کیونکہ میرے پاس دو آنکھیں اور ایک کام کرتا دماغ ہے۔" پھر ایک سانس بھری۔ "کیا سوچ کر یہ بیوقوفی کی تھی تم نے؟"

"بیوقوفی سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی، اکائرز مورا صاحب۔" وہ دو قدم پیچھے ہوئی پھر ایک ہاری ہوئی کراہ نکالی۔ "اب میں کیا کروں! تمھارے بیگ میں ڈال دوں؟"

اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "شوق سے ڈالو۔ پھر میں استعمال کرنے لگ جاؤں گا تو مائنڈ مت کرنا۔"

ظبیہ ڈر گئی۔ نہیں، نہیں۔ یہ شخص پیدا ہی دہشت گرد ہوا تھا۔ وہ کیوں اس میں چابی بھرے؟

"ملی کہاں سے یہ گن تمھیں؟" اکائر اس کا بیگ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ پہلے تو کترائی لیکن آخر کار کالا بیگ اس کے حوالے کر دیا۔ اب جب اسے پورا سچ پتا ہی تھا۔

"غزار کی ہے۔" وہ ٹیک لگا کر بولی، ہاتھ اپنے بازوؤں کے گرد لپیٹ لیے۔ "تھی۔۔۔ ہے، پتا نہیں۔" وہ جھلاہٹ میں آ گئی۔

اکائر اب اکڑو بیٹھا اس کا بیگ کھول رہا تھا، اس کی لمبی، شفاف انگلیاں اس کے سامان کو یہاں وہاں پلٹا رہیں تھیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"غزار کو کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا تو ظبیہ کی سانس پھول گئی۔ اس نے اچانک بات کا رخ موڑنا چاہا۔

"تمھیں گن کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"سوال کا جواب کبھی سوال نہیں ہوتا، مسز احمد۔" وہ لقب اس نے اسے عزت بخشنے کے لیے دیا تھا یا چڑھانے کے لیے، ظبیہ سمجھ نہیں پائی۔ بھوری رنگت والی لڑکی نے لب زبان سے تر کرتے چہرہ موڑا۔

"دبئی میں ہے۔ پتا تو ہے تمھیں۔ بزنس ٹرپ۔"

اکائر اب وار اینڈ پیس باہر نکال رہا تھا۔ اس کے الفاظ سنتے وہ مسکرا دیا۔ "یہ کہانی کب تک کھینچو گی؟ آئی مین، مجھے کوئی جلدی نہیں۔ وقت لے لو، بٹ اٹس کائنڈ آف پریڈ کٹیبل۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" ظبیہ کا سانس چڑھ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

سرمئی آنکھیں اس سے جا ملیں۔ اس کے کہے گئے اگلے الفاظ سادہ ہوتے ہوئے بھی ظبیہ کے تن بدن میں برف کے ریزوں کی طرح گھونپے تھے۔

"غزار دبئی میں نہیں ہے۔ یہ بات میں اور تم دونوں جانتے ہیں۔ تم بھولے پن کی اداکاری کر رہی ہو اور مجھ سے بھی کروا رہی ہو۔"

ظبیہ کو اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے آڑ پکڑنی چاہی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ غزار بزنس—"

"سچ نہیں بول سکتی تو جھوٹ بھی مت بولو، ظبیہ۔ یہ گن لے کر کیوں آئی ہو پھر تم؟ پولیس کے نام پر کیوں پسینہ پسینہ ہو رہی ہو؟ میرے یہاں ہونے سے اتنی متاثر کیوں ہو؟"

ظبیہ کو لگا کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اس کا فریب کھل چکا تھا۔ اس کا فریب اب چھپ نہیں سکتا تھا۔ چند ثانیے گزر جانے کے بعد اس کی آواز اس خالی راہداری میں سنائی دی۔ ہلکی، نرم اور خوف سے لیس۔

"تم۔۔۔ تمھیں کیسے پتا چلا؟"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر اب کتاب کے صفحات پلٹ رہا تھا۔ "کیا غزار جیسا جلاد آدمی اتنی آسانی سے دبئی چلا جائے گا، تمھیں تن تنہا چھوڑ کر؟ اور جانے کے بعد نہ کوئی کال کرے گا نہ میسج؟ لیکن اس سب کو رہنے دیتے ہیں۔"

سرمئی آنکھوں نے رخ اس کی سیدھ میں کیا۔ "جس کمپنی میں وہ کام کرتا ہے، اس کا دیوالیہ نکلا ہوا ہے۔ وہ اپنے ورکرز کو باہر بھیجنا بالکل افورڈ نہیں کر سکتے۔ زیادہ کچھ نہیں، بس تمھاری ریسرچ کمزور تھی۔" آخر میں وہ مسکرایا۔

ظبیہ کا چہرہ دہک رہا تھا اور ٹانگیں تنکے جتنی بے بس تھیں۔ اسے اپنا آپ چور چور ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بے آواز گھٹنوں پر اس کے برابر جا بیٹھی، ہتھیلیاں پسینے سے ٹھنڈی تھیں۔

اکائر نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ ”تم بولو گی تو میں خاموش ہو جاؤں گا۔ مجھے کچھ نہیں جاننا اگر تم بتانا نہیں چاہتی۔“

اس نے خفیف سا سر ہلایا، زبان تالو سے چپک چکی تھی۔ ”گناہ چھپ سکتے ہیں، مٹ نہیں سکتے۔ اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنے گناہ دھو ڈالوں۔“

بھوری آنکھیں سمت موڑیں تو وہ اسے تک رہا تھا، پلین کی روشنی میں دمکتے سرمئی نگینوں میں ہیجدہ رنگ مخلوط ہوتے۔

ظبیہ نے آواز نکالی۔ خاموش راہداری بھی اس کی جانب راغب ہوئی۔

”میں نے غزار کو قتل کر دیا ہے۔“

(یہ نیم پیلی بتیوں میں اجاگر ایک لائونج روم کا سماء تھا۔ کریم رنگا ترکش قالین ایک نووارد سرخی میں ڈوب رہا تھا۔ قالین سے دو قدم کی دوری پر لکڑی کا فرش تھا اور اس پر ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑے ہر جگہ پھیلے تھے۔ سرخی کی لکیر کا تعاقب کرتے ہم ایک ساکن وجود سے جا ملتے ہیں۔ وہ پچاس سے زائد عمر کا ایک خوبرو مرد ہے جو اپنے سر کے بل گرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چت کھلی تھیں اور پپوٹوں میں وحشت ہی وحشت تھی۔ سر کے پچھلے حصے سے سرخ و گاڑا خون رس رہا تھا۔)

لیدر جیکٹ والے مرد نے ایک بھاری سانس خارج کی۔

”بڑی دیر کر دی۔“

ظبیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

(دوسرا سایہ سافرون رنگ کی قمیص پہنی، گھنگریالے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں لپیٹی اور خوف و دہشت میں ساکت کھڑی ظبیہ کا تھا۔ لائونج روم کی زرد بتیاں ایک ایک کر کے اس کے پسینے سے ترماتھے

پر جگمگا رہی تھیں۔ گلابی ہونٹوں کے گرد واضح سوجن تھی اور بھوری آنکھیں خود سے چند قدم کے فاصلے پر گرے اپنے مرحوم شوہر پر۔)

"چلو، خس کم جہاں پاک۔"

ظبیہ کی آنکھیں اس بار واضح طور پر بڑی ہوئیں۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم صدمے میں ہو یا واقعی اتنے پُرسکون ہو؟"

اکائر نے بے سواد سا منہ بنایا۔ "مجھے دو ہفتوں سے معلوم ہے، ظبیہ۔ شاک والا ایلیمنٹ ختم ہو چکا ہے۔ مجھے یہ جاننا ہے کہ یہ تم نے کیا کیسے۔ اور کس کس کو پتا ہے؟"

ظبیہ نے لب کاٹتے نظریں چرائیں۔

وہ کتنے اور پورے سچ سے بھاگے گی؟

۲ فروری، ۲۰۱۴

(حال سے ایک ماہ پہلے)

کوالالمپور ایک بار پھر رات کی چاندنی کے سپرد تھا۔

ہلکی بارش نگینوں کی مانند آسمان سے ٹوٹ کر گر رہی تھی۔ بانگسار کا علاقہ دکانوں اور دیر رات تک کھلے کیفے کی روشنیوں میں سفید گوں تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف استادہ اسٹریٹ لائٹس اپنی نیم طلائی چمک سے ہر سو ٹیڑھے آڑے سائے کھینچ رہی تھیں۔ گاڑیاں اور موٹر بائیک اپنے گنگناتے انجنوں کے سنگ رواں تھیں۔

جلان تیلاوی، بانگسار کی شہ رگ، کا رخ کرو تو ایک سے بڑھ کر ایک تھائی اور مالائی پکوانوں کی مہک آپ کے نتھنے کھول جاتی ہے۔ سیکھوں پر بھنتا ساتے، تھائی مصالحوں کی خشبو اور ساتھ ہی گاڑی، ذائقہ دار کافی

کی سگھند۔ بار اور نائٹ کلبز بھی اس شہر کی خاصیت ہیں، جہاں بیشتر اوقات جوان لوگ جھومتے ناچتے اپنی راتیں کاٹتے ہیں۔ ہر جانب محفلیں عروج پر تھیں۔

یہ منظر ہے بانگسار کے ایسے ہی ایک کیفے PULP by Papa Palheta کا جو جلان ریونگ میں قائم پذیر ہے۔ کوالالمپور پر چھایا آدھا چاند چمکدار تھا اور اس کی ہلکی نیلی سفید روشنی کیفے کی فراخ کھڑکیوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ پانی کی بوندیں یک بعد دیگرے گیلے گلاس پر پھسل رہیں تھی۔

کیفے کشادہ تھا اور دیواروں کا رنگ ہلکے بھورے اور کریم کے درمیان کا چنا گیا تھا۔ کرسیاں اور میز عام طرز کی تھیں، لیکن آس پاس موجود رش اور بڑھتے گاہکوں کی آوازیں اسے خاص بنا رہی تھیں۔

اکائر نے اپنی آئیسڈ منٹ چاکلیٹ کا گھونٹ بھرتے ساتھ کھڑی عورت کو دیکھا جو ابھی دروازوں سے داخل ہوئی تھی اور کسی خالی کرسی کی چھان میں یہاں وہاں نظریں دوڑا رہی تھی۔ اس نے اس کے سامنے والی کرسی دیکھی تو دو قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ منٹ چاکلیٹ والے آدمی نے سر ہلایا۔

"It's taken."

کمینے الفاظ۔ عورت نے بیگ اٹھا کر مارنا چاہا، لیکن وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ نظریں پھیر گیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

کچھ اور لمحات بیتے تو واش روم کی راہداری سے ایک مرد آتا دکھائی دیا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی تھی اور کالی کاٹن پینٹس۔ قد اکائر سے چھوٹا تھا لیکن ڈھال ذرا زیادہ مضبوط تھی۔ رنگت گلابی اور نقوش چینی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے گلے میں ایک چھوٹا پینڈنٹ بھی جھول رہا تھا۔

"مر مرا گئے تھے کیا؟" اکائر نے دبے دبے غصے میں جھڑکا۔ سامنے کھڑا مرد سیٹ کھینچتے شرمندہ سا مسکرا دیا۔ "سوری بھئی۔ نیچرس کال۔"

سرمئی آنکھوں والا مرد بدمزاجی سے منٹ چاکلیٹ کا ایک اور سپ بھرنے لگا۔ نیلی شرٹ والے نے اپنی آدھی پی ہوئی لاٹے اٹھائی۔ "ہاں، تو ہم کہاں تھے؟"

"یہیں۔" ٹکا سا جواب۔

نیلی شرٹ والا محظوظ سا مسکرایا۔ "جی نہیں۔ ہم تمھاری کرائے دار پر تھے، جس کے لیے تم اوسو کنسرنڈ ہو۔"

سرمئی نگاہوں والے نے ابرو اچکائی اور نیچے رکھا بیگ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "اگر اس ٹون میں بات کرنی ہے تو میں جا رہا ہوں، کائی۔"

کائی نے ہنس کر اس کا بازو پکڑا۔ "اچھا، اچھا۔ تم بولو، میں سن رہا ہوں۔ پکا صرف سنوں گا۔"

اکائر سفید کرسی کے ساتھ پیچھے ہوا۔ زیتونی سبز جیکٹ میں ڈھکے اس کے کندھے ایک بھاری سانس کی ساتھ کپکپائے۔ اس نے ساتھ کالی جینز پہنی تھیں اور سیاہ بال پیچھے کیے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے پار بارش اب پھرتی اختیار کر رہی تھی۔

"اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔" سرمئی نگاہوں میں اداسی تھی۔ باہر روش پر گرتی بے نقس چاندنی اس کی آنکھوں میں چمچمائی۔ "اس کا شوہر اسے مارتا ہے۔ ہر دن نہیں تو ہر دوسرے دن۔ پھر وہ اگلے چار دن تک اپنا چہرہ چھپاتی پھرتی ہے۔ مجھ سے، خود سے۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

کائی نے وعدہ کیا تھا، تو وہ صرف سنتا گیا۔

"وہ اس حق سے اسے مارتا ہے کہ تم بھی دیکھو گے تو سہم جاؤ گے۔ اور وہ۔۔۔ وہ پٹتی رہتی ہے۔ وہ مار کھاتی رہتی ہے۔ کبھی وہ بیلٹ سے بھی مارتا ہے۔ ایک بار اس نے دروازے میں دکھا دے دیا تھا، ظبیہ کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اس دن۔ اسے ہاسپٹل بھی میں لے کر گیا تھا۔"

(اسپتال کے دروازوں سے نکلتے دو نفوس۔ پہلا سفید ہوڈی اور گہری نیلی جینز میں ملبوس اکائر جو سر نیچے کیا شیشے کا دروازا دھکیلتے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ دوسری گاڑھے سبز رنگ کی کُرتی اور سفید ڈھیلے ٹراؤزر کے

ساتھ ہم رنگ دوپٹہ سر پر اوڑھے، ظبیہ یمین۔ اس کے ایک ہاتھ میں خاکی رنگ کا بیگ تھا اور فارغ ہاتھ کی نازک انگلیاں، ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود، ہونٹوں پر ہوئی تازہ پٹی کو ہلکا ہلکا چھیڑ رہی تھیں۔

جب اس کا مددگار اس سے چار قدم آگے، تیز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا تو وہ اس کی خاموشی اور نہ جھیل سکی۔ کالی اسٹریپ سینڈلز والے پیروں کو قفل لگے اور وہ وہیں بنے چکنے ماربل کے فرش پر جار کی۔

"مجھ سے بات کرو، اکائر۔" التجاء تھی یا ملبے تلے آدمی کی آخری پکار، اکائر نامی مرد کے دل نے اسے ایک اور قدم آگے نہیں بڑھانے دیا، البتہ دماغ نے اس کی طرف پشت بر قرار رکھی۔

"کچھ خاص ہے تمھارے پاس جو میں کہوں؟" ظاہراً سرد لہجہ۔ ظبیہ کے دل کو لگی ٹھوکر مرگ آور تھی۔

وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں چند قدم چل کر اس کے نزدیک آئی۔ سفید ہوڈی کے پیچھے ہرے رنگ سے لکھے NEW YORK کو پڑھتے، اس نے دل تھام کر دوبارہ بادبباد کی جدوجھد کی۔

"تمھیں مجھ پر غصہ آتا ہوگا۔ تم مجھ پر غصہ ہونا؟" وہ کیا کہہ رہی تھی، اور وہ کیا کہتا۔ مرمری سفید ہوڈی میں ملبوس مرد آدھا تر چھا ہوا۔ کوالالمپور کی سنہری دھوپ اس کے سپید، تیکھے نقوش پر ریزہ ریزہ ٹوٹ رہی تھی، اس کے گالوں اور ماتھے کو ایک مدھم گلابی رنگ بخشتے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

سرمئی آنکھیں اٹھا کر تازہ پٹی کروا کے آئی عورت کو دیکھا اور سنسان سرگوشی میں الفاظ ادا کیے۔ "مجھے تم سے خوف آتا ہے۔"

ظبیہ کی دھڑکن نے کہیں دور جا کر اپنا گلا گھونٹا۔ اگر وہ کوئی اور گھڑی، کوئی عام موقع ہوتا تو وہ زور سے ہنس دیتی، اکائر کو ڈرپوک بلی پوک بلا کر جان چھڑوا لیتی لیکن اس لمحے، اس کی سرمئی آنکھوں میں ویرانی اور وحشت کے علاوہ اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

اکائرز مورا کی آنکھیں ظبیہ یمین کے لیے اجنبی تھیں۔

اس نے ایک پل ٹھہر کر سوچا تھا کہ اگر وہ جگہ تبدیل کرتے تو وہ اس کی آنکھوں سے خود کو کیسا پائے گی؟

مظلوم، لاچار، خود سے ہاری ہوئی ایک پاگل لڑکی۔

"خوف؟" آواز کو معمولی بنانے کی سراسر ناممکن کوشش۔

اکائر ایک لمحے کے لیے یونہی اسے تکتا رہا۔ شاید ایک لمحے سے زیادہ بھی، لیکن ظبیہ گننا نہیں چاہتی تھی۔

اگر واقعی ہند سے اپنا کھیل دکھا دیتے تو؟

"تمھاری برداشت سے۔ تمھارا صبر مجھے آزماتا ہے۔" نگاہ اس کے پٹی شدہ ہونٹوں کو چھو گزری اور جبڑا تنگ ہوا۔ "کاش تم جھکنا چھوڑ دو، ظبیہ۔ کاش تم۔۔۔ ٹوٹ جاؤ۔"

کچھ بدل گیا تھا ہوا میں، اس کی سانس میں۔ گنگ سی کھڑی وہ اسے بنا پلک جپکائے دیکھتی رہی۔

کوالالمپور کا سورج یکدم ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اور اس کی ہتھیلیاں بھی۔

کیا ظبیہ یمین ٹوٹنے کے لیے تیار تھی؟)

اکائر نے اپنی بھیگتی ہوئی ہتھیلیوں کو دیکھا، اگلے الفاظ سرگوشی میں کہے۔ "وہ دوانچ کے کٹ پر vaseline لگا کر خوش تھی، کائی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے؟"

نیلی شرٹ والے مرد نے سر جھکایا۔ "اس کی کوئی فیملی نہیں ہے؟"

اس کی انگلی اپنے منٹ چاکلیٹ کے گلاس کے گرد طواف کرنے لگی۔ "نہیں، شاید۔ اماں ابا تو نہیں ہیں۔ بہن بھائی کا بھی مجھے نہیں پتا۔ ایک خالہ ہیں بس۔ وہ چین میں ہوتی ہیں۔ آج کل انہی کے پاس جانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

کائی مسکرا دیا، کڑوی صریح مسکراہٹ۔ "وہ تنہا ہے، اکائر۔ تنہائی آپ کو مجبور کر دیتی ہے، اور مجبوری عذاب ہے۔"

اکائر خاموش سا باہر دیکھنے لگا۔ گھنے بادل اور مستقل بارش۔ مدھم روشنی میں منور اس کے ترچھے ہوئے نقوش اب کائی کے سامنے تھے، شیو تھوڑی بڑھی تھی اور نظریں گم صُم۔

کائی نے اپنی لاٹے کا ایک اور سپ لیا۔ ”تم کچھ کیوں نہیں کرتے؟ اس سے بات کرو۔ اسے یقین دلاؤ تم اس کے ساتھ ہو۔ شاید وہ ہمت کرے۔“

دور کھڑی لال گاڑی کے شیشوں پر تھپتھپاتی بارش کو تکتے اکائر مسکرا دیا، لیکن وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔

”تمھیں لگتا ہے میں خاموش رہا ہوں؟“ آواز میں شکوہ تھا۔ ”میں نے اس سے سب کہا ہے۔ کتنی بار؟ مجھے یاد بھی نہیں۔ وہ مجھ سے دور رہتی ہے۔ میں بھی اس کے زیادہ پاس نہیں جاتا۔ اس کے religious issues ہیں، میں عزت کرتا ہوں ان کی۔ اس کی بھی۔“ آخری الفاظ بے دھیانی میں اس کے لبوں سے اپنا راستہ تول گئے۔

کائی نے اپنے الجھے ہوئے دوست کو دیکھا جو احساسات کے بوجھ تلے پس رہا تھا پھر دھیرے سے کپ پرچ میں رکھا۔ ”صرف عزت؟“ زور دیا۔

وار وہیں کیا گیا تھا جہاں زخم آنے کا خدشہ تھا۔ سرمئی آنکھیں سمت موڑ گئیں، اس کی شفاف انگلیاں کانچ کے گلاس کے گرد سختی سے لپٹیں۔

کائی کے ہونٹوں کا ایک کونہ اوپر کو اٹھا۔ اسے اپنا جواب مل گیا تھا، اور شاید شیشے کے پار دیکھتے اُس بے نیاز بنتے مرد کو بھی۔

تھوڑی دیر بعد اکائر کی سیاہ ٹویوٹا اوانزا بانگسار کی گیلی سڑکوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ پانی کی بوندیں وزن اور پھرتی میں بڑھ چکی تھیں، اور گاڑی کے بے داغ شیشوں سے باہر معائنہ کرو تو برستے بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہر سو بلند تھی۔

رات کی تاریکی میں روشن زرد اور سیت بتیاں بھی خالی سی نمایاں ہوتی تھیں۔ یا پھر وہ اکائر کا دل تھا، جس نے اس کے اندر باہر افسردگی کے بادل بچھا دیے تھے۔ یک بارگی گاڑی کے ریڈیو سے کنیکٹ ہوا اس کا فون بجا تو اس کا رنجش بھرا خمار ذرا دیر کے لیے چکنا چور ہوا۔

اکائر نے آگے جھک کر اسکرین دیکھی، اور پھر ایک تھکی ہوئی سانس کے ساتھ اپنا گلا صاف کیا۔ یہ کال وہ کاٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ لوگوں کا آپ پر اتنا حق ہوتا ہے۔ فون پر اوپر کی طرف انگلی چلائی تو رابطہ جڑ گیا۔

¡"Ah, el amo del universe"!

اوہ، کل کائنات کے مالک!

فون کے دوسری طرف سے تیرتی آواز یک دم چہکی۔ مردانہ لہجے میں بے تکلفی اور واقفیت کے رنگ تھے۔

"کلیرو۔" اکائر نے طنزیہ مسکراتے اسٹرینگ ویل ڈھیلا چھوڑا۔ آگے سڑک سنسان تھی۔

"ویسے شرم تو نہیں آتی ہو گی؟ چھوٹے بھائی کو اتنا بدلحاظی سے کون اگنور کرتا ہے؟ ہماری تین ہفتے بعد بات ہو رہی ہے خیر سے۔" شکایتوں کا پٹارا کھل چکا تھا۔ چھوٹے بہن بھائی چھوٹے کیوں ہوتے ہیں؟

"کبھی بیگم کو بھی ٹائم دے دیا کرو، اڈرین۔ بیچاری منی بھائیوں سے جیلس ہوتے رہ جائے گی۔" اکائر بھی پورا اداکار تھا۔

"میری بیگم میں ایسے جراثیم نہیں ہیں۔" وہ ذرا تپ کر بولا۔ "میری روبن سے روزانہ بات چیت ہو جاتی ہے۔ نکولاس بھی دو تین دن میں پانچ دس منٹ کے لیے کال کر ہی لیتا۔ تمھارا الگ ہی حساب ہے، اکائر۔"

اب وہ اسے سب بھائیوں کا حال سنا کر اپنی خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔ الیسڈرز مورا صاحب کے چار بیٹے ہوا

کرتے تھے، جن میں نکولاس زموراسب سے بڑا اور اڈرین زموراسب سے چھوٹا تھا۔ سب بھائیوں میں اکائر کا نمبر تیسرا تھا۔

"تم فیملی گروپ چیٹ بھی نہیں دیکھتے۔" اس نے اپنی ناراضگی اینٹھی۔

"دیکھتا تو ہوں۔" اس نے شیشا نیچے کیا تو نم قطرے تیز دم کھڑکی کے کناروں سے ٹکرا کر اس کے چہرے پر برسے۔ فی الفور اس نے شیشے واپس اوپر چڑھا دیے۔

"دیکھنے کا مطلب 'seen' پر چھوڑنا نہیں ہوتا، سدا کے اینٹی سوشل آدمی۔" وہ سانس بھرتے رہ گیا۔

اکائر نے سر پیچھے چمڑے کی سیٹ سے ٹکایا۔ "اماں ابا کیسے ہیں؟" چاروں بھائیوں میں سے ان کے والدین کے ساتھ ویلانسیا میں اڈرین اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔

"اماں آج کل چرچ سے کچھ زیادہ ہی فیسینیٹ ہو گئی ہیں۔" وہ ہنس کر بتانے لگے۔ "ولنٹیئرنگ شروع کی ہے۔ منی کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، حالاں کہ وہ بدھسٹ ہے، بھئی۔"

اکائر بھی تھوڑا سا ہنس دیا۔ چہرے پر چھایا اندھیرا ٹمٹماتی مسکراہٹ سے دو پل کے لیے بالکل فنا ہو گیا۔ "منی اماں پر مذہبی جور و ستم کا کیس نہ کر دے کہیں۔ آر آئی پی (RIP)، موم۔"

"کسی دن بھی وڈیو کال آ سکتی ہے۔ موم ان ہینڈ کفس۔ او لیکن، تمھیں کیا؟ تم تو میری کال اٹھاتے نہیں۔" اڈرین بھی بلا کا خناس تھا۔ اکائر تھک کر مسکرا دیا۔

"ایسا نہیں ہے۔ چھوٹے بھائی ہو میرے۔ بس، مجھ سے کالز نہیں ہوتیں۔"

"کالز تم سے نہیں ہوتیں، ٹیکسٹ کا جواب دینا تم بھول جاتے ہو۔ کبوتر بھیجوں گا تو اسے بھی زہر پلا دو گے۔ کیسے رابطہ کروں تم سے؟ ایک تو پہلے ہی کس تھرڈ ورلڈ کنٹری میں جا کر بیٹھ گئے ہو۔"

"دنیا کے مشہور ترین پٹرو ناس ٹاور ہیں یہاں۔" وہ رٹا رٹایا جواب سنانے لگا۔ اپنے رکنے کی اصل وجہ وہ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ خود کو بھی نہیں۔

"اوکے، اور تم کیا کرتے ہو؟ روز پٹرونا س واٹ ایور کی چوٹی پکڑ کر فوٹو کھنچواتے ہو؟ آئی مین، واقعی اکائر؟ اس ملک میں کچھ نہیں ہے۔ بس اب واپس آجاؤ۔ ابا کو تمھاری ضرورت ہے، مجھے بھی۔"

"میں واپس نہیں آسکتا۔ میرا بہت کچھ یہاں ہے۔" نگاہوں کے پردے پر غیر ارادی طور پر ایک چہرا بھاگا تو اکائر نے بے اختیار سر جھٹکا۔

"بہت کچھ کیا؟ تمھیں نوکری بہتر یہاں مل سکتی ہے، تمھاری فیملی، فرنڈ سرکل، روٹس ہر چیز یہاں ہے۔ اسپین میں۔ وہاں کچھ نہیں ہے اس لائق کے تم اپنے سال برباد کرو۔" اڈرین واقعی الجھا ہوا تھا۔

"میں نے اس لیے کال نہیں اٹھائی تھی کہ تم مجھے بن مانگا تھیراپی سیشن دو۔" وہ اچانک تلخ ہو گیا تھا، اتنا کہ اس کے لبوں سے نکلے الفاظ اس کا اپنا آپ جھنجھوڑ گئے۔ اڈرین ذرا سا سنبھلا، مگر لہجہ نرم رہا۔

"تمھارے لیے بہتر چاہتا ہوں، اکائر۔ تمھیں کسی سے پیچھے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم ہم سب سے زیادہ کمپیٹنٹ ہو۔"

"تو اس کمپیٹنٹ انسان کی ججمنٹ پر بھروسہ رکھو۔ یہاں پر میری ضرورت ہے۔ میرا فرنڈ سرکل یہاں ہے، اور جہاں روٹس ہوں اس کا مطلب یہ تو نہیں کے شاخیں بھی ادھر ہی ہوں۔"

"تو تم کسی کے کہنے سے کوالالمپور نہیں چھوڑو گے؟"

"نہیں، اڈرین۔" لہجہ اٹل مگر پرسکون تھا، جیسے فیصلہ کئی برس قبل ہی لے لیا گیا ہو۔

"اگر مجھے، ابا، روبن یا نکو میں سے کسی کو تمھاری ضرورت ہوئی تب بھی نہیں؟"

"میں پہلی فلائٹ سے ادھر آجاؤں گا۔" وہ بغیر رکے بولا۔ "مگر وہ فیصلہ میرا ہو گا۔ اسی لیے تمھیں ابا یا کسی کو بھی میری تھیراپی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوالالمپور نے مجھے مقصد دے دیا ہے۔"

"اوکے۔" اڈرین کی آواز میں دھیمی مسکراہٹ عاری تھی۔ "تم نے ون یارڈ (انگور کے باغ) کی انویسٹ منٹ کا سوچا؟"

اکائر نے تیوری مسلی۔ ”تم سے بعد میں بات کروں؟“

”تم نہ کہہ سکتے ہو، اٹس فائن۔ لیکن میں صرف یاد کروا رہا تھا کہ تمھاری کمٹمنٹ تھی مجھ سے۔“

”میں کمٹمنٹ نہیں بھولتا، اڈرین۔ لیکن میں نے بھی تمھیں کہا تھا میرے پیسے ایک جگہ پھنسے ہیں۔ جیسے ہی نکلتے ہیں سب سے پہلے تمھارے ون یارڈ کے لیے کام کروں گا۔“

”اکائر، یہ بات تم نے مجھ سے چار ماہ پہلے بھی کی تھی۔“ اڈرین کا لہجہ تھوڑا برہم ہوا۔

”کیونکہ چار ماہ سے پیسے پھنسے ہیں، بلکہ اس سے بھی پہلے سے۔ خیر چھوڑو، پوائنٹ یہ ہے کہ مجھے مدد کرنے سے مسلہ نہیں—“

”ہاں، میری مدد کرنے سے ہے۔“

”اڈرین، کین یو پلیز اسٹاپ؟“ ناگاہ اس کی آواز کا پارہ چھت سے جا لگا۔ سر میں بھی تعذیبی قسم کی ٹیس اٹھی۔ اس نے ماتھے کو مسلتے آدھے لمحے کے لیے آنکھیں مینچ لیں۔ اڈرین خاموش تھا، بالکل خاموش۔ اور پھر وہ نہیں تھا۔ اس نے کال کاٹ دی تھی۔

اکائر نے ریڈیو سے تار الگ کیا اور فون پیسنجر سیٹ پر اچھالا۔ چہرے پر ناگواری اور اذیت واضح تھی۔

گریٹ! تین ہفتے کے بعد بات کرنے کے باوجود اس نے اپنے بھائی کو ناراض کر دیا تھا۔

اپنے بنگلے کی گلی دکھی تو اس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ انجن خاموش سا گنگناتا گیا، عقبی آئینے کے ساتھ لٹکتی موٹر سائیکل کی کی چین آگے پیچھے جھولی۔

ابھی گہرے بھورے دروازے والا گھر کا سرا نظر آیا ہی تھا کہ اس کے سامنے پیش تصویر نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔

برستی بارش اور سیاہ چاندنی میں دو نفوس گھر کے خارجی دروازے کے ساتھ کھڑے بھیگ رہے تھے۔ گھر کا دروازا شاید کھلا تھا کیونکہ لائونج سے آتی سنہری روشنی کی پٹی پانی کے گڑوں میں چمک رہی تھی۔

نیلے باجو کرتے اور پلیڈ پاجامے والا مرد اور کوئی نہیں بلکہ اکائر کا اپنا کرائے دار تھا، جسے اس کے باپ نے خوب عزت بخش کر دوستی اور روابط کے خاطر اپنا گھر کم کرائے کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔

خود تو اکائر کا سارا خاندان اسپین میں تھا، بچے کچے اسکاٹ لینڈ روانہ ہو گئے تھے، لیکن وہ پڑھائی اور پھر نوکری کے چکر میں یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود بھی کبھی زیادہ وقت کے لیے اسپین نہیں جاتا تھا۔ غلطی سے چلا جاتا تو گھر والے یاد کروا دیتے تھے کہ، محبتیں تو دور رہ کر ہی بڑھتی ہیں، اور پھر اکائر اگلی فلائٹ سے بھاگ کر واپس کوالالمپور آ جاتا۔

جب اس نے یونی ورسٹی کے بعد مستقل طور پر کوالالمپور میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ اپنے ابا کو بتا چکا تھا کہ دوست کے ساتھ مل کر ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لے گا، لیکن کبھی جو گھر میں اس کی سن لی جائے۔

الیسڈرز مورا صاحب نے تو فوراً اعلان جاری کیا کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو وہ کیوں کرائے اور مالک مکان کے دھکے کھائے گا، اور غزار احمد سے بات کر کے انھوں نے گھر کا اوپر والا حصہ اکائر کے لیے رکھوا لیا۔

ایسے ہی وہ اس بد طالع جوڑی کے ساتھ جڑ کر رہ گیا تھا۔ مالک مکان کم، وہ کپل کا کونسلر زیادہ لگتا تھا۔ بایں ہمہ خود وہ پتا نہیں عمر کے کون سے حصے سے تن تنہا گھوم رہا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

غزار احمد کا نیلا کرتا اس کی مضبوط جسامت سے چپک رہا تھا۔ سفید کھچڑی جیسے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک کر اسفالٹ کی روڈ پر ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ وہ چیخ رہا تھا، طیش اور عتاب میں ادا کیے الفاظ تھے تو بلند لیکن اکائر کے ٹویوٹا کے ساؤنڈ پروف شیشوں سے پار نہیں ہو پا رہے تھی۔

اس کے سامنے اس کی بیوی تھی، سیاہ گھنگریالی لٹیں مڑی توڑی سی آدھی جامنی رنگ کے کلپ میں بندھ تھیں اور آدھی اس کی گیلی پیشانی سے چپک رہی تھیں۔ اس نے ہلکے بینجنی اور زرد رنگ کی پرنٹڈ قمیص پہنی تھی اور ساتھ ہی یکساں ٹراؤزر۔ وہ غزار کے آگے بے حرکت کھڑی اپنے بغیر چپلوں والے پاؤں کو

تک رہی تھی، پانی کی بوندیں اس کے بھورے گالوں پر سے پھسل رہی تھیں۔ لیکن وہ پانی صرف آسمان کا برسا نہیں تھا، وہ اس کی آنکھوں کی اپنی نمی تھی۔

ظبیہ یمین برستی بارش میں کھڑی رو رہی تھی اور اس کی اطراف میں گری انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ خوف سے، ٹھنڈ سے۔

اکائر اپنی گاڑی کے شیشے سے ان کے اندھیرے سائے ہلتے جھلتے دیکھ سکتا تھا لیکن اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ رات گہری تھی اور بارش کی دھند قابلِ لمس۔ چاندنی رات میں پانی تیزی سے تھرتھرا رہا تھا۔

غزار اب کوئی بات ختم کر کے اندر جانے کو مڑا تو ظبیہ نے آنسوؤں کے ساتھ اس کا بازو تھاما۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔ اکائر کا دل پھٹ پڑنے کے در پر تھا۔ نیلے کرتا پہنے مرد نے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اپنی بیوی کو پیچھے دھکا دیا۔ ظبیہ پتھروں پر پھسلتی گیلی سڑک پر جا گری۔

قمیص سے نکلتے اس کے بازوؤں نے پکی اسفالٹ کی سڑک پر رگڑ کھائی اور اسے ٹراؤزر کے پار اپنے گھٹنے چھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب وہ چہرہ جھکائے غزار کے قدموں کے ساتھ اوندھی پڑی تھی۔ ایک ایک آنسو کھولتے سیسے کی طرح اس کے گال بھگو رہا تھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ برستے پانی کی بوندیں اس کی ٹھوڑی اور سیاہ بالوں کے کناروں سے رس رہی تھیں۔

اس کے سامنے اکڑو بیٹھتے غزار نے مٹھی بھر بال اپنے پنجوں میں جکڑے اور اس کا سر پیچھے کو کھینچا۔ اکائر کی انگلیاں بے اختیار گاڑی کے دروازے تک گئیں، لیکن اس سے پہلے وہ لاک کھولتا، کائی کے الفاظ اس کے کانوں میں موت کے اعلان کی طرح بجے۔

"وہ تنہا ہے۔"

اور ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ تنہا ہی تو تھی وہ۔ کون لگتا تھا اکائر اس کا؟ کیا مناسبت تھی ان کے درمیان؟ مروت، انسانیت، موافقت۔ آخری صورت پر اکائر خود ہی آڑا نشان کھینچ دینا چاہتا تھا۔

اس ہی سوچ کی صدائیں اس کے دماغ کے گنبد سے ٹکرا کر گونجیں تو خود کارانہ طور پر اس کی انگلیاں ٹھنڈے لاک سے دور ہو گئیں۔

غزار اس کے سامنے بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے زاویے ہر طریقے سے بگڑ رہے تھے۔ بات مکمل کر کے اس نے ظبیہ کو اس کے جبڑے سے دور اچھالا اور کھڑا ہو گیا۔

ربڑ کی چپل پٹخ کر وہ الٹے پاؤں گھوما تو کیچڑ سے اچھلتا پانی ظبیہ کے چہرے تک بلند ہوا۔ وہ آنکھیں میچ گئی۔ اس کے بازو لرز رہے تھے اور پیر کھڑے ہونے کی قوت ہار چکے تھے۔

غزار نے اندر جا کر دروازہ دھڑام سے بند کیا تو سنہری روشنی بھی بجھ گئی۔ اب گلی تاریک تھی اور رات ستم شعار۔

وہ سڑک پر رینگتے قریب بنے سیوریج لائن تک گئی جسے کالی جالیوں سے بند کیا گیا تھا۔ جالیوں کے درمیان بس تھوڑی سی ہی گنجائش تھی اور چاند کی روشنی میں وہ ان سے نیچے گرا اپنا پرچی پرچی ہوا پاسپورٹ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے آنسو بے لگام گرنے لگے۔

ہاں، اسی کے لیے ہی تو تھے اس کے آنسو۔ اس کے آخری اپنے، آخری رشتے کے پاس جانے کی اس کی آخری کوشش کو ٹکڑا ٹکڑا کر کے سیوریج لائن میں بہا دیا گیا تھا۔ غزار نے اس کا پاسپورٹ پھاڑ دیا تھا، اس کی خالہ کے پاس جانے کی ساری محنت کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

بھیگی ہوئی آستین سے آنکھیں رگڑتے اس نے بصارت سدھارنے کی کوشش کی، پھر کپکپاتی انگلیاں جالیوں کے اوپر رکھیں۔ سیوریج لائن کی زمین اس سے کوئی ایک فٹ دور تھی، لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

اس نے جالیوں کے درمیان بنی خفیف سے جگہ میں سے انگلیاں گزاریں۔ ایک کراہ اس کے ہونٹ چیر کر باہر نکلی۔ ٹھنڈا لوہا اس کی ہڈی دبا رہا تھا، لیکن وہ لہولہان ہوتی انگلیاں اندر گھساتی رہی۔ آنسو اب اور تیزی سے اس کے گالوں سے بہہ رہے تھے۔ اس نے بے آواز سرگوشی میں دعا کی۔

" Tolong, Ya Allah"!

یااللہ، مدد!

یکایک اس کے سر پر پڑتا پانی تھم گیا۔ اسے لگا تھا جیسے سارا آسمان خاموش پڑ گیا ہو۔ سر دوسری طرف گھماتے، اس نے بھوری آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وہ بیچ میں ہی ٹھہر گئیں۔

زیتونی سبز جیکٹ میں ملبوس چھ فٹ ایک انچ کا اکائرز مورا اس کے اوپر چھتری کھولے کھڑا تھا، سر تا پا بھیگا ہوا اور سرمئی نگاہیں زمین پر گری گھائل لڑکی پر۔ اس نے چھتری کے ڈنڈے کو اپنے سفید پڑتے بند انگشت میں عاجز کر رکھا تھا اور سانس ناہموار تھی۔

ظبیہ نے پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں میں جما پانی ایک ساتھ بہہ گیا۔ جالیوں کے درمیان پھنسی اس کی انگلیاں ادھر ہی تھم گئیں اور وہ سر اٹھائے سامنے کھڑے اپنے مددگار کو تکتی رہی۔

اکائر نے نظر اس کے ہاتھوں کی طرف پھیری، سرمئی آنکھوں میں ایک نووارد جذبہ بلندی چڑھا۔ ظبیہ کو اچانک اپنا آپ شرم سے لال ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے نگاہیں موڑ کر ہاتھ باہر نکالنا چاہا، لیکن وہ پھنس چکا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کے تن بدن میں ہول اٹھ گئے۔ اس نے چڑھتی سانس کے ساتھ اور قوت لگائی لیکن لوہا اس کا ہاتھ بے رحمی سے کچل رہا تھا۔

اور آنسو، اور اذیت۔

"اسے پکڑو۔" اکائر نے خاموش سی ہدایت کی۔ اس نے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں سے چھتری لے لی۔ اب وہ اس کے برابر اکڑوبیٹھ رہا تھا، اس سے چند انچ کے فاصلے پر۔

اکائر کی ٹھنڈی انگلیاں اس کے جالی میں پھنسے ہاتھ سے ٹکرائیں تو وہ ایک لمحے کے لیے سُن ہو گئی۔ بھوری آنکھیں، عبث زبان اور بے قابو دھڑکتا دل، ظبیہ یمین کے سارے اعضاء اس لمحے کے سہر میں قید ہو گئے۔

"ہاتھ گھمانے کی کوشش کرو۔" اس نے جالی کو کھینچتے تحکم سے لہجے میں کہا۔ ظبیہ کو تو آواز ہی نہیں آئی۔ وہ گیلی پلکیں اُٹھائے یونہی اسے دیکھتی رہی۔ کوئی رد عمل نہ ملنے پر اکائر نے نظریں اس کی سمت کیں۔

"ہاتھ گھماؤ، ظبیہ۔" سہر ٹوٹا اور سانس آئی۔

وہ سر گراتے ہاتھ اس کے بتائے ہوئے طریقے پر موڑنے لگی۔ گال اور گردن اب بھی ایک نامعلوم تپش سے دہک رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا، اور پھر ذرا سی قوت سے وہ جالی سے باہر کھنچ آیا۔ اکائر اپنی جینز جھاڑتے کھڑا ہوا، البتہ وہ یونہی بیٹھی رہی، اپنے ٹوٹے ہوئے ناخن کو گھورتے جس کے کناروں پر خون جما ہو چکا تھا۔

اس پر ایک آخری نگاہ ڈال کر وہ اندر جانے کو مڑا تو سرگوشی میں کہے گئے اس کے الفاظ نے اسے وہیں روک دیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اس نے میرا پاسپورٹ پھاڑ دیا۔"

وہ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا، گلے میں گلٹی سی بنی لیکن بولا کچھ نہیں۔

پیچھے پانی کے چھلکنے کی آواز آئی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ گیلی سڑک پر دو قدم آگے لیے۔ اس کے محسن کی پشت اب اس سے ایک گز کے فاصلے پر تھی۔

"تم نے کہا تھا ناں کہ ٹوٹ جاؤ۔" اس کی آواز میں لرزش تھی، درد تھا۔

سبز جیکٹ والے مرد نے اپنی سانس روکی۔

ظبیہ نے خون میں لت پت ہاتھ سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے اور پھر وہ ہنس دی۔ موت سے پہلے کی آخری ہنسی۔

"آج میں ٹوٹ گئی ہوں۔"

اکائر کو لگا اب وہ کبھی سانس نہیں لے پائے گا۔

رات کی تاریکی ان گے گرد پھیل گئی اور آدھا چاند مکمل روپوش ہو گیا۔ اب صرف گناہ تھے اور ان کی سفاک حقیقتیں۔

اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ظبیہ اس کے برابر سے نکل کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھل بند ہوا، سنہری روشنی آئی اور گئی، اور مکمل تر ہوئی سبز جیکٹ اوڑھا ہمارا مجسمہ ساکت کھڑا رہا۔

کاش، وہ بھی ٹوٹ پاتا۔

★★★

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

مرحلہ نمبر ۰۳

نادری

(انحراف)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

حال

جگہ: کاکپٹ۔

AM01:02

کاکپٹ میں انجنوں کی گھنگھناہٹ برقرار تھی۔ مدھم امبر لائٹس میں نہائی ہوئی دو کرسیاں اور ان میں مقیم ہمارے دونامور پائلٹ، کیپٹن رابح اور فرسٹ آفیسر اسامہ۔ دونوں اطراف نصب شیشے کی عریض کھڑکیوں کے پار سیاہی میں ڈوبا آسمان تاروں کی چمک میں اجاگر تھا۔

MH370 ملائی ساحلی خطّے سے نکل کر اب بحیرہ جنوبی چین کے اوپر سے اڑان بھر رہا تھا۔ رات بے پایان تھی اور اجالہ دور دست۔

کیپٹن آدم کی آنکھوں میں مخصوص سنجیدگی عیاں تھی۔ اپنے ماہر ہاتھوں سے اس نے ہوائی جہاز کو اس کے طے شدہ راستے پر قبض کر رکھا تھا۔ اس کے بہ وسعت کندھے نیلی کرسی کی پشت کے ساتھ ایک عمودی لکیر تھے اور رولکس کی سیاہ گھڑی شفاف کلائی کے گرد دوسری جلد کی طرح اچت۔ گول ڈائل میں چھپے سنہرے ہندسے کاکپٹ کی نیم روشنی میں جگمگا رہے تھے۔

ہاتھ کی پانچ انگلیاں کنٹرول یوک کو تھامے ہوئے تھیں، لیکن اس کی گرفت سست تھی، نہ زیادہ سخت نہ ہی مکمل بے قید۔ ایسا لگتا تھا جیسے خود اعتمادی کی شکل اسی کا عکس ہو۔ چھوٹی انگلی میں چاندی کی پتلی انگوٹھی بھی منور تھی۔ یہ پانچ سال پہلے والی نہیں تھی۔ شاید، نئی لی تھی۔

Old habits die hard.

برابر والی کرسی میں نشست فرسٹ آفیسر عامر اپنے ارد گرد پھیلے بادلوں کو ٹکٹکی باندھ کر تک رہا تھا۔ ان کے نیچے بحیرہ جنوبی چین اپنی لہروں کا بے آواز رقص درسا رہا تھا اور دور کھلتی بتیاں انھیں سلامتی اور امانت دونوں بخش رہی تھیں۔

اسامہ تاروں کو تکتے مسکرا دیا اور ایک سرسری نگاہ اپنے مقابل بیٹھے سینیر دوست پر ڈالی۔ "تمھارا دل بھر سکتا ہے کبھی اس منظر سے؟"

رانج اس کی آواز پر سیدھا ہوا اور متکلم کو دیکھا۔ اسامہ اب بھی باہر دیکھ رہا تھا، ہونٹ ایک گہری مسکراہٹ میں کھل رہے تھے۔

"یہ لائٹس، یہ اونچائی، یہ خاموشی۔" نظریں گھما کر رانج کا دیکھا۔ "خود پر یقین ہونے کا یہ احساس۔ میں نے پائلٹ بننے سے قبل ایسا کچھ کبھی محسوس نہیں کیا۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا میں کیا ہوں، رانج۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم بہت ٹیلنٹڈ ہو، اسامہ۔" رانج تھوڑا سا مسکرایا۔ "اپنا پوٹینشل ضائع مت کرنا۔ لوگوں کو دوست بنانے میں تو بالکل نہیں۔ خاص کر غلط لوگوں کو۔"

اسامہ نے بھی دانت دکھائے۔ "واہ بھئی۔ پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر برف پگھل گئی ہے کیا، کیپٹن صاحب؟"

کیپٹن صاحب نے آنکھیں گھمائیں۔ "پلین اڑاؤ۔" فرسٹ آفیسر ہنس دیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

چند لمحات کاکپٹ میں سکوت قائم رہا اور پھر معمول کے مطابق، کیپٹن نے ATC کو فلائٹ کی اونچائی کی اطلاع دینی چاہی۔ اس نے آواز کا حجم کم کرتے مائک کا بوم ہونٹوں کے قریب کیا۔

"Malaysian 370. Maintaining level 350".

ATC جواباً 'ملائیشیائی تھری سیون زیرو' بول کر خاموش ہو گیا۔

بادل گھنے تھے اور سیاہی دائم۔ چاند کی روشنی طیارے کے شیشوں سے ٹکرا کر اسے ایسا اثر دے رہی تھی جیسے وہ کوئی جلتا ہوا ستارہ ہو جو اب ارش میں اپنی جگہ سے فراموش ہو چکا تھا۔

بائیں ہاتھ کو throttle quadrant کے اوپر سجائے، مشہور ہیزل آنکھیں ہری بتیوں میں روشن انجن کے درجہ حرارت کو ناپ رہی تھیں۔ اس کی نازک پوروں تلے انجن کی گنگناہٹ مسلسل تھی۔ یکایک گنگناہٹ بے ترتیب ہوئی۔ رانج کی ہر حس نے یہ تبدیلی سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں ہی بھانپ لی۔

طیارہ بے دستور ہچکولے کھا رہا تھا، جسے پلین کی زبان میں ٹربیولنس کہا جاتا ہے۔

اس کی انگلیاں کنٹرول یوک پر تنگ ہوئی، رد عمل ظاہر کرنے کے لیے تیار۔ آنکھیں جہاز کی تیزی اور ارد گرد کی چیزوں کا اندازہ لگاتے آلاتی پینل جانچنے لگیں۔ ساتھ بیٹھا اسامہ آٹو پائلٹ کی سیٹنگز سیٹ کر رہا تھا۔

"اسامہ۔" کیپٹن کی آواز میں مقصد تھا۔ "ہمیں کیبن کا معائنہ کر لینا چاہیے۔ میک شیور کہ ہر کوئی اپنی جگہ پر بیٹھا ہو۔ کریو سے بھی اپڈیٹ لے لینا۔"

فرسٹ آفیسر عامر نے اسے دیکھا اور پھر حکم کی تعمیل کرتے سر ہلایا۔ وہ اپنے ہیڈ سیٹ کو ٹھیک طرح سے کانوں پر اٹکاتے سیٹ بیلٹ کھولنے لگا اور کھڑا ہوا ہی تھا کہ رانج نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اچھی طرح سے کرنا۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے، اوکے؟"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسامہ مسکرا دیا اور اپنے ساتھی کو تین انگلیوں والا سلام ٹھوکا۔ کاکپٹ کا دروازہ دھکیلتے وہ سفید بتیوں میں روشن نیلی کاکپٹ سے وقتاً آزاد تھا۔

رانج نے اس کی پشت دروازے کے پار غائب ہوتی دیکھی تو سر موڑ لیا۔ کاکپٹ میں تنہا موجود ہمارا کیپٹن اب نظریں جھکائے نیویگیشن پینل کی سیٹنگز چھیڑ رہا تھا، ہیزل آنکھیں پر عزم تھیں۔ لیکن وہ وہ نہ تھیں جو ہم نے اب تک دیکھا ہے۔

خالص شہد یا سونے کی چمک، سردیوں کے سورج کی پہلی کرن یا کسی فنن کی معشوق کاریگری کے رنگ، رانج آدم کی آنکھیں ان میں سے کچھ نہ تھیں۔ وہ تو سفاک تھیں، بے رنگ، بے نور۔ ایسی خالی جیسے سیاہ

شگاف کا ٹکڑا ان میں جا بسا ہو، وہ پارچہ جو اپنی سمت بڑھتی ہر تجلی، ہر رنگ کو اپنے اندرون میں کثیف کر دیتا ہے۔

بے ترتیب ہچکولے اب تھم گئے تھے۔ رانج پشت سیٹ سے ٹکائے، بے آواز سا MH370 بحیرہ جنوبی چین کے اوپر سے گزار رہا تھا۔ اس کی خاموشی میں کچھ تھا، کچھ بہت غیر آرام دہ۔

اس طیارے کا اگلا ٹھکانا ویتنام کا شہر ہو چی من تھا۔

کوالالمپور ائیر ٹریفک کنٹرول نے ایم ایچ تھری سیون زیرو کو ویتنامی سرزمین کے حوالے کرنے سے پہلے ایک بار پھر رابطہ جوڑا۔ ایک آخری بار۔ یہ وقت تھا رات 01:19 کا۔

"Malaysian 370, contact Ho Chi Minh. 120 decimal 9. Good night ".

ریڈیو لائن پر معمول کی گڑگڑاہٹ تھی۔ کوالالمپور اب یہ فلائٹ ہو چی من کو دے رہا تھا اور آگے کی رہنمائی طیارے کو وہاں سے حاصل کرنی تھی۔

آسمان تاریک تھا اور اس کے ارادے بے رحم۔

رانج کی انگلیوں نے مائک کو ہلکا سا چھوا۔ آنکھوں کی ویرانی دہشتناک تھی اور گلابی ہونٹ سیدھی لکیر میں بھنچے تھے۔ یہ وہ رانج آدم نہیں تھا جسے آپ جانتے ہیں۔

یا شاید، یہ وہی تھا، اور آپ اسے اب جانے ہیں۔

"Goodnight. Malaysian 370 ".

نرم آواز میں ادا کیے سادہ الفاظ۔ لیکن کون جانتا تھا کہ یہ اس مالائی طیارے کے غیوب سے قبل کہے گئے آخری الفاظ تھے؟ اس کے بعد صرف سوالات تھے، ایسے بھید جو اپنا اصل ہضم کر چکے تھے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

بیشتر اوقات کے برعکس، رانج نے احکام دوبارہ نہیں دہرایا تھا، جو کہ اپنے آپ میں کوئی نہایت غیر معمولی حرکت نہیں تھی، لیکن MH370 کی فلائٹ میں کچھ بھی، کسی بھی موڑ پر معمولی نہیں تھا۔ آئندہ سال ہمیں بہتر بتائیں گے۔

اس رابطے کے بعد ریڈیو خاموش پڑ گیا۔ کاکپٹ میں ہیزل آنکھوں والا پائلٹ اب بھی اکیلا تھا۔ اسامہ دروازے کے پار دھیمے قدموں سے پیسنجر کیبن کا جائزہ لے رہا تھا، جہاں لوگ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے، کچھ سو کر اپنی تکان اتار رہے تھے اور کچھ اپنی سوچوں میں گم سرد نگاہوں سے ارد گرد پھیلی رات کو دیکھ رہے تھے۔

رانج نے اپنے سامنے سیٹ اپ کو بغور دیکھتے، سیاہ رولیکس والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ کاکپٹ کی اندھیر سفید بتیوں میں گھڑی کا ڈائل یک دم چمکا۔

ملائیشیا کے معیاری وقت کے مطابق، یہ وقت تھا رات 01:21 کا۔

انگلیوں کی پوریں تھروٹل کو اڈرنٹ کے برابر بنے سوئچ کے اوپر جا ٹھہریں۔ یہ سوئچ دیکھنے میں چھوٹا اور غیر ضروری معلوم ہوتا تھا، لیکن کسی بھی طیارے کے لیے اس کی سانس کی طرح کام کرتا تھا۔ یہ جہاز کا ٹرانسپونڈر Transponder تھا، جو کہ ایک اخصائی سگنل بھیجنے والے ریڈیو کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کا کام ہوائی ٹریفک کنٹرول کو علم دلانا کہ طیارہ کہاں ہے، اور ان کے رسمی اسکرینز پر اسے تشخیص دینا ہوتا ہے۔

رانج نے ٹرانسپونڈر پر انگلی پھیری۔ وہ ALT کی سیٹنگ پر قائم تھا، جس سے ایئر ٹریفک کو طیارے کی اونچائی کی معلومات ملتی ہے۔ ہیزل آنکھیں اب مکمل خالی تھیں۔ اس نے انگلی آلٹ کے برابر 'آف' کے بٹن پر چلائی، اور پھر ذرا سی قوت کے ساتھ، بٹن اندر دبا دیا۔

رانج آدم نے MH370 کا ٹرانسپونڈر بند کر دیا تھا۔

ہماری تصویر میں اچانک بدل آتا ہے۔

کا کپٹ دھندلا گئی تھی، اور اب سامنے ایک آفیس تھا۔ وسیع ایل ای ڈی ٹی وی لائن سے کمرے کی دیوار کے ساتھ نصب تھے ۔ ہری بتیوں میں جگمگاتی ریڈار اسکرینز پر کئی نقتے جل بجھ ہو رہے تھے۔ یہ نقتے صرف نقتے نہیں، بلکہ دور فضاء میں سفر کرتے ملائیشیا ائیر لائنز کے طیاروں کی مقام شناسی تھے۔

یہ جگہ تھی کوالالمپور ائیر ٹریفک کنٹرول ٹاور، جہاں ۷ مارچ کی رات سفر کرنے والے ہر مالائی طیارے کی چڑھان، اتران اور مسافرت کا تعاقب ان ریڈار اسکرینز کے ذریعے زیرِ عمل تھا۔

گھڑی کی سوئیوں نے 01:21 بجائے، اور ہرے جزیوں کے ہجوم سے MH370 آدھے ہی لمحے میں معدوم ہو گیا۔ وہ نقطہ اب کہیں نہ تھا۔ کنٹرول ٹاور اس طیارے کو کھو چکا تھا۔

وہاں بیٹھے آفیسر زنے یہ بات پکڑی تھی کہ بوئینگ 777 کا طیارہ وقتاً ان سے تعلق توڑ گیا ہے، لیکن یہ سمجھ کر کہ جہاز ان کے ریڈار سے دور نکل کر، بخیر ویتنامی فضاء میں داخل ہو گیا ہو گا، انہوں نے کوئی فوری رد عمل ظاہر نہ کیا۔

پردہ ایک بار پھر جھولتا ہے اور ہری بتیاں خفیف ہو کر نیلی پڑ جاتی ہیں۔ ایک بار پھر ہم خود کو اس گمنام طیارے کی کا کپٹ میں پاتے ہیں۔

ٹرانسپونڈر بند کرتے ساتھ ہی کا کپٹ میں کئی تنبیہی سرخ بتیاں چمک اٹھیں۔ ہر ایک وارننگ میسنج اسے ٹرانسپونڈر کے بند ہونے کی اطلاع دے رہا تھا، ساتھ ہی اسے واپس کھولنے کی تفصیلات۔ لیکن اسے وہ نہیں چاہیے تھیں۔ سر قلم کرنے والے کو مرحم پٹی سے کب غرض ہوتا ہے؟

رانج نے ایک ایک کر کے سارے پیغامات پر لگی کاٹی دبائی اور سسٹم کو خاموش کروایا۔ اب طیارہ پھر سے پر سکون تھا۔ لیکن وہ گم راہ تھا، دائمی طور پر گم شدہ، اور اس کا واحد احاطہ تھا اپنی ہیزل آنکھوں میں موت کا سا سکوت لیا کیپٹن آدم۔

وہ کنٹرول یوک کے گرد ہاتھ لپیٹتے آگے ہوا، چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ جہاز اب بھی ویسے ہی رواں تھا جیسے پانچ منٹ پہلے، لیکن اس دہشت انگیز راز کا رکھوالا وہ آپ تھا۔

اور رانج آدم اپنے راز کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ کسی کو بھی نہیں۔

شیشے سے باہر پھیلی اندھیری کو دیکھتے، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی جانب رکھی چیزوں میں سے ایک اسٹیل کی بوتل اٹھائی، ساتھ ہی ایک محتاط نگاہ پیچھے دروازے پر روشن کی۔ اسامہ اب تک نہیں آیا تھا۔

رانج نے کنٹرول یوک، رڈر پیڈل اور جہاز کے تھروٹل کی مدد سے turbulence کی ایک جعلی تصویر کھینچی تھی۔ یہ ہوا یا بدلوں کا کام نہیں تھا، یہ اس کا دغا تھا۔ اسامہ کو باتوں میں لگا کے سیٹنگز کو چھیڑنا آسان تھا، وہ اس کے ساتھ گزاری ماضی کی سیاحتوں میں یہ جان چکا تھا۔ اسامہ عامر اس پر بھروسہ کرتا تھا، اسے دوست کہتا تھا، اور رانج کو اس کی بے وقوفی پر کامل یقین تھا۔

وہ بوتل کا ڈھکن ہٹانے لگا تو اسٹیل کے کلنک کی مدھم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، ساتھ ہی اندر چھلکتے خالص آم کے شربت کی خوشبو سارے میں پھیلتی چلی گئی۔ ڈھکن ہٹا اور اندر تیرتا شفاف پیلا جوس نظر میں آیا۔ وہ اب اپنی پچھلی جیب سے کچھ نکال رہا تھا۔ اس نے ہاتھ واپس آگے کیا تو کاکپٹ کی سفید روشنی میں کانچ کا چھوٹا وائل vial نمایاں ہوا۔ اس کے اندر خفیف سی مقدار میں ایک بے رنگ، پانی جیسا مائع تیر رہا تھا۔

وائل کا کیپ کھولتے اس نے بے رنگ مادہ بوند بابوند جوس کی بوتل میں ٹپکایا۔ وہ ایسا پرسکون تھا جیسے یہ پورا عمل ذہن ہی ذہن میں نہ جانے کتنی بار دہرا چکا ہو۔ چھوٹی شیشی خالی ہو گئی تو اس نے جیب میں واپس ڈال دی، اور بڑی تھرموفلاسک کی بوتل کا ڈھکن بند کرنے لگا۔

اس ہی لمحے کاکپٹ کا دروازہ کھلا۔ رانج کی سانس تھم گئی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"تھک گیا میں بھائی۔" اسامہ دروازہ چٹخنی کے ساتھ جوڑتے اندر بڑھ رہا تھا۔ کیپٹن مسکرا دیا اور بوتل دور رکھی، ہونٹوں پر سے گھونٹ پونچھنے کی کمال اداکاری کی۔

"آجاؤ۔ اب تو آرام ہی کرنا ہے۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

اسامہ سر ہلاتے مسکرا دیا، اپنی کرسی سنبھالی اور ہیڈ فون صحیح سے سیٹ کیا۔ رانج اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ان کی نگاہیں ملیں تو ہمارا کیپٹن مسکرا دیا۔

کوئی ان مسافرین کو بتاتا کہ اس فلائٹ کی منزل ہیل (hell) تھی۔

جگہ: پسنجر کیبن

AM01:19

ظبیہ ساری کہانی اکائر کو سنا چکی تھی۔

اب اگر وہ چاہتا تو فلائٹ اٹینڈنٹ کو بلوا کر اسے چلتے جہاز سے دھکا بھی دلوا سکتا تھا اور 'قاتل قاتل' کے نعرے لگا کر اس کی عزت کا ملیامیٹ بھی بنا سکتا تھا۔ فیصلہ اس کا تھا۔ اکائر کی خباثت پر پورا یقین رکھتے ظبیہ نے ایک عقلمند پیش گوئی کی تھی کہ وہ یہ دونوں ہی کرنے کے قابل تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اب وہ دونوں شانہ بشانہ چلتے پیسنجر کیبن لوٹ رہے تھے۔ ظبیہ کے ہاتھ میں اس کا مشہورِ زمانہ کالا ہینڈ کیری تھا۔ اکائر نے گن واپس اس کے سامان کے بیچ چھپا دی تھی اور ظبیہ کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اپنے تاثرات پر قابو رکھے، بلاوجہ بیگ کو نہ دیکھے اور چھونے کی غلطی کرنے پر تو وہ اسے زندہ چبا جائے گا۔ ظبیہ نے ڈر کر سر ہلا دیا تھا، لیکن وہ یہ ضرور قبول کرتی تھی کہ اکائر کی موجودگی نے تھوڑا بہت ہی سہی مگر اسے پر سکون کیا تھا۔

وہ ایک بار پھر اس کی شکر گزار تھی۔ ظبیہ اب گنتی بھول رہی تھی۔

کوئی نہیں، اکائر اسے یاد کروا دے گا۔ بدتمیز، ظبیہ اندر ہی اندر مسکرا دی۔

"کہاں بیٹھے ہو تم؟" وہ لوگ راہداری سے گزرنے لگے تو ظبیہ نے گردن ترچھی کرتے سوال کیا۔ ان کے آس پاس بیشتر لوگ آنکھیں موندے خواب خرگوش کا مزہ اٹھا رہے تھے اور بقیہ صاحب شعور مختلف مشغلوں میں مصروف تھے۔

اکائر سر موڑتے اسے اپنی سیٹ دکھانے لگا تھا کہ وہاں ہجوم سا پا کر رکا۔ ایک فلائٹ اٹینڈنٹ اس کی کرسی کے ساتھ جھکی اس کے برابر سیٹ والی عورت سے کچھ کہہ رہی تھی۔ عورت کی گود میں لیٹا بچا ان کی خاموش سرگوشیوں کے درمیان اونچا اونچا رو رہا تھا۔

اکائر کی ابرو تحقیق میں تنگ ہوئیں۔ وہ دھیمے قدم کے ساتھ اپنی سیٹ کی جانب بڑھا۔ ظبیہ نے پہلے سوچا کہ چھوڑو اس کا مسلہ، مجھے کیا، لیکن پھر اچانک خود پر شرمندگی محسوس ہوئی تو اس کے پیچھے چل دی۔

وہ فلائٹ اٹینڈنٹ کے پیچھے کھڑا جھانکنے لگا۔ "کیا ہوا ہے؟" انگریزی میں سوال کیا۔ ظبیہ کی انگریزی اس پردیسی جتنی اچھی نہیں تھی لیکن اتنی تو وہ سمجھ گئی تھی۔

فلائٹ اٹینڈنٹ اسے دیکھ کر پریشان سی سیدھی ہوئی۔ ساتھ بیٹھی عورت نے بھی ہونٹ کاٹتے اسے دیکھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر سسپنس سے مر جانے والا تھا۔ توبہ ہے۔ یہ خواتین بھی کتنی ڈرامائی ہوتی ہیں۔

"سر وہ۔۔۔" ہاتھ سے انگوٹھا چوستے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ۔۔۔ بیبی نے جوس گرا دیا تھا آپ کی سیٹ پر۔ آپ کا سامان خراب ہو گیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، بچے کی ماں نے فوراً بات وہیں سے جوڑی۔ "آئم سو سوری! مجھے نہیں پتا تھا یہ ایسا کرے گا۔ یہ کبھی—"

وہ ہنس دیا پھر سر جھٹکتے دونوں عورتوں کو دیکھا۔ "جو س ہی تو گرایا ہے۔ اس بیگ میں صرف میرے کپڑے ہیں۔ دھل جائیں گے۔ ہاں، سیٹ کا مسلہ ہے۔" مڑ کر ظبیہ کو دیکھا۔ "تمھارے برابر جگہ خالی ہے ناں؟"

وہ جو گنگ سی کھڑی سب سن رہی تھی اچانک اوپر دیکھنے لگی۔ سرمئی آنکھیں اس کی منتظر تھیں۔ خواب کی سی کیفیت میں سر اوپر نیچے کیا۔ اس کے جواب پر مسکراتے، اکائر نے پریشان ماں اور فلائٹ اٹینڈنٹ کو دیکھا۔ "سی؟ اٹس آل سورٹڈ۔ اتنی سی بات پر اتنا پریشان نہ ہوا کریں، لیڈیز۔" فکرے کے آخر میں ایک نگاہ ظبیہ پر ڈالتے اپنا بیگ اٹھایا اور آگے سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بھی اس کے پیچھے قدم قدم چل دی۔ فلائٹ اٹینڈنٹ اب اپنی ایک اور ساتھی کے ساتھ مل کر پیچھے سیٹ کی صفائی کر رہی تھی۔

وہ ظبیہ کی سیٹ کو پہنچے تو اکائر ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر باہر کا اشارہ کرنے لگا۔ خود اس نے window سیٹ لی تھی۔ وہ خاموشی سے نرم گدی پر جا بیٹھی۔ ویسے بھی، ان روشنیوں سے اس کا دل اُچاٹ ہو رہا تھا۔ پلین گنگنا رہا تھا، انجن حرکت میں تھے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر نے اپنا سامان بالائے سر بنے خانوں میں رکھنے لگا۔ ظبیہ اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر سجائے باہر دیکھنے لگی۔ سرمئی آنکھوں نے ایک پل رک کر اسے دیکھا۔

"چلا جاؤں کیا؟" یک دم سوال۔

کالے عبائے والی چونک کر سیدھی ہوئی اور اسے دیکھا۔ "کہاں؟"

"یہاں سے۔ اگر تم غیر آرام دہ ہو تو۔" وضاحت کی۔

بھوری آنکھیں اسے دیکھنے لگیں پھر سر نفی میں میں ہلایا۔ "بیٹھ جاؤ، ورنہ منہ کے بل گرو گے۔"

اکائر مسکرا دیا اور سامان ایک آخری مرتبہ پیچھے کرتے سیٹ پر نشست ہو گیا۔ اگلا سوال اس نے اپنے گرد بیلٹ باندھتے کیا۔ "بائی دی وے۔"

ظبیہ ٹھنڈے شیشے پر نقشے کھینچے لگی۔ "ہمم؟"

"تم اس پائلٹ کو جانتی ہو؟"

اس کے آس پاس زمین نے ہچکولے کھائے۔ پلین اچانک آگے پیچھے ہوا۔ آس پاس لوگوں نے شاک اور خوف میں دعائیں بلند کیں۔

پلین میں ٹربیولنس ہوئی تھی۔ صرف پلین میں نہیں ہوئی تھی۔

"کون پائلٹ؟" اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھتے نظریں چرائیں۔ دل اب بھی زور سے دھڑک رہا تھا۔

اکائر نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے اسے دل بھر کے دیکھا۔ وہ ٹربیولنس سے اتنا ہی متاثر ہوا ہوتا تھا جتنا کہ اس جانکاری سے کہ ظبیہ اب ایک سرٹیفائیڈ قاتلہ تھی۔

"جس کے ساتھ بورڈنگ گیٹ پر روم کوم شوٹ کر رہی تھی۔ That is not how you flirt, by the way."

ظبیہ کو اپنے کان شرم سے لال ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے منہ بگاڑتے سر کتاب کی اندر ڈال لیا۔ وہ والی کتاب نہیں، دوسری۔ "بکواس مت کرو۔"

اکائر بے اختیار ہنس دیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ "مطلب جان پہچان تو ہے۔"

"مجھے بات نہیں کرنی اس کے بارے میں۔ بدتمیز انسان ہے وہ۔ گدھا۔ جہاں جاؤ آ جاتا ہے۔ فضول مرد۔"

اکائر کے لب 'او' میں سکڑے۔ سر ہلاتے اس نے نیچے دیکھا۔ وہ اور نہیں پوچھنے والا تھا۔ اکائر زمورا کبھی حدود پار نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت خود سے کیے وعدوں کی تھی۔

"تم۔۔۔" ظبیہ نے اس کی خاموشی بھانپ کر اوپر دیکھا۔ "تم سے کچھ کہا کیا اس نے؟"

"آئی تھنک اسے صرف تم سے بات کرنے سے سروکار تھا۔" ٹھنڈا جواب۔ اب وہ گود میں رکھے بیگ پیک سے لیپ ٹاپ اور ہیڈ فون نکال رہا تھا۔

ظبیہ نے ابرو اچکائے۔ "کیا مطلب؟"

لیپ ٹاپ پر 'آن' کا بٹن دباتے، سرمئی آنکھیں اس کی جانب موڑیں۔

"مجھے نہیں پتا تم اس کو کیسے جانتی ہو اور وہ کیا لگتا ہے تمھارا بٹ جو اس نے ائیر پورٹ پر کیا وہ تھوڑا۔۔۔ آف تھا۔ انٹرنیشنل ائیر لائنز میں ایسی چیکنگ نہیں کی جاتی۔ اور تم صاحبہ بھی بندوق تانے گھوم رہی تھی۔ ڈمب اینڈ ڈمبر۔"

کالے عبائے والی کو یہ بات بری لگی۔ "میں ڈمب ہوں یا ڈمبر؟"

"ڈمبیسٹ!" اور کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لیے۔

ظبیہ نے اپنے آپ کو قتل و غارتگری کے اخلاقی اور دینی نقصانات گنوائے۔ مال میں محتاجی، ابدی بدبختی، سماجی تفریق۔ بس، اب اسے ڈپریشن ہو جانا تھا۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے اس نے اپنے نیچے بحیرہ جنوبی چین کو پایا، بے آواز سا، اپنی لہریں جھلاتا۔

"اس کا نام رائج ہے۔" اسے اپنی آواز دور کسی غار سے آتی محسوس ہوئی۔ وہ الفاظ ادا کرتے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایسی چبھن ہوئی تھی جیسے کسی تازہ زخم کو کریدا ہو۔

اکائر نے گردن موڑی۔

"وہ میرا پڑوسی تھا۔ میں اسے دس سال کی عمر سے جانتی ہوں۔ وہ جب ستھرہ کا تھا۔ لیکن میں اسے اپنا دوست نہیں کہوں گی کیونکہ ہم دوست نہیں تھے۔" سر جھکاتے ظبیہ کو اپنے حنجرے میں پتھر گرتے محسوس ہوئے۔ آنسو باہر آنے کے بجائے الٹے گر کر اس کا حلق جلا رہے تھے۔

"رابح۔۔۔" اپنی چوہتی انگلی کو دیکھا جہاں برسوں سے پہنی غزار کے نام کی انگوٹھی اپنا نشان چھوڑ چکی تھی۔ اچانک ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ سفید دھاگہ، شام کا وقت، بھورے باجو کرتے میں کھڑا ایک مسکراتا چہرہ اور اس کی بھوری آنکھوں میں چمکتے وعدوں کے رنگ۔

سفید دھاگہ ٹوٹ گیا تھا۔

"میں اسے پسند کرتی تھی۔" ایک لمحہ رک کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ "وہ بھی کرتا تھا۔ ہماری منگنی ہوئی تھی پانچ سال پہلے، جب میں اکیس کی تھی۔ میرے ساتھ اس وقت صرف ابا تھے۔ وہ بھی عجیب۔ وہ اس رشتے سے خوش نہیں تھے۔ رابح سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ وہ بہت قابل تھا، کامل تھا، ایک پائلٹ تھا۔ میں۔۔۔" وہ تلخی سے مسکرادی۔ "میں نے تو صحیح سے تعلیم بھی حاصل نہیں کی۔ میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔"

اکائر اسے سنتا گیا۔ اس نے ہیڈ فون اتار دیے تھے۔

"وہ بس، بہت مشکل انسان تھے۔ وہ یہ شادی نہیں چاہتے تھے، لیکن رابح مجھے ہر بار یقین دلاتا تھا کہ اسے کسی اور کی پسند ناپسند سے فرق نہیں پڑتا۔ اس کے لیے صرف ہم دونوں کے احساسات اہم تھے۔ میں اس کی شکر گزار تھی۔ رابح نے مجھے اندھیروں کے پار دکھایا تھا۔" اس نے ہلکی پیلی روشنی میں اکائر سے نظریں ملائیں، پانی کی تہ اس کی بھوری آنکھیں چمکا رہی تھی۔

"ہر کوئی یہ نہیں کرتا۔"

اکائر زمورا کو اپنے منہ میں بہت سا تھوک بنتا محسوس ہوا۔ اس نے سر جھکایا۔ "صحیح کہہ رہی ہو۔ ہر کوئی نہیں کرتا۔" نرم آواز میں دہرایا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک سوال جنم لے رہا تھا۔ وہ سوال جسے اکائر نے آج تک خیال سے زیادہ بڑھنے نہیں دیا۔ اس کی زندگی پلٹ دینے والے الفاظ اب اس کے لب تک ابل چکے تھے اور دل، دل ایسا تھا کہ ابھی سینا توڑ کر باہر آجائے۔

نہیں۔ نہیں۔

انگلیوں کو مٹھی میں جکڑتے اس نے سر موڑ لیا۔ نہیں!

اس نے فیصلہ لے لیا تھا۔ اب دل غدر کرے یا خون کے آنسو ٹپکائے، اکائرز مورا فیصلہ لے چکا تھا۔

ساتھ بیٹھی مسافر روشنی میں واضح اس کے آدھے چہرے کو دیکھتی گئی۔ "جب وہ میرے ساتھ تھا، اس نے میری زندگی آسان بنائی تھی۔ مجھے امید دلائی تھی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں اپنی زندگی کا آدھا حصہ صرف رانج آدم کے نام کر دیتی۔"

اکائر کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ اس کی نسوں میں خون اس رفتار سے دوڑ رہا تھا کہ اس کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔ وہ اور نہیں سن سکتا تھا۔ وہ بے چین سا آگے پیچھے ہوا۔

"تمھیں پتا ہے رانج میرے لیے کیا ہے؟" وہ نرم آواز میں بولی۔

سرمئی آنکھوں نے التجاء کی، بس کرو۔ "ظبیہ۔"

"رانج۔۔۔" وہ اسے دیکھتے رکی۔ "وہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

جیسے سفاک ہوا کا کوئی پوشیدہ جھونکا ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے اڑا ہو، سرمئی آنکھوں والا مرد چونک اٹھا۔ گلابی ہونٹ تحیر اور پھر تعجب میں کھل بند ہوئے۔ "کیا؟"

ظبیہ مسکراتی ہوئی شیشے کو دیکھنے لگی۔ سب ویسا ہی تھا۔ یا شاید، اب نہیں۔

"رانج اور میرا کوئی تعلق نہیں ہے، نہ تھا۔ جب وہ میرے پاس تھا، جب بھی وہ ایک اجنبی تھا۔ جب اس نے مجھے سہارہ دیا تھا، جب بھی وہ آزاد تھا۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ بندھا ہی نہیں۔ اس نے۔۔۔ بندھنے ہی نہیں دیا۔"

"وہ تمھارا منگیتر نہیں تھا؟"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے اسے دیکھا۔ ”منگیتر سے کیا ہوتا ہے؟ آپ کی چوہتی انگلی پر چمکتی ایک چیز آپ کو کس حد تک ایک دوسرے انسان سے باندھ کر رکھ سکتی ہے؟ کتنا حق ہو سکتا ہے اس شخص کا آپ پر؟ اگر نیت صاف ہو تو کسی انگوٹھی یا تحفے تحائف کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ عورت کو صرف ایک نام چاہیے ہوتا ہے۔ ایک رشتہ چاہیے ہوتا ہے اور اس مرد سے حفاظت چاہیے ہوتی ہے جس کے گھر میں وہ ہے۔ اور جو مرد اس وقت اسے یہ تین چیزیں نہیں دے سکتا جس وقت اسے ان کی ضرورت ہے، تو وہ مرد کچھ نہیں ہے۔“

”کیا رانج نے تمھیں یہ تینوں چیزیں نہیں دیں؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ آنکھوں میں کچھ تھا، کچھ بہت گہرا۔

ظبیہ نے نظریں اس سے ملائیں۔ ”ایک بھی نہیں۔“ اس کے گلے میں کچھ آ گرا تھا، کثیف اور پتھریلا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہوئی۔ پھر وہ اداسی سے مسکرائی اور اپنے ناخنوں کے کیوٹیکل کو کھرچنے لگی۔ ”لیکن میں کون سی نیک پارسا تھی؟“ آواز میں اپنی ہستی کے لیے چبھن تھی۔ ”میں نے بھی غلط کیا تھا۔ ایک نامحرم سے امید رکھی، اس کے وعدوں کو حقیقت مانا اور اپنا مستقبل اس کے سپرد کر دیا۔ مرد تو بنے ہی رسوا کرنے کو ہیں۔“ وہ آخر میں کڑواہٹ سے بولی۔

”تم کم عمر تھی، ظبیہ۔ ناسمجھ تھی۔ خود کو قصوروار مت ٹھہراؤ۔ ہو سکتا ہے رانج کی بھی مجبوری ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ایسی جگہ جکڑا ہو کہ نکل نہ پایا ہو۔ ہو سکتا ہے اس نے تمھیں خوب چاہا ہو، ظبیہ، اور تمھارا غم اسے روندھ گیا ہو۔“ اکائر نے اس کی جھکی پلکیں دیکھتے کہا۔ بھوری آنکھوں نے رخ پھیر کر اسے نظروں کے حصار میں لیا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"میں نے اس مرد کو چاہا تھا، اکائر، مگر اس کی چاہت نے مجھے میرے آئیندہ سالوں میں ذلیل کر دیا۔"
موٹے آنسو اس کی آنکھوں کی نچلی پٹی پر امڈ آئے تھے۔ "یہ انعام تھا جو میں نے کمایا اس 'کمٹمنٹ' میں بندھ کر، کیونکہ منہ سے کیے وعدے تب تک ہی نبھائے جاتے ہیں جب تک سامنے والے کو یاد نہ دلاؤ۔"
"تمھیں رائج اپنا گناہگار لگتا ہے؟" اس نے اپنی ہتھیلیاں دیکھتے پوچھا، اس کی ٹون میں جھجک تھی۔
"وہ میرا قاتل ہے، اکائر۔" اس نے ویران سرگوشی کی۔ "اس نے مجھ سے محبت کا سکھ چھین لیا۔ کوئی مجھے ایک موقع دے، میں اس سے زندگی کا سکھ چھین لوں۔"
اکائر کی ریڑھ کی ہڈی سن ہوئی، لب خشک۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔
"رائج آدم دنیا کا بدنصیب ترین مرد تھا۔"
پھر اپنے ناخنوں کو دیکھتے تھوک نگلا۔
قدم تو اس کے بھی سبز تھے۔
ساتھ بیٹھی ظبیہ کسی خواب کی سی کیفیت میں راہداریوں کے درمیان بنی بتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا اکائر کے سامنے اپنی زندگی کے مسائل کا اعتراف کر کے اسے بہتر محسوس ہو رہا تھا یا برا۔ دماغ نے فی الحال دل سے رابطہ توڑ رکھا تھا۔ اس کی خالی خالی بھوری نگاہیں آگے کی قطار میں بیٹھے ایک جوڑے کو تکنے لگیں۔
چند ماہ کا ننھا بچہ باپ کی گود میں تھا اور ان کے سامنے بنی اسکرین پر فروزن (Frozen) مووی چل رہی تھی۔ انا کو ہانس سے سچی محبت ہو چکی تھی اور وہ اس کے ساتھ اندھیری رات میں کھڑی تھی۔ اس کی بے رنگ، سرد زندگی میں آیا پہلا پہلا مرد جس نے اسے اپنے کچھ ہونے کا احساس دلایا تھا، اور وقت کے قفس

میں قید انا اس کے حقیقی مقاصد سے مکمل طور پر غافل اسے اپنا سب کچھ مان بیٹھی تھی۔ یہ مرد اس کی زندگی سے محبت کا سکھ چھیننے والا تھا۔ انا ظبیہ بننے والی تھی، اور وقت کے آگے سب بے بس تھے۔

کسی نے ٹھیک کہا تھا: محبت میں آنکھیں نہیں، دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

جب ننھے بچے کی ماں سونے لگی تو اس کے شوہر نے اپنا کندھا تر چھا کر کے اسے آرام بخشنا چاہا۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ محبت کی نظر۔ کیا غزار کبھی اسے ایسے دیکھتا تھا؟

دل میں بنتی خلش ناگہاں تھی۔ ظبیہ نے دماغ کو ماضی کے طواف سے باز رکھنا چاہا، مگر کچھ چبھ چکا تھا۔ بن بلائے وہ برستا دن اس کی سوچوں میں کہیں اٹک سا گیا۔

★★★

(فلائٹ ایم ایچ تھری سیون زیرو سے چار ماہ قبل)

10 دسمبر، 2013

شہر کوالالمپور میں آج بارش کی پیش گوئی تھی۔

شام ڈھلنے کے دہانے پر تھی اور ارش میں پھیلا بادلوں کا ہجوم چاروں اطراف چھائے گھپ اندھیرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ بانگسار کے دو منزلہ بنگلے میں بھی روشنی دور دست تھی۔ لاؤنج کی وسیع کیسمنٹ کھڑکیوں کے قلابے کھلے تھے اور سرد، نم ہوا کے جھونکے اندر سرسرا رہے تھے۔

لاؤنج میں لگے باون انچ کے ٹی وی پر نیوز رپورٹر کی آواز بلند تھی۔ کریم رنگ کا قالین اور چھت سے لٹکتا تین پر والا پنکھا تیز بن آواز ہوا پھینک رہا تھا۔

کیمل کلر کے باجو کرتے میں ملبوس ظبیہ ساکٹ کے ساتھ جھکی ویکیوم کلینر پلگ ان کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گرے رنگ کی شلوار اور ہم رنگ اسکارف گلے میں ڈالا تھا۔ گھنگریالی سیاہ لٹیں گلابی رنگ

کے کیچر میں اڑسی ہوئی تھیں۔ کچن اور بیڈ روم کی صفائی کر کے اب اس نے ویکیوم کرنا تھا اور پھر اس کا کام ختم تھا۔

آج غزار اور اس کی شادی کی چوہتی سالگرہ تھی، اور اس کے شوہر نے اسے اپنی ورسری (anniversary) ڈنر پر لے کر جانے کا وعدہ کیا تھا۔ غزار نے صبح دفتر جانے سے قبل مسکرا کر اس سے ریستوران پک کرنے کا کہا تھا، کیونکہ وہ اسے اس کی من پسند جگہ لے کر جانا چاہتا تھا۔ ظبیہ تو یہ سن کر ہی پھولے نہیں سما رہی تھی۔ برتن دھوتے دھوتے بھی اس کی آنکھیں ٹیبلٹ پر تھیں، جہاں مختلف ریستوران کی فوڈ ریٹنگ واضح تھیں۔ غزار نے اسے ریستوران کا انتخاب عطا کیا تھا، تو وہ اس کی پسندیدگی کے حساب سے ریستوران چنے گی۔

گو کہ وہ خود سی فوڈ کی شوقین نہیں تھی، مگر پورا دن 'بیسٹ سوشی پلیسس' سرچ کر کر کے چلتا پھرتا مینو کارڈ بن گئی تھی۔

"شام بخیر، میں اس وقت کوالالمپور کے علاقے تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل سے لائیو رپورٹنگ کر رہا ہوں۔" ٹی وی پر چلتے پیغام نے اچانک اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔

ویکیوم کلینر کے تار سے گانٹھیں مٹاتی اس کی انگلیاں دو پل کے لیے تھم گئیں اور اس نے چہرہ اٹھا کر اسکرین دیکھی۔

رپورٹر کی آواز صحن میں گونج رہی تھی۔

"نومبر سے ہوتی مسلسل بارشوں کی وجہ سے مقامی سطح پر آنے والے سیلاب کے باعث رہائیشی کئی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ گلیوں نے ندیوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور گھر گھر پانی میں ڈوبا ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگ اپنی پناہ گاہوں سے محروم ہیں۔"

ظبیہ نے صوفے سے ریموٹ اٹھاتے آواز تیز کی۔ ٹی وی پر کیمرا مین پانی سے بھری سڑکوں کا حال دکھا رہا تھا اور پیچھے رپورٹر کی آواز مسلسل تھی۔ اس کا دل دھڑکا، دھڑکن کانوں تک سنائی دی۔ گلی کی تصویر میں بھوری آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ کوئی نشانی، کوئی یاد۔

وہ گلیاں اسے کیسے بھول سکتی تھیں۔ رپورٹر کی پیٹھ پر رہائیشی سڑکوں کے درمیان سے گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی چھتریاں کھلی تھیں اور پجامے ٹخنوں سے اوپر لپٹے تھے۔ اس کے اپنے لوگ۔ گلابی ہونٹ بے معنیٰ سی مسکان میں گھل گئے۔

چار سال بیت گئے تھے اور اب وہ گلیاں اس سے کوسوں دور تھیں۔ وہ واپس جانے کے سارے راستے بھول چکی تھی۔ واپس جانے کا سارا حق لٹا چکی تھی۔ اس کے باپ، یمین العطاس، کڈنی ڈیمج کی وجہ سے دو سال قبل وفات پا چکے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ان کے گردوں تک جاتی خون کی نالیوں کو صدمہ پہنچا تھا اور ضعیف عمر کی وجہ سے صحتیابی کی طرف آتا سفر ان کے لیے کٹھن کام بن گیا تھا۔ وہ ہاسپٹل میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ غزار نے ان کے سارے بل کلیئر کیے تھے اور پھر اس کی تمان تُن والی پراپرٹی بھی سلامتی سے اس کے نام ٹرانسفر کروادی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے کاغذات پر دستخط کرتے انھیں دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کا دل اُچاٹ تھا۔ وہ اس گھر سے بے حس اور مبہوت تھی۔ اسی لیے اس نے غزار سے کہا تھا، بلکہ درخواست کی تھی، کہ وہ خود ہی کوئی گاہک دیکھ کر اسے ٹھکانے لگا دے۔ غزار نے کافی سوچ بچار کے بعد، خود ہی وہ گھر خرید لیا تھا اور ظبیہ کے نام کی ایف ڈی کھلوا کر رقم وہاں جما کر دی تھی۔

کیا وہ اس کے کہنے پر اسے وہاں لے کر جائے گا؟ ایک خیال اس کے دماغ کے کنارے چھو گزرا۔ بن بلایا، بے مقصد۔ اسے جھلاہٹ ہوئی اپنی خواہش پر۔ وہ کیوں جانا چاہتی تھی اس اجاڑ بستی میں؟

ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ سیاہی پوری اسکرین پر پھیل گئی۔ اب کہ اس کے ابرو تنے تھے اور چہرے پر واضح ناگواری۔

یکایک مین ڈور پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ اس نے ویکیوم کلینر کونے چھوڑا اور گھڑی پر وقت دیکھا۔ سات بج چکے تھے۔ عموماً یہ اکائر کے واپس آنے کی گھڑی ہوا کرتی تھی۔ لچھے دار اسکارف سر پر ٹھہراتے وہ دروازے تک پہنچی اور کی ہول (keyhole) سے جھانک کر گیٹ کھولا۔

"سلام۔" سامنے کھڑے اکائر نے تھکی ہوئی مسکراہٹ پیش کی، کندھے پر بیگ سنبھالا۔ سفید بٹن شرٹ اور سیاہ پینٹ پہنے پتا نہیں کیوں وہ روزمرہ کے مقابلے کئی گنا زیادہ باترتیب اور حاکمانہ ظاہر ہو رہا تھا۔ کلائی کے گرد سیاہ گھڑی تھی اور گھنے بال انگلیوں سے پس پیشانی دھکیلے گئے تھے۔ مین گیٹ کے اوپر لگے بلب کی روشنی اس پر قطرہ قطرہ نمایاں تھی۔

"واعلیکم۔" ظبیہ بھی مسکرائی، ساتھ ہی اس کی نگاہیں اکائر کے پیچھے بنتے منظر کو دیکھنے لگیں۔ گھر کی دہلیز کی چند سیڑھیاں چھوڑ کر بارش کی ننھی، میٹھی بوندیں آسمان سے ٹپکنا شروع ہو چکی تھیں۔ روڈ پر کھڑے درخت خنک ہوا میں جھوم سے رہے تھے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"It's raining".

اکائر نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے اقرار کیا، لہجے میں ایک غیر شناخت شدہ سی مٹھاس تھی۔ پھر اس نے چہرہ گھما کر اسے دیکھا۔

"میرے مہمان آئے ہیں۔ تمھیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟" اس نے دھیمے سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ سیاہ ٹویوٹا آویزا کی بتیاں بجھی تھیں اور ونڈ شیلڈ وائپر شیشوں سے پانی صاف کرنے میں مگن تھے۔

اس کے تاثرات حیرت کے رنگ ڈھلے۔ "او، نہیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔ میں ڈائننگ روم-"

"نہیں، دوست ہے۔ کمرے میں بیٹھ جائیں گے۔"

اطلاع کر کے وہ اندر جانے آگے مڑا لیکن ظبیہ اپنے استھان سے دو قدم بھی نہ ہلی۔ اس نے اچھنبے سے ابرو اوپر کی۔

"تمھارے جوتوں میں کیچڑ ہے؟" وہ بازو لپیٹے کسی استانی کی طرح پوچھ رہی تھی۔ اکائر گہری مسکان مسکرا دیا۔ "گاڈ فار بڈ کوئی آدمی کیچڑ والے جوتوں کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو جائے۔" اس نے اڑھیوں سے جوتے کھسکائے پھر ظبیہ کو دکھا کر باہر بنے ریک پر جمائے۔

"اب؟ اجازت ہے، ظبیہ پوان (میڈیم)؟"

وہ ہنس دی۔ "شوق سے جائیں، اکائر انسیک (سر)۔"

وہ سر کے خم کے ساتھ اس سے علیحدہ ہوئی۔ اکائر اپنے مہمان کو اندر دعوت دے رہا تھا۔ ظبیہ کچن سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چل دی۔ آٹھ بجنے سے پہلے ہی اسے تیار ہونا تھا، کیونکہ غزار نے کہا تھا وہ فوراً ہی ڈنر کے لیے نکل جائیں گے۔ اس نے ہینگر میں لٹکا استری شدہ گہرے گلابی رنگ کا باجو کو رنگ اتارا اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے غسل خانے چل دی۔

اس کے بعد اس نے اپنی تھکی ماندہ صورت کو فیس پاؤڈر سے سدھارنا چاہا۔ پف کو اپنے بھورے گالوں پر تھپتھپاتے اس نے ہلکے گلابی رنگ کا بلش پھیلایا اور پھر اسٹینڈ سے اپنی مسکارا اسٹک تھامی۔ استعمال سے قبل اس کو دو تین دفعہ ٹھوکا، پھر برش باہر نکالتے اسے اپنی پلکوں کے اوپر نیچے لگایا۔ سیاہ پلکوں کا خم اب ابھر کر واضح تھا۔ ناک کی لونگ بدلنے کا سوچا لیکن خیال ترک کر دیا۔ بلاوجہ کی جھنجھٹ۔ بالوں میں برش پھیر کر اس نے ایک اونچی پونی بنائی، مرغولے دار لٹیں اس کی گردن کی پشت پر جھولتی گئیں۔

دوپٹہ سر پر ڈال کر وہ واپس لاؤنج میں آئی تو وقت آٹھ کے قریب تھا۔ اب اسے غزار کا انتظار تھا۔ وہ خوش باش سی کچن میں آ کھڑی ہوئی۔ راستے میں ایک لاشعوری نگاہ اوپری زینے پر ٹھہرائی۔ اکائر کے کمرے میں ہلکی کھڑ پڑ سنی جا سکتی تھی۔

وہ پہلی دفعہ تھا جو اس کا کوئی مہمان گھر آیا تھا، اسی لیے ظبیہ کا تعجب قابلِ فہم تھا۔ خیر، وہ خوش ہوئی تھی کہ اکائر نے بھی گھر کو گھر سمجھا تھا، ورنہ تو وہ کُل چیزیں مروت میں ہی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر ظبیہ کو اکثر ترس آتا تھا۔

وہ دل سے چاہتی تھی کہ اس کے پاس بھروسہ کرنے کو لوگ ہوں، دوست ہوں۔

اچانک ہی اس کے من میں خیال آیا کہ اس کے مہمان کے لیے کچھ لوازمات کا انتظام کر دے، تو اس نے آدھی کیتلی بھر کر پانی چولہے پر چڑھایا۔

برتنوں کے ریک سے دو مگ برآمد کیے، پھر فرج سے کنڈینس (condensed) دودھ کا ڈبہ باہر نکالا اور کنارے سے ٹن کھولا۔ ٹیبل اسپون کی مدد سے دونوں کپ میں خاصہ مقدار ڈال کر وہ سیدھی ہوئی اور پانی کے قریب جھکی۔ ابال دور تھی، سو اس نے آنچ تیز کر دی۔ شعلہ بھڑک اٹھا۔

اس کی تیاریاں تے تاریک کے لیے تھیں، جسے بیشتر اوقات مالائی بلیک ٹی مانا جاتا ہے۔ مگر عام بلیک ٹی کے برعکس، اسے بنانے کا طریقہ مخصوص تھا۔

دروازے پر بیل بجی تو اس بار اسے معلوم تھا غزار کے علاوہ کوئی نہیں ہو گا۔ وہ ابلتے پانی کو وہیں رکھ کر گیٹ کھولنے آئی تو ایک ناگوار سی شکل بنایا غزار اپنے بریف کیس سے پانی کے چھینٹے صاف کر رہا تھا۔ صبح کی استری شدہ سیاہ ڈریس شرٹ شکن زدہ اور باسی معلوم ہوتی تھی، ساتھ ہی اس کا کوٹ بدمزگی سے بازو پر دھرا تھا۔ ظبیہ سے آنکھیں ملائے بغیر ہی وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے سلام کیا تو جواب بھی نہیں لوٹایا، بس وزنی قدموں سے صحن کی جانب رواں رہا۔

سیاہ لوفر اپنے عقب میں چمکتے ٹائلز پر کیچڑ کے نشانات روند گئے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"خیریت؟ بارش تیز ہے کیا؟" ظبیہ اس کے ساتھ کھڑی آہستگی سے سوال کرنے لگی۔ اس نے اس کی سنواری ہوئی صورت پر ایک نگاہ تک نہیں روشن کی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی اس کا موڈ اترا ہوا تھا، اور وجہ ذرے سے آفتاب تک کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

"پوچھو ہی مت۔" کچن کا نل کھولتے اس نے بہت سارا پانی اپنے ہاتھوں میں جما کیا پھر زوردار چھینٹا چہرے پر پھینکا۔ ظبیہ نے نچلا لب دانت سے کترا۔

"گاڑی پھنسی تو نہیں کہیں؟ میں نیوز میں دیکھ رہی تھی۔۔۔"

"کھانا کیا بنایا ہے؟" وہ اب آستینیں اوپر کی طرف موڑ رہا تھا۔ گندمی رنگے بازو صاف ظاہر تھے۔

"جی؟" وہ گڑبڑا کر رکی اور چولہے پر پکتے سادے پانی کو دیکھا۔ اب وہ دونوں کپ میں جھک کر باری باری اشیاء دیکھ رہا تھا۔

"او، چائے بنا رہی ہو، گڈ۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ ساتھ کچھ میٹھا بھی دے دینا۔"

"یہ، یہ ہماری نہیں ہے۔ مجھے لگا آپ۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں میں ایک اور رکھ دیتی ہوں۔" اس نے خود کو ٹوکا اور جلدی جلدی ریک سے اٹھا کر تیسرے کپ میں دودھ ڈالنے لگی۔ غزار ادھر ہی کھڑا رہا۔

"میں نہا کر آتا ہوں، پھر کھانا کھاؤں گا۔ فون کوٹ کی جیب میں ہے، چارج پر لگا دو۔"

وہ جانے ہی لگا تھا، کہ وہ کہے بنا رہ نہ سکی۔ اس کے مخالف بیانات ظبیہ کو بھنبھوڑ رہے تھے۔

"ہم تو۔۔۔ ہم باہر کھانا کھانے والے تھے۔"

غزار نے چہرہ اس کی جانب موڑا تو اسے اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ پھر بھی کہتی گئی۔

"مطلب، ایسا نہیں ہے کیا۔۔۔؟" وہ اتنا ہی کہہ سکی، پھر ٹھوڑی جھکا کر جلدی جلدی ابلتے پانی کی آنچ آہستہ کی۔

"تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟ اس خراب موسم میں تمھیں بٹھا کر کدھر اڑتا پھروں میں؟" وہ چڑ کر بولا، چہرے کے تاثرات بگڑ چکے تھے۔ ظبیہ نے دل میں اٹھتی چبھن دبائی۔

"مجھے بس لگا—"

"اور یہ تین کپ کس کی خاطر میں ہیں؟" وہ قریب بڑھا۔ ظبیہ کو اپنے رخسار ندامت سے کھولتے محسوس ہوئے۔

"وہ۔۔۔" اس کے پاس واقعی الفاظ کم تھے۔ غزار کان دھرے اس کے سامنے جھکا تھا۔

"وہ، اوپر اکائر کے مہمان۔"

"او، تو وہ میری بیوی سے خدمتیں کروا رہا ہے رئیس زادہ۔" اس نے ایک گھوری خاموش سیڑھیوں پر ڈالی۔ ظبیہ کی آنکھوں کے ڈلے پھیلے اور اس نے تردید میں سر ہلایا۔

"اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میں نے..."

"تو یہ تم ہو جسے خدمتِ خلق کا بھوت چڑھا ہے؟" وہ کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے پوچھنے لگا۔ ظبیہ اس کی آنکھوں سے فرار چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو کسی اونچی پہاڑی سے پھینک دینے جیسی بجلی اس کے تن بدن سے لپٹ گئی تھی۔

"یہ خدمتِ خلق ہے یا خدمتِ مالک ہے؟ مکان مالک۔" آگے بڑھ کر چولہا بند کیا۔ ظبیہ نے نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ "ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے لگا میں کچھ پینے کا دے دوں گی تو۔"

اس نے ظبیہ کے مٹھی بھر بال پچھلی طرف سے جکڑے، پھر دبے دبے غصّے میں غرایا۔ "تمھیں پتا ہے، بے وقوف لڑکی، کہ میرے گھر کا سودا اس امبانی کی اولاد کو پالنے کے لیے نہیں ڈلتا۔"

اس نے ہونٹ کاٹ کر اپنی سسکی روکی۔ ہاتھ اس کے آہنی قلاب کو توڑنے کے لیے سستی سے اس کی انگلیاں مسل رہے تھے۔

"تو تمھیں مدر ٹریسا بننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تنخواہ پتا ہے اس کی تمھیں؟ پر گھنٹہ بھی وہ 1500 رنگٹ کماتا ہے۔ اسے میرے اور تمھارے ٹکڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

ایک جھٹکے سے اس کے بال آزاد کیے، پھر ایک بے زار نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ بمشکل آنسو روک رہی تھی۔ اگر ابھی رو دی تو مسکارا بھی بڑی بری طرح بہنا تھا۔

"اتنا تیار کس خوشی میں ہوئی ہو تم؟" وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا تھا۔

"غزار۔" اس کی آواز درد سے کپکپائی۔ "آپ کو نہیں پسند تو میں مٹا دوں گی۔"

"ہوئی کس لیے ہو؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ جیسے چند لمحات قبل وہ نہیں، کوئی بہروپیا اس کا دم گھوٹ رہا تھا۔

"ہماری شادی کی سالگرہ تھی آج۔" وہ آنکھ کا کنارہ صاف کرتے مڑی۔ اب وہ گرم پانی کپ میں پڑی پتی کے اوپر بوند بوند ٹپکا رہی تھی، جو رنگ بدل کر گاڑھا بھورا ہو چکا تھا۔ پتی کے دانوں کی تیز مہک ان کے درمیان تیر گئی۔

غزار کی گہری سیاہ آنکھیں اسے دیکھتی رہیں۔ "تو تمھیں خوشی ہے ہماری شادی کی؟"

ظبیہ ٹھٹک کر رکی۔ بھوری آنکھیں سرخی میں ڈوب رہی تھیں اور نچلی پلکیں نم تھیں۔ کیتلی چولہے پر واپس رکھتے اسے امید کی کرن کسی کنارے سے پھوٹتی دکھائی دی۔

"رہنے دیں۔" اس نے بات ختم کرنی چاہی، مگر اگلے ہی لمحے غزار نے اس کی کہنی نرمی سے تھام کر اسے اپنی جانب موڑا۔

وہ پلکیں جھپکاتے اسے تکتی گئی جو اسے کاؤنٹر کے قریب لے کر کھڑا تھا۔ گہری آنکھوں میں ایک بے نام سا اشتیاق تھا۔

"تمھیں لگتا ہے ہماری شادی کامیاب ہے؟" اس نے مستحکم سی سرگوشی میں سوال کیا۔ انگلیاں اس کی کہنی سے ہوتی آستین کے کنارے تک جا پہنچی۔

"مجھے۔۔۔" اسے ساں س لینے میں دشواری ہوئی۔ نظریں بے اختیار نیچے کیں۔ "مجھے لگتا ہے ہم دونوں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دونوں خوش ہیں تو یہی معنیٰ رکھتا ہے۔"

اس کی انگلیوں نے مزید ڈھلوان پر سفر کیا اور پوریں ظبیہ کی ہتھیلی سی جا ٹکرائیں۔ اس کے ہاتھ کو اپنے دستِ قید میں لیتے اس نے ظبیہ کو تنکا برابر نزدیک کیا۔

"تم خوش ہو میرے ساتھ؟" اس نے سانس روکے سوال کیا، گھمبیر آواز بے ثباتی کے جذبے سے مالا مال تھی۔

بھوری آنکھیں بلا قصد عریض ہوئیں۔ اس کی جانچتی نظر میں امنگ اور اشتباہ مساوی مقدار میں تھے۔

"آپ اچھے ہیں، غزار۔"

"واپس جاؤ۔ میرا سوال کچھ اور تھا۔"

ظبیہ نے لپ گلوس والے ہونٹ دبائے، پھر ایک خوش امید نگاہ سے اسے دیکھا۔ "میں خوش ہوں۔ مجھے آپ سے اچھا کوئی کبھی نہیں ملنا تھا۔"

وہ تھوڑا سا مسکرایا اور دونوں ہاتھ اس کے گالوں پر رکھے۔ "تم مجھ سے محبت کرتی ہو، بیہ؟"

یکایک جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ وہ نظریں اٹھائے اپنے سامنے کھڑے وجود کو تکنے لگی، زبان ایسی تھی کہ ایک لفظ بھی باہر نکالنا محال تھا۔

"Because I love you. I love you a lot."

غزار نے شکست زدہ اعلان کے ساتھ اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکائی۔ "کاش، تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرو۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"میں کرتی ہوں۔ میں بھی۔۔۔" رخسار سرخ ابھرے تو اس نے بے کلی سے پہلو بدلا۔ غزار نے اسے فاصلہ برتنے کی اجازت دیتے گرفت آہستہ کی۔

اب وہ کانپتی انگلیوں سے پتی اور دودھ کے امتزاج کو خاصا اونچائی سے ایک کپ سے دوسرے میں انڈیل رہی تھی، کئی بار۔ یہ تے تاریک میں جھاگ بنانے کا طریقہ تھا۔

"کیا میں تمھاری پہلی محبت ہوں، ظبیہ؟" وہ اس کے شانوں کے اوپر جھکا۔ آئندہ آنے والے لمحات میں ایک برتن سے دوسرے میں بہتے دودھ کی چھپ چھپ تھ۔م چکی تھی۔ ظبیہ نے بااضطراب آنکھیں اس کی جانب موڑیں۔

غزار کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "اوہ، رائٹ۔ آف کورس۔ کیسے بھول سکتا ہوں؟ میری بیوی کا سیاہ ماضی محلے کے کسی سڑک چھاپ پائلٹ کے ساتھ۔" اب کہ لہجہ نیم کی کڑواہٹ سے سرپوش تھا۔

ظبیہ نے ٹھوڑی مزید نیچے تک جھکالی، ہاتھ تیزی سے دودھ اور پتی الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

"ویسے مجھے تم پر یقین نہیں آتا، ظبیہ۔ دکھنے میں اتنی سیدھی سادی ہو اور پورا مرد باورا بنا رکھا تھا۔" وہ طنزیہ انداز میں کہے جا رہا تھا۔ "اپنے باپ کا ہی خیال کر لیتی۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

بیتے ہوئے جرم اور گناہ کا احساس اسے ایک بار پھر ڈس رہا تھا۔ وہ ایک ایسا شجرہ قلہ تھا جو ہر بار فتح و فیروزی سے اس کے دل کو اپنے قابو میں جکڑ لیتا۔ اس نے کتنی ہی توبہ کر لی تھی، لیکن بشر نہیں بھولتا تھا۔

"آپ آئس ٹرے دیں گے مجھے؟" اس نے لرزتی آواز میں گزارش کی۔ غزار سر ہلاتا فرج سے ٹرے نکالنے لگا جس میں برف کے ٹکڑے گولائی میں جمے رکھے تھے۔

اس کے سامنے ٹرے رکھتے وہ برابر میں ہی ٹک گیا۔ "تمھیں یاد آتا ہو گا وہ۔" وہ بازو لپیٹے پوچھ رہا تھا۔

"مر جائے وہ میری بلا سے۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔ وہ چپ کیوں نہیں ہو رہا تھا؟ ٹرے سے ٹھوک ٹھوک کر وہ آئس کیوبز نکالنے لگی۔

استہزاء سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی، پھر اس کی ٹون سنجیدہ ہوئی۔ "اگر چار سال پہلے وہ ہوتا تو چار سال بعد میں نہ ہوتا۔ تمھارے لیے تو اول وہی تھا، ظبیہ۔"

ظبیہ نے آئس کیوبز بلینڈر میں ڈالتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہاں موجود تاثر اسے اندر تک دہلا گیا۔ غزار کی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور جبڑا تنگ تھا۔

"تم نے بہت دکھ دیا ہے مجھے۔" وہ خاموش آواز میں بولا۔ "تم نے مجھے ہمیشہ اس کی replacement (بدل) سمجھا ہے۔"

ظبیہ کے دل کو ٹھوکر لگی۔ "نہیں، غزار۔ وہ کہیں نہیں ہے۔" وہ اچانک اس کی ہتھیلی چھونے بڑھی تو اس نے ہاتھ دور کر لیا۔ "میرے شوہر آپ ہیں۔" ننھے موتی کی صورت آنسو اس کے گال سے بہنے لگے۔ "وہ غلطی تھی، ناسمجھی تھی۔ وہ کسی لائق نہیں ہے میرے۔ میں نے ہمیشہ اپنا سب کچھ آپ کو مانا ہے۔"

"تم سچ میں مجھ سے محبت کرتی، تو ایسی نہ ہوتی، ظبیہ۔" وہ بمشکل اپنے طیش کو لگام دیتے بولا۔ "تم آج تک غم میں ڈوبی ہو۔ نفرت ہوتی ہے مجھے تمھاری شکل سے جب مجھے یاد آتا ہے کہ مجھ سے پہلے کوئی اور مرد تمھیں اتنا پاس سے دیکھ چکا ہے۔ تم نے اپنے اور میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کے آنسو زار زار ٹوٹتے گئے۔ "میں نے معافی مانگی تو ہے آپ سے۔ اللہ سے۔"

"کس کس چیز کی معافی مانگو گی؟ تم جیسی عورت پر آدمی دوبار اعتبار نہیں کر سکتا۔ اداکارہ ہو تم ایک نمبر کی۔ ابھی بھی پلو میں کوئی عاشق چھپا رہی ہو گی، کسے پتا ہے؟"

وہ بے یقینی سے بازگشت ہوئی، تنہا آنسو اس کے گال پر دراڑیں ڈالتا اس کی ٹھوڑی سے زیر ہوا۔

"آپ۔۔۔" اس کے لب ہلے مگر کوئی آواز باہر نہیں آئی۔

"جاؤ یار۔" وہ اسے کہنی سے پکڑ کر پرے دھکیل گیا۔

"آپ کیسے یقین کریں گے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں؟" اس بار اس کی آواز مقابلتاً اونچی تھی۔ کرب اور آزردگی اسے کے لب و لہجے میں اچھی طرح مدفن تھے۔ مسکارا اس کی آنکھوں کے گرد حلقے نکھار گیا تھا۔

وہ جو کچن کی چوکھٹ تقریباً پھلانگ چکا تھا جاتے جاتے تھم گیا۔ مڑ کر ظبیہ کو گھورا جو حواس باختہ سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی، اور دھیمے سے چل کر اس تک آیا۔

اگلا ایک ایک لفظ چبا چبا کر اس کے منہ پر اگلا۔ "اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتی تو تمھیں کبھی یہ سوال نہ پوچھنا پڑتا۔ تمھارا مسئلہ ہی یہی ہے۔ You try so hard, it's ugly."

(تم اتنی کوششیں کرتی ہو کہ سب بدصورت لگتا ہے۔)

بیڈروم کے پیچھے گم ہوتے غزار نے دروازہ دھڑام سے بند کیا۔ وہ بے حرکت ادھر ہی کھڑی رہی۔ بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ اب بھی رینگ رہی تھی۔

خود کو مجبور کرتے وہ گھومی اور برف بلینڈ کی۔ پھر چائے دو کپ میں نکالی اور اس کے اوپر آئس کا چھڑکاؤ کیا۔ نمکین آنسو روکتے اس نے ٹوتھ پک کی مدد سے دوں وں کپ میں چائے کے گاڑھے مادے کے اوپر، انفینٹی (infinity) کا نشان کھینچا۔ یہ ہمیشہ سے اس کا ٹریڈ مارک تھا۔ اس کے ہاتھ مسلسل لرز رہے تھے، آنسو بوند بوند ٹھوڑی سے ٹپک رہے تھے۔

جب وہ تیار ہو گئی تو اس نے انھیں ٹرے میں منتقل کیا اور ٹھنڈے ہاتھوں سے فون کی اسکرین کھول کر اکائر کو نیچے آنے کا پیغام ایس ایم ایس کیا۔

وہ سیڑھیاں ہی اتر رہا تھا کہ ظبیہ باتھ روم میں خود کو لاک کر چکی تھی۔ اتنی قابلِ ترس حالت میں اسے اپنا دیکھے جانا گوارہ نہیں تھا۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے اکائر کو اسے ڈھونڈتے دیکھا، پھر وہ نرمی سے مسکرا کر ٹرے اپنے ساتھ لے گیا۔

ظبیہ غسل خانے کے ٹھنڈے فرش پر اگلے ڈیڑھ گھنٹے روتی گئی۔

★★★

جگہ: کاکپٹ

AM 01:28

"I know your secret".

میں تمھارا راز جانتا ہوں۔

ایک گہری، دلچسپ مسکراہٹ کے ساتھ اسامہ نے نظریں موڑتے اپنے مقابل بیٹھے پائلٹ کو دیکھا۔

سیت بتیوں میں روشن اس کا پر وقار چہرہ کچھ سوچ رہا تھا، اور اس کے وچار اتنے فرحت انگیز تھے کے ہونٹوں پر مسکان چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔

رانج کی رگوں میں بجلی رواں ہوئی، خون اس تیزی سے سر چڑھا کہ اسے اپنی سانس رُکتی محسوس ہوئی۔

ہیزل آنکھیں خاموش ٹرانسپونڈر تک پہنچیں۔

اسے پتا تھا کہ اسامہ کیا، کوئی بھی یہ تبدیلی ذرا دیر کے بعد بھانپ لے گا، اسی لیے اس کا منصوبہ حرکت آور تھا، لیکن اتنے کم وقت میں اسامہ کا یہ جاننا رانج کے لیے خطرہ تھا۔ خطرے سے بڑھ کر، یہ اس کے لیے اجاڑ تھا۔

کھلتی دشواری کے ساتھ خود کو مرکب رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے، کیپٹن نے اپنے کو پائلٹ کو نظر بھر کے دیکھا۔ "کون سا راز؟" آواز پر سکون مگر سنجیدہ تھی۔

رانج آدم کے تو الفاظ ہی دستی بم تھے اور نگاہیں شعلہ شعلہ۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسامہ مسکرا دیا۔ اس کی سفید سیاہ بالوں نے روشنی کے کھیل میں چمک پکڑی۔ اب وہ فلائٹ پلین اٹھائے اسے ایک اور بار پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی خاموشی سے اسے تنگ کر رہا تھا۔ رانج اسے گھور تا رہا، دل ادھم پدھل تھا۔

"فرسٹ آفیسر۔" اس نے زور دیا، جبڑا سختی سے بند تھا۔ "کون سا راز؟"

شاید اس کی بے بسی سدا کی مضحک معلوم ہوئی تھی اسامہ کو کیونکہ وہ ہنس پڑا تھا۔ سر یہاں سے وہاں ہلاتے وہ اسے دیکھنے لگا پھر ایک اور قہقہہ لگایا۔

"کیا حال بنالیا ہے اپنا، ہمم؟ اتنا ڈر لگ رہا ہے کہ میں تمھاری وائف ٹوبی کو جان گیا ہوں؟"

رانج کے اندرون میں بجتا ٹک ٹک بم دھیما پڑا، لیکن چہرے پر سوال ظاہر ہوا۔ مسکراتے چہرے کو دیکھتے اس نے ایک ابرو اونچی کی۔ "میری وائف؟"

اسامہ نظریں موڑتے مسکراتا رہا۔ "ٹوبی۔ اتنی جلدی ہے وائف بنانے کی؟"

شکر خدا کا، اب اس کا دل بند نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کی ساتھی کی باتیں اس کا دماغ ضرور چاٹ رہی تھیں۔ اس نے جھنجھلاہٹ سمیت چہرہ موڑا اور رڈر پیڈل پر پیر دباتے خود کو صبر رکھنے پر مجبور کیا۔ "کس کی بات کر رہے ہو؟"

اس کے دماغ میں اس وقت سو گھنٹیاں، ہزار نقشے اور لاکھ سوالات گونج رہے تھے جن کے جواب بھی اس نے خود بنانے یا بگاڑنے تھے۔ اس درہم برہم کے درمیان اسامہ کی بے تکی پہیلیاں اس کا خون چوس رہی تھیں۔

کاش، فرسٹ آفیسر کا بھی کوئی ٹرانسپونڈر ہوتا جو وہ ایک کلک کے ساتھ بند کر سکتا۔

"بلیک عبایہ، برائون آئیز، ابائوٹ فائیو فور، آئی تھنک؟"

بس، اس کا دل ایک بار پھر پتھر ہو گیا تھا، لیکن کانوں کی لو ایسے دہک رہی تھیں جیسے گرم سیسا انڈیلا ہو۔ رائج نے اسے دیکھا، الفاظ تمام تھے۔

اسامہ مسکرا دیا۔ "صحیح پہنچا ہوں، ناں؟ گڈ چوائس۔ پیاری ہے۔"

"کیسے۔۔۔" اس کی انگلیاں کنٹرول یوک کے گرد طواف کرنے لگیں۔ یہ جاننا ضروری نہیں تھا کہ کیسے اور کیوں۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ اسامہ اس کے اصل منصوبے سے کامل طور پر غافل تھا، لیکن اس بھوری آنکھوں والی کے معاملات میں رائج دماغ سے کم اور دل سے زیادہ فیصلے لیتا تھا۔

"بورڈنگ گیٹ پر جو ترکش ڈرامہ شوٹ کیا تھا تم نے، اس کے چرچے بریفنگ روم پہنچ گئے تھے۔ سب حیران تھے کہ کیپٹن رائج کو کسی مسافر سے مسلہ تھا۔ And what better romance then two people in love fighting؟ ابھی پیچھے کیبن میں اسے بغور دیکھا۔ وہی تھی وہ۔ اسے ہی سوچ سوچ کر دانت نکال رہے تھے ناں تم چالباز آدمی؟"

اس نے ایک سانس بھرتے ابرو سکیڑیں۔ "تم سب ریٹارڈ ہو۔ رومانس ناولز کم پڑھو تو یہ حال نہ ہو تمھارا۔"

فرسٹ آفیسر نے ناراض سی آنکھیں گھمائیں۔ "کیا کروں، تمھاری طرح ڈائٹ اسمودی بنانے کے ٹوٹکے دیکھوں رسالوں میں؟"

کیپٹن نے ہار مان لی۔ فضول بکواس میں اسامہ کا کوئی مخالف نہیں تھا۔

اسامہ تھوڑا سا مسکرا دیا، اس بار اس کی آنکھوں میں نرمی تھی۔ "انشاءاللہ سب اچھا ہو گا۔ لیکن ایک مشورہ دینا چاہوں گا۔ پلین اور پلین اڑانے میں تم میرے باپ ہو، لیکن دل اور دل کے معاملات میں ذرا کچے ہو۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج نے نظریں باہر کی طرف پھیر لیں۔ MH370 اب ویتنام کی فضاء میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن کسی کو یہ خبر نہیں تھی۔ دنیا والوں کے لیے پچھلے چند منٹ قبل ہی وہ ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

"تم نے آج اس سے جیسے بھی بات کی، جس بھی وجہ سے کی، آئیندہ کوشش کرنا ایسا نہ ہو۔ عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے، رانج۔ وہ تمھارے سامنے شاید یہ بات کبھی نہ مانے، خود کو کبھی مجبور یا بے بس ظاہر نہ کرے، کیونکہ اس معاشرے نے اسے ایسا سکھایا ہے۔ مدد مانگنے پر انکار کا ڈر سماج نے عورتوں میں پرویا ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ لینا کہ اگر وہ تمھارے ساتھ کسی رشتے میں بندھی ہے تو اسے تم سے ہر وہ چیز درکار ہے جو اس کا حق ہے۔ اور عورت کے حق پر کبھی سمجھوتا مت کرنا۔ کبھی بھی نہیں۔"

سامع نے متکلم سے نگاہیں ملائیں۔ ہیزل آنکھیں پوری طرح سے اس کے حصار میں تھیں۔ ہلکی بڑھی شیوہ والا پائلٹ بغیر کچھ کہے، ہوا میں ملغوب باتوں کے وزن کو محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس نے پلکیں جھپکیں، اور وہ سوال کیا جس کا جواب ڈھونڈنا اس نے بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔

"اور اگر۔۔۔" رانج اپنی آواز نہیں پہچان سکتا تھا۔ یہ وہ نہیں تھا۔ یہ وہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نچلے حصے میں پانی کی تہ چمک رہی تھی۔ اسامہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دوست کے دل میں سوال تھا، اس کے دوست کا دل سوالات کے بوجھ سے بھاری تھا۔

"اور اگر آپ نے اس سے چھین لیا ہو اس کا حق؟ اسے دکھ دیا ہو، تکلیف پہنچائی ہو۔" اس کی آنکھ سے اداسی کا تنہا آنسو گر کر نابود ہوا۔ "اگر آپ نے اسے رد کر دیا ہو، اسے خالی ہاتھ لوٹایا ہو۔۔۔ تب کیا کریں؟"

اسامہ خاموش سا اس کا سوال سنتا گیا پھر خشک ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستگی سے اس کا کندھا پکڑا۔

"کیا تکلیف جانتے بوجھتے دی تھی؟"

رائج نے سر جھکا لیا، ہاتھ کی پشت سے گال پر سے آنسو کے نشانات صاف کیے۔ "کیا فرق۔۔۔"

"فرق پڑتا ہے، رائج۔ سارا فرق ہی اس سے پڑتا ہے۔ بتاؤ۔" اسامہ سنجیدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ کاٹا، پیچھے جلد سرخ ہو گئی۔

"جان کر نہیں کیا تھا۔" اس نے سوچ سوچ کر الفاظ ادا کیے، پھر آنکھیں نیچے کیں۔ "لیکن میں انجان بھی نہیں تھا۔"

"کیا وہ جانتی تھی تم یہ سب کیوں کر رہے تھے؟ کیوں تم نے اسے رد کیا تھا؟"

ایک ہاتھ کی کپکپاتی انگلیاں اس نے مٹھی میں بند کیں۔ "وہ، وہ جانتی تھی۔ وہ شاید سنتی بھی، مجھے سمجھتی بھی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ہم دونوں اپنے غموں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں اسے جواب نہیں دے سکا، اور وہ مجھے وقت۔"

اسامہ نے اس کا بازو چھوا اور اس کی جھکی پلکیں دیکھتے مشورہ دینا چاہا۔ "تم اب اس سے بات نہیں کر سکتے کیا؟ اسے بتا دو کہ تم نے جو کچھ بھی کہا اور کیا تھا وہ مجبوری میں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھی تم سے بات کرنا چاہتی ہو۔ ہو سکتا ہے تم دونوں کو ہی دوسرا موقع مل جائے۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رائج مسکرایا اور اپنا بازو آہستہ سے دور کیا۔ پھر اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھتے اس سے آنکھیں ملائیں۔ "میں نے جو بھی کیا تھا وہ میں نے کیا تھا، اسامہ۔ اپنی غلطی اور خطا کو کسی مجبوری کی آڑ میں نہیں رکھوں گا۔ گناہگار میں تھا، وہ تھی، ہم دونوں تھے۔"

"ہر بار انسان گناہگار نہیں ہوتے، رائج۔ کبھی کبھی حالات سب سے کثیر خناس خود ہوتے ہیں۔ ہم سے وہ فیصلے کروا لیتے ہیں جن کا جواز ہم خود کبھی نہ دیں۔" اس نے رک کر سانس لی۔

"Second chances exist".

دوسرے مواقع وجود رکھتے ہیں۔

ہیزل آنکھوں والا مسکرا دیا، جیسے کہ اس بات نے اسے دل تک محظوظ کیا ہو۔ پھر برابر رکھی لوہے کی بوتل اٹھائی اور ڈھکن کھولا۔

".Not for me"

میرے لیے نہیں۔

وہ جوس کی بوتل اوندھا کرتے لبوں تک لے کر گیا تھا لیکن گھونٹ لینے کی صرف اداکاری کری۔ آم کا مزہ اس کے لبوں سے ٹکرایا تو اس نے انھیں سختی سے بند کر لیا تاکہ وہ ملاوٹ والا مادہ اس کے اندر نہ اترے۔ ہونٹوں پر لگی بقیہ نمی اس نے انگوٹھے کی پشت سے صاف کی اور پھر بوتل کو پائلٹ کی جانب بڑھائی۔

"پی لو۔ بہت گیان دیتے ہو۔"

اسامہ اداس سا مسکرا دیا اور بوتل تھامی۔ ابھی وہ گھونٹ لینے ہی والا تھا، رابح کی بے رنگ ہوتی انگلیاں اپنی کرسی کے ہتھے میں دھنس ہی رہی تھیں، کہ اس نے بوتل لبوں کے قریب لے جا کر روکی۔

رابح کو لگا اس کا منصوبہ تباہ ہو گیا ہے۔ وہ لب ادھ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ اسامہ نے گردن اس کی جانب کی۔

"میری دعا ہے کہ تم اپنے آپ کو دوسرا موقع دو گے، رابح۔ میں تمھیں قابل نہیں، پرُسکون دیکھنا چاہتا ہوں۔" پھر مسکرا دیا، ایک آخری بار، اور اپنے ہونٹ بوتل کے منہ کے ساتھ جوڑ دیے۔

رابح نے اس کے گلے کی گلٹی ہر گھونٹ کے ساتھ حرکت کرتی دیکھی۔ پانی میں گھلی مسکن دوا قطرہ قطرہ اسامہ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ فینوبار بٹل، ایک دوائی جو اعصابی بیماریوں کے علاج میں استعمال ہوتی ہے، جسے اضافی اور ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر لینے سے ممکن بے ہوشی، حتیٰ کہ موت بھی ہو سکتی ہے، اب وہ اسامہ کے اندر تھی، اور اس کا خدمت گار اور کوئی نہیں بلکہ برابر کرسی پر بیٹھا سونے کی سی چمکتی ہیزل آنکھوں والا اس کا ساتھی تھا۔

بوتل دور کرتے اس نے رائج کی طرف بڑھائی، جس نے دیوانہ وار دھڑکتے دل کے ساتھ تھام لی۔ لوہا اس کی پسینہ میں تر ہوئی انگلیوں کے برعکس ٹھنڈا تھا۔ اس کے لب بے روک پھیلتے گئے، آنکھیں براس اور دہشت میں فراخ تھیں۔ اس نے اپنے حصے کا کام کر لیا تھا، اب دوا کو اپنا کھیل دکھانا تھا۔

کب ہوا، کیوں ہوا، اسے پتا نہیں چلا لیکن رائج آدم کی آنکھ سے دو آنسو ٹوٹ گرے اور اس کی سوتی کپڑے کی سلی نیلی پینٹ میں جذب ہو گئے۔ اس نے لرزتی انگلیاں اسامہ کے ہاتھ کے اوپر ٹھہرائیں، پلکیں اب بھی بھیگ رہی تھیں۔

اس نے کیا کر دیا تھا؟ وہ کیا کرتا جا رہا تھا؟

"اسامہ، تم ٹھیک ہو؟" اس کی آواز نم تھی، دل اپنے گناہوں کے وزن سے چھلنی چھلنی۔ کوپائلٹ اپنی کرسی سے ٹیک لگائے بے آواز سا بیٹھا تھا۔ اس کا منظر دھندلا رہا تھا، دماغ ویران ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خالی پیٹ تھا، اسی لیے دوا اس کے خون میں گھل کر اور پھرتی سے اثر دکھا رہی تھی۔ پھیپڑے بھاری ہو رہے تھے اور سانس لینا امر دشوار۔ اس نے بند ہوتی آنکھیں کیپٹن کی طرف پھیریں۔

رائج کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے اسامہ کا ہاتھ اٹھا کر ہتھیلی سہلانا شروع کی، جیسے واقعی مدد کرنا چاہتا ہو۔ جیسے وہ سب واقعی ایک حادثہ ہو، جیسے وہ واقعی قاتل نہ ہو۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔" آنسو تھے کہ رک ہی نہیں رہے تھے۔ اس نے اپنے سے درجے میں چھوٹے، عمر میں بڑے، عقل میں اور بھی زیادہ چھوٹے لیکن انسانیت اور اچھائی میں سب سے کثیر دوست کے بند انگشت پر بوسہ دیا۔ ہونٹوں پر چمکتے موتی جیسے اشک اس کا دامن بھگو رہے تھے۔

سفید بال والا پائلٹ اپنی ایک ایک سانس کے لیے خود سے غزوہ جیت رہا تھا۔ اس نے ہونٹ کھولے لیکن آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر دھند چھا گئی۔ دھند میں بستا سامنے براجمان اس کا قاتل بھی ناقابل دید سا ہو گیا۔ اسامہ اسے نہیں جانتا تھا۔

وہ رائج آدم کو کبھی جان ہی نہیں پایا تھا۔ قابل پائلٹ، ایئرلائنز کی شان، طیارہ سازی کا دیوتا۔ اور تھا ہی کیا اس کے بارے میں؟ اور تھا ہی کون رائج آدم؟

کو پائلٹ سوال کرنے کی حس کھو چکا تھا۔ اپنی حتمی نازک سے نازک تر ہوتی سانسوں کے پل باندھتے، وہ صرف سن سکتا تھا۔ لیکن اس کا قاتل بے آواز تھا، اور پینتیس ہزار فٹ کی بلندی، دو انجان ممالک کے درمیان تحلیل، اپنے قاتل کے ہاتھ میں ہاتھ دیے، فرسٹ آفیسر اسامہ عامر کو یہ احساس ہوا تھا کہ رائج آدم کی بے زبانی نوزائیدہ نہیں تھی۔ وہ تو ضعیف تھی، لاانت۔

اس نے بے ضابط ہوتی پھولی سانسوں سے مہلت مانگنی چاہی، آنکھیں بند کرتے سوچنا چاہا کہ آخر کب تھی اس کی پیدائیش۔ کب رائج آدم اپنی زبان کاٹ کھایا تھا؟ کب وہ یہ بنا تھا جو وہ تھا؟

کب؟ کب؟ کب؟

یک دم اسامہ کا دل بھاگا، اتنا تیز کے اسے لگا کہ وہ سینے کی حدود توڑ نکلے گا۔ اس کی سانسیں الٹی چلنے لگیں، تیز، تیز، تیز۔ اور پھر آہستہ، اور ہلکی، اور نازک۔ دوا اس کے اعصاب پر سوار تھی، اس کی دماغ کی چابی اب وہ خود بند کر رہی تھی۔

رائج اسے دیکھتا رہا، گویا کہ وہ اس منظر سے جدا ہو۔ اس نے اپنے دوست کی پلکیں جھپکتی دیکھیں، اس کی انگلیاں اطراف میں پھسلتی دیکھیں، اس کی آنکھوں کی سفیدی عریض ہوتی دیکھی، اور پھر۔۔۔ انت۔

دوسرے مواقع ہر کسی کو نہیں ملتے، اور یہ حقیقت کالے دستانے، نیلا یونیفارم اور کندھے پر سہنری پٹیوں والا بیج لیا پائلٹ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا؟

"Selamat tinggal, Usama".

الوداع، اسامہ۔

ہاتھ آگے بڑھاتے اس نے اپنے مقتول کی آنکھیں خود بند کیں۔ پھر پلین کو آٹو پائلٹ پر کرتے وہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوا۔ اپنے خدشات مٹانے کے لیے اسامہ کی شہہ رگ کو انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا، لیکن وہ خاموش تھی۔ آج سب خاموش تھے۔

ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور قدم قدم چل کر کاکپٹ کے دروازے تک آیا۔ چٹخنی کو آہستگی سے ہٹاتے اس نے تنکا برابر جگہ میں سے باہر جھانکا۔ فلائٹ اٹینڈینٹس یہاں سے وہاں گھوم رہی تھیں، مسافرین کی اکثریت خوابیدہ تھی اور راہداریوں کے درمیان سکوت دائم۔ اس نے واپس اسی خاموشی کے ساتھ دروازہ بند کیا اور پھر مشاق انگلیوں سے اسے لاک کر دیا۔

پیچھے ہٹتے اس نے اپنی پشت دروازے سے ٹکائی۔ ایک بار پھر بے یقینی کی لہر اس کے تن بدن کو سن کر گئی، لیکن فرار کے سارے راستے بند تھے۔ اس نے خود ہی تو سارے قفل جوڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے آنکھیں موندیں، اور پھر اپنے منصوبے کے اگلے مرتبے کی تصویر کھینچی۔

کہانی کا چوتھا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

★★★

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

مرحلہ نمبر ۰۴

انقطاع

(خلل)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

جگہ: پیسنجر کیبن۔

AM01:43

ستم از حد تھا۔

اوریو کے تینوں ڈبے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے، اور اکائر کے آنسو اس کا اندرون جلا رہے تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک ہر پیکٹ اٹھا کر رپلاسٹک کے اوپر سے محسوس کرتا کہ کوئی تو مجاحد ہو گا جو ائیر پورٹ والوں کی ظالمانہ چیکنگ سے ثابت بچ آیا ہو، لیکن نہ۔ صرف چورا بچا تھا۔ وہ کہاں جا کے روئے؟

بیرا غرق ہو تیرا رائج آدم۔

"وحشیوں کی طرح چیکنگ کی ہے تمھارے منگیتر نے!" وہ غصہ پیتے سرگوشی میں غرایا۔ ظبیہ جو اسی فیصد غنودگی کے حصار میں تھی پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔ سیٹ کے پشت سے لگا سر اکائر کی جانب موڑا اور اس کی ناراض شکل دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

"تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟ میرے لیے تو ایکسٹرا سرچ ٹیمیں بلوائیں تھیں اس نے۔" ساتھ ہی اپنے بازئوں کے گرد لپٹی شال اوپر کو کھینچی اور آدھی شکل اس کے پیچھے چھپالی۔ آخر کار اب اس کے دماغ کو نیند کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ البتہ حلق سے اس نے پچھلے چھبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں اتارا تھا۔

کالی جیکٹ والا مرد طنزیہ سا مسکرا دیا اور ایک پیکٹ چھوڑ کر باقی ڈبے واپس بیگ میں بھرنے لگا۔ اوریو اس کا اموشنل سپورٹ میل تھا۔ -"کیا دکھا تھا تمھیں اس میں؟ خروس نہ ہو تو۔" کاغذ پھٹا تو پلاسٹک کے سرسرانے کی آواز آئی۔

ظبیہ نے آنکھیں موندے رکھیں، ہلکے سرخ ہونٹ سیدھی لکیر میں تھے، لیکن اس کے نقوش اب آسودگی کی تصویر تھے۔ "پہلے اچھا ہوا کرتا تھا۔" اس نے مدھم سرگوشی میں کہا تو وہ اوریو ہونٹوں کے درمیان دبائے ہنس دیا۔

"اچھا؟ پیدائش سے پہلے؟"

ظبیہ بھی مسکرا دی۔ نیند کا اثر تھا، ورنہ اگر خود کو اس پانچ فٹ نو انچ کے پائلٹ کی تعریف کرتے پکڑ لیتی تو اپنی زبان تالو سے آپ الگ کر دیتی۔

"سو رہی ہو؟" چند ثانیے اور چوراسمیت تین اور یو نگلنے کے بعد اکائر نے اس کا چہرہ دیکھتے احتیاط سے سوال کیا۔

"ہمم۔" جواب آیا۔ گہری قرمزی رنگ کی شال کے نیچے صرف اس کی آنکھیں دکھ سکتی تھیں جن کے اوپر گھنی پلکوں کا پہرا ڈلا تھا۔ ابرو کے درمیان ہلکی سی شکن تھی اور سر پر اوڑھا شفون اسکارف پچھلی طرف پھسل گیا تھا۔

سرمئی آنکھیں دل فریب مسکراہٹ میں چھوٹی ہوئیں۔ "سو جاؤ۔" پھر پیکٹ سے چوراہاتھ میں گرایا اور کالے دانے منہ میں پھانکے۔ عجیب ذلت تھی، اور یو بھی چھالیہ کی طرح کھانا پڑ رہا تھا۔

اس نے گود میں رکھے ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے اور اپنے ڈیل DELL لیپ ٹاپ کی اسکرین کھولی۔

ساتھ ہی مائکروسافٹ والے اپنا اشتہار بیچنے لگے۔ لیپ ٹاپ کھلنے کا انتظار اس نے ایک اور اور یو کھول کے کیا، جس میں ثابت بسکٹ کی مقدار ذرا زیادہ تھی۔ اکائر کو زندگی کے رنگ نظر آئے۔

ہوم پیج کھل گیا تو وال پیپر کی نیلی روشنی میں اس کی گلابی و سپید رنگت کھل اٹھی۔ پتلے ہونٹ عادتاً دانتوں کی غذا بن گئے۔ ڈاونلوڈز پر کلک کرتے ایک محتاط نگاہ اپنے برابر سوتی لڑکی پر ڈالی۔ اسکرین کی روشنی اس کا بھی چہرہ پر نور کر رہی تھی۔ کھڑی ناک، نیند میں قید بھوری آنکھیں اور پپوٹوں کے نیچے بستے حلقے۔

کچھ سوچ کر اس نے کرسر سیٹنگز پر لے جا کر لیپ ٹاپ کی چمک تھوڑی کم کرتے اس کا چہرہ جانچا۔ آہستہ آہستہ روشنی اس کے جانب خفیف ہوتی گئی تو وہ مطمئن ہو کر پیچھے ٹک گیا، ساتھ ہی مووی پر 'PLAY' کا بٹن دبایا۔

بنی لینڈ کی کہانی شروع ہو چکی تھی۔

اپنی مہین صورت اور سماجی تفریق کے باوجو پولیس آفیسر بننے کا خواب رکھتی پر خلوص خرگوش جولیا ہاپرس، اور اس کے بالکل برعکس سوچ رکھنے والا چالاک اور طانہ باز لومڑ، نیش وائلڈر۔ بنی لینڈ کی دنیا ان دونوں کے لیے ہی کٹھن تھی، لیکن انھیں ساتھ تھا تو ایک دوسرے کا۔

ایک ایسی دنیا کو کھوجنا جہاں جنم سے ہی آپ پر 'شکار' اور 'شکاری' کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ ایک ایسی جنگ جو سراسر آپ کی فطرت اور حقیقت پر انگلی اٹھاتی ہو، آپ کے خوابوں کو ایک دائرے کے اندر قید کر دیتی ہو۔ آسان نہیں ہے۔ لیکن یہی تو کُل بات تھی۔ کبھی جنگ کو جنگ کی طرح نہیں لڑا جاتا۔ لڑ بھی لیا جائے، تو فاتح کا نام کبھی نہیں سنا جاتا۔

جنگ کو سمجھا جاتا ہے۔ محسوس کیا جاتا ہے۔ دونوں اطراف کے احساسات و جذبات کو مد نظر رکھ کر اس کا حل نکالا جاتا ہے۔ جنگ نام نہیں ہے خون بہانے کا یا کسی بلندی پر چڑھ کر مصنوعی جیت کا جھنڈا لہرانے کا۔ جنگ نام ہے کوشش کا۔

اپنے سے مختلف کو سمجھنے کی کوشش۔

اسکرین پر جولیا کا خرگوش ابا کچھ بولا تو اکائر مسکرا دیا۔ اسے تو یہ فلم حفظ تھی۔ شاید، اسی لیے کیونکہ وہ بھی چند خاموش لمحات میں اپنا اصل ڈھونڈتا تھا۔ لیکن اس کی جنگ کبھی چیخ پکار یا کسی پر وار کر کے نہیں ہوتی تھی۔

شاید، وہ بزدل تھا یا شاید، بہت دلیر۔ لیکن فیصلہ کس کا تھا؟

دیکھنے والی آنکھ کا۔ سمجھنے والے دماغ کا۔ محسوس کرنے والے دل کا۔

MH370 اپنی منزل بھول چکا تھا۔ سیاہ آسمانوں میں پرواز ڈالے وہ کسی نقشے یا منصوبے نہیں، بلکہ اپنی تقدیر کے تابع تھا۔

اس نے ظبیہ کی جانب بنے شیشے کے پار دیکھا۔ اس اونچائی پر وقت اور حالات بے معنیٰ سے معلوم ہوتے تھے۔ اکائر اپنا اصل بھول رہا تھا، یا شاید وہ دھند چھوڑ کر پہلی بار اپنے وجود کے اتنا قریب آیا تھا۔ چاند ایسا تھا، تارے ویسے تھے۔ کچھ معنیٰ نہیں رکھتا تھا۔ اپنے مقابل نشست مسافرہ کو دیکھتے اس کا دماغ خالی تھا، وزن تھا تو صرف دل میں۔ وضاحتوں کا وزن، ان کہے ارادوں کا وزن۔

پیسنجر کیبن میں وقت ایک بار پھر تھم گیا تھا۔ راہداریوں کی چھت پر نصب نیم پیلی بتیوں سے خارج ہوتی روشنی دھواں بن رہی تھی۔ مسافرین کے مدہوش سائے مٹ رہے تھے۔ ۸ مارچ کی رات دو پہلے ماہ کے صبح میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور اسی طرح ہم پاتے ہیں خود کو بانگسار میں بنے اس بھورے دروازے والے بنگلے کے نچلے حصے میں۔

بانگسار کو کوالالمپور کا معاشرتی مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں کے بازارات، کافے اور کھانے پینے کی جگہوں کا مقابلہ تو شاید مکمل ملائیشیا میں کہیں نہ ہو۔ اس علاقے کی رہائش رکھنے والی اکثریت اپر مڈل کلاس اور اپر کلاس ہوتی ہے، جن کی زندگیاں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ شروع ہو کر بارہ بجتے اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

صبح کے پہر اگر اس محنت کش قصبے کی گلیوں میں بھٹکو تو ماحول آرام دہ اور سکونی پایا جاتا ہے، لیکن شہری حرکات کی بنا پر کبھی کبھار دوادش کا سلسلہ جڑ جاتا ہے۔

گلی میں اڈتے زیبائی اور آسودگی کی جمالیات رکھتے بنگلوز میں سے ایک کا رخ کریں تو وہ وہی بھورے دروازے والا گھر ہو گا، جہاں نرم پیلی لکڑی کی تختی پر تراشے گئے ALISDER ZAMORA کو انتہائی بچکانہ انداز میں کاٹ کر انگریزی میں اوپر نیچے ہوتے حروف کے ساتھ GHAZAR AHMED لکھا گیا تھا۔

گھر کے مالک کا مزاج تو نام کی تختی سے ہی واضح تھا۔ کوئی عقل سے فارغ شخص ہی اندر جانا چاہے گا۔ لیکن ان کا کیا جو پہلے ہی اندر تھے؟

یہ کہانی ان ہی کی تو ہے۔

جنوری کی شروعات تھی لیکن کوالالمپور میں گرمیوں میں ذرا برابر کمی نہیں آئی تھی۔ پورے سال ہی یہ شہر ہندر گاہی موسم کا لطف اٹھاتا تھا اور درجہ حرارت بغیر کسی بڑی تبدیلی کے ٹروپیکل رہتا تھا۔

یہ منظر ہے دو منزلہ بنگلو کے نچلے حصے کا جہاں صبح سویر کی روشنی میں لکڑی کے فرش والا وسیع و عریض لاؤنگ روم چمک رہا تھا۔ کمرے میں ہلکے سبز اور سفید رنگ کا صوفہ سیٹ بچھایا گیا تھا، جس کے بیچ سفید شیشے کی سینٹر ٹیبل لگی تھی۔ باون انچ کی سکرین والا ایل ای ڈی ڈیوائڈر کیبنٹ میں نصب تھا اور اس کے کالے شیشوں میں سامنے بنے باورچی کھانے کا عکس جھول رہا تھا۔ لاؤنگ روم کی دیواروں کے ساتھ سفید کنارے والی فراخ کیسمنٹ کھڑکیاں تھیں جنہیں عام دروازے کے طرح دھکیل کر کھولا جاتا ہے۔ گھر کے رہائشیوں کو ابھی تک انھیں کھولنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

باورچی خانے میں ماربل کے بنے کاؤنٹر پر رکھا ڈیل کا لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ ذرا پاس آؤ تو کروم پر تین ٹیبز کھلے تھے جن میں سے جامنی رنگ کا نشان تو ہاٹ میلز کا تھا، جہاں انباکس نئی ای میلز سے لبالب تھا۔ وہ الگ بات تھی کہ اس میں آدھی اسنیپ چیٹ والوں کی تھیں جو کسی aczorro_@ سے لوگ ان کی تصدیق مانگ رہے تھے، اور مانگ مانگ کے تھک ہار چکے تھے۔

دوسرا ٹیب یوٹیوب کا تھا جہاں پر کوئی وڈیو پہلے ہی پلے بیک میں چل رہی تھی۔ دھن ہلکی تھی، لیکن سارے کچن کو اپنے آغوش میں لیے ہوئی تھی۔ ویڈیو کا نام آدھا پڑھا جا سکتا تھا اور دکھنے میں وہ کوئی گانا معلوم ہوتا تھا۔

Moves like Jagger by Maroon 5.

سفید ڈراپ شولڈر شرٹ اور پنڈلیوں تک آتے خاکی ٹراؤزر میں ملبوس اکائرز مورامرون بھائی کی کہی گئی ہر بات جھوم جھوم کر سن رہا تھا۔ اس کی لمبی، شفاف انگلیاں بریڈ کی تھیلی میں سے دو ٹکڑے پلیٹ میں ڈال چکیں تو وہ اپنی ایڑیوں پر گھوما اور اس کے قد سے ذرا سے چھوٹے فرج تک پہنچا۔

دروازہ کھولتے جھکا تو سامنے رکھے، ٹھنڈ میں سکڑتے کریم چیز کے ڈبے نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ اس راکشس سائز فرج میں دو کریم چیز کے ڈبوں، اسٹرابیری جیم، ایک دودھ کی بوتل اور تین شملا مرچ کے علاوہ کھانے کی برادری سے تعلق رکھتی کسی چیز کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اکائر نے ایک لمحہ رک کر ٹھنڈی سانس بھری۔ کب آئیں گے اس کی زندگی میں وہ دن جب ایک سندر، سشیل بیوی اس کا فرج سجائے گی؟ پھر اپنے خیالات پر خود ہی بری طرح ہنس کر پلٹا۔

اس بات پر وہ پورے زمورا خاندان کے ساتھ بیٹھ کر پچاس منٹ ہنس سکتا تھا۔ اس کی شادی کا خیال تو کسی کو آتا ہی نہیں تھا۔ اب اس کا دل کیا وہ ہنستے ہنستے تھوڑا سا رو دے۔

کیا مطلب، کیا زیادتی تھی؟ ابھی تک تو ٹھیک تھا، لیکن اسے دو تین سال میں سنگل نہیں رہنا تھا۔ ہوتے ہوں گے قابل کامل لوگ جنہیں محبت کی ضرورت نہیں ہو گی اپنی زندگی میں، لیکن اکائر کو تھی۔ اور وہ اس بات پر خود سے ملامت نہیں کرتا تھا۔

"تم میری بات سن بھی رہے ہو؟" ہینڈ فری سے گزرتے اس کے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔ کال کی دوسری طرف بیٹھا اس کا دوست چڑ کر سوال کر رہا تھا۔

اکائر نے اپنی دکھی لولائف کے خیالات پرے دھکیلے اور فوکس اس کی بات پر کیا۔ "ہاں، سن لیا ہے۔ الفاء گروپ والوں کی ساری بیک اسٹوری ہی یہ ہے۔ عمر سعید بڑا چڑیل آدمی ہے۔"

ایک تو صبح صبح کام کی باتیں اسے بالکل پسند نہیں تھیں۔

وہ اپنی فرج کی ساری اشیاء سلیب پر جما کر چکا تھا، سوائے شملا مرچ کے۔ ایسا لگتا تھا پلے ڈو بنانے والا ہو، لیکن فی الحال تو منصوبہ صرف ناشتے کا تھا۔ موو س بائی جیگر اب اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اگ، پھر گانا بدلنا پڑے گا۔ کیا مصروف زندگی تھی۔

"تمھارے کتنے پیسے پھنسے ہیں اس کے پاس؟" دوسری طرف سے سوال اٹھایا۔ مردانہ آواز کے پیچھے ہوا کی دھیمی گرج تھی۔ اکائر کے برعکس اس کا کام صبح سویر ہی شروع ہو جاتا تھا شاید۔

اکائر شرمیلا سا مسکرایا۔ "بہت زیادہ ہیں، تم گالیاں بکو گے۔" کریم چیز کا ڈبہ کھول کر ڈھکن برابر رکھا اور مکھن والی چھری سے بہت ساری کریم باہر نکالی۔ بریڈ کا ٹکڑا ہاتھ میں اٹھائے اب وہ چھری بہت باریکی سے کناروں پر پھیر رہا تھا، چہرے پر اس قدر سنجیدگی تھی جیسے فائنل ایئر کے بچوں کے پرچاجات گریڈ کر رہا ہو۔

"وہ تو میں ویسے بھی بک دوں۔ اماؤنٹ بتاؤ۔ اسٹریٹجی اس حساب سے پلان ہو گی۔" دوسرے مرد کے پیچھے ہلکے شور کی گونج تھی۔

گانا ختم ہو چکا تھا اور اب یوٹیوب اپنی مرضی سے اگلا چلا رہا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"There I was again tonight

Forcing laughter, faking smiles "...

اکائر نے سر ہلایا۔ "اوف کورس، یوٹیوب!"

یوٹیوب نے ہر دل عزیز ٹیلر سوئفٹ کو چنا تھا۔ وہ کون ہوتا تھا کہ اسے ہٹاتا؟

"اکائر، تم مجھے اگنور کر رہے ہو۔"

"ویل، ایسا نہیں ہے کہ میں نے کورٹ میں اپیل نہیں کی۔ میں الفا گروپ اور عمر سعید کا نام ہر لیگل طریقے سے اچھال چکا ہوں۔ کمبخت میری ڈیڑھ سال کی تنخواہ روکے ہے۔ خدا کرے کبھی ہضم نہ ہو اسے

۔"بہت ساری بد دعائیں ساتھ دینے کے بعد، اپنے بریڈ کے ٹکڑے پر ڈھیر ساری کریم چیز پھیلائی اور پھر، کبھی نہ ہونے والا ماسٹر شیف اسٹر ابیری جیم کی شیشی کھولنے پلٹا۔ پیچھے ٹیلر سوئفٹ کے گانے 'Enchanted' کی دھن پل پل آواز میں تیز ہو رہی تھی۔

اس کا دوست خاموشی سے سنتا گیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔"آئی گیس ہمیں چیزیں اپنے طریقے سے ہی کرنی پڑیں گی۔ ایک بار اور مل کر دیکھو اس سے۔ میں چاہتا ہوں یہ معاملہ آسانی سے سلجھ جائے تمھارے لیے۔"

اکائر نے ایک حیران کن نگاہ ہینڈ فری سے جڑے مائیک پر ڈالی۔"کیا ڈیڑھ سال کافی نہیں ہے؟ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا ہے۔ یہ بندہ ایسے پیسے نہیں دے گا۔ اب تم میری ہیلپ کرو۔"

"ڈیڑھ سال تک تم اس سے پیسوں کی بھیک—"

"وہ میرے پیسے ہیں۔" اسے اچانک غصہ محسوس ہوا۔

"اوکے، سوری۔ تصیح، 'اپنے' پیسوں کی بھیک مانگتے رہے، اور اب جب میں کہہ رہا ہوں کہ ایک آخری بار بات کر لو تو تم نہیں کر سکتے؟"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر نے منہ بگاڑا۔ اسٹر ابیری جیم کی تگڑی مقدار اپنی ڈبل روٹی پر لیپ کر دونوں اشیاء دور کر دیں۔ آہا! اس کے عجیب و غریب ناشتے کا غریبانہ حصہ تیار ہو چکا تھا، اب عجیب کی باری تھی۔

"میں لائن پر ہوں۔" شور سے چلتے مرد نے یاد کروایا۔

اکائر نے ایک بے آواز سانس اندر لی۔ اب وہ سلیب سے ٹک کر دودھ کی بوتل کھول رہا تھا، کاؤنٹر کی جانب اس کی پشت تھی۔ اُف، یہ کون ہلک تھا اس کے گھر میں جو دودھ کی بوتلیں قارون کے خزانے کی طرح بند کرتا تھا۔

"میں اب بھی لائن پر ہوں۔"

اکائر نے جواب دینے کو لب کھولے لیکن، جھنجھلاہٹ میں الفاظ سمجھ نہ آئے۔ وہ واقعی عمر سعید کی شکل ایک اور بار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ آدمی اسے اپنے ہی پیسوں کے لیے ان گنت بار رلا چکا تھا، حالاں کہ وہ اس کے لیے کام کرنا بھی برسوں پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اسے اس کی جرات سے نفرت تھی، لیکن اکائر یہ بھی جانتا تھا اسے یہاں ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ لینا تھا۔

ٹیلر سوئفٹ کی آواز اب بھی کچن کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔

"And it was enchanting to meet you

All I can say is, I was enchanted to meet you".

ہلکی چاپ کب راہداری پار کر آئی اسے معلوم نہیں ہوا، لیکن اگلے لمحے اسے تلائی روشنی میں پر نور کچن میں صرف ایک نفس نہیں تھا۔ گہری نیلی شرٹ اور کالے ٹراؤزرز پہنی ظبیہ کے کمر تک آتے سیاہ، گھنگریالے بال آدھے بندھے تھے اور چہرے پر صبح سویر کی تازگی نمایاں تھی۔ ہلکی نمی بھی اس کی تیوریوں پر چمک رہی تھی اور بھوری آنکھیں اپنی گھنی پلکوں سمیت سحر انگیز لگ رہی تھیں۔ البتہ نازک انگلیوں سے اس نے دائیں آنکھ کے گرد ایک کپڑا پکڑ رکھا تھا، جو اندر رکھی برف کی وجہ سے گیلا ہو چکا تھا۔

وہ خاموشی سے کاؤنٹر تک آئی اور اپنے مالک مکان اور اس کے میوزک سسٹم کو نظر انداز کرتے، پانی کی ٹوٹی دبا کر گلاس بھرنے لگی۔

پانی گرنے کی آواز پر اکائر چونک کر پیچھے مڑا۔ ظبیہ اس کی طرف پیٹھ کیے، اکڑو بیٹھی ایک سانس میں سارا پانی اندر اتار رہی تھی۔ پھر وہ کھڑی ہوئی اور دوسرا گلاس بھرنے لگی۔ ان کے درمیان گانا اب بھی چل رہا تھا۔ اکائر کو خیال نہیں آیا کہ بند کر دے۔

وہ منہ پھیر کر بوتل دوبارہ کھولنے لگا۔ کھل جا، میری ماں!

گلاس اسٹینڈ میں واپس رکھ کر وہ سیدھی ہو گئی۔ اکائر کو لگا وہ چلی جائے گی، لیکن اس نے ادھر ہی کچن کے دوسرے حصے میں قدم جما لیے۔ دلفریب بھوری آنکھیں اپنے سے دور کسی نقطے کو تک رہی تھیں جیسے ایک نئے جہاں کی تصویر ذہن نشین کر رہی ہوں۔

سفید ٹی شرٹ والے مرد کو اچانک عجیب لگا۔ "میرا ٹائم ہے۔" اس نے یاد کروانا چاہا۔

کیونکہ گھر میں ایک ہی کچن دیا گیا تھا تو سیٹ شیڈیول کے مطابق دونوں فیملیز اپنے کھانے پینے کا انتظام کر لیتے تھے۔ ظبیہ اور اس کا شوہر، غزار۔ اکائر اور اس کی تنہائی، اسی سے بیزار۔ ظبیہ اپنے شوہر کے ساتھ فجر کے تھوڑا بعد ہی ناشتہ پانی کر لیتی تھی، کیونکہ اسے کام پر جانا ہوتا تھا۔ اکائر ذرا دیر سے اٹھ کر اپنا خرچہ دیکھ لیا کرتا تھا، کیونکہ اس کی نوکری دس بجے سے تھی۔

"جانتی ہوں۔ گھر میں دوسرا باورچی خانہ بنوا دو، تو نہیں آؤں گی۔"

سرمئی آنکھیں واضح طور پر پھیلیں۔ اسے کیا ہوا تھا؟

بوتل کا ڈھکن ڈھیلا پڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا تو اس نے بغیر آواز کیے دودھ گلاس میں گرایا۔

"کرایہ وقت پر دو، یہ فرمائش بھی پوری کر دیں گے۔" مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر اس نے ماحول ٹھنڈا رکھنا چاہا۔

کچھ زور سے پٹخا گیا تھا۔ اکائر ہڑبڑا کر پیچھے مڑا تو وہ اسے گھور رہی تھی۔

"مزہ آتا ہے ناں تمھیں؟" وہ یک دم چلائی۔ ٹیلر سوئفٹ کی آواز ان کے درمیان گنگنا رہی تھی۔ ہلکی۔ نرم۔ ڈھیروں التجاء سمائے۔

"Please, don't be in love with someone else

Please don't have somebody waiting on you"...

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"کیا ہوا ہے؟" اسے سمجھ نہیں آیا اس کا طیش تھا کس پر۔ اس بار سرمئی آنکھوں والے مرد کے الفاظ پر فکر تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے سوال دہرایا اور پھر کڑواہٹ بھرے انداز میں ہنس دی۔ "تم بتاؤ کیا ہوا ہے! انجوائے کرتے ہو ناں تم یہ ڈیلی سوپ۔ مزہ آتا ہے ناں بہت!"

تھا تو وہ مرد طبقے کا اور بحثیت ایک آدمی، وہ پہیلیاں اس کے سر کے اوپر سے اڑ رہی تھیں۔

اس نے دودھ کی بوتل سلیب پر رکھتے مڑ کر اسے بغور دیکھا۔

"کچھ کیا ہے کیا میں نے؟"

وہ ایک دم رکی، بھوری آنکھیں جھلاہٹ کا شکار تھیں۔ اس نے گلابی رنگت اور گہری سیاہ شیوہ والے کا چہرہ دیکھا اور پھر آہستہ سے سر جھٹک دیا۔ غصہ، طیش، جھنجھلاہٹ سب دھواں بن گیا۔

"کچھ نہیں... بس!" وہ اس کے قریب آئی اور اوپر بنے کیبنٹ سے خاموشی کے ساتھ سامنے رکھا نیلا اوریو کا کارٹن نکالا۔ ایک ڈبہ کاؤنٹر پر رکھتے اس کی نظریں سامنے کھڑے مرد سے مخالف سمت تھیں۔ ڈبہ نکالنے کے لیے، اس کے ہاتھ اپنے چہرے سے دور ہوئے تو اکائر نے ایک پل میں ہی اس کے چہرے کی حالت تک لی۔

کھڑی ناک میں سونے کی بالی چمک رہی تھی، لیکن اکائر کو دھچکا لگنے کی وجہ اس کی بھوری آنکھوں میں سے ایک کے نیچے اڈتی سوجن تھی۔ کبود لون پھیل کر اس کی دائیں آنکھ کی زینت بن چکا تھا، اور اسے اندازہ تھا کہ چند گھنٹوں کی دیر تھی اور یہ چوٹ گہری ہو کر جامنی ہو جائے گی۔

"کیا ہوا تمھیں؟" وہ بدحواس سا قریب آیا، لب شاک میں فراخ تھے۔

ظبیہ نے سیدھا ہاتھ بلند کرتے اسے وہیں روک دیا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" الفاظ کڑک تھے۔ ساتھ ہی اس کی انگلیاں ڈبے میں سے اوریو کا پیکٹ وصول کر رہی تھیں۔

اس کی جنبش موقوف ہوئیں۔ اکائر اسے دیکھتا رہ گیا۔ ہاتھ کی انگلیوں نے کاؤنٹر کے کنارے جکڑے۔

"کب؟" سرگوشی میں دریافت کیا۔

نیلی شرٹ میں کھڑی گھر کی مالکن اب گردن جھکائے اوریو کو پیکٹ کے اندر ہی مٹھیاں بنائے پیس رہی تھی۔

دھم، دھم، دھم۔

اکائر کو اپنے دماغ کی شریانیں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ غصہ اس قدر تھا کہ اس کی انگلیاں کسی کی گردن دبوچنے کے لیے پھڑ پھڑا رہی تھیں، حالاں کہ اس نے اپنی انتیس سالہ زندگی میں تشدد کو کبھی ترجیح نہیں دی تھی۔ اس بار وہ بغیر لحاظ کیے بات کی تہہ تک جانا چاہتا تھا۔ مذاق تھا کوئی؟ اپنے گھر میں یہ جہالت وہ اور برداشت نہیں کرے گا۔

"ظبیہ، کب؟"

"آج صبح، کل رات، کل صبح، پرسوں، ایک ماہ پہلے، پچھلے پانچ سال سے!" اس کی آواز کپکپائی۔ ظبیہ یمین کی سانس رک رہی تھی، گھٹنوں سے جان آزاد تھی۔ چہرہ موڑ کر اس کی جانب دیکھا جو ابرو سکیڑے اسے ہی تک رہا تھا، شکل پر کچھ تھا اور کچھ نہیں بھی۔

لیکن ظبیہ شکلیں پڑھنا چھوڑ چکی تھی، سب کفر ہی تو کرتی تھیں۔

"کیوں انجان بنتے ہو؟" الفاظ التماس سے لیس تھے۔ بھاری پھولی ہوئی سانسیں الفاظ چبا رہی تھیں، پلکیں نووارد آنسوئوں سے تر تھیں۔ اس نے لبوں پر زبان پھیرتے نیچے دیکھا۔

"سب پتا تو ہے تمھیں۔" وہ ٹوٹنے کے در پر تھی۔ اکائر اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے بغیر آواز کرے اس کی انگلیوں سے نیلے Oreo کا کاغذ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن ظبیہ نے گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اس کی نظریں سیدھ میں تھیں، آنکھوں میں تیرتے آنسو برف بن چکے تھے۔

اسے خود الجھن ہوتی تھی اس نمک آلود پانی سے جو پل پل اس کی آنکھیں بھگا جاتا تھا، لیکن خوف تو اسے اس روز کا تھا جب اس کی آنکھیں سوکھ جائیں گی اور بہتری کے لیے کرتی دعائیں تھم جائیں گی۔

اس کی اندھیر زندگی میں اگر کوئی نور تھا تو وہ امید کے چراغ کا تھا، اور ظبیہ یمین کو ڈر تھا کہ اس کا ایندھن خرچ ہو چکا تھا۔

"اتنے پسند ہیں تمھیں اوریو؟" اکائر نے اس کے آہنی قلاب پر تبصرہ دیا۔ ظبیہ نے ایک پل رک کر اسے دیکھا پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی، ہاتھ اس کے بسکٹ سے دور ہوئے۔ خود بھی وہ اس سے دور ہوئی۔

مرمری سفید ٹائلز سے اٹھتی روشنی بھوری آنکھوں میں چمکی اور وہ دوسرے طرف کے کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کپڑے میں لپیٹی برف اپنی سوجی ہوئی آنکھ پر رکھنے لگی۔

اکائر اب ریپر پھاڑ کر بسکٹ کا چورا اپنے دودھ کے گلاس میں گرا رہا تھا۔ کوئی بہت ہی عجیب ملک شیک تھا جس پر ظبیہ ہر بار تمسخر اڑاتی تھی، لیکن آج الگ تھا۔

اکائر نے ایک نظر رک کر اسے دیکھا۔ "پیو گی؟" پیشکش دی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

آج تو واقعی الگ تھا۔ اوریو ایڈکٹ اکائرز مورا اپنا سیکریٹ اوریو ملک شیک اس سے بانٹنا چاہتا تھا۔ ظبیہ کو سمجھ نہیں آیا کوئی ٹرافی اٹھائے یا گھر کے کیبنٹ زہر کی شیشی کے لیے چھانے۔

"تم ہی پیو۔" ڈرامائی انداز میں آنکھیں گھماتے اس نے کپڑا آنکھ پر تھپتھپایا۔

ڈراپ شولڈر شرٹ اور خاکی ٹراؤزر والا مرداب اپنا ناشتہ ٹرے میں رکھ رہا تھا۔ ظبیہ کو اچانک شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے کیا کر دیا تھا؟ وہ ایسی تو کبھی بھی نہیں تھی۔ یہاں کا غصہ وہاں اتارنا تو اسے ہمیشہ سے بچکانہ لگتا تھا، لیکن اس نے وہی کیا تھا۔

وہ اس سے ناراض تو نہیں ہو گیا تھا؟ اس خیال پر اس کے دل کو ٹھوکر لگی۔

ٹرے اٹھائے پلٹتے، سرمئی آنکھوں نے رخ اس کی طرف موڑا۔ "کبھی میرے اوریو پکڑ لیتی ہو، کبھی میرے ناشتے کو گھورتی ہو۔ آفر کرو تو ہاں بھی نہیں کہتی۔ کس قسم کی بھوکی ہو تم؟"

ظبیہ بے روک ہنس پڑی، آنکھوں میں بنی نمی پگھل کر اس کے گال سے نیچے ٹپکی۔

وہ ناراض نہیں تھا۔ وہ ناراض نہیں ہوا کرتا تھا۔

لیپ ٹاپ کے پاس کھڑے اسپیس بار دبایا اور ٹھوڑی سے ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے آگے چلا گیا۔ ظبیہ نے اندرونی طور پر ایک لمبی سانس اپنے پھیپھڑوں میں گھسیٹتے قدم اس کے پیچھے بڑھا دیے۔

ٹیبل سیٹ چار کرسیوں کا تھا اور گہری بھوری لکڑی پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ ایک کرسی کھینچے، اکائر اپنی ناٹ سو صحت مند غذا کا نوالہ توڑ رہا تھا۔ اس سے ایک کرسی چھوڑ کر ظبیہ نشست تھی، جسے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے کسی انٹرویو کے لیے بلایا گیا ہو، یا پھر کسی جرم کی انٹیروگیشن۔

"صرف آنکھ پر مارا ہے؟" اس نے بے باکی سے بات کا آغاز کیا تو ظبیہ کا سارا جسم دہک اٹھا اور گیلی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ اسے نفرت ہو رہی تھی۔ خود سے۔ اپنی حقیقت سے۔ اس لمحے سے۔ اس نے آہستگی سے سر اثبات میں نیچے کیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے اکائر کو گہری سانس خارج کرتے سنا لیکن کیونکہ نظریں جھکائی ہوئیں تھیں سو وہ اس کے چہرے پر بکھرتے ناخوشی اور جھلاہٹ کے رنگ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ ایسا ہی نظر آ رہا ہو گا، اس اور اس کے مسائل سے بیزار۔ اگر وہ اوپر دیکھ لیتی تو اپنی بات کو خود ہی غلط ثابت کر دیتی۔

"ظبیہ۔۔۔" یہ وہی ٹون تھی، وہی سچ جس سے وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ ایک ایسا حل جو اس کے سارے مسائل بجھا سکتا تھا، اسے ایک نئی زندگی بخش سکتا تھا، لیکن وہ صرف ایک خواب تھا۔ اپنے دل و دماغ کو بہلانے کے لیے دیا گیا ایک جھوٹا لارا۔

"چھوڑ دو اسے۔"

یک دم نیل زیادہ دکھا تھا۔ ظبیہ نے کپڑے کی سمت بدلتے اسے نرمی سے دبایا، چہرے پر ایک بے معنیٰ مسکراہٹ واضح تھی۔ "غزار نے تمھیں یہ کہتے سنا تو جان لے لیں گے۔"

"میری یا تمھاری؟"

اتنی سادہ بات تھی، لیکن اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔

ٹی شرٹ پہنا نفس سر جھٹک کر اپنے کریم چیز والے ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا کاٹنے لگا۔ "نامرد ہے تمھارا شوہر۔ اصلی مردوں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس میں، اسی لیے بیوی کو مار کر شیر بنتا ہے۔"

گھنگریالے بالوں والی لڑکی اب اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ "تمھیں لگتا ہے مجھے یہ سب نہیں پتا؟" آواز خاموش تھی، الفاظ ترتیب شدہ۔

"سب پتا ہے تو کیوں ہو اس کے ساتھ، ظبیہ؟ کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تمھیں کوئی مستقبل نظر آتا ہے اس شخص کے ساتھ، اس رشتے میں بندھ کر؟ یا ویٹ۔۔۔" وہ سیٹ میں پیچھے ہوا اور لکڑی کے ہتھے سے جا ٹکا۔ "تمھیں یہ گمان تو نہیں کہ تم اس سائیکو کو فکس کر سکتی ہو اور۔۔۔"

"نہیں۔" اس بات پر ظبیہ کو کوئی خدشہ نہیں تھا۔ "غزار فکس نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ٹوٹے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ بس، ایک انا پرست انسان ہیں جنھیں اپنی ہر بات اپنے طریقے سے چاہیے۔ دوسروں کی زندگیاں، ان کی خواہشات پر بھی وہ کنٹرول چاہتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے قید میں سکون ہے۔ انھیں لگتا ہے میرے ساتھ برے ہو کر وہ مجھے دنیا کی ظالمانہ نظام سے بچا رہے ہیں، حالاں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کر رہے۔ وہ صرف مجھے اذیت دے رہے ہیں۔ ہر روز، پہلے سے بھی زیادہ۔"

"وہ میرا دل خراب کر رہے ہیں۔" چوٹ سے نیلی ہوئی آنکھ نے پلکیں جھپکیں تو نمی ایک بار پھر بہہ گئی۔ سد شکر، ابھی چراغ پر نور تھا۔ "وہ بس مجھے خود سے دور کر رہے ہیں۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی سسکیاں بلند ہوئیں تو اکائر نے نگاہیں دور کھڑکی کی طرف کر لیں۔ بند شیشوں کے باہر کبوتروں کی جوڑی دانہ چگ رہی تھی۔ صبح کی روشنی سوکھ کر دوپہر کی گرم دھوپ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہر چیز تپ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے انگلیوں کے کنارے ناک پر مسلتے سانس اندر کھینچی، آواز اب بھی بھیگی ہوئی تھی۔

"ڈونٹ بی۔" دودھ کا گھونٹ بھرتے، اکائر نے اسے دیکھنے سے گریز کیا۔

وہ ہاتھ میز کے کناروں پر رکھتے، کرسی دھکیلتے کھڑی ہونے لگی۔ سفید ٹی شرٹ والے نے اب بھی اسے نہ دیکھا۔ برہنہ تلوے خنک فرش سے جا ملے اور لڑیوں والا سفید اسکارف گلے میں پھنسائے لڑکی نے کرسی واپس میز کے ساتھ جوڑی۔ اب وہ اپنے سامع کو اس کا ناشتہ سکون سے کرنے دینا چاہتی تھی۔ ہلکے گھنگریالے بالوں والا اب گردن جھکائے اپنی پلیٹ کو تک رہا تھا، جہاں دو بریڈ میں سے صرف آدھی بچی تھی۔ اتنی خاموشی تھی ان کے درمیان۔ کیا ظبیہ کو محسوس ہوتی تھی؟

کپڑا آنکھ پر سہلاتے ظبیہ نے ٹیبل کی طرف پیٹھ کرتے ایک قدم آگے بڑھایا، اور پھر وہیں جم کر رہ گئی۔

اکائرز مورا کے اگلے الفاظ نے اسے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس لمحے کا باندی بنا دیا تھا۔ اس گھڑی اسے سانس لینا بھی قبول نہیں تھا۔

"1-5-9-9-9."

اس کا بہی خواہ سر اٹھائے اب اس کی پشت کو تک رہا تھا۔ ظبیہ کے لب ایک دوسرے سے جدا ہوئے، کندھوں پر ایک بے شناخت بوجھ آن گرا تھا۔ وہ چند ہندسے، ایک معمولی فون نمبر اس کا دل کس طرح کاٹ چکے تھے، شاید متکلم کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ یا شاید تھا۔

اکائر نے اگلے حروف ہجے کرنے کے لیے آواز نکالی اور وہی الفاظ، اس کی جانب پیٹھ کی ہوئی ظبیہ نے بھی دہرائے۔ اور کیسے نہ دہراتی؟ ہر صبح اور شام، ہر چاندنی اور دھوپ، ہر گرے آنسو اور بہے خون کے بعد دھندلی بصارت لیے وہ جگمگاتی اسکرین پر یہ ایک نام ہی تو کھوجا کرتی تھی۔ اس ایک نام کے ہی تو اتنا پاس جاتی تھی، اتنا قریب کہ اس کی لرزتی انگلیاں ماؤس کے اوپر ہوتی تھیں اور کرسر اُن کی ہیلپ لائن سے ایک کلک دور۔

ایک کلک کی دوری، ایک گھنٹی کا فاصلہ!

"Talian Kasih".

تالیان کسیہ ملیشیائی قومی ہیلپ لائن ہے جو گھریلو تنازعات اور دوسرے مسائل سے متاثر افراد کو مشورہ اور حمایت فراہم کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ اسے 15999 پر کال کر کے یا سرکاری ویب سائٹ پر رابطہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حواس باختہ ہوا اس کا دل گلے میں پھنسا تھا اور ایک ایک دھڑکن صور کی پھونک تھی۔ ظبیہ نے کمزور جسم اس کی سمت موڑا، کندھوں کے اوپر سے بھوری آنکھیں سرمئی گہرائیوں سے جڑ گئیں۔

اکائر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نگاہ داری میں بغیر خلل کیے، برابر رکھا اپنا فون ان لاک کر کے اس کی جانب سرکایا۔

ظبیہ نے نظریں نیچے کیں۔ ایمرجنسی کال اور ہندسوں سے تیار کی پیڈ اس کا منتظر تھا۔ دیر تھی تو صرف اس کی ہمت کی، طاقت کی۔

انگلیوں میں ذرہ برابر حرکت پیدا ہوئی۔ ادھر ہی تھے، وہ پانچ ہندسے ادھر ہی تھے۔ اس کے دماغ کے سب سے اول درجے پر۔ وہ آزادی چاہتے تھے، بخشش چاہتے تھے! کال کا ہرا بٹن اس کے سامنے جگمگا رہا تھا۔ بس، ایک بار کی محنت، ایک بار کی ذلت اور پھر کوسوں تک آباد فرار۔

سامنے بیٹھا مرد بے حرکت تھا، اگر کوئی جزبہ تھا تو ان آنکھوں میں جو ڈوبتے کو سہارا دے کر اس کے تیرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ ظبیہ نے اپنی پوروں تلے فون کی ٹھنڈی اسکرین کو پایا۔ پانچ ہندسے۔ پانچ سال۔ پانچ ہندسے۔ پانچ سال۔

اس نے نرمی سے '1' دبایا۔ گود میں رکھا اکائر کا ہاتھ مٹھی میں بند ہوا۔

چار ہندسے، پانچ سال۔

اس بار اس کا ہاتھ '5' تک گیا لیکن بغیر حرکت ہی تھم گیا۔ ایک تنہا آنسو ٹوٹ کر میز کی لکڑی میں جذب ہوا اور۔۔۔

"آئی ایم سوری۔۔۔" سرگوشی کی۔ "آئی ایم ریئلی سوری۔"

اور پھر وہ دور ہو گئی، ایسے کہ جیسے کبھی پاس آئی ہی نہ ہو۔ اکائر اسے خود سے دور جاتا دیکھتا رہا۔ فون کی اسکرین بھی تھک کر دھیمی پڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کی انگلیاں اب بھی مٹھی میں قید تھیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

آہستگی سے ہاتھ واپس کھولا تو پسینہ چمچما رہا تھا، ساتھ ہی اس کے ناخنوں سے پیدا ہوئے سرخ نشان اس کی ہتھیلی رنگ چکے تھے۔

اس نے ایک بار پھر کھڑکی کی جانب دیکھا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔

"ڈونٹ بی۔"

★★★

ایک ماہ اور تین ہفتے بعد

۲۵ فروری، ۲۰۱۴

روشنیوں اور باغوں کا شہر رات کی سیاہی میں گم تھا۔ کوالالمپور اپنے بیتے مونسون کا سوگ مناتا بمشکل تپتے گریشیم کو اپنا رہا تھا۔ تھوڑا وقت لگنا تھا لیکن لوگ عادی ہو جاتے تھے، کیونکہ کچھ تبدیلیاں انسانی شکنجے سے بالکل بالاتر ہوتی ہیں۔

بانگسار میں مقیم الیسڈرز مورا کے گھر میں چراغاں اشد تھا۔

اور یہی ایک آنکھوں دیکھا ثبوت ہوتا تھا کہ کن وقتوں میں غزار احمد گھر سے دور تھے اور کب ان کی واپسی منعقد ہونے کو تھی۔ بھورے دروازے والا وہ دو منزلہ بنگلا کہیں سے بھی جنوری کی اس خاموش صبح میں ڈوبا ٹھکانا نہیں لگ رہا تھا۔ رات کے اس پہر گھر کا لاونگ روم زرد اور سیت روشنیوں سے سنوارا گیا تھا۔ بڑے، تپش برساتے LED بلب ایک ایک کر کے سب روشن تھے اور ماربل کے کاونٹر والے سفید اور سیاہ کچن میں سے من للچاتے کھانوں کی سگھند اٹھ کر ہر سو پھیل رہی تھی۔

باون انچ والے ٹی وی سے کسی نیوز اینکر کی نسوانی آواز سنی جا سکتی تھی۔ لونگ روم میں لگے ایئر کون کو چلا کر گردو پیش کا درجہ حرارت کم کر دیا گیا تھا، تاکہ باہر سے آنے والی لو ولپٹ گھر کے دروازوں کے پار نہ ہونے پائے۔ سبز و سفید صوفہ سیٹ کے سارے تکیے جما کر بچھائے گئے تھے اور ہاتھ پھیر کر ہر شکن کو دس دس بار مٹایا گیا تھا۔

سافرون رنگ کے فلورل ٹو پیس سوٹ میں تیار ظبیہ یمین نے آج سیاہ گھنگریالے بال اونچے کر کے جوڑے میں کسے تھے۔ دو تین ضدی لٹیں اس کی کنپٹیوں کے مقابل سائے کھینچ رہی تھیں لیکن اس کا چہرہ نکھرا ہوا اور واضح تھا۔ ہم رنگ ریشمی دوپٹہ دائیں کندھے سے گزارا ہوا تھا اور پیروں میں موٹے کف پا والی سفید سینڈلز تھیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

چہرے پر ہلکا میک اپ بھی واضح تھا، جو اس کی روزمرہ کی عادت کے خلاف تھا۔ لیکن اگر عادتیں بدلنے سے گھر بسنے تھے تو ظبیہ ایسی سو عادتیں اور اپنا لیتی اور دو سو ترک کر دیتی۔ پتلی کلائی کے گرد چمکتے چاندی رنگ کی لیڈیز واچ بھی پہن رکھی تھی، جو شادی کی تیسری سالگرہ پر عنایت کیا غزار کا اس کو تحفہ تھا۔

اس نے لوہے کے بڑے پتیلے میں چمچا چلاتے ایک سانس اندر کھینچی۔ مسکارہ سے لیس، گولائی میں خم ہوئیں اس کی پلکیں گالوں پر بند ہوئیں۔ پتیلے میں فرائے ہوتے چار کوئی ٹیو کے اجزاء کی مہک اس کے نتھنوں کو پار کرتے دل تک اتر گئی۔

(چار کوئی ٹیو ایک ملائیشیائی اور سنگاپوری پکوان ہے جس میں چوڑے اور چپٹے چاولوں کے بنے نوڈلز کو گرم پانی میں بھگویا جاتا ہے، اور پھر چکن یا بیف کے سو سیجز شامل کر کے گرما گرم ساس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔)

آج وہ ہر چیز صحیح کرے گی۔

غزار کو اس کی اندھیرے میں بیٹھنے کی عجیب عادت سے مسئلہ تھا، وہ ہر جگہ نور بکھیر دے گی۔ اسے اس کی لاپرواہی اور ہر کام سستی سے کرنے سے مسلہ تھا، وہ وقت سے پہلے ہر چیز اپنی شوہر کی پسند سے کر دے گی۔ اسے گھر میں گرمی سے چڑ تھی، ظبیہ گھر کو جنت کا ٹکڑا بنا دے گی۔ اسے اپنی بیوی ہر وقت بنی ٹھنی اور صاف ستھری پسند تھی، ظبیہ کبھی میک اپ اتارے گی ہی نہیں۔

اسے ہر چیز صحیح کرنی تھی، ہر چیز غزار کی مرضی سے کرنی تھی۔

جب سبزیاں اس کی پسند کے مطابق بھن چکیں تو اس نے برابر رکھے پھینٹے ہوئے انڈے بھی اپنی ترکیب میں ملا دیے۔ اب باورچی خانہ مکمل طور پر خوشبوؤں کا گاؤں بن چکا تھا۔ ظبیہ کو فخر تھا اپنے اس ہنر پر۔ کٹے ہوئے لہسن، لال مرچ، شلجم اور انڈوں کو بھنتا چھوڑ کر ظبیہ لیونگ روم تک آئی اور ایک نگاہ دیوار پر نصب وینٹیج طرز کی گھڑی پر ڈالی جو چاندی کے ہندسوں کے مطابق 08:12 بجا رہی تھی۔ سونے کی پتلی

انگوٹھیوں سے سنواری ہوئیں اس کی انگلیاں آپس میں تنگ ہوئیں۔ لب کاٹتے، اس نے ہتھیلیوں پر امڈ تا پسینہ اپنی قمیص کے دامن سے صاف کیا۔

وہ کچن کی طرف جانے کے لیے پلٹی ہی تھی جب ڈور بیل کی آواز سارے میں گونجی۔ ظبیہ ششدر سی سیدھی ہوئی اور پھرتیلے قدموں کے ساتھ دروازے تک پہنچی۔ لغزش کرتی اس کی انگلیوں نے لاک کھولا تو دروازہ دھکیلتے غزار خود ہی اندر داخل ہو گیا۔

گہرے سرمئی رنگ کے پلین سوٹ میں ملبوس اس کی قامت لمبی اور مستحکم تھی۔ پچاس کا ہندسہ پار کرنے کے بعد بھی چترائی اور کاردانی چہرے کے ہر جزو میں عیاں تھی۔ موٹے، زر سفید بالوں سے ایک دو لٹیں تکان سے سلوٹ زدہ ماتھے پر بکھری ہوئی تھیں، لیکن سر کے پچھلے حصّے میں بال اب بھی دم خم کالے رنگ کے تھے۔

ہاتھ میں پکڑا لیپ ٹاپ بیگ اس کے حوالے کرتے، اس نے ایک گہری نگاہ اپنے عین سامنے کھڑی بنی ٹھنی بیوی پر ڈالی۔ ظبیہ نے نظریں جھکا کر اس کا بیگ تھاما اور دروازہ بند کرتے اس کے پیچھے چل دی۔ غزار احمد کی مشتاق چال اور کالے ٹمبر لینڈ جوتوں سے بنتے نشانات قرمزی رنگ کے کارپیٹ کو داغ رہے تھے۔

وہ سبز و سفید صوفے پر جا بیٹھا اور اس کے ہونٹوں سے چھوٹتی، ایک بھاری، ضعف سے لیس سانس ہوا میں گھل گئی۔ سر صوفے کے ہتھے پر رکھتے، اس نے انگلیوں کی پوروں سے اپنا ماتھا مسلا۔ سرمئی سوٹ میں جذب ہوئی دھاتوں کی فلزاتی بو نے لاؤنج روم کو اپنی آغوش میں گھیر لیا۔ یہی اس کی زندگی تھی، معدنیات اور حیاتین کی چھان میں دنیا کا سفر کرنا اور اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں لوگوں کے لیے قابلِ میسر بنانا۔

غزار احمد کو ملائیشیا کی قومی آئل کمپنی میں چیف جیولوجسٹ کا درجہ حاصل تھا۔

ظبیہ اس کا بیگ تھامے کمرے تک جانے لگی تو اس کی گھمبیر آواز نے اسے وہیں ٹھہرا دیا۔ "ادھر آؤ، بیہ۔" وہ سہم گئی، پھر کچن اور کمرے کے درمیان کوئی مصروفیت ڈھونڈنی چاہی لیکن اچانک سب سنسان پڑ گیا تھا۔

غزار اب بھی صوفے پر سر ٹکائے، اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک سانس گلے سے نیچے اتاری اور کالے بیگ کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے اس تک قدم بڑھائے۔ وہ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی تو غزار نے سیاہی کی حد تک بھوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر۔

ظبیہ کا دل بھاگ رہا تھا، اس کی کھال کا پور پور دہک رہا تھا۔ اس نے اچھنبے سے آنکھیں یہاں وہاں کرنا چاہیں۔

غزار نے نظریں اس میں پرویے، اپنے جوتوں سے قید پیر آگے رکھے اور ٹھوڑی سے ان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی اسے کس لیے بلایا گیا تھا۔ بیگ کو اپنے شوہر کے برابر سلیقے سے جماتے، وہ اس کے سامنے گھٹنوں پر نشست ہوئی اور آہستگی سے اس کا پیر تھاما۔ اس پورے عمل کے دوران، اس کاردان جیولوجسٹ کی نظریں صرف اس پر تھیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے جوتا اس کی ایڑھی کے پاس سے پیچھے کھسکایا، چہرہ اب بھی فرش پر بچھے قالین کے نقشے گھور رہا تھا۔ ایک جوتا اتار کر اس نے آرام سے اسے ماربل کے چکنے فرش پر رکھا اور نازک انگلیاں دوسرے کی طرف بڑھائیں، لیکن اس سے قبل ہی غزار نے آگے ہوتے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس کے جسم میں بجلی نے ایک زوردار غوطہ لگایا۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی اور ادھ کھلے لب لیے، بھوری نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ غزار اسے تکتے مسکرا رہا تھا، گردن ٹیڑھی کیے وہ اس کے بدلتے تاثرات دیکھتے نہایت مسرور نظر آ رہا تھا۔

"غزار، پلیز۔۔۔" ظبیہ نے شرمندہ سا ہو کر اپنا ہاتھ آزاد کروانا چاہا، لیکن سامنے براجمان مرد کا قلاب پتھریلا تھا۔

"پیاری لگ رہی ہو آج۔" اس نے سرگوشی میں الفاظ ادا کرتے انگوٹھے کی پشت سے اس کی کلائی پر ایک لکیر کھینچی۔ ظبیہ نے نظریں سیڑھیوں کی طرف کیں اور خود پر جبر کر کے آنکھیں کھلی رکھیں۔

"یہ وہی گھڑی ہے ناں؟" اس نے اس کے دوسرے ہاتھ میں بندھے تحفے کی تصدیق چاہی۔ ظبیہ نے جبڑا بھینچ لیا۔

"جی۔" خاموش جواب۔

غزار کی مسکان گہری ہوئی اور وہ سر جھکاتے اس کی کلائی پر واضح نسوں کے نقشے سہلانے لگا۔ گھٹنوں پر بیٹھی لڑکی کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے ایک پریشان سانس اندر کھینچی۔ "پلیز، غزار۔۔۔" ایک بار پھر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔

غزار اس کا چہرہ دیکھتے ہنس دیا اور چند لمحات اسے بغور تاک کر اپنا ہاتھ دور ہٹا لیا۔ ظبیہ کی سانس بحال ہوئی تو اس نے جلدی جلدی اس کا دوسرا جوتا بھی کنارے رکھا۔ پھر برق رفتاری کے ساتھ لیپ ٹاپ بیگ اور جوتوں کی جوڑی ہاتھوں میں اٹھائے کمرے کی طرف لپک گئی۔

وہ اسے اندر جاتا دیکھتا رہا پھر ایک فرحت انگیز مسکراہٹ کے ساتھ سر موڑ کر اپنا فون چیک کرنے لگا۔

تھوڑے وقت بعد، سفید لکڑی کی ٹیبل پر گھر کے کرائے داروں کو بیٹھا دیکھا جا سکتا تھا۔ رات ڈوب کر سیاہ ہو گئی تھی، نقرئی رنگ کی گھڑی کے شاقول متحرک نے دس بجائے تو بنگلے کے لاونگ روم میں گھنٹہ پورا ہونے کی مخصوص آواز گونج اٹھی۔

غزار احمد سر ابراہی کرسی پر بیٹھا چار کوئی ٹیو کے آخری نوالے اپنے کانچ کی پلیٹ سے صاف کر رہا تھا۔ وہ سلیقہ مندی سے لوہے کا چمچہ تھال میں گھماتا اور پھر کمرا کڑائے نوڈلز منہ میں رکھتا۔ گود میں بچھا رومال اس کے نامیاتی نظریہ کی بھرپور عکاسی تھا۔

ظبیہ، جو کھانا دس منٹ پہلے ہی ختم کر چکی تھی، ساتھ کھڑی پلیٹیں اور ڈونگے ایک طرف کر رہی تھی۔ چہرے کا میک اپ دو گھنٹے پہلے کے برعکس مدھم پڑ گیا تھا، بھرے ہوئے ہونٹوں کی گلابی بجھ گئی تھی اور جوڑے میں سے چند لٹیں بھی اس کے ماتھے پر لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ چمچا چلاتی بچا ہوا کھانا کانچ کے برتن میں سے نکال کر پلاسٹک کے پیالے میں بھر رہی تھی تاکہ ریفریجریٹ کر سکے۔

غزار نے نوالہ منہ میں رکھتے نظریں اس کی طرف کیں جو مشغول سی صاف پلیٹس ایک جگہ جما کر رہی تھی، آنکھیں جھکی ہوئی اور بھوری رنگت سنہرے بلبوں کی روشنی میں ایسی تھی جیسے دہکتی آگ سے اٹھتے شرارے، اپنے گرد و پیش میں بستی ہر شے کو جھلسا دینے کی حیثیت رکھتے ہوئے۔

"تمھاری خالہ کیسی ہیں؟" اس کا چہرہ دیکھتے اسپاٹ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

ظبیہ کے ہاتھ لکڑی کے چمچے کے اوپر تھم گئے۔ وہ جانتی تھی غزار کیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جواب سننے سے زیادہ، اس کے تاثرات کا کھیل پرکھنا چاہتا تھا، جاننا چاہتا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے کیے گئے اس کی بے رحمی کا ظبیہ پر کیا اثر چھوٹا تھا۔

سافرون سوٹ والی لڑکی نے دو سیکنڈ کے لیے اپنے شوہر سے نگاہیں ملائیں پھر اس کی خالی ہوئی پلیٹ اٹھا کر اپنے طرف کھینچی۔ "ویسی ہی ہیں۔ ہاسپٹل میں۔"

سفید شرٹ میں ملبوس جیولوجسٹ کے تراشیدہ گال سیاہ شیو کے پیچھے چھپے تھے۔ اس نے سر ایک طرف کرتے، انگلی کی نوک اپنے چہرے پر رکھی اور ایسا تاثر دیا جیسے اس کی بات پر کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر برابر رکھا پانی کا گلاس اٹھایا۔ "بیجنگ میں ہوتی ہیں ناں؟"

ظبیہ کا دل کیا تھا وہ گفتگو اور اسے اسی کرسی پر چھوڑ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ وہ کیوں انجان بنتا تھا؟ کیوں اس کے احساسات کو رواں کج کلے میں اچھال دیا کرتا تھا؟ اس کے دل کو چوٹ لگی تھی، وہ چوٹ سینے کی بارہ ہڈیاں پار کر کے روح تک اتری تھی۔ اس کا پاس پورٹ پھاڑ کر بھی کیا اس کو لگتا تھا کہ اس کی معصومیت ظبیہ کے لیے قابل یقین تھی؟

"جی۔" اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ جواب دیا۔

"کون ہوتا ہے ان کے ساتھ؟" اب وہ پانی پی کر گلاس دور رکھ رہا تھا، ساتھ ہی اس نے ایک ہتھیلی دوسری کرسی کے قریب رکھی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ظبیہ ایک پل ٹھہر گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ نرم تھیں، اس کی منتظر۔ اس کے لب ساتھ مل گئے اور پیروں نے اس کے دماغ کو دھوکا دے دیا۔ ایک بار پھر۔

وہ اس کے برابر بیٹھ گئی، البتہ خود کو پوری طرح سے اس کی پہنچ سے دور رکھا۔

"الطاف ہوتا ہے۔ لیکن اس کی نوکری کہیں اور ہے تو، ہاسپٹل کا عملہ ہی ہوتا ہے۔"

"الطاف۔۔۔ ان کا بیٹا؟" اس نے ظبیہ کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔ اس نے سر جھکا کر ہامی بھری۔ غزار نے گردن ہلاتے اس کی بات اندر اتاری۔ آج وہ مطمئن لگ رہا تھا، ہر طرح سے۔ ظبیہ کو سمجھ نہیں آیا کہ اس کا کیا مطلب لے۔

"کھانا اچھا بنا تھا۔" اس نے تعریف کی تو ظبیہ نے نظریں اپنی گود تک جھکا لیں۔ اس کی ہر بات نظر انداز کر کے اور ہر گناہ معاف کر کے، اس کو اگر کبھی کسی کے تعریف بھاتی تھی تو وہ اس کا شوہر تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا کرتی تھی۔ آج البتہ اس نے لب بس تھوڑے سے اچکائے۔

غزار نے اس کا چہرہ دیکھتے ایک ہاتھ بلند کیا اور اس کے گال تک لایا۔ ظبیہ بے اختیار پیچھے ہوئی تو وہ چونک کر ہنس دیا۔ پھولی سانس لیے، وہ اس کو غور سے دیکھنے لگی، دل بھاگم بھاگ تھا۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟" اس نے نرمی سے اس کے گال کے خم کو چھوا۔ ظبیہ کو لگا اس کا جسم برس پڑے گا۔ اس کی ابرو تنگ ہوئے اور ہونٹ سیدھی لکیر میں پھیل گئے۔ گردن اپنے آپ پیچھے ہونے لگی تو اس نے خود پر قابو پا کر اسے اٹل رکھا۔

"میں۔۔۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔" اس کی نظریں کہیں اور تھیں، دماغ ہمیشہ کی طرح پہلے انکار کا بدلہ اتارتے اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔

غزار مسکرا دیا اور آگے جھکا، اس بار اس کی گھنگریالی لٹوں میں سے ایک کو اپنی انگلی پر لپیٹا۔ ظبیہ کو لگا وہ رو دے گی، اس کا حلق کڑوا ہو رہا تھا۔ چار کوئی ٹیو اپنا مزہ کھو چکا تھا۔ اب صرف کھارے آنسو تھے، اس کو تباہ کرنے کے لیے مستعد۔

"ڈرتی نہیں ہو؟" اس نے اس کی کان کی لو پر انگلی پھیرتے سوال دہرایا۔

"بالکل نہیں۔" وہ خود کو باز نہ رکھ سکی۔

غزار نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اس کی سانس اٹک سی گئی اور کان سننے کی حس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی انگلیوں نے بے اختیار اپنا دامن جکڑا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ڈرتی نہیں ہو تو نظریں کیوں نہیں ملاتی؟ آنکھیں صرف وہ چراتے ہیں جو چور ہوں یا۔۔۔" اس بار آگے جھکتے، اس کی سیاہی مائل بھوری آنکھیں اس سے جڑ گئیں۔ ظبیہ دور بھی نہیں ہو سکی۔۔ "یا جن کے دل میں چور ہو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ پریشان سی ہو کر پیچھے کو کھسکی، دل نے اچانک ایسے شور کیا تھا جیسے سلاخوں کے پیچھے قید مجرم۔ کیا وہ چور تھی؟ کیا اس کے دل میں چور تھا؟

وہ اس کو دیکھ کر دھیما سا مسکرا دیا اور اس کی ٹھوڑی سے گرفت آزاد کی۔ "حقائق۔ ایسی ہی ہوتی ہے دنیا۔ انسان کو اس کی سائیکولوجی سے بہت اچھا پرکھا جا سکتا ہے۔"

ظبیہ سر جھکاتے کھڑی ہونے لگی تو اس نے آگے جھکتے اس کی پشت پر اپنی انگلیاں سجائیں۔ "بیٹھی رہو۔ اتنی کیا جلدی ہے بھاگنے کی؟ بہت کام ہے کیا؟" اس نے آخر میں ایک نگاہ باورچی خانے کی طرف ڈالی جہاں سب ستھرا ہوا تھا۔

"نہیں۔ وہ بس..." اس نے خود کو واپس کرسی کے ساتھ ٹکتے محسوس کیا۔ آج فرار مشکل ہو گیا تھا، یا پھر اسے لگ رہا تھا۔ شاید، اس لمحے سے قبل اسے اس سب سے دور ہونے کی چاہ اس شدت سے کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔

"بہت کام کرتی ہو تم۔۔۔" سفید شرٹ والے مرد نے اس کا سونے کے چھلوں کی سنہری چمک میں اجاگر ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ غزار کی جلد اس کے برعکس کھردری تھی۔ چہرہ اٹھا کر اس نے ظبیہ کو دیکھا، پھر ٹھہر کر الفاظ ادا کیے۔

"کہو تو ملازمہ رکھ لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" اس بار اس کا انگوٹھا اس کی ہتھیلی کے کنارے نرمی سے سہلا رہا تھا۔ بھوری آنکھیں اس کی بات پر تذبذب میں چھوٹی ہوئیں۔

"ملازمہ؟ کیوں؟ میں ٹھیک ہوں۔"

غزار نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں کے قریب کیا۔ "آئی نو۔ تم ٹھیک ہو۔ لیکن تھک جاتی ہو گی۔ میں نہیں چاہتا تمھیں میرے گھر میں کوئی تکلیف ہو۔"

ظبیہ کو کچھ بہت عجیب لگا تھا، لیکن اس کے اندر کے پاگل، بدھو انسان کو کچھ اچھا بھی لگا تھا۔ اس نے اپنے رجائیت پسند شخصیت کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش ٹکڑا ٹکڑا کرنا شروع کی۔

"نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ پانچ سال سے سب ایسا ہی تو ہے۔ ہمیں کب ملازمہ کی ضرورت پڑی ہے؟" اس نے اس سے ہاتھ دور ہٹا کر اپنے جوڑے میں بندھے بال بہتر طریق سے لپیٹے اور گھنے بالوں میں سے لمبی انگلیاں گزار کر انھیں سدھارا۔

غزار کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے اور اس نے ہاتھ اچکا کر اس کے فیصلے پر اتفاق کر لیا۔ "ایزیو سے، مائی کوئین۔"

اس بار وہ چاہ کر بھی اپنی مسکان نہیں روک پائی اور گلابی ہونٹ پھیل کر اس کے چہرے پر بکھرتی روشنی کا ذریعہ بن گئے۔ "ٹیبل ٹاک ختم ہو گئی ہے کیا؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

غزار ہنس دیا اور ایک ابرو اٹھا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ "در حقیقت، نہیں۔ مجھے تمھیں کچھ دکھانا ہے۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے راضی ہو گئی تو وہ اپنا فون آن کر کے ایک دو جگہ ہاتھ مارنے لگا۔ سیمسنگ گیلیکسی کے نئے ماڈل سے اٹھتی پیلی چمک میں وہ کافی سنجیدہ سا نمایاں ہوا۔ اس کی انگلیاں پھرتی سے کی پیڈ پر کچھ لکھ رہی تھیں۔

"تمھیں یاد ہے کچھ دنوں پہلے میں تمھیں بتا رہا تھا؟ مرزا کی بیوی۔۔۔ وہی جس کو کار ایکسیڈینٹ میں بہت بری چوٹیں آئیں تھیں۔ ہاں، اسے ڈاکٹر مل گئی تھی اپنے لیے۔" وہ اب بھی فون کو دیکھتے بول رہا تھا۔

ظبیہ نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "یہ تو اچھا ہوا بہت۔ اللہ اس کے لیے کرے گا ان کے لیے۔ انھیں تو بہت زیادہ لگی تھی، نا؟ آپ بتا رہے تھے کہ ان کا چہرے کا نقشہ تک بگڑ گیا تھا۔"

"وہی تو!" وہ اچانک پر جوش سا ہو کر بولا۔ "پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔ مرزا سے خود شناخت نہیں ہوئی تھی، اسے دو بار بلایا گیا تھا تھانے۔ لیکن تمھیں پتا ہے، اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اتنا فٹ علاج کیا ہے۔ بلکہ۔۔۔" وہ اپنی قریب الوقوع کہے جانے والی بات پر خود ہی ہنس دیا۔ "مرزا تو کہہ رہا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہے۔ پکچر دیکھو گی؟"

ظبیہ نے گھال میل میں آ کر ہامی بھری تو وہ کرسی پر اس کی طرف جھکا اور فون کی اسکرین قریب لایا۔ کانچ کے پیچھے ایک تیس سے چالیس سال کی عورت تھی جو عام سی شرٹ اور پجامے پہنے ہوئے تھی۔ روشنی

سے کھلتا اس کے بالائے سر بنے کنڈل میں بدحواس لٹیں سرخ کا ایک دلفریب رنگ نمایاں ہو رہی تھیں۔ چہرہ سپید اور نقوش تیکھے تھے، لیکن وہ زخموں پر ہوئی دریسی کے پیچھے ڈھکے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ ان خوفناک چوٹوں کے نشانات عیاں تھے اور ٹانکوں کے دھاگے بھی اس کی صورت داغ رہے تھے، لیکن چہرہ ایک پُر بہار مسکراہٹ کے ساتھ زندہ تھا۔ وہ کمرے میں ایک پلنگ پر ٹکی تھی، جسامت کمزور اور دبلی نظر آتی تھی، ایسے کہ جیسے بہت دنوں کی بیمار ہو۔ شاید وہ اسپتال ہی تھا۔

"شکریہ ٹھیک ہیں۔" ظبیہ نے خود کو کہتے سنا۔ وہ واقعی ں ہتر محسوس کر رہی تھی اس خاتون کے علاج کے بارے میں جان کر۔

"ہاں، لیکن اس کا پورا چہرا بدل گیا ہے۔ سرجن نے کیا جادو کیا ہے؟ مرزا بتا رہا تھا کہ کوئی بہت مہنگی اور ہونہار cosmetologist تھیں۔ وہ تو پٹی کھلنے کے انتظار میں ہے تاکہ پورا چہرہ دیکھ سکے۔" غزار اب اسکرین پر زوم کر کے عورت کا چہرہ بغور ملاحظہ کر رہا تھا۔ ظبیہ کو کچھ برا لگا تھا۔

"چھوڑیں ناں۔ وہ بچ گئیں، یہ کافی ہونا چاہیے۔ شکل صورت تو آنے جانے والی چیز ہے۔" وہ کرسی دھکیل کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اور پلیٹیں اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے غزار اب بھی اس ایک تصویر کو گھور رہا تھا۔ بیوی کی بات سن کر اس نے آنکھیں چڑھائیں۔

"ایسا تم عورتوں کو لگتا ہے۔" اس کی انگلی اب اسکرین کے پور پور پر اس عورت کو چھان رہی تھی، آنکھوں میں ڈھیروں چاہت تھی، رشک تھا۔ "لیکن مرد ہمیشہ خوبصورتی چہرے پر ہی ڈھونڈتا ہے۔"

ظبیہ نے نلکہ کھولا تو ٹھنڈے پانی کی دھار اس کی پسینے سے شرابور انگلیاں دھو گئی۔ اس نے مایوسی سے ڈش واش سے اپنے ہاتھ رگڑنے شروع کر دیے۔

چند لمحات صرف خاموشی تھی۔

تیوریوں پر خفگی جمائے، ظبیہ پھرتیلی حرکات سے ایک کے بعد ایک پلیٹ پر صابن گھس رہی تھی۔ اسے کچھ چبھا تھا، غزار کی باتوں میں سے کوئی گوشہ تھا جو اس کا انتر گھائل کر گیا تھا، لیکن وہ اسے نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ دن اپنے اختتام کو تھا۔ سارا کام سمیٹ کر، بغیر کچھ غلط کیے وہ سونے لیٹ جائے گی۔ آج وہ اپنی محنت اور ضبطِ نفس کو رائگاں نہیں جانے دے گی۔

وہ اور غزار ایک نارمل کپل کی طرح رہیں گے۔ اب وہ اور موقع نہیں دے گی کسی کو بھی ان پر ہنسنے کا، بے شک وہ اکائر ہی کیوں نہ ہو۔ اس آدمی کا سوچ کر وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہری تھی۔ وہ اس پل تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس نے گھڑی کو دیکھا۔ شاید، وہ باہر ہی رہنے والا ہو۔ پھر شانے اچکا دیے۔ مجھے کیا؟

"ہم بھی ٹرائے کریں؟" غزار نے آواز بلند کرتے اسے مخاطب کیا۔

اب وہ کانچ کا گلاس کھنگال کر اسے فوم کے برش سے رگڑ رہی تھی۔ "کیا چیز؟"

"یہ کوسموٹولوجسٹ۔ تمھارے لیے۔"

جلتی اسکرین والا فون لکڑی کی میز پر دھرا چھوڑ کر، وہ کھڑا ہو گیا اور قدم قدم چل کر کچن تک آیا۔ ڈھیلی سفید شرٹ اور کالے کاٹن پجامے زیب تن کیے، اس نے فرج کے ساتھ ٹک کر ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔ ظبیہ نہ سمجھی میں پیچھے گھومی اور اسے دیکھا، سرف والے ہاتھ اب بھی جھاگ سے چھپے تھے۔ "میرے لیے؟ میں ٹھیک ہوں، غزار۔" یکدم اس کا دل ارتعاش میں آکر پھڑ پھڑایا تھا۔

غزار نے ایکائی میں سر نیچے کیا اور اس کے قریب پہنچا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پرے ہٹایا اور اپنی طرف متوجہ کیا۔ "مجھے پتا ہے، جان۔ تم ٹھیک ہو۔ ٹم ٹھیک نہیں، تم بہترین ہو۔ لیکن۔۔۔" اس نے نظریں نیچے کرتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پھنسایا، پھر بہت مان سے اسے دیکھا۔ "اگر کوئی چیز بہتر بن سکتی ہے تو..."

"غزار!" ظبیہ نے فوراً سے بھی پہلے اپنا ہاتھ اس کی ہاتھوں کی کڑی سے باہر نکالا۔ سیاہ مسکارے میں رنگی بھوری آنکھوں کی پلکیں ایک بار بند ہوئیں، پھر دوبار۔ اس کے چمچماتے کتھئی آئینوں میں حیرت تھی، عتاب تھا۔

"آپ۔۔۔" اس کے لب مشکل سے حرکت کر رہے تھے، الفاظ حلق کی کھال سے چپک رہے تھے۔

"آپ خود کو سن رہے ہیں؟ آپ کیا، آپ یہ کیسے۔۔۔"

غزار نے اس کا چہرہ چھونا چاہا لیکن اسے نے قوت کے ساتھ اس کا بازو دور ہٹایا۔ اس نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ "ظبیہ، میری جان، پلیز۔ بی پریکٹیکل۔ ایسا کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔ ایک آفر کی ہے، شوہر ہوں تمھارا، کر سکتا ہوں۔ میری اتنی استطاعت ہے کہ میں سرجری افورڈ کر سکتا ہوں۔ ہر کسی کی نہیں ہوتی۔ تمھیں نعمت کی ناشکری کرنی ہے؟"

"سرجری کرنی ہی کیوں ہے؟" اس نے چیخ کر سوال کیا، پلکیں بھیگ رہی تھیں اور سینے کے حدود میں قید دل آنتوں تک گر چکا تھا۔

غزار نے اس کے آنسو پونچھے۔ "ادھر دیکھو۔ تمھیں بہتر نہیں بننا؟ تم ایک فریش شروعات نہیں چاہتی ہمارے لیے؟ ظبیہ۔۔۔" اس نے آگے ہوتے اس کی آنکھوں میں خود کا عکس تلاشا۔ "ہم بہت کچھ غلط کر چکے ہیں۔ میں اب ٹھیک کرنا چاہتا ہوں سب۔"

اس کے آنسو گر رہے تھے، گرم لاوا کی طرح اس کے گالوں پر دراڑیں پیدا کر رہے تھے۔ بلکتے ہوئے اس نے سر یہاں سے وہاں ہلایا۔ "میں یہ نہیں کر سکتی۔ نہیں، غزار۔ آپ یہ مجھ سے نہیں کروا سکتے۔۔۔"

"شششش۔" اس کے شوہر نے آہستہ سے اسے اپنی آغوش میں گھیر لیا، مضبوط بازو دونوں اطراف سے اس کے گرد لپیٹ لیے۔ اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی جماتے، اس نے سرگوشی میں اسے دلاسہ دیا۔ استہزاء کا کیا قصہ تھا، زخم دینے والا ہی رونے کو کندھا بخش رہا تھا۔

"بس، بیہ۔ میں ادھر ہی ہوں۔ تم تو مضبوط ہو۔ اتنی پیاری، اتنی اچھی بیوی ہو۔ ہمیشہ میرا خیال رکھتی ہو۔" ایک ہاتھ سے اس کی لٹیں کان کے پیچھے اٹکائیں۔ "تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں تمھاری حفاظت کروں گا۔ سب بہت اچھا ہو گا۔"

ظبیہ نے کمزوری سے سر نفی میں دائیں بائیں گرایا اور اس سے دور ہوئی۔ پیچھے بیسن تھا اور آگے وہ۔ آنسو خشک ہو کر اس کے سرخ ہوئے گالوں پر جم گئے تھے۔

"نہیں۔" انکار ہمیشہ سرگوشی سے شروع ہوتا ہے۔ ظبیہ یمین نے بھی آج ابتدائی قدم اٹھا دیا تھا۔ "میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔"

غزار نے تو اس کی بات ہوا میں پرندے کی طرح جھونک دی۔ "بیہ، تم وقت لو۔ سوچو، سمجھو۔ تمھارا شوہر ہوں، کچھ سوچ کر کہہ رہا ہوں۔"

"کیا سوچ کر کہہ رہے ہیں؟" آنسوؤں کے باعث، اس کی آواز خاموش ہو گئی تھی، الفاظ سپاٹ اور لہجہ سرد تھا۔ "آپ صرف اپنے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح۔"

وہ ایک لمحہ رکا اور پھر چونک کر ہنس دیا۔ اس کے برابر بنے کاؤنٹر کو پکڑتے اس نے محظوظ سے انداز میں گردن ترچھی کی۔ "اچھا؟ میں صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں؟ یہ کس نے کہا تم سے؟"

"کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آنکھیں ہیں میری، دماغ بھی۔" وہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہر لفظ توڑ توڑ کر ادا کر رہی تھی۔ "اور زبان بھی۔"

غزار کی مسکراہٹ بدل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے اس کے الفاظ اندر اتارے پھر واپس اس کی جانب راغب ہوا۔ "اور آج تم نے سوچا کہ اس زبان کے جوہر دکھائے جائیں۔ ہمم؟" وہ ایک قدم آگے آیا اور ظبیہ پوری طرح سے قید ہو گئی۔ اس نے پھر بھی نگاہ داری میں رکاوٹ نہیں آنے دی۔

"میں سرجری نہیں کرواؤں گی۔" بہت دھیرج کے ساتھ بات جاری رکھی۔ "آپ زبردستی نہیں کرسکتے ورنہ۔۔۔"

"اوہ!" وہ ہنس دیا، تراشیدہ گال مسرور مسکان میں اوپر اٹھے۔ "انٹرسٹنگ! ظبیہ یمین کے پاس تو آج 'ورنہ' بھی تیار ہے۔ سنائیے، بیگم صاحبہ، کیا کریں گی ورنہ؟"

"میں۔۔۔ میں پولیس کو بتاؤں گی۔ ہر وہ چیز بتاؤں گی جو آپ نے میرے ساتھ غلط کی ہے۔ میں ظلم سہہ سکتی ہوں، غزار، بربریت نہیں۔" وہ ہانپ رہی تھی۔

اس کی مسکراہٹ اب بھی کم نہیں ہوئی۔ غزار نے چہرہ جھکاتے ایسے ہنسی دبائی جیسے وہ کوئی اعلیٰ لطائف کی کتاب سے اسے اقتباسات پڑھ کر سنا رہی ہو۔

"کیا بتاؤ گی پولیس کو؟" اس نے اس کی طرف دیکھتے سوال کیا۔ "یہ کہ میں تمھیں پالتا ہوں یا یہ کہ میرے علاوہ اس دنیا میں تمھیں کوئی پوچھنے والا نہیں؟ یہ کہ تمھارے باپ نے پیسوں کی لالچ میں تمھیں میری زندگی میں جھونک دیا تھا یا یہ کہ تمھارا منگیتر شادی والے دن آیا ہی نہیں تھا؟" اس نے آگے ہوتے اپنا ماتھا ظبیہ سے ٹکرایا۔ بھوری رنگت والی لڑکی نے ضبط سے آنکھیں منچ لیں، پلکوں کی قید سے ایک آنسو بحال ہوا۔

"یا پھر یہ کہ تم کبھی ماں نہیں بن سکتی اور میں پھر بھی تمھیں پانچ سال سے جھیل رہا ہوں؟" اس نے اس کی ٹھوڑی جکڑی اور مجبوراً آنکھیں کھلوائیں۔ "تمھیں تو عورت ہونے کا بھی حق نہیں ہے، ظبیہ یمین۔"

ہاتھ اٹھا تھا، لیکن مظلوم کا۔ ظبیہ نے بے قابو دھڑکتے دل کے ساتھ اسے گھورا جو دو قدم پیچھے ہوئے اپنا لال پڑتا گال تھاما ہوا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی، آنکھیں غصے سے سرخ جل رہی تھیں۔

"ہمت کیسے ہوئی آپ کی ایسی گھٹیا بات کرنے کی!" اس کا چہرہ دہک رہا تھا، سینے میں آگ کا دریا ابل رہا تھا۔

"اگر میں عورت نہیں تو آپ بھی کسی زاویے سے انسان نہیں!"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی للکار پر غزار بڑے ڈگ بھرتے قریب پہنچا اور اس کے بال گدی سے پکڑ کر آگے کھینچے۔ وہ بے اختیار چلائی اور اس کی گرفت چھڑانی چاہی مگر اس سے چھ انچ لمبا وجود پہلے ہی اسے بیسن کی دیوار میں دھنس رہا تھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میرے ٹی وی پر کسی اور کا چینل نشر ہو رہا ہے؟" اس نے غراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ظبیہ کا درد، ان ذلت بھرے الفاظ کی تکلیف دو پل میں فنا ہو گئی جب اسے اندازہ ہوا کہ اس کے شوہر کا اشارہ کس طرف تھا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ بول اٹھی۔

"او، یو نو 'کیا'، ظبیہ!" وہ اچانک بھرپور توانائی کے ساتھ جگمگایا۔ اس کے بال اپنی مٹھی سے آزاد کیے اور فوراً ہی اس کا بازو پکڑ لیا۔ بغیر پیچھے دیکھے، وہ اسے کھینچتا ہوا گھر کے لاؤنگ روم تک لایا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دور پھینکا۔

ظبیہ نے آستین کے اوپر سے اپنی کہنی سہلائی جہاں اس کے ہاتھ نشان چھوڑ گئے تھے اور گردن اٹھا کر اپنے شوہر کو جانچا جو دائیں سے بائیں اور واپس بائیں سے دائیں ٹہل رہا تھا۔ چہرے پر امڈ تا پسینہ اس نے شرٹ کے کھلے کف سے صاف کیا اور ہاتھوں کی مٹھی بنائے اپنی ٹھوڑی مسلی۔

تھوڑے وقت بعد وہ واپس اس کی طرف گھوما۔ وہ قریب آیا تو وہ دور ہٹی۔

سر ہلاتے وہ کسی بات پر انکاری لگتا تھا۔ "نو، نو، نو۔ یہ تم نہیں ہو سکتی، ظبیہ۔ پانچ سال سے تمھارے ساتھ ہوں۔ تم نے کبھی آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا نہیں اور آج۔۔۔" وہ استہزاء سے مسکرا دیا۔ "آج تم نے مجھے تھپڑ بھی مار دیا۔ اتنا جلدی گلو اپ تو کسی کا بھی نہیں آتا۔ نو، نو۔"

اس کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو سب ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ کیا اسے سب ٹھیک کرنے کی سزا مل رہی تھی؟

"غزار، مجھے معاف کر دیں۔۔۔" وہ بے اختیار اپنے گھٹنوں پر پھسل گئی اور ہتھیلیاں ساتھ مسلنے لگی۔ "مجھے نہیں پتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اللہ کا واسطہ، رحم کھائیں مجھ پر۔" آنسوؤں سے اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"تمھیں نہیں پتا؟" وہ بے یقینی میں بڑبڑایا، پھر اس کے سامنے اکڑو بیٹھا۔ "میں یاد کروا دیتا ہوں۔ نو پرابلم ،ڈیئر وائف۔ دیکھو، سب سے پہلے تم نے کافی 'پیں پیں' کی اس بات پر کہ میں تمھاری پلاسٹک سرجری کروانا چاہتا ہوں۔ آئی مین، واقعی؟ تم دیکھ رہی ہو تم کتنی بچکانہ ہو، بالکل کسی بگڑے ہوئے بچے جیسے۔ اینی ویز، آگے بڑھتے ہیں۔ نیکسٹ، اور یہ سب سے فنی تھا، وہ یہ کہ تم نے کہا میں صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں اور میں تم پہ۔۔۔" رک کر ظبیہ کا چہرہ دیکھا جو ہتھیلی سے اپنے آنسو رگڑ رہی تھی اور پھر مسکرا دیا۔

"میں تم پہ ظلم کرتا ہوں! آہا۔ کتنا بڑا اولن ہوں ناں میں! کسے پتا تھا؟"

سافرون رنگے جوڑے میں گری لڑکی نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لب ادھ کھولے ہی تھے کہ غزار نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"میری بات ختم نہیں ہوئی ہے، بیہ۔ ابھی تو شروع ہی ہوئی ہے بلکہ۔ تمھیں پتا ہے تمھاری سب سے عجیب بات مجھے کون سی لگی تھی؟"

وہ سر ہلاتے بلکنے لگی۔ "مجھے۔۔۔"

غزار نے تنگ آ کر آنکھیں گھمائیں۔ "سیواٹ۔ جواب دو۔ اچھا چھوڑو، میں بتا دیتا ہوں۔" وہ خوشی خوشی آگے ہوا جیسے کوئی دلچسپ قصہ سنانے والا ہو۔ "سب سے عجیب بات یہ تھی کہ تم نے بولا تم پولیس کو بتاؤ گی۔"

بھوری آنکھیں خوف سے پھیلیں۔ "آئی ایم سو سوری! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں بس۔۔۔ گرمی لگ رہی تھی۔ میرے منہ سے کچھ بھی نکل گیا۔ پلیز غزار۔"

سامنے بیٹھے مرد کے ابرو تنگ ہوئے۔ "گرمی سے پولیس کی دھمکی؟" اس نے ٹھوڑی پر انگلی تھپتھپائی۔

"زیادہ سینس تو نہیں بن رہا۔" اسے سے پہلے کہ وہ دوبارہ اپنا رونا شروع کرتی، غزار آگے جھکتے مسکرایا۔

"ایک بات بتاؤ، سچی سچی۔"

ظبیہ بغیر آواز کیے اسے تکتی رہی۔

"تمھیں یہ، ہمارا مالک مکان کیسا لگتا ہے؟"

اس کی رگوں میں دوڑتا خون سکڑ گیا، منہ میں قید زبان لوہا بن گئی۔

"اچھا لگتا ہو گا، آئی ایم شیور۔ جوان ہے، خوش شکل ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کو یہی چاہیے ہوتا ہے ناں؟ بات بھی اچھے ڈھنگ سے کرتا ہے۔ تم دونوں ہم عمر بھی ہو۔ خیالات بھی ملتے ہوں گے۔ یونو، ینگ بلڈ (جوان خون)!"

اسے پتا چل چکا تھا کہ اس ریل کی منزل صرف اور صرف ایک تھی۔ پاتال۔

اس نے مسکراتے ہوئے ظبیہ کا ہاتھ تھاما۔ "یہ اسی کہ مشورے ہیں ناں؟ تم اسی کی سکھائی بولی بول رہی ہو۔" آخر میں اس نے اس کی انگلیاں الٹی طرف موڑیں تو ظبیہ کراہ کر رہ گئی۔ وہ سسکیوں کے ساتھ رریار رہی تھی۔

اس نے اس کی انگلیاں کھینچ کر اسے کھڑا کیا اور لاؤنج روم کے درمیان جھونکا۔ قرمزی رنگا قالین اس کے پیروں تلے رل گیا۔ ظبیہ ہانپ رہی تھی، بھوری آنکھیں دہشت سے کھلیں، آس پاس فرار ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے ڈیوائڈر کیبنٹ تھا اور بائیں طرف کانچ کا رکھا لمبا بک شیلف جو صرف ایک ٹانگ پر پائیدار تھا۔ اس کے دو پائے وقت سے قبل ہی جان کی قربانی دے چکے تھے، اور منصوبہ یہ تھا کہ اس شیلف کو گھر سے جلدی فارغ کیا جائے، لیکن سامان صاف کرنے کی فرصت کسی کو میسر ہی نہیں ہوئی تھی۔

"اسے پسند ہے تمھاری شکل۔" غزار اب اس کے قریب بڑھ رہا تھا۔

"کسے؟ آپ کیا بول رہے ہیں؟" اس کے ابرو بھنچے تھے، ہونٹ لرز رہے تھے۔

"ارے، اسے! اسی لیے تو تم اتنا نہ کر رہی تھی پروسیجر سے۔ ہیں نا؟ مان لو، ظبیہ۔ اپنے لیے آسان کرتے ہیں اسے۔"

"غزار، آپ اب بھی کسی تیسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں!" اس کی آواز سرگوشی تھی، التجاء تھی۔

"آپ کو کچھ کیوں نہیں دکھتا؟"

"دکھ رہا ہے، سب دکھ رہا ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔۔۔" وہ دو قدم آگے آیا اور جیب سے کچھ نکالا۔ نقرئی اور سرخ۔ وہ اس کا لائٹر تھا۔

ظبیہ کا دل حلق تک اچھلا، ہونٹ پھیل گئے اور وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔

"غزار! غزار، بس! کیا کر رہے ہیں آپ؟ دور پھینکیں اسے!"

اس کی صدائیں سنی انسنی کر کے لمبی قامت والے مرد نے کنارے پر لگا بٹن نیچے کھینچا تو شعلہ بھڑک اٹھا۔ اس کی سیاہی کی حد تک بھوری آنکھیں بھی اس آگ میں جل کر نمایاں ہوئیں۔

"کیسا لگتا ہے تمھیں وہ؟" اس بار اس کی آواز خالی تھی۔ وہ بتدریج اس کے نزدیک آ رہا تھا، مڑی ہوئی پلکیں، مغرور ناک اور بے تاثر آنکھیں صرف ایک ہی احساس کی ہجے کر رہی تھیں۔

جرم۔ گناہ۔ اپرادھ۔

"وہ، وہ کون؟" ظبیہ پیچھے ہونے لگی تو اس کی کمر ٹی وی اسکرین سے جا ٹکی۔ اس نے نظریں ارد گرد دوڑائیں۔ کوئی ہتھیار، کوئی چیز، کچھ بھی جو اس کی حفاظت کر سکے۔

وہ اس کے عین سامنے آ کر رکا اور ہاتھ میں پکڑا لائٹر جلایا، لال اور نارنجی شعلے یہاں سے وہاں لہرائے۔ اگلا سوال سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ادا کیا۔

"کتنے 'وہ' ہیں تمھارے؟"

ظبیہ دنگ کھڑی اسے تکتی رہے، ایسا لگتا تھا گویا اس کے سارے اعضاء نے ایک ساتھ جراحی کرنے سے مقاطعہ کر لیا تھا۔ بھوری آنکھیں آنسو برسا برسا کر تھک چکی تھیں، روندا ہوا دل اپنی دھڑکنیں گننا بھول چکا تھا، دماغ دفاع اور حملے کی تدبیریں سوچ سوچ کر گھس چکا تھا۔ اس کی زندگی کے پچھلے پانچ سال اس کے سامنے تھے، اس کی خوشیوں اور کامیابیوں کی سب سے بڑی دیوار بنے ہوئے۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے فیصلہ کرنا تھا، کیونکہ انتظار وہ کر چکی تھی۔

"جواب دو۔" لائٹر اس کے منہ کے قریب لاتے، وہ غرایا۔ اس کی جرم سے سیاہ ہوئی آنکھیں امید کی روشنیوں سے کوسوں دور تھیں۔ ظبیہ جان چکی تھی وہ چاہ کر بھی اسے نہیں بچا سکتی تھی۔

ٹھوڑی سے بہتے آنسو پونچھتے اس نے اس کا ہاتھ دور ہٹانا چاہا، تو غزار نے اچانک اس کا جبڑا سختی سے جکڑا اور آگے کھینچا۔ وہ زوردار آواز میں چنگھاڑی اور اس کے شوہر نے ظلم اور زیادتی کے سارے درجے پار کرتے سلگتا ہوا لائٹر ٹھیک اس کے ہونٹوں پر دبایا۔

اسے اپنے گرد سب راکھ بنتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ حواس باختگی سے اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگی، اسے دور ہٹانے کی کوشش کرتی رہی لیکن غزار نے اتنی ہی قوت کے ساتھ اسے ٹی وی اسکرین سے ٹکرایا اور شعلہ ٹھیک اس کے ہونٹوں کی نرم جلد سے ملایا۔ وہ چیخ چیخ کر ہانپ رہی تھی، اس کی انگلیاں اس کے کندھوں میں دھنس رہی تھیں اور پھر اچانک، طاقت کا سیلاب اس میں امڈ آیا۔

اس نے بغیر لحاظ کیے غزار کو اپنے اوپر سے دھکا دیا۔ اس کا پیر کارپٹ کے کنارے میں الجھا تو اس نے سنبھل کر آگے ہونا چاہا لیکن ظبیہ نے نفرت کے ساتھ اسے چھاتی پر ٹھوکر مار کر ایک اور بار پیچھے گرایا۔ وہ چاہتی تھی وہ اس سے دور ہو جائے تاکہ وہ اپنے دفاع کے لیے کہیں بھاگ سکے، لیکن اگلے چند لمحات میں جو ہوا تھا اس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

غزار اپنے پیروں پر پھسلتا بائیں جانب اوندھا ہوا تو اس کے پیچھے کانچ کا شیلف اپنے پائے پر ڈگمگایا۔ اس نے بھاری سانسوں کے ساتھ اس کے دروازے کو پکڑنا چاہا لیکن قدم کچھ اس طرح مڑے کہ اس کی پشت اس سے زوردار آواز کے ساتھ جا ٹکرائی، اور پھر زخمی بک شیلف بھی خود کو قابو نہ کر سکا۔ چھ سے زائد فٹ کی الماری پوری کی پوری اس پر پلٹ گئی۔ کانچ کے ٹکڑے اس کی گردن میں گھونپے اور ایک لمحے میں اس کے جسم کے پور پور سے سرخی رس رہی تھی۔

ظبیہ بے حرکت کھڑی رہی۔ سارا منظر اس کے سامنے ایسا تھا جیسے لال پردے پر چلتا کوئی اوپرا شو۔ گرد و پیش کی ہر آواز نے اس کے کانوں کے پاس دم توڑ دیا۔ وہ اس سب سے دور تھی، بہت دور، یا ہونا چاہتی تھی۔

سر کے بل لیٹے غزار احمد کی آنکھیں چت کھلی تھیں، گھنی پلکیں ابرو سے جڑ چکی تھیں اور آنکھوں کے نچلے حصے میں نمی تھی۔ دونوں بازو اس کے اطراف میں گرے تھے اور سانسیں ٹھہر ٹھہر کر بحال ہو رہی تھیں۔ لکڑی کے فرش پر ہر جگہ کانچ پھیلا تھا۔ نوکیلے، چمچماتے گوشے جن پر خون کے دھبے نمایاں تھے۔ گھڑی کی ٹک ٹک ظبیہ کے بھاگتے دل اور غزار کی نازک سانسوں کے درمیان ایک واضح دراڑ تھی۔

اس نے بمشکل خود کو چلنے پر مجبور کیا، سٹپٹا کر دو قدم پیچھے لینے چاہے تو غزار کی انگلیوں نے نہایت باریکی سے اس کے پیر کو تھاما۔ اس کے چھونے کا وزن کسی پنکھ جتنا تھا، یا شاید اس سے بھی کمتر، لیکن ظبیہ سیدھی نہ رہ سکی۔ اس نے بھاری سانسوں کے ساتھ قدم پیچھے اٹھائے، بھوری آنکھوں میں خوف بھرا تھا۔

"ظبیہ۔۔۔"

فرش پر گرے وجود کی آواز سرگوشی تھی۔ وہ مٹ رہا تھا، اس کی سانسیں گھٹ رہی تھیں۔ سر کے گرد احمر رنگا مائع پھیل کر عریض سے عریض تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لہو کی اس گنگا میں منہ ڈالے بیٹھا ہو۔

وہ تھم گئی، کپکپاتی انگلیاں ہونٹوں کے گرد لگائیں تو آگ سے جلی جلد کا احساس ہوا۔ آنسو، خون، پسینہ، وہ سب میں تیر رہی تھی، سب میں ڈوب رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے؟ اس کی مدد کرے، اس کی بلیڈنگ روکے، ایمبولینس کو کال کرے اور اسپتال لے جا کر اچھی بیویوں کی طرح شوہر کی صحتیابی کی دعائیں مانگے؟

یا بھول جائے؟ اس شخص کو، اس کے خون سے بنتی ان سرخ لکیروں کو، اس کی التجاء سے لیس ان سانسوں کو؟ بھول جائے وہ سارا وقت جو اس نے اس کے ساتھ گزارا، وقت جس میں اس نے اسے چاہا اور اس کی چاہت کی خواہش کی۔

کیا وہ یاد رکھے وہ لمحات جب دھرتی کے اس گولے پر اسے کسی کا ساتھ نہیں تھا سوائے اس کے، جب غزار احمد کی بیوی بننے نے اسے ایک نئی زندگی بخشی تھی؟ کیا وہ دہرائے وہ مواقع جب وہ اسے تیار ہوا دیکھ کر مان سے مسکرا دیا کرتا، اپنے دوست احباب سے اس کا تعارف کرواتے اس کا ہاتھ تھام لیتا اور تسلی دلاتا تھا؟

یا پھر محسوس کرے اس چبھن کو جو اس کے ہونٹ جلا رہی تھی، اس کا دل جھلسا رہی تھی؟ وہ جلن جو اس کے جسم کی پور پور کی شناخت بن چکی تھی، وہ دھبے جو اس کا ضمیر، اس کا اصل داغ چکے تھے؟ وہ چوٹیں جو اس کو گوشت کو پار کر کے اس کی روح میں خراشیں چھوڑ چکی تھیں؟ وہ کیسے بھول سکتی تھی وہ درد، وہ اذیت جو غزار کی ہر دھتکار پر اس کا کلیجہ کاٹ دیا کرتی تھی؟ کیسے فراموش رہ سکتی تھی اس تحقیر سے جس کو اس نے اپنی حقیقت مان لیا تھا، اپنے شوہر کی آنکھوں میں بنتی حقارت سے جس کو اپنا آئینہ تصور کر لیا تھا؟ وہ یہ تو نہ تھی۔ ظبیہ یمین یہ تو کبھی نہ تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ چار دیواری، جو اسے سلامت رکھنے کے وعدے جھٹلا چکی تھی، اس کے درمیان کھڑی لڑکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کون تھی، اور یہ انکشاف اس پر کچھ اس طرح ہوا تھا کہ اب وہ چاہ کر بھی اپنا اصل نہیں بھول سکتی تھی۔

ظبیہ یمین معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ وہ مظلوم نہیں تھی جو لہو دے کر منہ میں زہر کا پیالہ الٹا لے، وہ اپنے غلط کار کے ساتھ نوالہ توڑ سکتی تھی لیکن حلق سے صرف تھوک گزارا کرتی تھی، وہ مار کھا کر اپنے زخم سکھانے کے بجائے دوسرے کی ثابت کھال کو تکا کرتی تھی۔

ظبیہ یمین اپنی آزادی نہیں، اپنے مجرم کی قید خانی کی دعا کیا کرتی تھی۔

فرش پر گرے مرد کے بے حرکت وجود اور خمار آلود آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر، اس نے خوب آہستگی سے ایک قدم پیچھے لے لیا۔ پھر ایک اور۔ پھر اور ایک۔

اس کے انتخاب پر غزار بے اختیار ہنسا تھا، لیکن اس کی مرجھائی ہوئی صورت سے صرف ایک بھاری سانس ہی چھوٹ پائی۔ ہنسی کے زور سے اس کی لال پڑتی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ گرا۔

"یو بچ۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا، یا شاید اتنا ہی کہنا چاہتا تھا۔ اس کی سانسوں نے دم توڑ دیا، بھوری آنکھیں کھلی رہ گئیں اور اس کی نگاہیں تاعمر اس پر محفوظ ہو گئیں۔ وہی جو اس کی قرضدار تھی، وہی جس نے احسان فراموشی کی تھی۔

اپنی چیخ کا گلا گھونٹ کر وہ پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگی اور پھسل کر زمین پر نشست ہو گئی۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگ رہی تھیں، ہر سانس کٹ کٹ کر اس کے پھیپھڑوں میں اتر رہی تھی۔

اپنے گرد بنتے بحرِ احمر کو تکتے، وہ خالی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل، دماغ، سب بھول رہا تھا۔ آنکھ سے ایک تنہا آنسو ٹپک کر اس کی سافرون رنگی قمیص میں جذب ہوا تو کپڑے پر ایک داغ سا امڈ آیا۔

کچھ تھا جو تھم گیا تھا۔

ظبیہ نے دعا کی تھی کہ کاش، وہ 'کچھ' وقت نہ ہو۔

★★★

(حادثے کے دو دن بعد)

جگہ: غزار احمد کا گھر

PM06:34

نیا روز، نئی امنگ لیکن پرانے حالات۔

بانگسار میں بنے اس دو منزلہ بنگلے پر شام کی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ فروری کے اختتامی دن تھے لیکن موسم ویسا ہی تھا جیسے دو ماہ یا دو سال پہلے۔ گرم، تپتا ہوا، آگ برساتا۔

نچلے حصے میں واقع دو کمروں میں سے ایک کا رخ کرو تو وہ گاڑھے قرمزی رنگ کی لکڑی کے دروازے والا کمرہ ہو گا جسے اندر سے بند کیا ہوا تھا۔ دروازے کے نیچے سے امڈتی روشنی کی پٹی کو کھوجو تو آپ اپنے آپ کو کمرے کے اندر پائیں گے۔

اس وسیع و عریض ضخامت کے کمرے کے بیچ و بیچ کنگ سائز بیڈ بچھایا گیا تھا، جس پر ہلکی گلابی رنگ کی چادر چڑھی تھی۔ شام کی مدھم نارنجی روشنی شیشے کی کھڑکیوں سے چھن کر اندر برس رہی تھی۔ لکڑی کے فرش پر ہلتے جھلتے سائے واضح تھے اور قریب مقیم موٹے ستون والے درخت کے پتوں کی سرسراہٹ اس گھر کی واحد آواز تھی۔

کمرے میں بتیاں بجھی ہوئی تھیں، جیسے رہنے والے کو روشنیوں سے سخت چڑ ہو، اسی لیے جو بھی روشنی تھی وہ یا تو مٹتے سورج کی تھی یا گلی میں کھڑی لمبی اسٹریٹ لائٹس کی جو خوبصورت نقرئی شعائیں کمرے کے شیشوں پر انعکاس کر رہی تھیں۔ کوالالمپور میں عصر کا وقت تکمیل ہونے کے در پر تھا۔

پلنگ کے ہتھے پر بیٹھی ظبیہ نے ہتھیلی اپنی ٹھوڑی پر مسلی اور وہاں موجود پسینہ صاف کیا، پھر دونوں ہاتھ آپس میں پھنساتے، ناہموار ہوتی سانسوں پر قابو پانا چاہا۔ اس نے آسمانی نیلے رنگ کی قمیص پر ڈھیلی ڈھالی جینز پہن رکھی تھیں، سفید دوپٹہ اس کے پیچھے بیڈ پر جھری زدہ ہوا پڑا تھا۔ بال کل کی طرح ہی بندھے تھے لیکن لگتا تھا اسے پچھلی رات کی بات سے ان مین کنگی پھیرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

چہرے پر چمکتا پسینہ، آنکھوں کے ڈلوں میں عیاں سرخی اور واضح انداز میں جلے گلابی ہونٹ، سب کچھ کل تھا۔ آج آیا ہی نہیں تھا۔ ظبیہ اس لمحے سے نکل ہی نہیں پائی تھی۔

اس نے کمرے کے دوسرے حصے کی طرف نظریں موڑیں جہاں مضبوط لکڑی کی ونٹیج طرز پر مبنی گہرے سبز رنگ کی سائڈ میز اپنے چار پائیوں پر کھڑی تھی۔ آنکھوں نے پلکیں جھپکائیں اور اس کی نظر کا زاویہ میز پر سجی کتابوں اور پنی چڑھے لیمپ سے ہوتا برابر دیوار کے ساتھ ٹکے ساکت مجسمے کی جانب گھوما۔

وہ مجسمہ اینٹ یا پتھر نہیں تھا، وہ سیمنٹ سے گوندا یا ہاتھوں کی نفاست کا کمال نہیں تھا۔ وہ تو کھال تھا، انسانی جسم جس کی پور پور میں زندگی ہوا کرتی تھی۔ اس کے نقوش کسی میوزیم کی زینت نہیں بلکہ حاکمیت اور قیادت کا چترام تھے۔ لیکن آج وہ بجھے ہوئے تھے، اس کا ہر جزو سانس کی رمق سے خالی تھی، اندھیر۔

سفید بال ماتھے پر جھول رہے تھے، سہر انگیز آنکھیں اپنے جالوں میں قید تھیں اور ہونٹ چپک کر نیلے پڑ چکے تھے۔ وہ بے جان، بے حرکت سا کونے میں ڈھے گیا تھا، ایسے کے جیسے کوئی وزنی بوری ہو جسے مزدور نے پہلی جگہ دیکھتے ہی ٹھکانے لگا دیا ہو۔

ہمارا مزدور اور کوئی نہیں بلکہ وہی تھی۔ ظبیہ نے کوفت سے غزار کے بیس گھنٹے سے مردہ صورت کو دیکھا اور ایک بے زبان گوہار کے ساتھ سر اپنی ہتھیلیوں میں گرا لیا۔ کاش، انسانی جان بھی ڈیٹول واریرز کے گیم کی طرح ہوتی اور مرتے ساتھ ہی لاش دھواں دھواں ہو کر غائب ہو جاتی۔ کیا ضرورت ہے اتنی لمبی فوڈ چین کی؟

ہم جانور کھائیں، جانور پودیں کھائیں اور پودے ہمیں کھائیں۔ ظبیہ کو یقین تھا غزار کو کھا کر تو کسی پودے کا پیٹ بھی نہیں بھرنا تھا۔

اس نے جھنجھلاہٹ میں اپنا ماتھا مسلا۔ تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، ظبیہ۔ پھر سیدھی ہوئی اور لاش کو گھورتے، اپنا باسی ہوا دماغ دوڑانے کی جدوجہد کی۔ اسے کیا کرنا تھا؟ اسے کچھ کرنا تھا۔

اسے حیرت تھی اپنے ٹھوس رویے پر اور خوف تھا اپنے اندر بنتے اس ٹھہراؤ پر۔ وہ کیا بن گئی تھی؟ اسے کل سے رونا نہیں آیا تھا، نہ ہی کوئی پچھتاوا محسوس ہوا تھا۔ ظبیہ، جس کی آنکھیں ٹی وی پر کسی ہنستے کھیلتے بچے کو دیکھ کر نم ہو جایا کرتی تھیں، اُس کے سارے چشمے خشک ہو چکے تھے۔ بنجر۔ ایک دم ویران۔

سست حرکات کے ساتھ اس نے پیر فرش پر اتارے اور خود کو پلنگ سے نیچے منتقل کیا۔ وہ دھیمی چاپ سے دیوار میں نصب سفید کناروں والے پوری لمبائی کے آئینے تک جا پہنچی۔ مغرب کی روشنی اب اس کی پشت پر تھی۔ دھواں دھواں ہوتی شعاعیں اس کے بالوں سے ٹکرا کر انھیں سونے کے زرد رنگ سا اثر دی رہی تھیں۔

اس نے اپنا عکس اپنے روبرو حاضر ہوتے دیکھا۔ آج ظبیہ یمین کی عدالت میں ایک شیطانی مجرم، ایک قاتلہ کی پیشی تھی۔ پانچ فٹ چار انچ کی فریق ثانی جرم سے سیاہ ہوئی کتھئی آنکھیں لیے اسے تک رہی تھی۔ سیاہ گھنگریالے بال گانٹھوں میں جکڑے ہوئے تھے، کپڑوں میں بھی ایک عجیب سی الجھن عیاں تھی۔ ظبیہ شیشے کر پار سے بھی اس کے پاس سے اٹھتی موت اور خون کی بو اپنے وجود میں رستی محسوس کر سکتی تھی۔ کتنی بہائم سیرت تھی وہ جو اپنے ہاتھ کسی دوسرے کے خون میں رنگ آئی تھی۔ ایسی لڑکی بن سکتی تھی کیا کسی کی بیٹی، کسی کی بہن، کسی کی بیوی؟ کیا اسے ماں بننے کا شرف دے گا اس کا رب؟ بالکل نہیں۔ قاتلہ تھی وہ! جان لینے والی۔ وہ جو بغیر ڈکار کے اپنا سارا گھر ہضم کر گئی۔ وہ جس کی تعبیر اور تدبیر دونوں ہی عذاب تھا، ایسا عذاب جس میں دنیا نہیں اس کا اپنا آپ اس سے کوسوں دور بھاگے۔

اس نے گردن ترچھی کی تو آمنے کھڑی راکشس نے بھی اس کی نقل اتاری۔ اسی پل ظبیہ کو اپنے آپ پر نفرت کا پلندہ ٹوٹتا محسوس ہوا اور اس کی انگلیاں بے رحمی سے اپنی ہتھیلی میں قید ہو گئیں۔

تو وہ نقل چور بھی تھی!

اس کی معافی، اس کی توبہ کیسے قبول ہو سکتی تھی؟ ظبیہ نے اس جیسے سو دیکھے تھے اپنے باون انچ کے ایل ای ڈی پر، جہاں مجرم اور اس کے جرم کی تفصیلات مصالحہ دار خبروں میں پڑھی جاتی تھیں۔ قتل، خون، دشمنی۔ سب ایک جیسے ہوتے تھے، خون کے پیاسے، جنم سے ہی نمک حرام! کتنا آسان تھا ان کے لیے چاقو اٹھانا، بغیر آواز کی پستول پکڑے کسی کی کھوپڑی اڑا دینا۔ غیر انسانی مخلوقات جو معافی اور توبہ کی آسائش پر بھی حق نہیں رکھتے۔

یہی تھی ظبیہ اور یہی تھا اس کا فیصلہ، ہر اس شخص کے لیے جس نے جان لی تھی، دل توڑا تھا اور گھر برباد کیے تھے۔ لیکن آج وہ بک گئی تھی۔ کسی نے اسے بغیر بتائے خون کا پیالہ پکڑا دیا تھا اور اس بدھو نے سارا کا سارا اندر اتار لیا تھا۔ وہ بدل گئی تھی، خود کی ہی نظروں میں دھوکہ کھا گئی تھی۔ اس کی توبہ چھن گئی تھی، اس کا صبر ضائع ہو چکا تھا۔ صرف ایک پل کی غلطی، ایک لمحے کی خطا اس کی زندگی بھر کا بوجھ بن گئی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

قاتلہ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ منصفہ نے چہرہ موڑ لیا۔ وہ بک چکی تھی، خیانت کار تھی، امن و قانون کی پاسدار نہیں بن پائی تھی۔ وہ اس فاسق مجرمہ کو وہ سزا نہیں دے سکتی تھی جو اس کا حق تھا، کیونکہ وہ حق پر رہنا بھول چکی تھی۔

گھر کے عقبی دروازے کی کھٹ پٹ سنائی دی تو وہ جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہوئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اکائر آ گیا تھا۔

وہ کل رات گھر نہیں آیا تھا تو ظبیہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کسی دوست کے گھر رک گیا ہو گا کیونکہ وہ اکثر ایسا کرتا تھا۔ اس سب کے بعد وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ اگر وہ اس پل آجاتا تو وہ اسے کیا جواب دیتی۔ کس طرح لکڑی کے تختوں کے درمیان رستا خون اس نے بلیچ اور سرف سے گھس گھس کر دھویا تھا اس کا علم صرف ظبیہ اور اس کے سرخ ہوئی انگلیوں کو تھا۔ کس دشواری سے وہ اپنے سے وزن میں دگنے مرد کو کندھوں پر ڈال کر کمرے تک لائی تھی اور پھر ان کا تعاقب کرتی خون آلود لکیروں کو سفاہستی سے مٹایا تھا۔ کس طرح اس نے ریزہ ریزہ ہوئی الماری کے ٹکڑے سمیٹے تھے، اور سمیٹنے کے دوران ہی پانچ مختلف جگہ سے اپنے پیر کانچ سے کٹوائے تھے۔ اب بھی وہ لنگڑا کر ہی چل رہی تھی۔ ان سب کے درمیان سب سے مشکل الماری کی لکڑی کو گھر کے باہر منتقل کرنا تھا، تاکہ اگلے روز کوڑا کرکٹ والا اسے اٹھا کر لے جائے۔

اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہانپتی سانس کے ساتھ غزار کے ساکت جسم کو دیکھا جو بیڈ روم کے کونے میں نشست تھا۔ گردن جھکی ہوئی تھی اور چہرہ ظبیہ کو ہر کچھ گھنٹے بعد پہلے سے زیادہ خوفناک نمایاں ہوتا تھا۔ وہ تو رات بھر سو بھی نہیں پائی تھی، بس لاؤنج روم کے چکر کاٹ رہی تھی۔ دائیں سے بائیں پھر بائیں سے دائیں۔

پلنگ پر سے اپنا دوپٹہ اٹھاتے اس نے حلیہ سدھارنا چاہا۔ منہ پر ملنے کے لیے لوشن کی شیشی پکڑی، لیکن گرمی کا اندازہ کرتے گڑبڑا کر واپس الماری پر سجا دی۔ دوپٹے کی تہہ کھولی اور شیفان کی چادر ہوا میں ہلائی، پھر پیچھے سے لا کر سر پر ڈال لی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی ریکارڈ توڑ کوشش کی اور ریکارڈ توڑ بھی دیا، پھر ایک گہری سانس بھرتے کمرے کی چابی پکڑی اور باہر کی جانب قدم اٹھائے۔

کمرے کے باہر آکر اس نے پھرتی کے ساتھ دروازہ چوکھٹ سے لگایا اور کپکپاتی انگلیوں سے چابی سوراخ میں گھمانے لگی۔ تھوڑی اور کھٹر پٹر کے بعد اس نے ہلکا سا دھکا دے کر چیک کیا تو دروازہ بند رہا۔

وہ اپنے ایڑیوں پر پلٹی تو لاؤنج روم میں ڈلے سفید اور سبز صوفہ سیٹ پر اکائر بیٹھا تھا۔ ظبیہ کی مٹھیاں بے اختیار بھینچ گئیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اٹھارہ گھنٹے پہلے اس کا زندہ سلامت شوہر اس سے جوتے اتروا رہا تھا۔

وہ اپنے سامنے کئی کاغذات پھیلائے ہوئے تھا اور لمبی، چمکدار انگلیاں ٹھوڑی کے نیچے جمی تھیں۔ سیاہ بال نفاست سے پچھلی طرف سیٹ تھے اور سپید رنگت مغرب کی نرم گلابی روشنی میں واضح تھی۔ وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں میں قلم تھامے پرچے پر کچھ کاٹ رہا تھا، ساتھ رکھے کیلکولیٹر میں بے ترتیب ہندسے چمک رہے تھے۔ آنکھوں پر چاندی کے پتلی فریمز والی عینک چڑھی تھی۔

ظبیہ ٹھٹک کر رکی اور نظریں آس پاس دوڑائیں۔ صوفے، ڈائننگ ٹیبل،، باورچی خانہ، قالین۔

جوتے، سرجری، پولیس، خون۔

اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو اکائر نے گردن موڑ کر سفید بٹن شرٹ میں ڈھکے کندھے کے اوپر سے پیچھے جھانکا۔ وہ جہاں تھی وہیں تھم گئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تاری کرنے کی کوشش کی۔

"تم آ گئے۔" اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ظبیہ نے اندرونی طور پر خود کو ایک مکا جھڑکا۔

عینک والے مرد نے سر موڑا اور طنزیہ مسکرا دیا۔ "کرائے داروں کو زیادہ مزے نہیں کرنے دے سکتا ورنہ وہ بھول جائیں گے کہ اصلی باس کون ہے۔"

اس بار ظبیہ کی مسکان کچھ حد تک اصلی تھی۔ اس کی پشت کو دیکھتے اسے لگا تھا وہ رو دے گی، وہ ایک بار پھر اس کے سامنے ٹوٹ جائے گی اور وہ کچھ کہے سنے بغیر اس کی ڈھال بن جائے گا۔ یہی تو تھا ان کا رشتہ۔ ظبیہ کو اس روز سے پہلے کبھی سب اتنا شفاف نظر نہیں آیا تھا۔ شاید، اس کے آس پاس بچھے دھند کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

"کہاں تھے تم؟" لڑکی کی آواز خشک تھی جیسے عرصے بعد کسی سے ہمکلام ہو۔ اکائر نے ایک پیپر سے کچھ پڑھ کر دوسرے میں اتارا۔ "بے فکر رہو۔ جیل میں نہیں تھا۔"

"جیل؟" اس کے منہ سے بے لگام چھوٹا۔ "تم جیل میں کیوں ہو گے؟ کون۔۔۔ کیسی جیل؟" وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے بول رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کوئی ڈیلی اسکور پورا کرنا ہے کیا ۳۰۰ دفعہ 'جیل' بول کر؟"

ظبیہ نے گڑبڑا کے پلکیں جھپکیں۔ "نہیں۔۔۔ عجیب۔ سر مت کھاؤ میرا۔ واپس جاؤ جہاں سے آئے ہو!"

آخر میں وہ کچن کی طرف چل دی۔ اُس شخص کی باریکی اسے عجیب کر دیتی تھی۔ ہمیشہ سے۔

"مشکل ہے۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں، وہاں آؤں گا نہیں۔" بے نیازی سے پرچے پر قلم چلایا۔

ظبیہ کولر کے سامنے کھڑی پانی نکالنے لگی، پیر لاشعوری طور پر زمین تھپتھپا رہے تھے۔ گلاس منہ تک بھر کر اس نے کنارہ لبوں سے لگایا ہی تھا کہ۔۔۔

"او، ایک فیور دے دو۔ غزار کو بلا دو۔ کچھ اخراجات ڈسکس کرنے ہیں۔"

پانی اس کی ناک میں چڑ گیا تو وہ بے اختیار کھانسی۔ گلاس کپکپاتی انگلیوں سے واپس سلیب پر رکھا اور اوندھے ہوتے سارا پانی تھوک کی صورت باہر نکالا۔

اکائر اس بار پوری طرح گھوما تھا صوفے پر۔ پریشان تاثرات لیے اس نے اس کی خیریت دریافت کرنی چاہی۔

"میں۔۔" کھانسی۔ "ٹھیک۔" کھانسی، کھانسی۔ "میں ٹھیک ہوں۔ غزار، وہ۔۔۔" فریب کے سمندر میں سو ہزار مچھلیاں تھیں کذب کی۔ ظبیہ نے بھی اپنا شکار چن لیا تھا۔ "بزنس ٹرپ پر گئے ہیں!"

سفید بٹن شرٹ والے نے ابرو سکیڑے۔ "بزنس ٹرپ؟ کب؟"

ظبیہ اب پانی چھوڑ چھاڑ کر لاؤنگ روم میں واپس آ رہی تھی۔ اس نے ضرورت سے زیادہ مسکراتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ "کل رات۔ جب تم نہیں تھے۔"

"اتنا اچانک؟" ایک تو یہ بی بی سی کتنے سوال کرتا ہے۔ آسمانی نیلے رنگ کی قمیص پہنی لڑکی نے جبراً سر ہلایا۔

"پلین تو پرانا تھا لیکن کل ہی طے پایا۔ ان کی جاب تو۔۔۔ یو نو ہاؤ اٹ از۔"

"ہمم، اوکے۔" وہ زیادہ کچھ کہے بنا آگے مڑ گیا۔ ایک بار پھر اس کی انگلیاں کیلکولیٹر پر بٹن دبانے لگیں تو ظبیہ نے سکھ کا سانس اندر کھینچا۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ یہ محاورہ اسے سچ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"بائی دی وے، الماری کہاں گئی یہاں والی؟" اس نے پین سے کمرے کی دوسری طرف اشارہ کیا جہاں جگہ خالی تھی۔ ظبیہ کا دل ہل کر رہ گیا۔ اس نے خود کو آگے جھک کر خون کے دھبے چیک کرنے سے روکا۔ اللہ تعالیٰ پلیز، میری صفائی کی لاج رکھ لیں۔

"وہ!" وہ اچانک اتنا پرجوش ہو کر بولی کہ وہ تک سٹپٹا گیا۔ "اتنی گھٹیا، دو نمبر الماری تھی۔ تمھیں شکر کرنا چاہیے میں نے جان چھڑوا دی تمھاری۔ جب دیکھو لنگڑی لولی جھولتی رہتی تھی یہاں سے وہاں۔ اتنی کیا محبت تھی تمھیں اس سے؟ جہیز کی تھی کیا؟"

اکائر اسے ہکا بکا سا دیکھا گیا، عینک کے پیچھے چمکتی سرمئی آنکھیں حیرت میں فراخ تھیں، اور پھر وہ آہستہ سے ہنس دیا۔ نرم، پرخلوص ہنسی۔ ظبیہ نے ایسی شاید اس پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"تم ایک الماری کی جسمانی معذوریوں کا مذاق اڑا رہی ہو؟" وہ مسکراتے ہوا بولا۔ ظبیہ بھی رک گئی اور اس کے چہرے پر پھیلتی گلابی کو دیکھتے مسکراہٹ واپس لوٹائی۔

"میں کسی کو نہیں بخشتی۔" وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور ڈرامائی انداز میں آنکھیں گھمائیں۔ ڈرامہ ہی تو تھا۔ کیا واقعی۔۔۔ ڈرامہ ہی تھا؟

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔ ظبیہ کو لگا کچھ بدل رہا ہے، اس کے اندر، اس کے باہر۔ اس کا دل دہک اٹھا تھا، کان گلابی پڑ رہے تھے۔

اس سارے مکالمے میں اکائر نے پہلی بار اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "تمھارے منہ پر کیا ہوا؟" اس نے سوال اٹھایا۔

اس نے ٹھٹک کر انگلیاں اپنی ہونٹوں کی لال ہوئی جلد پر لگائیں۔ "اسٹریٹنر سے جل گیا۔"

"اتنا گہرا؟"

لڑکی نے اسے دیکھا۔ "اس سے بھی گہرا جل سکتا ہے۔ تم نے کتنی بار کیے ہیں بال اسٹریٹ؟"

اکائر نے ہنس کر ہاتھ اٹھا دیے تو وہ مسکرا دی۔

"کیا لکھ رہے ہو؟" اس نے بات گھماتے اس کے کاغذات کی طرف اشارہ کیا۔

"نظم، اپنی یک طرفہ محبت کے نام۔" پین پر ڈھکن لگاتے فخریہ اعلان کیا۔

ظبیہ کے ہونٹ پھیل گئے، چہرے پر واضح مسکراہٹ بھی کھل گئی۔ اس کی دھڑکن اس کے کانوں تک بلند ہوئی۔ وہ نہ سن سکی تھی، نہ بول سکی تھی۔ بس گنگ سی سامنے براجمان مرد کو تکتی رہی۔

اکائر نے اس کے تاثرات بھانپے اور سیدھا ہوا۔ "مذاق تھا، لڑکی۔ یہ دیکھو۔۔۔ آفیس کا کام ہے۔" اس نے ایک فائل اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے ہلائی۔ ظبیہ کچھ پڑھ بھی نہیں پائی۔

"تمھیں واقعی میں شاعر ٹائپ بندہ لگتا ہوں؟" اس نے استہزاء سے اسے دیکھا۔

ظبیہ نے مشکل سے سر دائیں بائیں کیا پھر تھوڑا سا مسکرا دی۔ اب کہ مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ "مجھے کیسے پتا ہو گا؟"

اکائر نے اس سے نظریں ملائیں۔ گلابی شام اور سرخ ہوئے دل، بھورے نگینوں کا عکس سرمئی شیشوں پر، سبز رنگ صوفے ان کے رازدار اور زرد چمکتی روشنی، انگنت رنگ تھے ان کے ارد گرد، پھر بھی دنیا بجھ کر سیاہ اور سفید کیوں ہو گئی تھی؟

"صحیح کہہ رہی ہو۔ تمھیں کیسے پتا ہو گا؟" وہ مسکرا کر واپس اپنے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا تو ظبیہ کو اپنا آپ وہاں بیٹھا بے قصد معلوم ہوا۔ وہ بھی خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

کمرے کی طرف بڑھتے اس نے ایک آخری بار اس کی پشت کو دیکھا تھا۔ بہائم سیرت قاتلہ کی آنکھیں اب خالی نہیں تھیں۔ وحشت، جرم اور گناہ کے علاوہ بھی آج کچھ تھا ان میں۔ لیکن اس کا اعتراف اس کی سزاؤں میں سے ایک تھا۔

★★★

غزار کی موت کو چوبیس گھنٹے بیت چکے تھے اور ظبیہ کو ڈر تھا کچھ وقت میں سارا گھر اس سے باخبر ہو جائے گا۔

اس نے گوگل کھول رکھا تھا اور یہ بھی پڑھ لیا تھا کہ لاش کو بوسیدگی کی انتہا تک پہنچنے میں تقریباً چوبیس سے اڑتالیس گھنٹے لگتے ہیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے اگلے چوبیس گھنٹے تشویشناک تھے اور اسے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔ لیکن کیا؟

غزار کا فون وہ سوئچ آف کر کے دراز میں جھونک چکی تھی۔ اس کی خون میں لت پت ٹی شرٹ بھی دھو دھا کر صاف کر دی تھی اور اسے ایک سادہ کالے رنگ کا کرتا پہنا دیا تھا۔ وہ الگ بات تھی کے کپڑے اس کی گردن سے نیچے اتارتے ہوئے اسے انتہا کا خوف تھا کہ وہ بھی اٹھ بیٹھے گا اور بن آواز اس کی جان لے لے گا۔ خون اس کے جسم سے ضائع ہو چکا تھا، اس کا سر پھٹا تھا اور حملہ سیدھا پچھلی طرف ہوا تھا۔ ظبیہ نے

زیادہ غور نہیں کیا تھا، لیکن اسے اٹھاتے وقت اس نے چند کانچ کے ٹکڑے اس کی گردن میں چبھے نظر آئے تھے۔

مرحوم کے خاندان کی فکر کرنے کی اسے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ظبیہ کو جہاں تک علم تھا غزار کی پہلی شادی سے اس کا ایک بیٹا تھا جو اب اپنی بیوی کے ساتھ پرتگال میں ہوا کرتا تھا۔ اپنے باپ سے اس کے سارے رابطے منقطع تھے کیونکہ طلاق کے وقت غزار نے اس کی ماں کو بہت ستایا تھا۔ ظبیہ نے شکر کیا کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ پرتگال کہاں تھا۔ اس کا مطلب دور ہی تھا۔

اسے ایک پلین بنانا تھا، اپنا escape plan!(فرار کا منصوبہ۔)

ہاتھ میں کاپی پین پکڑے اس نے بیڈ پر چوکڑی ماری اور سائڈ لیمپ کھولا۔ ادھ کھلے سیاہ گھنگریالی لٹیں اس کے آس پاس جھول رہی تھیں، سنہری روشنی میں موم بتی کی لو جیسی چمکدار۔ کھڑکی کے باہر سر نکالو تو بانگسار چاندنی رات کے حوالے تھا۔ فروری کے دن اپنے اختتام کو پہنچ رہے تھے، آئندہ سال لوٹنے کے لیے تیار۔ لیکن اگلا سال کس نے دیکھا تھا؟ اگلا ماہ کس نے دیکھا تھا؟

قلم تھامی اس کی انگلیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ وہ کیا لکھے؟ کہ وہ قاتلہ تھی، کہ وہ اپنا قتل چھپا رہی تھی، کہ اس نے خود کو خود ہی کہ ہاتھوں بیوا کر دیا تھا، کہ اس نے اپنے تڑپتے میاں پر ترس نہیں کھایا تھا؟

ظبیہ نے آنکھیں سختی سے بند کیں۔ نہیں۔ وہ اس وقت خود کو جذباتی نہیں ہونے دے گی۔ پھر واپس سفید پرچے کو دیکھا اور قلم کی نوک کاغذ پر جمائی۔ نیلی سیاہی میں ڈوبا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ زبان سے ہونٹ گیلے کیے اور آخر کار نوک گھمائی۔ اب کہ وہ مالائی میں کچھ لکھ رہی تھی۔

پہلا قدم: گاڑی حاصل کرنا۔

یہ جمعرات کی دوپہر تھی اور ظبیہ بنگلے کے کچن اسٹول پر بیٹھی ہاتھ میں قید جامنی بلیک بیری فلپ فون کو تک رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا فون تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سنسان سی گہرائی تھی اور سیاہ بال اونچی پونی ٹیل میں بندھے تھے۔

اسے ایک گاڑی چاہیے تھی، لیکن وہ غزار کی نہیں لے سکتی کیونکہ وہ اسے اس کی کمپنی نے دی تھی۔ گاڑی کو کچھ بھی ہوا تو کمپنی والوں کو معلوم ہو جانا تھا، اور ظبیہ کسی کو بھی کچھ بھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔

اس نے بے دھیانی میں لب کاٹے تو جلن اس کے اندر تک اتر گئی۔ وہ کراہ کر رہ گئی اور انگلیوں کی پوروں سے زخم کو چھوا۔ وہ پرسوں سے سات بار اپنے ہونٹوں پر ٹوتھ پیسٹ مل چکی تھی لیکن جلے ہوئے کا اثر زائل نہیں ہو رہا تھا۔ اسے وقت چاہیے تھا، لیکن اس کے پاس وقت ہی تو نہیں تھا۔

پچھلی رات سے لاش کے پاس سے بساند اٹھنا شروع ہو گئی تھی، معنیٰ کہ غزار کا مردہ جسم اب گلنے سڑنے کے مقام تک پہنچ رہا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا، لیکن گھر میں ایک بڑی ناک والا مالک مکان ضرور تھا۔ خدا کا شکر تھا وہ نچلی منزل پر کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن ظبیہ کو اپنی خوش قسمتی پر بالکل یقین نہیں تھا۔

اس نے آخر کار فلپ فون کی اسکرین کھولی اور بٹنوں والا کی پیڈ اپنے سامنے کیا۔ اب وہ سست رفتاری سے کوئی نمبر ملا رہی تھی، تاثرات سے وہ اب بھی پوری طرح آرام دہ نہیں لگتی تھی۔

فون کان پر لگایا تو دوسری طرف رنگ جانے لگی۔ فراخ کھڑکیوں سے چھن کر آتی دھوپ لوہے کی اسٹول کے پائے سے ٹکرائی اور ظبیہ نے دعا کی کہ اس کے پرانے محلے کی دوست اسے بھولی نہ ہو۔

اچانک گھنٹی بند ہوئی اور ایک نرم، نسوانی آواز لائن پر کھنکاری۔ "ہیلو؟"

ظبیہ فوراً سیدھی ہوئی۔ "ریٹا؟" اس کی آواز میں کیا نہیں تھا۔ خوف، پریشانی، خوشی اور امنگ بھی۔

ریٹا ایک پل کے لیے رکی پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "کون بات کر رہا ہے؟" ظبیہ نے اس کی آواز پر آنکھیں بند کیں۔ آنسو اس کے گال بھگا رہے تھے۔ کتنا کچھ تھا اس کی دوست کی آواز میں، یادیں، گزرے زمانے، اچھے وقت اور بیتے حالات۔

"میں۔۔۔" وہ سانس لینے کے لیے رکی۔ آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے گرا تو اس نے اپنی جلد پر ہتھیلی رگڑی۔ "ظبیہ۔ ظبیہ یمین۔"

اس بار ریٹا کا اشتباہ قابلِ لمس تھا لیکن اس سے پہلے کہ ظبیہ کچھ اور کہہ پاتی وہ اچانک پر جوش سی ہو کر چیخی۔ "ظبیہ! تم!"

اسٹول پر بیٹھی لڑکی کو دونوں میں پہلی بار زندگی محسوس ہوئی تھی۔ شاید، پانچ سال میں۔

"ہاں، میں۔ یاد آئی؟"

ریٹا کی طرف کھڑ پڑ ہو رہی تھی، اس کے پیچھے لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دے سکتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ کسی آفیس میں ہو۔ "تم۔۔۔ کہاں غائب ہو گئی ہو؟ او مائی گاڈ۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ تم نے ٹی ٹی ڈی آئی کیا چھوڑا، سب کو چھوڑ دیا۔ اتنا اچھا ہے کیا تمھارا شوہر کہ میری یاد ہی نہیں آئی؟"

ظبیہ مسکرائی۔ بیچاری ریٹا کو پتا بھی نہیں تھا لیکن وہ دنیا کا اول ترین طنز کر چکی تھی۔

"میں نے ٹی ٹی ڈی آئی کو نہیں چھوڑا تھا، ریٹا۔ اس نے مجھے چھوڑا تھا۔" آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ آیا تو وہ ضبط کر گئی۔ کمبخت پائلٹ۔

"اورائٹ۔" وہ تھوڑی دھیمی پڑ گئی۔ ظبیہ یمین اور اس کی ناکام محبت کی کہانی سے اس کی سہیلی بھی بخوبی آگاہ تھی۔ "تمھارا کوئی کانٹیکٹ نہیں ہوا اس سے؟"

ظبیہ نے ایک بھاری سانس اندر کھینچی۔ "میں کیوں کروں گی اس سے کانٹیکٹ؟ میں شادی شدہ ہوں۔ اور ویسے بھی۔۔۔" اس بار اس کا انداز کڑوا تھا۔ "جو اس نے کیا تھا اس کے بعد میں اس سے کیا بات کروں؟ انتیس اگست کو فون اٹھا کر اسے 'ہیپی برتھ ڈے، میٹ!' کہوں؟"

"تمھیں اس کی برتھ ڈے یاد ہے۔" ریٹا کے الفاظ کی مسکراہٹ عیاں تھی۔

ظبیہ کے کان اچانک گرم ہوئے۔ "ہاں، کیونکہ میں ہر سال اس دن سوقیدی رہا کرتی ہوں۔" وہ طنزیہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

ریٹا ہنس دی۔ "او گاڈ، ظبیہ۔ تم تو ویسی ہی ہو۔" اس کی آواز تھوڑی سنجیدہ ہوئی۔ "لیکن رانج ویسا نہیں رہا۔"

وہ سننا نہیں چاہتی تھی لیکن کچھ تھا اس کی دوست کی آواز جو وہ چپ ہو گئی۔ اپنے ناخنوں کو ماربل کے کاؤنٹر پر گھسیٹتے اس نے خود پر جبر کیا۔

"وہ آیا تھا میرے پاس پانچ سال پہلے۔"

ظبیہ کا دل پیچ سے آدھا ہوا تھا۔ وہ بے اختیار ہانپی، جیسے اسے سانس نہیں آ رہی ہو۔

"اس سب کے بعد؟" اس نے خود کو پوچھتے سنا۔

ریٹا نے ہامی بھری۔ "ہاں، اس سب کے بعد۔ آئی تھنک دو مہینے گزرے تھے تمھاری شادی کو۔ اصل میں تمھارے ٹی ٹی ڈی آئی سے جانے کے بعد مجھے بھی دوسرے علاقے میں جاب مل گئی تھی۔ امی کی ذیابطیس کا تو تمھیں پتا ہی تھا۔ ان کے لیے بھی چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی لیے ہم ان دنوں پیکنگ وغیرہ میں مصروف تھے۔"

اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔

"وہ آیا تھا لیکن زیادہ وقت نہیں رکا۔ میں نے اندر بلایا تو وہ بس رہاداری تک ہی آیا تھا۔" ریٹا نے ایک گہری سانس لی۔ "وہ تمھارا پوچھ رہا تھا، ظبیہ۔"

لڑکی نے چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ کاش، ریٹا اسے یہ نہ بتاتی۔ کاش، وہ اسے کچھ نہ بتاتی۔

"کیا پوچھ رہا تھا؟" اس کا لہجہ سرد تھا، غیر طعنہ کن۔

"یہی کہ تم کہاں رہتی ہو شادی کے بعد۔ وہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھول بھی تھے۔"

ظبیہ نے آنکھیں بند کیں۔ کونسے پھول ہوں گے اس کے ہاتھوں میں؟ گلاب؟ گُل بہار؟ گُل نرگس؟ وہ اچانک مسکرائی اور تھک کر آنکھیں کھولیں۔

"تو تم نے اسے میرا پتہ دے دیا تھا؟"

ریٹا نے فون کی دوسری طرف کسی چیز کا گھونٹ بھرا اور پھر چمڑے کی سرسراہٹ کی آواز آئی، جیسے وہ سیٹ میں پیچھے ہوئی ہو۔ "میں کیسے دے سکتی تھی، ظبیہ؟ تم دونوں کی آخری لڑائی میرے سامنے ہوئی تھی۔ اس کے بعد تم نے ہی تو کہا تھا اس سے کوئی رابطہ نہ رکھوں۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ اچانک سنگ دلی سے بول اٹھی۔ "اس کی باتیں رہنے دیتے ہیں۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

لائن کی دوسری طرف لڑکی نے اثبات میں جواب دیا۔ "تم بتاؤ، ملنے کا پلان کریں؟"

ظبیہ نے کان کی لو کھجائی۔ اب مشکل گفتگو کی شروعات تھی۔ "وہ اصل میں آج کل میں تھوڑی مصروف ہوں۔ تمھیں پتا ہے ناغزار کا کام۔ جیولوجسٹ ہیں۔ اسی لیے ہر وقت ٹائٹ شیڈیول رہتا ہے۔"

"ہمم، میں سمجھ سکتی ہوں۔"

اس نے وہیں سے رابطہ جوڑا۔ "لیکن ہم ملیں گے۔" بالکل نہیں۔ "میں پوری کوشش کروں گی۔" میں ملائیشیا سے دور دراز بھاگ جاؤں گی۔ "تم میری دوست ہو، ریٹا۔" تم صرف خطرہ ہو۔

ریٹا خوش سی سنائی دی۔ "ضرور!"

"لیکن تمھاری مدد چاہیے تھی، یار۔" اس نے گھبراہٹ میں دانت پیستے بات چھیڑی۔

"حکم کرو، جانِ من۔"

"وہ اصل میں، غزار کی گاڑی مین ٹیننس کے لیے گئی ہوئی ہے اور ان کا ان کے آفیس کولیگ کے ساتھ پکنک کا پروگرام بن گیا ہے۔ ایک دن کے لیے تمھاری گاڑی چاہیے ہو گی۔۔۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، "مل سکتی ہے کیا؟"

"آف کورس، ظبیہ۔ پانچ سال بعد میری سب سے اچھی دوست مجھ سے کوئی فیور مانگے گی تو میں انکار تھوڑی کروں گی۔ تم مجھے اپنا پتہ ٹیکسٹ کر دو۔ میرا ڈرائیور چھوڑ جائے گا۔"

"ڈرائیور؟" ظبیہ کو حیرت ہوئی تو وہ ہنس دی۔ "ہاں، کُک (خانساماں) بھی ہوتا ہے۔ I am expecting. تو شوہر صاحب کو امڈ امڈ کر پیار آ رہا ہے۔"

اسٹول پر نشست لڑکی کا دل اچانک خالی ہو گیا۔ دماغ کے کونے کونے سے آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ شور، ہنگامہ، رش۔ اس کی بصارت دھندلا رہی تھی۔ لاؤنج روم کی کھڑکیوں سے چھن کر آتی دھوپ ہوا میں گھل رہی تھی۔ سبز و سفید صوفے مٹ کر ایک نیلی راہداری کا سماں پیش کر رہے تھے۔ ظبیہ نے ابرو مسل کر تفکر جھٹکنا چاہا تو اس نے اور تیزی کے ساتھ اس کے دماغ میں چھپی تصویر سے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

نرم پیلے رنگ کی دیواروں میں رنگے کلینک روم میں اس وقت تین نفوس موجود تھے۔ کمرے میں چلتا اے سی گنگنا رہا تھا اور اس کی جالیوں سے چھوٹتی خنک ہوا ہڈیوں تک کو قابض کر لیتی تھی۔

کمرے کے ایک کنارے پر رکھی مشاہداتی میز کے نیلے میٹرس پر اس وقت ظبیہ بیٹھی تھی۔ اس نے اسٹرائپ پرنٹڈ لال رنگ کا ٹو پیس سوٹ پہنا تھا اور سر پر کالے رنگ کا شیفان دوپٹہ گرا تھا۔ چہرے پر ہلکا میک اپ تھا اور ناک میں سونے کی بالی چمچما رہی تھی۔ وہ کم عمر لگتی تھی، لگ بھگ بائیس کے عنقریب۔

اس کی انگلیاں تنگ تھیں اور آنکھوں میں ڈھیروں امید اور توقع تھی۔ وہ گاہے گاہے دروازے کی طرف دیکھتی جہاں تھوڑی دیر قبل ہی ڈاکٹر اس کی رپورٹس لینے گئی تھی۔

اس سے تھوڑے فاصلے پر غزار بیٹھا تھا جو اس کے بے چین تاثرات دیکھتے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے برابر کھڑے ہوتے اس نے مسکرا کر ظبیہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھتے تھوڑا سا مسکرا دی۔

ڈاکٹر کمرے میں واپس آئی تو ان دونوں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ سنہرے چمکتے بالوں والی ڈاکٹر تیس کی قطار میں معلوم ہوتی تھی۔ کالے ہیر ٹائی سے اس نے نیچی سی پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی اور کندھوں سے سفید گاؤن جھول رہا تھا۔ اپنی ہیل پر ٹک ٹک کرتی وہ ان تک آئی اور ہاتھ میں پکڑے نیلے فولڈر کا بٹن کھولا۔

ظبیہ نے غزار کو دیکھا۔ غزار نے آگے جھک کر اس کا ہاتھ تھاما۔

"تمھاری ٹیسٹ رپورٹس تیار ہیں، ظبیہ۔" اس نے پیپرز باہر نکالتے اسے دیکھا اور مسکرائی۔ لیکن کچھ تھا اس کی مسکراہٹ میں جو ظبیہ کو کھٹک گیا تھا۔ کچھ غلط۔ اس کا دل اچانک ڈوبنے لگا۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ تمھاری پوری زندگی تمھارے آگے ہے۔" اس نے کاغذات دیکھتے ایک ٹھنڈی آہ بھری تو ظبیہ کو لگا وہ اس کا کلیجہ چھیل رہی ہے۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ سہمی ہوئی سی اپنے شوہر کی طرف مڑی۔ غزار نے بھی تشویش میں قدم آگے پیچھے کیے۔

"ظبیہ، تمھیں پتا ہے تمھیں Polycystic Ovary Syndrome ہے۔ PCOS بھی کہتے ہیں اسے۔"

"مجھے، مجھے پتا ہے۔" وہ چپ نہیں رہ سکی۔ "ہم یہاں اعلاج کے لیے ہی آئے ہیں۔ غزار، بتائیں نا انھیں۔" اس نے ساتھ کھڑے مرد کا بازو تھپتھپایا۔ سوٹ میں ملبوس آدمی نے نرمی سے سر اوپر نیچے کیا۔

"ایک منٹ، بیبہ۔" وہ ڈاکٹر کی جانب مڑا۔ "آپ بتائیں، میم۔"

"اوکے۔ میری بات تحمل سے سنو، ظبیہ۔" سفید گاؤن والی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "PCOS ہمیشہ ایک پیچیدہ حالت ہوتی ہے۔ اسے کسی ایک طریقے سے سلجھایا یا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ میڈیکل تاریخ میں کئی کیسز ایسے ہیں جس میں PCOS کے باجود بھی کئی عورتیں پریگننٹ ہو پائی ہیں۔"

بھوری آنکھیں امید سے جاگ اٹھیں۔ اس کی انگلیاں لوہے کی میز کے ٹھنڈے کناروں پر تنگ ہوئیں۔

"لیکن۔۔۔" اس کا چہرہ اچانک بجھ گیا۔ گائنی کالوجسٹ کے سنہرے بال سوکھ کر سیاہ ہو گئے، نرم سپید رنگت پر ایک اندھیر سایہ چھا گیا اور اس کی انگلیوں میں پکڑی ظبیہ کی رپورٹس اس کا اعمال نامہ بن گئیں۔ اس وقت وہ جان کی رکھوالی نہیں، موت کی نشر کار لگ رہی تھی۔

"لیکن؟" ظبیہ آگے جھکی، بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ غزار نے اس کا چہرہ دیکھا۔

معلن نے نظریں اٹھائیں اور پھر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ "لیکن تمھارے لیے یہ حالات نہیں ہیں۔ تمھاری کنڈیشن لا اعلاج ہے۔"

کچھ دم توڑ گیا تھا اس کے اندر۔ شاید وہ امید تھی یا شاید اس کا اپنا دل۔ میز کے بے آرام لوہے پر نشست بائیس سالہ ظبیہ یمین کی زندگی کو قفل لگ گئے تھے۔ ائیر کنڈیشنر سے نکلتی سخت برفانی ہوائیں اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں، اس کا سانس لینا دشوار سے دشوار تر کر رہی تھیں۔ دیوار پر نصب گھڑی اپنی سوئیاں چلا کر ہر بیتے لمحے کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کی ٹک ٹک، دور میز پر رکھے کاغذات کی کھڑ کھڑاہٹ سب ایک اور جہاں کا حصہ لگتی تھیں۔ وہ جہاں جس سے ظبیہ پوری طرح سے منقطع تھی۔

آس پاس لگے سرٹیفیکیٹس اور ننھے بچوں کی تصویریں اس کے منظر سے دور ہو رہی تھیں، سب اپنا اصل کھو رہی تھیں۔

غزار اب ترچھا ہوا سنجیدہ آواز میں ڈاکٹر سے تفصیلات پوچھ رہا تھا۔ چہرے سے تو وہ بھی پریشان لگتا تھا لیکن اس کا مکمل قابو تھا اپنے الفاظ اور رویے پر۔

ان دونوں کا مکالمہ اسے کسی خراب ریڈیو سے آتی آدھی ادھوری کمنٹری جیسا لگا تھا۔ کانوں نے ہر سچ، ہر سوال سے منہ موڑ لیا تھا۔

اب صرف وہ تھی اور اس کے اندر بنتا پاتال۔

★★★

دوسرا قدم: لاش کو ٹھکانے لگانا۔

"تھینک یو!" ظبیہ نے دروازے سے سر نکالتے کی چین سے لٹکتی چابی تھامی۔ سامنے کھڑا سفید وردی میں ملبوس ڈرائیور مسکرا دیا۔ گلی میں چمکتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی اس کی عینک کے شیشوں پر واضح ہوئی اور جھری زدہ گال گولائی میں ڈھل گئے۔

"بیگم صاحبہ نے کہا تھا آپ کو یہ بھی دے دوں۔" اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا خاکی بیگ اس کے حوالے کیا۔ ظبیہ کی آنکھیں اس کے ہاتھوں تک گئیں اور وہ مروت میں مسکرا دی۔ "کیا ہے اس میں؟" اسے تھامتے اس نے لفافے کو دیکھا جو اس کی ہتھیلی سے تھوڑا ہی بڑا تھا۔

بوڑھے ڈرائیور نے شانے اچکائے۔ "کچھ معلوم نہیں، میڈم۔ لیکن انہوں نے کہا تھا سنبھال کے لے کر جاؤں۔"

"ہیلو، مسٹر۔ ڈرائیور کا یونیفارم پہن لیا آپ نے لیکن نو پارکنگ کا نشان نہیں دیکھا۔" پیچھے کھڑی آواز بولی تو ظبیہ اور بوڑھے مرد نے گردنیں موڑیں۔ پیچھے وہ تھا، وہی جس کی نگاہیں اسے جان جانے کی عادی تھیں، اسے پہچان جانے کے بہت قریب۔ سیاہ آدھی آستینوں کی ٹی شرٹ پر کریم رنگ کے پینٹس پہنے، ساتھ ہی بازو پر اس کی زرشکی رنگ کی بائیکر جیکٹ تھی۔ ہاتھ میں اس کا بیک پیک تھا اور سرمئی آنکھیں تفتیشی طرز میں ظبیہ اور ساتھ کھڑے مرد کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی آفیس سے آیا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"صاحب، میں نے غلط پارکنگ نہیں کی۔" ڈرائیور نے گھر کے دروازے کے ساتھ کھڑی سفید ہونڈا سٹی کی صفائی پیش کی۔

اکائر نے اسے دو پل ٹھہر کر دیکھا پھر جوتے سے زمین مسلی۔ "تو میں نے غلط گھر بنایا ہے؟"

ظبیہ نے ابرو بھینچے۔ "اکائر، جانے دو، پلیز۔ انکل جا ہی رہے تھے۔" وہ دروازے سے پیچھے ہٹی اور اپنے مالک مکان کے لیے اندر جانے کا راستہ چھوڑا۔ اس نے ایک لمحہ اسے دیکھا پھر بغیر کچھ کہے گھر کے اندر چل دیا۔ ڈرائیور بھی معذرت کر کے اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا تو ظبیہ نے دروازہ بند کیا۔ چابی اور خاکی لفافہ اب اس کے ہاتھوں میں تھے۔

وہ کچن اسٹول پر بیٹھا اب اپنے جوتے ایڑیوں سے کھسکا رہا تھا، جیکٹ کرسی کے ہتھے پر ٹنگی تھی۔ سفید لوفر لکڑی کے فرش پر گرے تو ظبیہ ٹھٹک کر رکی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے تک بھاگ کر اپنے منصوبے کے اگلے قدم کا نقشہ کھینچنا چاہتی تھی لیکن کچھ تھا اس کے رویے میں جو غیر معمولی تھا۔ وہ جگ سے آدھا گلاس پانی نکال رہا تھا، چہرے پر دن بھر کی تکان نمودار تھی۔ جہاں تک ظبیہ کو پتا تھا وہ ایک پرائیویٹ بزنس کنسلٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ ہچکچاتے ہوئے لاؤنج پار کر کے کچن کاؤنٹر تک آئی اور لب ساتھ جوڑے۔ ہمیشہ کی طرح اکائر کی پشت اس کے سامنے تھی۔ وہ گلاس لبوں سے لگائے پانی اندر اتار رہا تھا، گلے کی گلٹی ہر گھونٹ کے ساتھ حرکت میں تھی۔

"کیسا دن گزرا تمھارا؟" اس نے ہلکا سا مسکراتے بات کا آغاز کیا۔ اس کی آواز پر اس کے ابرو اٹھے اور وہ گلاس دور ہٹاتے اس کی جانب گھوما۔ چہرے پر ایسی سختی تھی جیسے جانتا ہی نہ ہو، نہ اسے نہ ہی اس کے سوال کو۔

سرمئی آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھتے تھک گئیں تو اس نے سر دوسری طرف موڑ لیا۔ "گزر گیا۔"

ظبیہ نے ہتھیلی کاؤنٹر کے کنارے پر رکھی، ساتھ ہی لفافہ بھی وہیں ٹکا دیا۔ "یہ کیا جواب ہوا؟ تم تو بڑے اپٹیمسٹ انسان تھے۔"

"تھا۔" گال پھلا کر ایک بھاری سانس باہر نکالی۔ "اب نہ انسان ہوں نہ اپٹیمسٹ۔"

اس کے اعلان پر وہ ہنس پڑی۔ اکائر نے ایک ہاری ہوئی مسکان کے ساتھ اسے دیکھا۔ "اور بڑا بھی نہیں ہوں۔ انتیس کوئی عمر ہوتی ہے؟"

"بالکل نہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ اور نہیں دیکھ سکا۔ نظریں کاؤنٹر پر سجے خاکی لفافے تک کرتے اس نے ابرو اچکائے۔ "غزار تمھیں ٹرپ سے تحفے بھیج رہا ہے؟"

"میری دوست نے بھیجا ہے کچھ۔ آئی ڈونٹ نو کیا ہے۔" اس نے لاپرواہی سے بتایا۔ اکائر نے سر ہلایا۔ ٹھیک ٹھیک۔

سفید رنگ کی قمیص پہنی لڑکی نے سر ہلکا سا ترچھا کرتے سامنے براجمان مرد کے تاثرات پرکھنے چاہے۔ اتنا مشکل کیوں تھا وہ؟ کاش، وہ بھی اس کی طرح اپنے زخم سینے میں چھپا کر نہیں، چہرے پر سجا کر رکھتا ہوتا۔ کاش، اس کی پریشانیاں بھی ظبیہ کو معلوم ہوتیں جیسے وہ اس کی مشکلات سمجھ جاتا تھا۔ وہ کون تھا؟ وہ کب کیا کرتا، کیا سوچتا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں ہو گا۔ ہمیشہ ہنستا، مسکراتا، تنگ کرتا۔ کچھ تو ہو گا اس کے اندر جو وہ دور رکھتا تھا، اس کی پہنچ سے کوسوں دور، اور یہ جان کر ظبیہ کو اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔

"کچھ پریشانی ہے تو تم شئیر کر سکتے ہو۔"

اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ "آئی ایم فائن۔"

"اکائر، تم مجھ پر۔۔۔"

"میں ٹھیک ہوں، ظبیہ۔ کچھ غلط ہوا تو سنبھال لوں گا۔ میری زندگی میں لوگ ہیں جو میری قدر کرتے ہیں، مجھے یاد رکھتے ہیں۔ اسی لیے مجھے ہمدردی لینے کسی کے پاس جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی گی۔"

وہ دنگ کھڑی رہ گئی۔ تحمل اور خبر گیری کی ساری رمق اس کے اندر سے پانی کی مانند نچوڑ گئی۔ وار اتنا گہرا تھا کہ وہ اپنے دو پاؤں پر سیدھی بھی نہیں کھڑی رہ سکی، دوسری کرسی کا تکیہ پکڑتے وہ آگے پیچھے جھولی۔

"او، سوری۔" اس کی آواز اتنی کمزور تھی کہ اسے خود بھی مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔ "مجھے لگا۔۔۔" دل دکھ رہا تھا۔ "بس۔" دل چیخ رہا تھا۔ "سوری، مجھے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔"

"نہیں، رکو۔" وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوا۔ سرمئی آنکھوں میں واضح اذیت تھی۔ الفاظ اپنے کہے کہ بوجھ سے بھاری تھے۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"نہیں، اکائر۔ تمھارا کچھ مطلب تھا۔ شاید تم یہ کہہ سکتے ہو بغیر مطلب کے کیونکہ تمھارے پاس لوگ ہیں جو تمھاری قدر کرتے ہیں، تمھیں یاد رکھتے ہیں۔ یہی مطلب تھا نا؟ جتانا کہ تم کتنے امیر ہو رشتوں کے معاملے میں؟"

"فار گاڈ سیک، ظبیہ۔" اس نے الجھن میں اپنے بال بگاڑے۔ "میں ایسا کیوں کروں گا؟ وہ میں نے غلطی سے کہا تھا۔"

"اچھا؟" ظبیہ کا حلق بند ہونے کو تھا، لیکن حیرت تھی کہ ایک بھی آنسو اس کے گال پر نہیں ٹوٹا تھا۔

"غلطی کر کے معافی مانگتے ہیں۔ تم وضاحتیں دے رہے ہو۔" وہ تکلیف سے مسکرائی۔ "اور مزے کی بات، تم یہ کرنے والے پہلے بھی نہیں ہو۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ بغیر سانس لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس پر محفوظ تھیں، درد، گھبراہٹ، سب سے پر نور۔ "میں دل سے معافی مانگتا ہوں۔"

وہ پہلا نہیں تھا، جس نے اسے سہارا دیا تھا، سنا تھا یا اپنی موجودگی سے اس کے عزیز ہونے کا احساس دلایا تھا۔ اکائر سے پہلے یہ کوئی اور کر چکا تھا۔ لیکن وہ پہلا تھا جس نے اس کے دل کا پاس رکھا تھا، اپنی غلطی

مجبوریوں اور تکلیفوں کی آڑ میں نہیں رکھی تھی، اس کی نظروں میں دیکھ کر اپنے احساسات اس کے سامنے کھرے رکھ دیے تھے۔

اکائرز مورا پہلا تھا جس نے اسے اپنے کچھ ہونے کا احساس دلایا تھا۔

"اٹس اوکے۔" وہ لفافہ لے کر پیچھے ہو گئی۔ وہ وہیں ساکن کھڑا رہا۔ کمرے میں مڑنے سے پہلے اس نے رک کر اسے دیکھا۔

"اور فکر مت کرو۔ آئندہ ہمدردی لینے کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔" کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر چل دی۔

★★★

رات کے ایک بج چکے تھے۔

غزار کی موت کی گھڑی اب اس سے بہتر گھنٹے پیچھے تھی۔ اس کا بیڈ روم لاش کی اندرونی تباہی اور گلتی سڑتی بوؤں میں سبکدوش تھا۔ اب اس کمرے میں اس کا سانس لینا بھی میں مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑے ہی وقت اندر رہ پاتی تھی، پھر دروازہ کھول کر مین ہال میں آ کر بیٹھ جاتی۔ بارہ بجنے کا انتظار اس نے اپنی حتمی تیاریوں کو انجام پاتے کیا تھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھولتے اس نے باہر قدم جمائے تو اس کا سراپہ سیاہی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے بڑے طرز کی ہوڈی تان رکھی تھی جو بلاشبہ غزار کی ہی تھی، ساتھ ہی اپنی کالی جینز کو عمل میں لایا تھا۔

دوپٹہ پلنگ پر ڈالتے وہ پھرتی سے بال اونچے جوڑے میں لپیٹ رہی تھی، چال ڈریسنگ ٹیبل کی جانب تھی۔ بال باندھ کر اس نے کالا شیفان کا دوپٹہ اٹھایا اور سر کے گرد گولائی میں ڈھالا۔ ریٹا کی گاڑی کی چابیاں سامنے میز پر چمک رہی تھیں، ساتھ ہی وہ لفافہ رکھا تھا جسے وہ اپنے منصوبہ بندی کے درمیان سرے سے بھول چکی تھی۔

اس نے ایک سانس بھرتے ہاتھ اندر ڈالا تو کاغذ چرچرایا۔ انگلیوں کی پوریں ایک مخملی ڈبی سے ٹکرائیں تو وہ ٹھٹک کر رکی اور چہرہ اندر گرایا۔ سامنے گہرے نیلی رنگ کی چھوٹی سی ڈبیا پڑی تھی، ساتھ ہی ایک صفحہ نفاست سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے دونوں چیزیں باہر نکالیں۔

ڈبی کو میز پر رکھا اور چاند کی روشنی میں ترچھے ہو کر اس نے صفحے کی تہہ کھولی۔

پیاری ظبیہ،

معذرت کہ میں تمھیں کال پر بتا نہیں سکی کیونکہ آفیس کے کاموں میں لگ گئی تھی، لیکن آج گھر پہنچ کر ہی مجھے یاد آیا کہ تمھاری ایک امانت ہے میرے پاس۔ میں نے اسے پانچ سال سے سنبھال کر رکھا ہے۔ جب رانج تمھارا پتا پوچھنے آیا تھا تو تمھاری دوست ہونے کے ناطے میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے مجھے فورس بھی نہیں کیا تھا، بس اتنا فیور مانگا تھا کہ یہ تم تک پہنچا دوں۔ اس کے بعد سے نہ تم سے رابطہ رہا نہ اس سے۔ آج تم ملی ہو تو تمھاری امانت تمھیں سونپ رہی ہوں۔

پی ایس: میں نے اسے نہیں کھولا ہے۔ فکر ناٹ۔

تمھاری اپنی،

ریٹا کور۔

ظبیہ نے لرزتی انگلیوں سے پرچہ دور کیا۔ چاند کی روشنی میں اس کے ماتھے پر چمکتا پسینہ صاف ظاہر تھا۔ اس نے تھوک نگلتے اپنی توجہ اس چھوٹی ڈبیا کی طرف کی اور بہت احتیاط سے اسے تھاما۔ اس کا وزن کتنا ہو گا؟ چند معمولی گرام، لیکن اس وقت وہ اس کے وجود پر ایسے حاوی تھا جیسے ڈھیر ہوئی کوئی بستی۔ اس نے سانس تھامے انگوٹھا اس کے کنارے پر لگایا اور پھر ذرا سی قوت کے ساتھ ڈھکن اوپر کی طرف اٹھایا۔ نیلی مخملی ڈبی کی جھلی سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں بے پردہ ہوئی تو بھوری آنکھوں نے اندر چمکتے تحفے کا منظر جانچا۔

تاریکی میں زیر بار اس کمرے میں ایک پل کے لیے سپید روشنی نے جنم لیا تھا، لیکن اس سے پہلے کے پورا نقشہ سامنے آپاتا، ظبیہ نے 'ٹھا' کی آواز کے ساتھ ڈھکن واپس نیچے گرا دیا تھا۔ وہ میز سے ٹک گئی۔ اس کا سانس بری طرح چڑھ رہا تھا، اس کی امانت کے گرد قبضہ آور انگلیاں سفید پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ چاند کی نقرئی روشنی کے بیچ و بیچ کھڑی وہ اس نور کی عدو لگتی تھی۔ اس کا آپ سیاہ تھا، ہر امید، ہر چمک سے خالی۔

نگاہیں واپس اس ڈبی تک موڑتے اس نے ایک اور ناہموار سانس ہوا میں خارج کی اور پھر متزلزل دھڑکنیں لیے اس نے ڈھکن کھول دیا۔

اس کا صبر، اس کے پانچ سال، اس کی تاریخ اور الہام سب اس کے سامنے تھا۔ ڈبے کے وسط میں پلاٹینم کی بے داغ انگوٹھی سجی تھی۔ اس کا نچلا حصہ آدھا مخمل میں دھنسا ہوا تھا اور تابدار بینڈ کی اوپری طرف ایک خوبصورت تتلی تراشی گئی تھی۔ تتلی کے نازک پروں پر ننھے موتی جڑے تھے۔

ظبیہ نے کپکپاتی انگلیوں سے اس کے ٹھنڈے کنارے محسوس کیے۔ کھڑکی کے پار سے آتی گرم ہوا نے پردے ہلائے تو اوٹ میں چھپی چاندنی کھل کر واضح ہوئی۔ انگوٹھی کے پٹے میں ایک پتلا کاغذ بھی پرویا ہوا تھا، جیسے قیمت کا لیبل ہو۔ اس نے اسے اپنی طرف پلٹا تو سفید پرچی پر غایت بدرجہ چھوٹے الفاظ مالائی میں درج تھے۔

"Yang sebenar."

اصلی والی۔

اور نیچے ایک تاریخ تھی۔ وہ تاریخ جس پر ان کی تاریخ لکھی گئی تھی۔

25/Nov/2009.

ظبیہ کو ایسا لگا تھا جیسے کسی نے اس سے سانس لینے کا حق بھی چھین لیا ہو۔ اس کی دماغ کی شریانیں سکڑ رہی تھیں، کانوں کے پردے کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے دل پر قابو پانا چاہا، ہتھیلی سینے پر مسلتے کچھ اور سوچنا چاہا لیکن آج سب اس کی پکار سے غافل رہے۔ ہمیشہ اس نے اپنے فہم و ادراک کو رد کیا تھا، آج اس کی ہر تفکیر اس کے برعکس تھی۔ آس پاس سب دھندلا پڑ رہا تھا، ہر چیز اپنی آواز کھو رہی تھی۔ جب سب تھک کر دھیما پڑ گیا تو اس کے ضمیر نے ماضی کی گھڑی اس کے سامنے لا رکھی، کانوں میں کسی بہت قریبی کی آواز گونجی اور اسے وہ نظر آیا جو بہت پہلے تھا۔

"ابھی اس پر گزارا کر لو، پچیس کو اصلی والی پہنا دوں گا۔"

اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر ایک آنسو اس کی کلائی پر گرا تو اسے اندازہ ہوا ماضی بیت چکا تھا۔ ظبیہ نے گردن جھکا لی، ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی اسی طرح ڈبے میں جمی رہی۔ وہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی، نہ انگوٹھی پر نہ انگوٹھی کے دینے والے پر۔ اس نے ہی تو اس کی زندگی اس مقام تک پہنچائی تھی، ظبیہ یمین کو وہ بنایا تھا جو وہ تھی۔ ایک وحشی درندہ۔ رابح آدم کون تھا؟ جھوٹا، فریبی، خود غرض انسان۔

دماغ نے اس کی دلیلیں رد کر دیں۔ امیدوار، گھائل، مجبور مرد۔ اسے وقت چاہیے تھا۔

ظبیہ نے جبڑا بھینچ لیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس نے امید دلائی تھی، وعدہ خلافی کی تھی۔ کمزور مرد کو محبت پر اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

دماغ نے سیٹی بجائی۔ وعدہ خلافی، رئیلی؟ تمھارے ہاتھ میں اس کے بجلی کے بل ہیں کیا؟ اس نے وعدہ پورا کیا ہے۔ تم ظالم ہو گئی تھی، ظبیہ۔

لڑکی نے ڈبیا میز پر اچھالی، اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ چپ! اس نے اپنی سوچوں کو لگام ڈالنا چاہا۔

"کیوں چپ؟ برا لگ رہا ہے اصل؟ تم بھی اپنے غم میں اتنی ہی گم تھی جتنا وہ۔"

اس بار اس نے بغیر لحاظ کیے برابر رکھا گلدان اٹھایا۔ موتیے کے پھول مہک رہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رکی اور اپنی سانس دبائی۔ ایک اور آنسو اس کے گال سے نیچے پھسلا۔

"تم بھی گناہگار تھی۔" دماغ نے اسے پھر جکڑا۔ وہ ٹوٹ گئی، گلدان سستی سے میز پر واپس رکھا۔

"تم بھی مکار تھی۔" اس کی سسکیاں ہلکی تھیں لیکن وہ تھیں۔

"تم مطلب پرست ہو۔" ظبیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما۔ بس، اللہ کا واسطہ، بس!" اور سب سے بڑھ کر۔۔۔"

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چاند کی روشنی اس کی نم پلکوں پر گردش کی۔

"تم ایک منافق ہو!"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ ہانپ رہی تھی، آنکھ سے نکلتا ایک ایک آنسو اس کے گال پر تپتے لاوے کی طرح پھسل رہا تھا۔ اس نے آستین سے اپنی ناک رگڑی۔ "وہ، وہ غلط تھا۔۔۔"

اس کے اندر کسی آواز نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اور تم؟ کیا تم نے مڑ کر سوچا اس کی زندگی ان پانچ سالوں میں کیسی ہو گی؟"

اس نے انگلیوں کی پوریں آنکھوں پر رکھیں اور جان لگا کر دبایا۔ کاش، سب خاموش ہو جائے۔ کاش! لیکن اب سکوت ٹل چکا تھا۔ اب تباہی تھی۔ فنا کن تباہی۔ آنکھوں کے پیچھے رنگ برنگے دائرے گردش کر رہے تھے۔ پیلا، نیلا، ہرا۔

"تم، ظبیہ یمین، تم۔۔۔" کسی نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ اس کی سانس اٹک سی گئی، ہاتھ چہرے سے دور ہوئے اور آنسوؤں سے نم گال سڑک کی بتیوں میں جگمگائے۔

فاسق مجرم اور کند ذہن مقتول میں وہ وہ نہ تھی جس کا اسے گمان تھے۔ چاقو تھامنے سے بہت قبل ہی وہ اپنے ہاتھ خون میں دھو چکی تھی۔

رائج آدم وہ نہ تھا جس نے اسے ظبیہ یمین بنایا تھا۔ وہ ظبیہ یمین تھی، جس نے رائج آدم کو بگاڑا تھا۔

★★★

آدھی رات کو کوالالمپور کی تاریک سڑکوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماہِ محدب سیاہ آسمان پر اپنی نیلی روشنی برسا رہا تھا۔ یہ چاند کی حالات میں سے آٹھویں اور آخری صورت ہوتی ہے، جس کے بعد چاند مکمل طرح سے مٹ کر اگلے مہینے آنے کے لیے تیاری شروع کرتا ہے۔

اگلے ماہ کا چاند اس کے لیے کیسا ہو گا؟ ظبیہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

غزار کی لاش کو اس نے بڑی پلاسٹک کی تھیلیوں میں قید کر کے ڈکٹ ٹیپ سے باندھ دیا تھا۔ ظبیہ کو حیرت تھی وہ یہ سب کیسے کر رہی تھی اور کس ہمت سے، اور کہیں نہ کہیں فخر بھی۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔ میں نے لاش ٹھکانے لگائی ہی۔ پھر اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ نہیں، بھائی۔ کوئی کچھ نہ پوچھو۔

اس لاؤنج روم سے جس خاموشی سے اس بوری کو گھسیٹا تھا، اس پر وہ اپنے ہاتھ خود چوم سکتی تھی۔ اوپری منزل پر مقیم اکائر کے کمرے کی بتی بجھی تھی، سوائے ہلکی طلائی روشنی والے نائٹ بلب کے۔ اس نے بغیر سانس لیے لاش کو لاؤنج کی وسعت سے کھینچا اور پھر دروازہ کھولنے سے قبل باہر سر نکال کر گلی میں جائزہ لیا۔ سڑک پر امبر لائٹس جل رہی تھیں، ہلکی نیم پیلی چمک میں ہر سو ٹیڑھے میڑھے سائے جھول رہے تھے۔

سیاہ ہوڈی اور ہم رنگ بیس بال کیپ پہنی لڑکی نے دروازہ ٹک کی آواز کے ساتھ کھولا اور دو قدم باہر لیے، لیکن کچھ سوچ کر رک گئی۔ کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھتے اس نے مدھم روشنی میں قید اس بنگلو کو دیکھا جہاں وہ پانچ سال پہلے دلہن بن کر آئی تھی، لیکن کبھی مالکن نہیں بن سکی تھی۔

وہ گھر نہیں تھا، صرف ٹھکانہ تھا۔ ظبیہ کی شادی نہیں ہوئی تھی، بس اس کی رہائش گاہ تبدیل ہو گئی تھی۔ پہلے وہ باپ کے گھر میں باتیں سنتی آئی تھی، جب وہ نہیں رہے تو جگہ اس کے شوہر نے لے لی۔ ماں کی کمی

نے اسے ضرورت سے زیادہ پر امید بنا دیا تھا۔ وہ خوش رہا کرتی تھی، اچھے کی امید کرتی تھی اور برے کو بھلا دیا کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں ہمیشہ سے لوگ کم تھے، یہی وجہ تھی اس نے اپنے لیے کوئی معیار تعمیر نہیں کیے تھے۔

جو ملا، مل گیا۔ جو گیا، چلا گیا۔

گھر کے ساتھ بنی کیاری کی اوٹ میں چھپا کوئی جھینگر غرایا تو اس کا ٹرانس ٹوٹا۔ وہ سیدھی ہوئی اور فروری کی رخصت ہوتی ہوا میں ایک سانس خارج کی۔

اب وہ قدم آہستہ آہستہ نیچے اتار رہی تھی۔ غزار کی لاش اب بھی دروازے کے کنارے پڑی تھی۔ اس نے لیٹیکس دستانوں میں چھپی لرزتی انگلیوں سے چابی پکڑے گاڑی کا دروازہ ان لاک کیا تو گاڑی کی ویلکم لائٹس جل بجھ ہوئیں۔ ٹرنک کا دروازہ کھول کر وہ واپس مڑی اور گردن جھکائے دروازے تک واپس گئی۔ کالی تھیلیوں میں پیکڈ لاش کو سیڑھیوں سے نیچے کھینچتے اس نے خاموشی کا خاص خیال رکھا تھا۔

دشواری ہوئی تھی تو اس بوری کو ٹرنک میں چڑھانے میں، لیکن وہ کامیاب ہو گئی تھی۔ اندر پڑی بے جان بوری ایک ہی پل میں ڈھے گئی۔ ظبیہ نے اس کے اتنا پاس ہونے پر ناک اپنی انگلیوں سے چھپائی۔ موت کی بو بے آرام تھی۔ سب ٹھیک کر کے اس نے اچک کر دروازہ واپس بند کیا، پھر ڈرائیور سیٹ کی طرف بڑھ گئی اور لیٹیکس میں قید انگلیوں سے ہینڈل کھولا۔

ہونڈا سٹی کے اندر اب دو نفوس تھے، جن میں سے جیتی جاگتی واحد وہ تھی۔ بہت سکون سے کلیدی اگنیشن سوئچ میں لگائی اور 'ON' کی جانب موڑی۔ اس سارے عمل میں اس کی بھوری آنکھیں خالی تھیں، ایک دم ویران، لیکن دل اور دماغ مسلسل ایک جنگ میں تھے۔ اسے اپنی حقیقت پر نہ رونا آتا تھا نہ ہنسنا۔ وہ اس سب سے اتنا جلدی آرام دہ کیسے ہو گئی تھی؟

نم ہوا گاڑی کے کھلے شیشے سے اندر آئی تو اس کی ہوڈی میں ڈھکی زلفیں چہرے پر اڑیں۔ سیٹ بیلٹ اپنے گرد کستے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پرانے لمحات کو یاد کیا تو پیچھے لیٹے اس کے شوہر کا زندہ سلامت چہرہ اس کے سامنے ہنس پڑا۔

"اوہ گاڈ، ظبیہ۔ ریلکس۔ گاڑی ہے، پلین تھوڑی۔ سیکھ جاؤ گی۔"

اس نے بیلٹ باندھ کر کمر لیدر سے ٹکرائی اور آنکھیں ایک پل کے لیے بند کیں۔

"چلو، اب چابی ڈالو۔ اسٹارٹ پر لے کر آؤ۔"

اس کی انگلیوں نے چابی 'START' کی طرف گھمائی تو انجن نے جان پکڑی۔

"گڈ۔ اب چھوڑ دو چابی۔ انجن کو وارم اپ ہونے دو۔"

"غزار، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اکیس سالا ظبیہ کی آواز اس کے دماغ میں اب بھی تازہ تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں مینچ لیں۔

"کس سے؟" غزار نے اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ واقعی حیران لگا تھا، ایسے کہ جیسے ڈر نام کی چیز کا اسے علم ہی نہ ہو۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اس سے۔ میں نے کبھی ڈرائیو نہیں کیا۔۔۔"

وہ مسکرا دیا تھا۔ "کبھی نہیں کیا تو کبھی نہیں کرو گی؟" اس نے اسٹیرنگ ویل پر ہاتھ رکھا تھا۔ "تمھارا ڈر یہاں نہیں۔۔۔" پھر انگلی ظبیہ کی کنپٹی پر رکھی۔ "یہاں ہے۔"

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ظبیہ یمین اپنا ڈر کھوج چکی تھی۔ اس نے چابی چھوڑی تو گاڑی کا انجن چلتا گیا۔ اپنے الٹے پاؤں سے کلچ پیڈل کو دبایا اور سیدھے ہاتھ سے گئیر تبدیل کیے، پھر آہستہ سے کلچ چھوڑتے پیر ایکسیلیٹر پر عاجز کیا۔

اس کی زندگی کی گاڑی آگے چل پڑی۔

★★★

بکیت ناناس Bukit Nanas ریزرو جنگلات کی عقبی سڑک پر خاموشی کا پہرہ تھا۔

کوالالمپور کی بلند و ارفع اسکائے اسکریپرز کا منظر یہاں سے دور دراز تھا، ان کی چمچماتی بتیاں ہر سو پھیلی تاریکی کے جال میں قابض نظر آتی تھیں۔ یہ اس شہر کا فطرتی نخلستان تھا، جہاں جنگلات کا حاشیہ شہری دوادش سے جڑتا ہے، جہاں استادہ زمرد پھلیاں آسمان کو چومنے کے عزم سے اپنی جڑیں توڑ کر اگتی ہیں، جہاں کی ہوا میں کھاد کا گاڑھا پن پل پل محسوس کیا جا سکتا تھا۔

سنسان سڑک پر سفید ہونڈا سٹی کے پہیے جا رکے۔ اندر بیٹھے نفس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا انجن بند کیا۔ اب کہ ہوا کو پہلے سے زیادہ گہرے سکوت میں اصطباغ دیا گیا تھا۔ نرم چاندنی اوپر تنی سبز بھلکساری کی اوٹ سے چھن کر اتری تو اندر بیٹھی ڈرائیور کی بھوری آنکھیں چوکس نظر آئیں۔

ظبیہ نے نچلا ہونٹ سفید دانتوں کے درمیان پھنسایا ہوا تھا، بھوری رنگت خشک ہوئے پسینے سے بھبک رہی تھی۔ اس کی لیٹیکس میں ڈھکی انگلیاں اسٹیرنگ ویل پر جمی تھیں اور نظریں شیشے کے باہر ہوتی کاروائیوں کو جانچنے میں مگن۔ سیاہی اس کا چوغہ تھی اور سادھانی اس کا زرہ بکتر۔

باہر کی دنیا میں ٹڈے اپنی ہم آہنگی میں جھوم رہے تھے، کسی الو کی پکار بھی آپ کو جنگل کی جانب للکار رہی تھی۔ آخر کار اندر نشست لڑکی نے دروازہ کھول دیا تو کناروں پر بنے قلابے کر کرائے۔ چوکنی حرکات کے ساتھ اس نے قدم اسفالٹ کی ٹھنڈی سڑک پر اتارے اور آس پاس نظر دوڑائی۔ وہاں سن سناٹا تھا۔ اب وہ اپنے ٹوپے کو اوپر کھینچتے گاڑی کی پچھلی طرف بڑھ رہی تھی۔ چاند کی روشنی تلے بستا وہ ہریالی کا منڈپ شہری تابش اور بھگ دڑ سے ایک وقفہ پیش کرتا تھا۔ یہاں آ کر اپنی روزمرہ کی زندگی کو فراموش کر دینا آسان تھا۔ نجانے ظبیہ کیونکر نہیں کر پا رہی تھی؟

اس نے کی فوب key fob پر بٹن دبایا تو ٹرنک کی میکانکی کلک کی آواز پوری بستی کو سنائی دی۔ سیاہی میں ڈوبے وجود نے سہم کر آس پاس سر موڑا۔ گھنا جنگل اس کا استقبال کر رہا تھا۔ آہستگی سے ٹرنک کی چھت اٹھتی گئی اور اندر موجود اشیاء سے دنیا کا تعارف ہوا۔

کالی پلاسٹک تھیلیوں میں لپٹا وجود اور اس کے ہتھے پر پڑا ایک بیلچہ۔ ساودھان شہری نے آگے جھک کر اس کا ڈنڈا تھام لیا اور سر اٹھا کر اوپر اٹھتی پہاڑیوں کو دیکھا۔ زبرجد گہرائیوں میں اخفاء ایک زندان، اور ظبیہ اسے موت سونپ رہی تھی۔ وہ جنت کے پھولوں میں نہائی ہوئی وادی اور وہ اسے اپنی جہنم کا ٹکڑا بخش رہی تھی۔

اس سے بعید الو نے ایک اور غل نکالی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اسے کام شروع کرنا تھا۔ بلکہ نہیں۔ اسے ختم کرنا تھا۔ سب کچھ۔

★★★

اگلی صبح

(فلائٹ ایم ایچ تھری سیون زیرو سے سات دن قبل)

امارچ، ۲۰۱۴

بانگسار میں بنے اس بنگلے کا صحن صبح سویر کی روشنیوں میں کھل رہا تھا۔ آج ہفتہ تھا، معنیٰ کہ ہر کام کاج کرتے مزدور کی ہفتہ وار عید کا پہلا دن۔ لاؤنگ روم خالی تھا، کچن میں چولھے بجھے ہوئے تھے اور ٹی وی پر تاریکی نشر ہو رہی تھی۔

اکائر نے گھر کا عقبی دروازہ ہاتھ میں پکڑی چابی سے کھولا اور اندر داخل ہوا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی ڈرائے فٹ شرٹ پہنی تھی، ساتھ ہی کالی سوئٹ پینٹس۔ سیاہ بال بکھرے ہوئے سے سرخ پڑتے ماتھے پر

گرے تھے اور ہاتھ میں لوہے کی بوتل تھی جس کا ڈھکن ہٹا تھا۔ ہانپتے ہوئے مرد کی گردن میں کالے ہیڈ فون بھی اٹکے تھے۔

وہ لاؤنگ روم میں آیا اور گلے میں پھنسے ہیڈ فون نکال کر صوفے پر ڈالے۔ اس کا چہرہ پسینہ میں تمتما رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ مارننگ جاگ سے آیا ہو۔ ساتھ پڑا تولیہ اٹھا کر گال پر تھپتھپایا اور پانی کی بوتل سے ایک اور سپ لیا۔ لاؤنج میں لگی گھڑی نے گھنٹہ پورا ہونے کی مخصوص آواز نکالی تو اس نے سر موڑ کر اوپر دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گردن سامنے بنے قرمزی رنگ کے دروازے کو دیکھنے کے لیے گھوم گئی۔

ناراضگیاں۔

وہ ایک اور سانس بھر کر رہ گیا۔ ہاتھ میں پکڑی بوتل ہونٹوں پر الٹالی اور سارا پانی چٹ کیا۔ اگلے لمحے خالی بوتل کاؤنٹر پر رکھ کر اس نے تولیہ اپنے گیلے بالوں میں رگڑنا شروع کیا۔

ابھی وہ سر دھڑ سے جدا کرنے ہی والا تھا کہ ساتھ رکھا لینڈ لائن فون گونج اٹھا۔ وہ ٹھہر گیا اور سفید پی ٹی سی ایل کے فون کو دیکھا پھر واپس بند دروازے کو۔ وہ فون تھا عام لیکن وہ کبھی اسے اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لایا تھا۔ زیادہ تر کالز غزار یا ظبیہ کی ہی ہوتی تھیں، اسی لیے وہ اٹھانے سے بھی گریز کرتا تھا۔

فون بج بج کر تھک گیا تو لاؤنج میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اب نیلی شرٹ پہنا مرد تولیہ گلے میں ڈالے اپنے کمرے تک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے نہانا تھا اور اس کے بعد سونا تھا۔ لمبا والا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ فون نے دوبارہ صدائیں بلند کیں۔ وہ جھنجھلا کر رکا اور ظبیہ کے کمرے کو دیکھا۔ اٹھ جا، بی بی!

جب اگلے پانچ سیکنڈ دروازہ نہیں کھلا اور گھنٹیاں بند نہیں ہوئیں تو مالک مکان جبراً قریب آیا اور ریسیور کان پر لگایا۔ اب تک اس کا منہ بگڑ چکا تھا۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا غزار کا کوئی کیوٹی سوئیٹی پیغام اس کی بیگم تک پہنچانے کا۔ حد ہوتی ہے۔

"کیا یہ غزار احمد کی رہائش گاہ ہے؟" ریسیور کے پار کسی مرد نے سوال اٹھایا۔ اس کے پیچھے ہوتی ہلچل سنی جاسکتی۔ اکائر نے دو انگلیوں سے ماتھا مسلا۔

"Alisder Zamora, but yeah."

وہ اصلاح کرنے سے خود کو روک نہیں پایا۔

"صبح بخیر۔ میں پیٹر وناس کا ایچ آر منیجر، حطار عزیز، بات کر رہا ہوں۔ ہم پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے چیف جیولوجسٹ، غزار احمد، سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کا فون بند آرہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں دخل اندازی نہیں کر رہا ہوں، لیکن میں ان کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔"

اکائر کے دماغ میں دو بلب جلے اور سیاہ بھنویں تن گئیں۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے لیکن الفاظ نہ تھے۔ کیا مطلب غزار ان سے رابطے میں نہیں تھا؟ وہ تو بزنس ٹرپ پر نہیں گیا تھا؟

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی خاموشی بھانپ کر حطار نامی مرد نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ ممکن الحصول کب تک ہوں گے یا ان کی غیر حاضری کی کوئی خاص وجہ؟ ہمارے لیے یہ میک شیور کرنا ضروری ہے کہ ہمارے ملازمین محفوظ ہوں۔ اور ہم ان کی کام کی زمہ داریوں کے بارے میں بھی فکر مند ہیں۔"

فون تھامے مرد نے سر ترچھا کیا، لب ادھ کھلے تھے۔ اس کا دماغ اس وقت ایک سو بیس کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ کچھ ہوا تھا، لیکن وہ نہیں جو اسے بتایا گیا تھا۔

"ہیلو...؟"

"غزار بیمار ہے۔" وقفہ لیتے اس نے بند کمرے کی طرف دیکھا، آنکھوں میں تمسخر تھا۔ "بہت بیمار۔"

"اونو۔" حطار عزیز کا تو دل دکھ گیا۔ اکائر کو تعجب ہوا کہ ایسے لوگ بھی تھے دنیا میں جو اس کے کرائے دار کو بھلے الفاظ میں یاد رکھتے تھے۔ "وہ گھر پر ہیں یا کسی ہاسپٹل؟ ہماری ٹیم ان سے ملنے آنا چاہے گی۔"

"میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنا خرچہ بچائیں۔ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ درد مشکوک (Tuberculosis) ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کی ٹیم کے کسی فرد کو چمٹ گیا تو پورا سیکٹر بند کرنا پڑے گا۔" آخر میں وہ مسکرایا۔

"ڈونٹ یو اگری؟"

"جی، جی۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں سب کی طرف سے پھول بھجوا دوں گا۔ ہم کمپنی ڈنر پر ان کی صحتیابی کی دعا بھی کریں گے۔ کسی بھی قسم کی مدد چاہیے ہو تو آپ ہمیں بتا سکتے ہیں، مسٹر۔۔۔؟"

"زمورا۔ غزار احمد کا بیسٹ فرینڈ۔" یہ تو اس نے اپنا جنازہ پڑھا تھا۔

"اوکے، مسٹر زمورا۔ ہمیں یاد رکھیئے گا۔"

"یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے۔" وہ ابھی سے بھول چکا تھا اس بندے کا نام حطار تھا یا اتھر۔

کال کٹ ہوئی تو اکائر نے ریسیور واپس فون پر سجا دیا۔ اس کی حرکات سست تھیں اور سرمئی آنکھیں کسی نووارد جذبے سے نہائی ہوئی۔ وہ قدم قدم چلتا لاؤنج روم میں بنی کیسمنٹ کھڑکی تک گیا۔ سورج کے نرم پیلی شعاعیں اس کی گلابی رنگت پر آ کے تمام ہوئیں تو اس نے سر موڑ کر گھر کی پارکنگ کی جانب دیکھا۔ اس کی اپنی سیاہ ٹویوٹا اوانزا کے برابر غزار کی سبز رنگی جیپ کھڑی تھی۔ ساتھ ہی نئی آئی سفید ہونڈا سٹی تھی۔

اس نے ہونٹ پیس کر اسے دیکھا۔ ظبیہ کو ایک اور گاڑی کیوں چاہیے تھی؟ وہ اب تک تو غزار کی ہی استعمال کرتی آئی تھی۔ گلے میں ڈلا تولیہ اوپر اٹھا کر اپنے گال پر رگڑا، نظروں میں اب بھی تفتیش تھی۔ نہ کوئی کالز، نہ کوئی میسجز۔ اسے پہلے ہی کچھ گڑبڑ لگا تھا۔ وہ پہلی بار نہیں تھا جب غزار گھر سے دور کسی ٹرپ پر گیا تھا لیکن اس کی ہر بار کڑی نگرانی رہتی تھی اپنی بیگم پر۔ وہ مسلسل کالز کرتا رہتا تھا، کبھی وڈیو،

کبھی آڈیو۔ کبھی بہانے سے اپنے کسی دوست کو گھر پر بھیج دیتا جو اسے بعد میں ساری خبریں دیتا۔ ظبیہ یہ سب نہیں سمجھتی تھی لیکن اکائر پاگل نہیں تھا۔

اس بار مختلف تھا۔ اس نے غزار کو آخری بار منگل کو کام پر جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اس رات خود بھی گھر نہیں آیا تھا۔ اگلے روز اسے ظبیہ نے کہا تھا وہ ٹرپ پر چلا گیا ہے۔ اور کیا کہا تھا اس لڑکی نے؟

اکائر نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا، اور جب ہی اسے دھچکا لگا۔

الماری۔ الماری غائب تھی۔

وہ واپس گھوما اور لاؤنگ روم میں آیا، اب کہ اس کی چال پر عزم تھی۔ سفید و سبز صوفہ سیٹ اپنی جگہ پر تھا، قرمزی قالین بھی دھلا دھلا تھا۔ ٹی وی دیوار میں نصب تھا اور چھت سے لٹکتا شیشے کا جھاڑ بجھا ہوا تھا۔

غائب تھی تو الماری۔ وہ اس خالی جگہ تک واپس آیا جہاں چار دن پہلے تک لنگڑی الماری جھولا کرتی تھی۔

بھاری لکڑی اور پکے شیشے والی اس سات فٹ کی الماری کو ظبیہ نے اکیلے اٹھایا کیسے؟

اب وہاں ایک گلدان رکھا تھا جس میں نکلی گلابوں کی سرخی عیاں تھی۔ اکائر نے گلدان با آسانی دور رکھا اور زمین پر جھکا۔ اس کے وزن تلے لکڑی کے تختے چڑچڑائے۔ وہ سر موڑے کچھ دیکھ رہا تھا، کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ یہاں سب صاف تھا۔ وہ اٹھنے ہی لگا تھا جب اس کی آنکھوں کے کنارے میں کوئی چیز چمکی۔

ڈوائڈر کیبنٹ کے نیچے امڈتی وہ چھوٹی سی چمک کافی تھی اکائر زمورا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے۔

وہ نیچے جھکا اور لمبی انگلیاں کیبنٹ کے نیچے بنتے اندھیرے کی طرف بڑھائیں۔ جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس کی انگلیوں کے درمیان ایک چھوٹی سی لال اور نقرئی چیز قید تھی۔

اس نے سر ترچھا کیا۔ "غزار کا لائٹر؟" وہ اپنے آپ سے بڑبڑایا۔

اچانک ہی دماغ نے ایک فلم چلانے کی پیشکش کی۔ وہ کچھ اور سوچ بھی نہ پایا۔

معذور الماری والے لطیفے کے بعد اکائر نے پہلی بار اس کا چہرہ غور سے دیکھا تھا۔ "تمھارے منہ پر کیا ہوا؟" اس نے سوال اٹھایا تھا۔

ظبیہ نے ٹھٹک کر انگلیاں اپنی ہونٹوں کی لال ہوئی جلد پر لگائیں۔ "اسٹریٹنر سے جل گیا۔"

اکائر ہنس کر چپ ہو گیا تھا، لیکن اب وہ جان چکا تھا گھاؤ بے دھیانی میں نہیں ملا تھا۔ وہ تو وار تھا، جانا مانا۔ اس نے لائٹر کو اپنی مٹھی میں قبض کر لیا۔

Lips are sealed.

★★★

یکم مارچ کو بیدار ہوتے ہی ظبیہ نے سب سے پہلے خود کو شاور کے نیچے جھونک دیا تھا۔ پانچ دنوں میں پہلی بار اسے سکون کی نیند آئی تھی، ایسی نیند جس میں ہر پانچ منٹ بعد اسے کروٹ لے کر لاش کو دیکھنا نہیں پڑا تھا یا ہر جلتی بجھتی گاڑی کو گھورنا نہیں پڑتا تھا، یہ سوچ کر کہ کہیں پولیس نے اسے کھوج نہ لیا ہو۔ لاش کو ٹھکانے لگا کر اس کی واپسی فجر کے قریب ہوئی تھی۔ اس وقت گھر میں سناٹا تھا اور اکائر، شکر خدا کا، سویا ہوا تھا۔

وہ بے آواز قدموں سے اپنے کمرے میں قید ہو گئی اور چند لمحات صرف کانپتی رہی تھی۔ اس کے کپڑے جنگل کی کھاد اور دھول میں اٹ چکے تھے اور ہاتھ بیلچہ چلا چلا کر لال پڑ چکے تھے۔ وہ صرف دو گھنٹے ہی سو پائی تھی کیونکہ اسے جلدی اٹھ کر ایک بہت اہم کام انجام دینا تھا۔

اسے اپنا پاسپورٹ بنوانا تھا۔ اور یہی تھا اس کے فرار کے منصوبے کا آخری اور سب سے بڑا قدم!

شاور سے نکل کر اس نے بلو ڈرائر ساکٹ میں لگایا اور مشین کو اپنے سر کے اوپر پکڑا۔ آج اس نے ہلکی گلابی پولکا ڈاٹ شرٹ پہنی تھی، ساتھ ہی گھیر والی شلوار۔ زوں زوں کی آواز کے ساتھ گرم ہوا کے بھپکے اس

کے گیلے بال سکھا رہے تھے۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی اور اپنی کمزور لیکن ستھری صورت کو دیکھتے ایک مطمئن سانس خارج کی۔

بال سوکھ گئے تو سیاہ لٹیں کترا کر اس کے گالوں پر چپک گئیں۔ وہ نرمی سے مسکرا دی اور دراز میں سے اپنی چیزیں اکھٹی کرنے لگی۔ شناختی کارڈ، پرانے پاسپورٹ کی کاپی، پاسپورٹ سائز تصاویر اور دیگر ضروری دستاویزات۔

وہ واقعی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ کیا وہ مکمل طرح سے انسانیت بھول چکی تھی؟ کیا اب وہ صرف ایک گوشت کا مجسمہ تھی؟ اسے تو یہ سوالات بھی اب تکلیف نہیں دے رہے تھے۔

اچھا یا برا، معلوم نہیں، لیکن ظبیہ یمین بدل گئی تھی۔

تیاری مکمل کر کے اس نے گلابی شیفان کا دوپٹہ اپنے سر پر ڈالا ہی تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔ جامنی فلپ فون کھول کر اس نے ریٹا کا نمبر لگایا تو وہ سیدھا صوتی میل میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے فون ہونٹوں کے قریب پکڑا اور فائل کا بٹن لگاتے بولنا شروع کیا۔

"تمھارا بہت، بہت شکریہ ریٹا۔ پکنک پر بہت مزہ آیا۔ آج تمھاری کار گھر پر چھوڑ کر چابی گارڈ کو دے دوں گی۔"

بھیج کر اس نے دوپٹہ درست کیا اور سارے کاغذات اپنے سلنگ بیگ میں منتقل کیے۔ اس کے بعد وہ کمرے کی الماری تک آئی اور دیوار پر بنے قلابے سے چابی اتاری۔ ایک سانس بھرتے اس نے الماری کے پٹ کھولے تو لکڑی بول اٹھی۔ سامنے اس کے کپڑے تہہ ہوئے تھے اور غزار کے ہینگر میں لٹکے تھے۔ وہ نظر انداز کرتے آگے جھکی اور اپنے کپڑوں کی گڈی باہر نکالی۔ اب اندر کافی جگہ خالی تھی۔ چھن چھن کرتی چابی کو تھامے وہ آگے بڑھی اور الماری کی دیوار پر اپنی انگلیاں رگڑیں۔ کسی انجان آدمی کو یہی لگنا تھا

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

کہ وہ دیوار تھی، لیکن ظبیہ جانتی تھی وہ دیوار نہیں، دروازہ تھا۔ اس کے خزانے کا دروازہ۔ ننھا سوراخ مل گیا تو وہ اچک کر آگے ہوئی اور چابی اندر لگائی۔ تجوری کھل گئی۔

سامنے غزار کا بٹوا تھا اور چند بہت اہم کاغذات جو وہ اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھتا تھا، جیسے گھر کے پیپرز اور گاڑی کا انشورینس سرٹیفیکیٹ۔ اس نے طنزاً سر ہلایا اور وہ سب پرے ہٹایا۔ اس کے پیچھے چھپا منظر اس کی آنکھوں میں جو چمک لایا تھا وہ کسی چاند، سورج کے مترادف نہیں تھی۔

مالائی رنگٹ کے نوٹوں کے پلندے سجے ہوئے رکھے تھے، کالے ربر بینڈ سے قید۔ سورنگٹ کے سلطانی رنگے نوٹ اس کی پہنچ سے بس ایک پھونک کے فاصلے پر تھے۔ ظبیہ نے مسکراہٹ دباتے خود کو قابو کرنا چاہا۔ وہ پیسے کی بھوکی نہیں تھی، لیکن وہ بے جگر ضرور ہو گئی تھی، اور اس جہنم سے نکلنے کے لیے ہر کچھ کرنے کو تیار تھی۔

وہ آگے جھکی اور سو کی گڈی میں سے دس کے قریب نوٹ باہر نکالے۔ باقی گڈیاں پچاس اور دس کی تھیں۔ اس نے ان میں سے بھی تھوڑی تھوڑی رقم نکال کر اپنے پرس میں بھر لی۔ اس کے اپنے پیسے بھی اس نے رکھے تھے، لیکن وہ غزار کی مال و دولت کے مقابلے رتی برابر بھی نہ تھے۔ جیولوجسٹ کے باقی فنڈز اس کے بینک میں تھے۔ ظبیہ کو انھیں بھی نکلوانا تھا، لیکن اس کی تدابیر وہ بعد میں جوڑے گی۔

شاید، اکائر میری مدد کر سکے۔ وہ بزنس کنسلٹنٹ ہے۔ اس نے پلنگ کے نیچے سے اپنی چپلیں نکالتے سوچا۔ بزنس کنسلٹنٹ ہے، مرڈر کنسلٹنٹ نہیں۔ دماغ نے اسے ٹوکا تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

"کبھی جو یہ وقت پر کام آجائے۔"

اس نے پیروں پر پلٹتے خود سے کلام کیا۔

★★★

پترا جایا میں واقع ملائیشیائی محکمہ ہجرت کا آفیس ہفتے کو صبح آٹھ سے دوپہر بارہ تک کھلتا تھا، اور اسے پہلے ہی دس بج چکے تھے۔

ریٹا کی گاڑی اس نے ابھی واپس نہیں کی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ سارا کام کروا کے وہ گاڑی کو اچھا سا کار واش دے گی (ظاہراً مرحوم غزار کے پیسوں کا) اور ایک الوداعی تحفے کے ساتھ اسے ریٹا کے گھر چھوڑ آئے گی۔ اس کا اپنی سہیلی سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اللہ بچائے پرانے دوست احباب سے۔

ظبیہ نے گاڑی کا ہینڈل کھولتے ایک پل سوچا تھا وہ کیا بن گئی تھی۔ عجیب، آدم بیزار اور احسان فراموش۔ ایسا تو کوئی اور نہیں تھا؟

اگ، کمبخت پائلٹ۔

اس نے امیگریشن آفیس کے اندر قدم رکھا تھا وہ نانی جی کا گھر معلوم ہوا۔ ساری میز ساتھ ملا کر وہاں آفیسرز بڑے ایل ای ڈی پر چلتے فٹ بال کے کھیل میں مشغول تھے۔ ظبیہ کو نفرت ہوئی مرد ذات سے۔ کیوں مشقت کرتی تھی حکومت ہفتے کو دفتر کھولنے کی جب اس نے چیخیں اور شور شرابہ ہی سننا تھا؟

اب وہ کہاں سے کوئی پڑھا لکھا مرد ڈھونڈے اس کا معاملہ سمجھنے کے لیے۔ وہ جھجھکتے ہوئے ادھر کھڑی ہو گئی اور آس پاس نظریں دوڑائیں۔ لوگ کام بھی کر رہے تھے، گھنٹیاں بھی بج رہی تھیں اور قدموں کی چاپ بھی ہر جگہ تھی لیکن اس فارغ ہجوم کو دیکھ کر اس کی امیدوں کا جھاگ ایک پل میں بیٹھ گیا تھا۔

شاید اسے پیر تک رک جانا چاہیے تھا۔ بلکہ نہیں۔ وقت نہیں تھا اس کے پاس۔ جو ہونا تھا ابھی ہونا تھا۔ اس نے مضبوطی سے اپنے شانے اکڑائے اور قدم قدم چلتی کنارے والی میز تک گئی جہاں اسی کا ہم عمر ایک مرد مسکراتا ہوا اسکرین دیکھ رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور نیلی ڈریس شرٹ کا کالر کھلا تھا۔

وہ اس کے عین سامنے کھڑی ہوئی۔ "سلام۔ آپا خبار؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ السلام و علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟

گھنی پلکوں والے مرد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر۔ "سیلامت پاگی۔" وہ روکھا سا بولا۔ صبح بخیر۔

"میں پاسپورٹ کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔" وہ اب بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ یا اللہ، اس کا میٹر شاٹ نہ ہو۔

"نمبر لے کر ویٹنگ میں بیٹھ جائیں۔" اس نے ٹی وی کو دیکھتے کہا اور آخر میں برابر بیٹھے مرد سے ہنس کر تالی ماری۔ کسی نے گول کیا تھا۔

ظبیہ نے ناک سے سانس اندر کھینچی۔ یا اللہ، اس کا نہیں، میرا میٹر شاٹ نہ ہو۔

"سر، ارجنٹ ہے۔ تھوڑا تعاون کر لیں، پلیز۔" اس نے اپنی معصوم ترین شکل بنائی۔ پگھل جا، بدبخت۔

"لو جی۔ ایک اور ارجنسی۔" وہ مسکراتا ہوا اپنے ساتھی سے متوجہ ہوا۔ اب دو تین اور آفیسرز اسے دیکھ رہے تھے۔ نیلی ڈریس شرٹ والا اس کی طرف مڑا۔ "ہم آپ تک آتے ہیں۔ تھوڑا سکون رکھیں۔ آفیس مصروف ہے۔"

"کس میں؟ میسی کے گول کاؤنٹ کرنے میں؟" وہ بنا رکے بول گئی تو ڈریس شرٹ والے کے ابرو غصے سے تنے۔ آس پاس کھڑے مرد بھی متوجہ ہوئے۔ کچھ نے تو محظوظ سی مسکراہٹیں دبائیں۔

وہ آگے جھکا اور بہت تحمل سے سانس بھری۔ "دیکھئے—"

"گول!!!!" آس پاس سب چلائے، کچھ نے سیٹیاں بھی بجائیں۔ اب کہ مرد نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"دیکھئے پلیز۔۔۔" وہ آگے جھکی اور مسکین سی شکل بنائی۔ "مجھے واقعی ارجنٹ یہ کام کروانا ہے۔ میرا پاسپورٹ پھٹ گیا تھا۔ مجھے نیا بنوانا ہے جتنا جلدی ہو سکے۔"

اس بار اس آدمی نے اسے بھرپور غور سے دیکھا، پھر ہتھیلیاں ٹھوڑی کے نیچے جماتے وہ کمینی مسکراہٹ کے ساتھ بولا، "اور یہ درگھٹنا ہوئی کیسے؟ آپ کی عمر تو نہیں پاسپورٹ سے کھیلنے یا اسے پھاڑنے کی۔"

ظبیہ نے اس کی شکل دیکھی۔ کون تھا یہ مرد؟ اور سارے مرد اسے ایسے ہی کیوں ملتے تھے؟

"حادثہ ہو گیا تھا۔" اس نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"آپ نے پاسپورٹ سنبھال کر کیوں نہیں رکھا؟" وہ الٹا اسے کوسنے لگا۔ یہ اس کا گیم خراب کرنے کی سزا تھی۔ واؤ، ظبیہ بالکل بھی شرمندہ نہیں تھی۔

"وہ کیا ہے نا۔۔۔" وہ بہت تحمل سے مسکرائی۔ "مجھے پتا نہیں تھا نیا پاسپورٹ بنوانے کے لیے میرا ایسے۔۔۔" آدمی کو دیکھتے اس نے نگاہ میں بیچارگی جمائی۔ "ایسے لوگوں سے پالا پڑے گا۔ ورنہ میں یہ کبھی نہ ہونے دیتی۔"

آس پاس کچھ لوگ ہنس دیے۔ اب ان کی توجہ ظبیہ اور اپنے لال پڑتے دوست پر تھی۔ میسی گیا تیل لینے۔ آدمی نے اسے گھورا جو فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"آپ کا کیس کوئی اور دیکھ لے گا۔" اس نے سر موڑتے اپنے کولیگس کو دیکھا۔

"نوپ۔" سب یک جہتی کے ساتھ بول اٹھے۔ "ہم تو نہیں دیکھیں گے۔" عجیب بدتمیزی تھی۔

ظبیہ کی بھنویں تن گئیں لیکن وہ چپ رہی۔ پہلے ہی اس نے کافی پٹر پٹر زبان چلالی تھی۔ اور بولتی تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا۔

نیلی ڈریس شرٹ والا اس کی طرف راغب ہوا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا ظبیہ بیچاری سی شکل بنا کر آگے جھکی۔ "ہم تنہائی میں بات کر سکتے ہیں؟ میں آپ کو اپنا مسلہ سمجھا دوں گی۔"

پہلے تو وہ تھوڑا مشکوک نظر آیا پھر سر ہلاتے کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور مین ہال کے کنارے بنے آفیس کا دروازہ کھولا۔

آفیس چھوٹا تھا اور دیواریں نیلی۔ کاغذات اور رپورٹس کے پلندے ہر جگہ سجے تھے اور ایک فریم کی صورت دیوار پر مالائی محکمہ حجرت کا لوگو نصب تھا۔ کمرے میں دو کرسیاں تھیں، میز کے دونوں طرف۔

ظبیہ نے سوچا کوئی یہاں پر سانس بھی کیسے لیتا ہو گا؟

جیسے کوئی ایک لاش کے ساتھ بہتر گھنٹے سانس لے سکتا ہے۔ دماغ نے جواب دیا۔

"بیٹھیے۔" مرد نے نرمی سے کہا۔ ظبیہ نے شکریہ کہہ کر کرسی سنبھالی اور اس کے دوسری طرف آنے کا انتظار کیا۔

"اب کہیے۔ کیا مسلہ ہے؟ اور میں بتاتا چلوں کہ میں اپنا گیم چھوڑ کر آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ پلیز، make it worth my while ".

باتیں سنو اس کی، ظبیہ نے دل میں سوچا۔

"سر، میرے پاسپورٹ کے ساتھ مسلہ ہو گیا ہے۔ مجھے نیا بنوانا ہے۔ میری فلائٹ ہے اگلے ہفتے بیجنگ کی۔"

وہ فلائٹ جس کی بکنگ بھی اس نے گھر لوٹ کر کرنی تھی۔

اب وہ اپنی ڈیسک پر کچھ کاغذات ٹٹول رہا تھا، پھر اس نے ایک فارم اس کے آگے رکھا۔ "اسے پر کریں۔ آپ کی تصاویر، شناختی کارڈ وغیرہ بھی چاہیے ہو گا۔"

ظبیہ کو تھوڑا سکون ملا اور وہ سر ہلا کر فارم جانچنے لگی۔ آدمی نے بال پوائنٹ اس کی جانب بڑھایا تو اس نے تھام کر انگوٹھے سے اس کا کلکر دبایا۔

فارم میں اس کی ذاتی معلومات اور پچھلے پاسپورٹ کے حوالے سے چند سوالات تھے جو وہ پر کرنے لگی۔

سامنے بیٹھا مرد اسے دیکھ رہا تھا۔ ظبیہ نے فارم بھر دیا تو اس نے اس سے لیتے کاغذات ایک طرف رکھے۔ "نارمل یا ارجنٹ؟ مقررہ وقت دو سے چھ ہفتے ہیں اور ارجنٹ—"

"ارجنٹ۔ مجھے ارجنٹ چاہیے۔ میں زیادہ فیس دینے کے لیے تیار ہوں۔" وہ تیزی سے بولی تو وہ ایک لمحہ رکا پھر سر ہلایا۔

"ایک ہفتے کے اندر—"

"تین دن۔" وہ اٹل انداز میں بولی۔ "تین دن میں چاہیے۔"

"اوکے۔ قریبی بینک میں جا کر آپ یہ رقم جما کروا دیں۔ وہاں سے آپ کو ایک ریفرنس نمبر مل جائے گا۔ Keep it safe. تین دن بعد اپنے ساتھ لے کر آیئے گا۔"

ظبیہ مسکرا دی۔ وہ اتنا خوش تھی، اگر وہ رو جاتی تو اس بندے نے اٹھ کر بھاگ جانا تھا۔ "تھینک یو سو مچ!"

وہ دفتر سے باہر آئی تو دن چڑھا تھا۔ گرم سورج جھلس رہا تھا اور زمین تپ رہی تھی۔ اس نے ایک پر سکون مسکراہٹ کے ساتھ سر پیچھے گرایا تو گلابی شیفان کا دوپٹہ اس کے بالوں سے پھسل گیا۔

ظبیہ یمین نے ایک لمبی سانس اندر کھینچی اور پھر باہر چھوڑی۔ وہ پہلی بار اپنی زندگی میں حاضر تھی، زندہ تھی۔

چہرہ نیچے کرتے اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تاکہ دھوپ آنکھوں پر نہ پڑے۔ قدم آگے بڑھانے کے لیے ہوا میں بلند کیے تو وہ رک گئی۔ دفتر کے کنارے کیاریوں کے ساتھ ایک سیوریج لائن بہہ رہی تھی۔ اسے کالی جالیوں سے بند کیا تھا اور نیچے گدلا پانی لہریں بنا رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اس تک چلتی آئی۔ اس کے آس پاس روڈ پر گاڑیاں بھاگ رہی تھیں، ٹھیلے والے اپنی پھل سبزیاں بیچ رہے تھے۔ گھنے درخت گرم ہوا کے سائے جھول رہے تھے۔ یہاں سے وہاں اور واپس وہاں سے یہاں۔

سیمنٹ کی پٹڑی پر کھڑے ہوتے اس نے نیچے بہتے پانی کو دیکھا۔ اس کی انگلیوں نے حرکت کی اور ایک ہاتھ کی انگلی نے دوسری ہاتھ کی چوتھی انگلی کو چھوا۔ وہاں چمکتی سونے کی انگوٹھی پانچ سال سے وہیں تھی۔ کچھ سوچ کر اس کی حرکات سست ہوئیں، لیکن دماغ نے ایک آخری ٹھوکر لگائی۔

کرو!

اور بس۔ اس نے انگلی سے وہ زیور باہر نکالا اور بغیر دیکھے کالی جالیوں کے درمیان اچھال دیا۔

ننھی انگوٹھی پانی کے زور پر آگے بہہ گئی، اس کی پہنچ اور خیالات سے کوسوں دور۔

وہ پیچھے مڑی اور کی فوب پر بٹن دبایا۔

سارے رابطے منقطع ہو گئے۔

وہ دوٹوک انداز میں چل کر سڑک کے کنارے کھڑی گاڑی تک گئی۔ اندر بیٹھتے اس نے بیلٹ کسی اور اپنا بیگ برابر والی نشست پر ڈال دیا۔

دوپہر کا وقت تھا اور وہ چہکتی سڑکوں سے گاڑی گزار رہی تھی۔ حرکات مامون تھیں اور بھوری آنکھوں میں ان دیکھی تھکن۔ کون کہتا ہے فرار آسان ہے؟

سگنل پر بتی لال ٹمٹمائی تو اس نے پیر سے بریک دبائے۔ اسٹیرنگ ویل پر دھری اس کی انگلیوں میں آج آرام تھا۔ اب اس نے کسی مال میں رک کر ریٹا کے لیے کوئی گفٹ پسند کرنا تھا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اپنے برابر والی گاڑی سے ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں سنتے سر موڑا۔

اونچی سیاہ رنگ کی جیپ میں بھرپور طریقے سے تیار کئی لوگ بیٹھے تھے۔ چمک دمک کے ملبوسات زیب تن کیے ہوئیں عورتیں اور لڑکیاں اور ان کے ساتھ رسمی مالائی پوشاک پہنے مرد۔ وہ سب خوش اور پرجوش لگتے تھے۔ ظبیہ دو پل میں سمجھ چکی تھی، وہ کسی شادی کی گاڑی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

مہندی سے سرخ رنگے ہاتھ، قیمتی زیور اور چمکیلے سوٹ دیکھتے اسے ایک زمانہ شدت سے یاد آیا۔ دماغ کے پردے لہرائے اور گزرے وقتوں کی تمنا ہوا کے سرد جھونکے کی مانند اسے جھنجوڑ گئی۔

موتیے کی خوشبو اس کا جسم کا ذرہ ذرہ چھو گزری۔

چہرہ موڑتے اس نے انکار کیا۔ ماضی پیچھے تھا اور مستقبل آگے۔ وہ اور نہیں سوچ سکتی تھی۔ لیکن باراتیوں کی خوش باش ہنسی کی آواز اسے بہرا کر رہی تھی۔ ونڈ شیلڈ سے باہر دیکھتے کب دماغ حال سے جدا ہو گیا، اسے خبر تک نہ ہوئی۔

★★★

(حال سے بارہ سال قبل)

۱۵ مئی، ۲۰۰۲

موسم سہانا اور خوشگوار تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گھنے بادلوں کے گرد پہرا دے رہے تھے۔ تمان تن ڈاکٹر اسماعیل تو مانو جی اٹھا تھا۔ اس وقت قطار میں بنے بنگلوں میں سے خاکستری رنگ کے دروازوں والے گھر کے آگے شور اور گہما گہمی تھی۔ کئی گاڑیاں مین روڈ پر پارک ہوئی تھیں اور مہمانوں کے بڑے لشکر گیٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا، جب عصر سر نکالنے کو تھی۔

عورتیں، مرد، بالغ لڑکے لڑکیاں اور گھر کے اندر باہر دوڑتے بچے۔ پہلے تاثر سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی شادی والا گھر تھا۔

گھر کے لاونج میں مہمان لبالب بھرے تھے۔ دو منزلہ بنگلہ پھولوں اور مٹھائیوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ گول زینوں کے ارد گرد سنہری دمکتی فیری لائٹس چمک رہی تھیں، ساتھ ہی ریلنگ پر یاسمین کے پھولوں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔

جوتے، چپلوں کی کھٹر پٹر، سیڑھیوں سے اوپر نیچے جاتا سامان، مہمان عورتوں کے گپے اور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے لدی کم عمر لڑکیوں کی جوڑیاں جو کبھی سیاہ پاؤڈر آنکھوں پر لگاتیں، تو کبھی حجاب میں ایک اور سیفٹی پن کا اضافہ کرتیں۔

وہ اپنے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ ایک مہمان بچہ اس سے ٹکراتے ہوئے بچا۔ رائج نے توازن سنبھالا اور اسے جھڑکنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ برابر سے کٹ کر اوپر بھاگ گیا۔ وہ سر جھٹک کر سانس لیتے گھر کے برآمدے کی طرف بڑھا۔

اکیس سالہ رائج کا چہرہ جوانی کی گلابی رنگت سے پر نور تھا۔ اس کے بھورے بال حال کے مقابلے ذرا بڑے تھے، لیکن ان کی ڈھٹائی ایک سی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب رائج نے زندگی میں پہلی بار جم شروع کیا تھا، تو اس کا جسم کافی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ لیکن قامت ہمیشہ کی طرح چوڑی اور مضبوط تھی۔

اس نے دودھ کے سفید رنگ کا باجو کرتا پہنا تھا، ساتھ ہم رنگ شلوار پنجانگ (روائیتی مالائی لباس کا نچلہ حصّہ) اور کمر کے گرد گہرے نیلے رنگ کا سمپین۔ (روائیتی مالائی کپڑا جو رسمی تقریبات میں مرد اپنی کمر کے گرد پہنتے ہیں۔)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رباب کے نکاح کے لیے یہی اس کا لباس تھا۔

برآمدے تک جاتے وہ نئے آئے مہمانوں سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا جا رہا تھا۔ کبھی کسی کو تشریف رکھنے کہتا تو کبھی ملازم کو ٹھنڈا پوچھنے کا حکم جاری کرتا۔ بے بین قدموں سے وہ دروازوں کے آگے چکر کاٹ رہا تھا۔ اسے گاڑی والے کا انتظار تھا۔ عصر کی نماز کے بعد، مرتضیٰ کے گھر کے پاس والے مدرسے میں اس کا اور رباب کا نکاح پڑھایا جانے والا تھا، اور دونوں گھرانوں کو وہیں پہنچنا تھا۔

بھیڑ سے نکل کر ایک آواز اس تک آئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ گیارہ بارہ برس کی لڑکی اس کی دور کی پھپھو کی بیٹی تھی۔ آنکھوں پر سلور شیڈ اور خوفناک لال لپ اسٹک۔ ٹین ایجرز کبھی نہیں سدھرتے۔

"کیا ہوا؟" وہ مردوں سے ہٹ کر اس کی طرف آیا۔

"رباب کاک اور ممانی آپ کو بلا رہی ہیں۔" وہ ہانپتے ہانپتے بولی اور واپس اپنے سہیلیوں کے جم غفیر میں غائب ہو گئی۔

رابح نے ایک نگاہ خالی مین روڈ پر دوڑائی۔ یہ کمبخت ڈرائیور اسے بہن کے سسرالیوں کے آگے ناک منہ رگڑوائے گا۔ سر جھٹک کر وہ اوپر کی طرف سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

رباب کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک سانس اندر اتاری اور بند انگشت سے لکڑی کھٹکھٹائی۔ دو پل خاموشی رہی اور پھر کسی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

کمرے میں رکھے منٹ رنگے میٹرس سے لے کر وینٹی مرر تک رش ہی رش تھا۔ ایک تو پتا نہیں اس کی کون کون سی دوستیں اٹھ کر آ گئی تھیں، رابح کو سخت چڑ ہوئی۔

اس کی خالہ کی بیٹی زرین رباب پر جھکی اس کا حجاب پن اپ کر رہی تھی، جس کا رخ شیشے کی طرف تھا۔ ایک دوست اس کے ماتھے پر لگا ٹیکا درست کر رہی تھی اور ایک مہندی لگے ہاتھوں میں چوڑیاں آگے پیچھے کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اماں کھڑی تھیں جو نرم، شفقت سے چمکتی آنکھوں سے اپنی بیٹی کا دلہن بنا روپ سراہا رہی تھیں۔ انھیں تو اپنی ہی نظروں سے خوف آ رہا تھا، کہ کہیں آپ ہی بیٹی کو نظر نہ لگا دیں، اسی لیے مسلسل درود شریف کا ورد کیے جا رہی تھیں۔

رابح نے گلا صاف کیا تو لڑکیوں کو تھوڑا لحاظ یاد آیا۔ اس کے لیے جگہ دیتے وہ لوگ یہاں وہاں ہوئیں۔ اماں نے چہرہ موڑا اور ان کی آنکھیں اسے دیکھتے جی اٹھیں۔ وہ نرمی سے مسکرائیں اور اسے اوپر سے نیچے تک جانچا۔

رباب نے سرمے سے رنگی گول اور سبز آنکھیں اوپر اٹھائیں تو آئینے میں ان کی نگاہیں ملیں۔ وہ شرمگین سا مسکرا دی، ساتھ ہی اس کے چمکتے دانت واضح ہوئے۔ بلاشبہ، وہ اس کہانی کی سب سے خوبصورت لڑکی

تھی۔ ڈسٹی پنک گاؤن میں اس کا وجود سر تا پا کسی خواب کا تاسف دیتا تھا۔ پلم رنگا حجاب اس کے چہرے کے گرد نفاست اور وقار سے لپیٹا گیا تھا۔ گھنی پلکیں، نیوڈ لپ اسٹک والے پھولے ہوئے ہونٹ اور گالوں پر پھیلی نیچرل سرخی۔

رانج اسے بہت مان سے دیکھتا رہا۔ اس کی بڑی بہن زندگی کے ہر درجے پر اس سے آگے، بلند اور صحیح رہی تھی۔ ہر گھڑی اور پہلو میں، وہ دونوں ایک دوسرے کا واحد سپورٹ تھے۔ ان کے درمیان عمر میں کافی انحراف تھا، لیکن وہ ہمیشہ ایسے ایک دوسرے کو سمجھ لیتے تھے کہ معلوم ہی نہ چلتا۔ لڑائیاں بھی ہمیشہ بلا جھجک ہوتی تھیں اور بن کر سلجھ بھی جایا کرتی تھیں۔ رانج اماں کو پٹانے میں شیر تھا تو رباب باپ کی لاڈلی۔ رانج اسے خود سے زیادہ ذہین تصور کرتا تھا۔ رباب کی جنرل نالج، انسائڈر انفورمیشن اور خود اعتمادی اس نے ہمیشہ اپنے لیے چاہی تھی، لیکن کبھی اس کے لیے اس سے حسد نہیں کی تھی۔ وہ تو چاہ کر بھی اس کے بارے میں کچھ منفی نہیں سوچ سکتا تھا۔ رباب اس کی ماں کی جگہ تھی۔ اور اس ایک ہستی کے لیے اس کے دل میں اگر کچھ تھا، تو وہ تھا بے پناہ احترام اور لازوال محبت۔

"اچھا، پانچ منٹ دو۔" اس نے اپنی آس پاس کھڑی لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ "آ کے لگا لینا، مجھے ابی سے بات کرنی ہے۔"

رانج دیکھتا رہا اور چند ثانیوں میں کمرے میں صرف تین وجود تھے۔ رباب نے گول گھومنے والی چیئر اس کی جانب کرنا چاہی، لیکن بال گاؤن اتنا وزنی تھا کہ ہل نہ سکی۔ رانج نے مسکرا کر ایک ہاتھ سے اس کی کرسی اپنی طرف موڑی۔

وہ ہنس دی۔ "ہیلو!"

"ہیلو ڈیئر۔" وہ گال پر آدھا چاند لیے مسکرایا، پھر چہرہ برابر کھڑی اماں کی جانب موڑا۔ "اماں، نظر اتاری؟

"دوبار۔" انھوں نے نم آنکھیں پلو سے صاف کیں۔ "ایسا رنگ کھلا ہے اس کا۔" انھوں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر بوسہ لیا۔ رباب مسکراتی رہی۔

"یار، اماں اتنی VIP ٹریٹمنٹ دے رہی ہیں، ابی، قسم سے۔ تم بھی نمبر لگالو اپنا۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔" وہ چھیڑ کر بولی۔ وہ ہنس دیا۔

"اب یہی سوچ رہا ہوں میں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر لگا ٹیکا سدھارنے لگا۔ "دکھی کوئی میرے لائق؟

اماں نے اس کا بازو ٹھوکا تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ رباب کھکھلاتی چلی گئی، اور چند لمحات بعد تھوڑا سنبھل کر اسے دیکھنے لگی۔ آنکھیں نرم اور پر امید تھیں۔ اماں کو کوئی مہمان آنٹی رشتے دار سے ملانے لے جا چکی تھیں۔

"پیارے لگ رہے ہو۔" رباب نے اس کے سمپین سے سلوٹیں مٹاتے کہا۔ "دیکھا، کتنی اچھی پسند ہے میری۔ ٹھیک—"

"آپا، آپ مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔" اس نے نرمی سے پیشکش کی۔ رباب ٹھٹک کر رکی، سبز آنکھیں حیرت اور تعجب سے وا ہوئیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"کر تو رہی ہوں بات!" اس نے فوراً تاثرات چھپانے چاہے۔

رابح نے سر ترچھا کیا۔ رباب نے ہار مان کر شرمندگی سے اداکاری ترک کی۔

"دبئی بہت دور ہے، ابی۔۔۔" اس کی آنکھیں موٹے آنسوؤں سے بھر آئیں۔ نچلی پٹی سرخ ہوئی۔

رابح خاموش ہمدردی سے اسے سنتا گیا۔ رباب کا بولنا کسی بھی تسلی سے زیادہ اہم تھا۔

اس نے مہندی سے گاڑھے سرخ رنگی انگلیوں سے آنکھ کر کنارہ صاف کیا، مگر وہ پھر بھر گیا۔ "مجھے پتا ہوتا مرتضیٰ کا ٹرانسفر ہو جائے گا تو۔۔۔" اس کی آواز کانپ اٹھی۔

رابح آگے جھکا، ہیزل آنکھیں پر سکون تھیں۔ "تو کیا؟"

رباب نے شکست سے سر نیچے کر لیا۔ سیاہ سر ماپانی بن رہا تھا۔ رابح نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

"تو کیا، آپا؟ کیا آپ انھیں چھوڑ دیتیں؟ کیا آپ ان سے شادی نہ کرتیں؟" وہ اعتماد سے پوچھ رہا تھا۔

سوال کسی بھی وار یا تنقید سے خالی تھا۔

رباب کا چہرہ گرم ہوا۔ اس نے ندامت سے زبان ہونٹوں پر پھیری۔

"آپا، جواب دیں۔ آپ نے تو کہا تھا آپ کو محبت ہوئی ہے۔ کیا آپ کو محبت اس شخص سے نہیں، بلکہ اس کی موجودگی سے ہوئی تھی؟" وہ خاموش آواز میں پوچھ رہا تھا۔ "کیا مرتضیٰ عباس صرف تب تک آپ کی چاہت اور خیال کا حقدار ہے جب تک وہ پاس ہے؟ کیا آپ اس کی محبت کے لیے فاصلہ قبول نہیں کر سکتیں؟"

گرم آنسو اس کے گال سے نیچے پھسلے۔ اس نے ہتھیلی سے انھیں رگڑنا چاہا، مگر میک اپ خراب ہونے کے ڈر سے ہلی نہیں۔

"اگر آپ کا جواب ہاں ہے، اگر آپ نے واقعی مرتضیٰ عباس سے نہیں، بلکہ اپنے تصور سے محبت کی تھی، اس تصور سے کہ وہ آپ کی موجودہ زندگی کا اسی طرح حصّہ بنے گا جس کا آپ نے گمان کیا تھا۔ تو مجھے بتائیں آپا، میں یہ نکاح یہیں روک دوں گا۔"

وہ لرز اٹھی۔ "نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔" رباب نے اس بے بسی اور شکست سے الفاظ منمنائے، کہ دو پل وہ بھی ساکت رہ گیا۔ وہ ہتھیلیوں کا پیالہ بنائے، بن آواز سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ وہ آپ کو مجبور کر رہا ہے؟" رابح کو لگا اس کا جسم شعلہ شعلہ ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ مرتضیٰ عباس کا ایک ایک دانت پلاس سے نکالنے کو پھڑ پھڑائے۔ خبیث مرد۔

"ہاں۔" رباب نے سر اوپر اٹھایا۔ گیلا چہرہ۔ "مجھے مجبور کر رہا ہے میرا دل، رائج۔"

وہ دنگ کھڑا رہ گیا۔ اب یہ کیا ہوتا ہے؟

"مجھے مرتضیٰ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس سے دوری قبول ہے، اس کا جانا نہیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا وہ مجھے اتنا پسند آجائے گا، مگر رائج۔۔۔" وہ سادگی سے مسکرائی۔ "اس نے مجھے اتنا دے دیا ہے کہ میرے پاس میرا کم، اس کا زیادہ ہے۔ میں ہر چھوٹی چیز پر اس کا سوچتی ہوں۔ کیا اسے میرا یہ کرنا پسند آئے گا، وہ کیا کہے گا جب میں اسے یہ بتاؤں گی، اسے کیا چیز ہنسائے گی، کون سی چیز وہ سینے میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اس نے ٹشو سے اپنی ناک گھسی۔ "وہ میرے لیے ضرورت سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ عجیب، آئی ہیٹ ہم۔"

رائج کھلا منہ لیے اسے دیکھتا رہا۔ "تو وہ آپ کو مجبور نہیں کر رہا؟"

رباب نم آنکھوں سے ہنس دی۔ "وہ مر جائے گا کسی کو مجبور کرنے سے پہلے۔ اتنا سا تو دل ہے اس کا۔"

رائج بھی تھوڑا سا مسکرایا۔ "تو آپ کیا چاہتی ہیں، مسز عباس؟"

رباب کے گال سرخ ہوئے چلے۔ "یہ فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ دبئی میرے لیے انجان ہے۔" وہ اس کے ہاتھ سے کھیلتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

"مرتضیٰ کے لیے بھی تو ہے۔" اس نے انگوٹھے کی پشت سے اس کا ہاتھ سہلایا۔ "اور آپ نے کہا کہ آپ کو اس مرد سے محبت ہے، جائے، وقوع، اوقات سے نہیں۔ کیا آپ اس پر بھروسہ کرتی ہیں؟"

رباب نے بڑی آنکھیں جھپکیں۔ "بھروسہ کہ وہ ایک اچھا پارٹنر ثابت ہو گا، یس۔ بھروسہ کہ وہ فرج میں رکھی میری ٹوئیکس نہیں کھائے گا، نو۔"

رائج ہنس دیا اور جھک کر اس کے سر پر بوسہ دیا۔ "آپ پوری طرح گر چکی ہیں، آپا۔ ایو (ew)۔"

"جج مت کرو۔" رباب نے حجاب سنبھالا۔ "تمھیں بھی ہو گی ایک دن محبت، پھر میں پکڑوں گی بچو۔ تم بھی ساری ایو اور یک والی حرکتیں کرو گے۔"

وہ شان سے مسکرایا۔ "میں ایک نہایت باوقار مرد ہوں۔ ایسی چھچھوری حرکتیں زیب نہیں دیتیں مجھے۔"

رباب نے آنکھیں گھمائیں اور باہیں کھول کر اسے دعوت دی۔ وہ مسکرا کر اس سے لپٹ گیا۔ رباب نے اس کے بال سہلائے۔

"Kau macam lampu malam".

"تم اندھیری رات میں روشنی ہو۔"

رابح نے آنکھیں موندے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "اور آپ سحری میں بجتا ڈھول۔"

رباب نے جھپٹ کر اس کا کان کھینچا، ساتھ ہی تمام مہلاؤں کو اندر آنے کے لیے اجازت دے دی۔ وہ بگڑے توازن سے جھکا کان آزاد کرنے کی جست میں کراہ رہا تھا۔

ساری عورتیں دبی مسکراہٹوں اور سرگوشیوں میں اسے دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ رابح کا چہرہ لال دہک اٹھا۔

"لا اللہ آپا۔" وہ سرگوشی میں غرایا۔ "میں اکیس کا ہوں۔" رباب نے ابھی تک کان جکڑ رکھا تھا۔ اس کے دوست اس کی ناک پر لمبے برش سے سرخی لگا رہی تھی۔ رابح کو دیکھ کر وہ شگفتگی سے مسکرائی۔

"سوری بولو۔" وہ آنکھیں بند کیے بولی۔

"آپا، سب دیکھ رہے ہیں۔" وہ تمتماہٹ سے گلابی رنگ گیا تھا۔

"ہمم، جلدی سوری بولو ورنہ سب سنیں گے بھی۔ سارے راز کھول کر جاؤں تمھارے دبئی؟ یہ نہیں، وہ ڈارک پنک والی۔" اس نے لڑکی کو اپنی سینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

"اوکے۔ معذرت، معافی، سوری، متأسف، پارڈون۔"

رباب نے مطمئن ہو کر اسے آزاد کیا پھر ہاتھ جھاڑے۔ اور وہ لمحہ اوپر لگائے بغیر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ سرخ ہوا کان سہلاتے اس نے زینے اترے اور تب ہی دیکھا گاڑی والا کھڑا اس کے چچا سے گلے مل رہا تھا۔

رابح کو لگا اس کا میٹر پھٹ پڑے گا۔

"ارے، رابح بھائی!" وہ اچانک ہی اس کی جانب مڑا اور ondeh-ondeh کی دو چھوٹی گیندیں اس کے منہ میں ٹھونس دیں۔

Ondeh-Ondeh ایک مالائی مٹھائی ہے جسے اکثر شادی کی تقریبات میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی گیندوں کی صورت ہوتی ہے، جنھیں چاول کے آٹے اور کھجور کے سیرپ سے بنایا جاتا ہے۔ آخر میں، انھیں تازہ کٹے ہوئے ناریل میں رول کیا جاتا ہے۔

"Tahniah, abang"!

وہ پُرجوش سا اسے مبارکباد دے رہا تھا۔ رابح سب سمجھتا تھا۔ یہ اس کے عتاب کو ٹالنے کے ٹوٹکے تھے۔ وہ پھولے گال لیے مٹھائی چباتا رہا، آنکھیں ڈرائیور کو گھور رہی تھیں جو پورے پندرہ منٹ اوپر آیا تھا۔

"چلو، اب اپنے باپ کی طرح نہ شروع ہو۔" چچا نے اس کا بازو تھپکا۔

رابح موڈ صحیح کرتا اس کے ساتھ باہر آیا اور کزنوں اور ملازمین کو تحائف اور پھول گاڑی میں رکھنے کا کہا۔ عصر کی ہوا ٹھنڈی تھی۔ کیاریاں بھی فیری لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ صرف شام ڈھلنے کی دیر تھی اور پھر ہر سو سنہرا نور ہو گا۔

وہ اب ڈرائیور کو بہت مگن سا ہو کر مدرسے کا راستہ سمجھا رہا تھا، جو چہرے پر تفتیش لیے سب سن رہا تھا۔ عادتاً رابح کے ہاتھ ہوا میں چل رہے تھے، کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ وہ گفتگو کی گور میں اتنا غرقاب ہوا تھا کہ تارکول کی سڑک پر قدم قدم چل کر آتا وجود اسے دکھائی ہی نہیں دیا۔

"سنیں۔"

ہچکچاہٹ سے لیس پکار پر اس نے چہرہ موڑا۔ سامنے چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی تھی، سر پر زیتونی سبز رنگ کا ریشمی حجاب تھا جسے پن سے ٹھہرایا گیا تھا اور ہم رنگ باجو کرونگ جس پر سونے کی تاروں کا کام ہوا تھا۔ اس کی نازک کلائیوں میں سونے کی چار چار چوڑیاں تھیں اور ہاتھ پھولوں کی بڑی سی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھے۔

"وہ، رباب کاک۔" اس نے بمشکل کہا۔ رابح اسے جانتا تھا کیونکہ وہ اس سے چند گھر چھوڑ کر ہی رہتی تھی۔ اس کی رباب سے خوب بنتی تھی، حالاں کہ ان کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ البتہ اس نے کبھی اس بچی کو زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

اس نے نظریں جھکائیں۔ تحفہ تھامے لڑکی کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ مسکراہٹ دبا گیا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اندر ہیں۔ کیا لائی ہو؟" اس نے گفٹ ریپر چڑھے ڈبے کی جانب اشارہ کیا، مسکراہٹ آرام دہ تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے مذاق مذاق میں تھوڑا تنگ کر دیا کرتا تھا۔

"تحفہ ہے ان کے لیے۔" ظبیہ کی آنکھیں اوپر ہی نہیں اٹھتی تھیں۔ "میں مل لوں ان سے؟" اس کا دل اتنا زور سے دھڑک رہا تھا کہ ابھی منہ سے ابل آئے گا۔ اُف! اس کا یہ ٹین ایج کرش اس کی جان لے لے گا۔

"پلیز۔" وہ بآسانی ایک سائیڈ ہو گیا، ہونٹوں کی مسکراہٹ قائم رہی۔

وہ جانے کو مڑی ہی تھی کہ وہ اس کے راستے میں آ رکا۔ ظبیہ کا دل اچھل کر کودا۔ پھر اس نے ہولے سے اس کے ہاتھوں سے پھولوں کی ٹوکری لی۔ موتیے کی خوشبو ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا وجود بن گئی۔

"گفٹ ان کا ہے، پھول تو میں لے سکتا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ ظبیہ کے لب کھلے مگر زبان ایسی لوہا تھا جیسے بارش کے بعد زنگ آلود دروازے۔

"گاڑی میں رکھنے ہیں ناں۔" اس نے سادگی سے کندھے سے پیچھے اشارہ کیا۔ ظبیہ اچانک سنبھلی۔ ہائے اللہ! وہ کیا کہہ رہا تھا اور وہ کیا سمجھ رہی تھی۔

"جی، جی۔" اس نے جلدی سے ٹوکری اس کے حوالے کی۔ رابح نے مسکرا کر 'تھینک یو' کہا، پھر ملازم کا نام لے کر ایک زوردار آواز لگائی۔ ظبیہ بے جا ٹھٹک گئی۔

"اندر لے کر جاؤ انھیں۔ آپا بیڈ روم میں ہیں۔" وہ ظبیہ سے کہتے پلٹا کہ اچانک دونوں نفوس کو ایک جھٹکا محسوس ہوا۔

ظبیہ کے حجاب کا سرا اس کی گھڑی میں اٹکا تھا۔

حیا سے اس کے گال گلابی ٹمٹما اٹھے اور وہ ہڑبڑاہٹ میں نزدیک آئی۔ رابح بنا حرکت کھڑا رہا، ٹھوڑی جھکی تھی اور گہری ہیزل آنکھیں اس پر۔ وہ تذبذب میں اپنا حجاب جھٹک رہی تھی، لیکن اس کی گھڑی کا پٹا چھونے کی دلیری اس میں نہ تھی۔ رابح نے پُرامنی سے اپنی پہلو میں گری کلائی ہوا میں کی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے، نہایت نرمی سے اس کا پلو آزاد کیا۔

پھر وہ دو قدم پیچھے ہوا اور اسے دیکھے بغیر مڑ کر باہر نکل گیا۔ ظبیہ نے فرش کی طرف ٹھوڑی کیے اپنی سانس بحال کی۔

باہر کھلی فضا میں قدم رکھتے رابح کو اپنے تپتے گالوں سے لالی بھاپ بنتی محسوس ہوئی۔ اس نے مٹھی بنا کر ہوا باہر چھوڑی۔ وہاں کھڑے کھڑے اس نے خود سے اپنے اصول دہرائے۔ وہ اصول جن کی یاددہانی کی ضرورت اسے اس روز سے قبل کبھی پیش نہیں آئی تھی۔

کچھ ہوا تھا، لیکن وہ غور نہیں کرے گا۔

کچھ ہوا تھا، لیکن وہ ضبط نہیں کھوئے گا۔

کچھ ہوا تھا، لیکن وہ اقرار نہیں کرے گا۔

اور ان سب آدھے ادھورے، عارضی بچنوں پر اس کی روح دہلانے کے لیے ایک انکشاف ہی کافی تھا۔

کچھ ہو چکا تھا، اور وہ اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

★★★

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

مرحلہ نمبر ۰۵

ھبوط

(زوال)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

حال

جگہ: کاکپٹ

01:30 AM

کبھی خاموشی کا بوجھ محسوس کیا ہے؟

کبھی امن سے کترائے ہو؟ کبھی سناٹے سے خوف کھایا ہے؟ کبھی کھڑکی سے باہر پھیلتی سیاہی کو دیکھ کر جھنجھلائے ہو؟ کبھی بے خواب راتیں گزاری ہیں؟ کبھی اپنی ہی ہوا نفس کی آواز پر کانپے ہو؟ کبھی خواہش کی ہے چیخ و پکار کی، بحث و تمحیص کی؟ جب اپنا آپ صرف ایک گمنام پاتال معلوم ہوتا ہو، جب خاموشی آپ کی پور پور کو ڈسنے کے لیے لپکے، تب کیا کرتے ہو؟

کبھی محسوس کیا ہے اپنا نزول؟

وہ جو تمھاری ارتفاع کی کلاہ اور جیت کی ستائش میں روپوش ہوتا ہے؟ وہ جو آہستہ آہستہ تمھاری ہستی میں اپنی جگہ بنا رہا ہوتا ہے؟ تمھاری بلندیاں تمھیں آسمان دکھاتی ہیں تو تمھارا نزول وہیں ہوتا ہے، تمھارے سینے میں ساکن۔ وہ انتظار کرتا ہے، وقت کاٹتا ہے۔ تمھاری چاہتیں زیرِ دست لا کر، وہ تمھیں عادی بنا لیتا ہے تمھارے حال کا۔ تمھیں گمان ہوتا ہے تم قادر ہو، تم عزیز ہو، تم کامل ہو۔

لیکن گمان ہی تو ہے۔ ایک فریبی پرچم، ایک منکر تصویر۔

آٹھ مارچ کی رات، بحیرہ جنوبی چین کے ٹھیک اوپر ہمارا طیارہ سفر کر رہا تھا۔ ملائیشیاء ائیر لائنز کے بوئنگ ۷۷۷ کا ماڈل، نامور ایم ایچ تھری سیون زیرو، کوالالمپور سے بیجنگ کی اور۔ ایک مخصوص ریڈ آئی (red-eye) فلائٹ، دو قابل ترین پائلٹ کی زیرِ قیادت۔ دو سو انتالیس جانیں، جن میں سے بارہ کریو ممبرز تھے اور دو سو ستائیس مسافرین۔ ایک نان اسٹاپ فلائٹ، جس کا دورانیہ تھا چھ گھنٹے اور پچیس منٹ۔ کیا غلط ہو سکتا تھا؟ بلکہ۔۔۔

کیا غلط ہو چکا تھا؟

کا کپٹ میں خاموشی تھی، وزنی، نا قابلِ فہم۔ دیوار پر نصب آلاتی بتیاں لال اور نیلی چمک رہی تھیں، ریڈار اسکرین پر ہرے دائرے تھے، جن کے درمیان ایک سوئی دائیں سے بائیں گردش کر رہی تھی۔ بنیادی فلائٹ ڈسپلے (PFD) پر طیارے کی حالت، عروج اور ہوائی شتابی کو ہندسوں میں ناپا جا رہا تھا۔ اس ہی کے ساتھ نیویگیشن ڈسپلے تھا جس پر فلائٹ کی معلومات عیاں تھی، ساتھ ہی اطلاعِ راہ (route information).

Departure Airport: Kuala Lumpur International Airport (WMKK)

Waypoints: KATOL, VPG VOR, IGARI, MEKAR, SUMDI

Airways: M765 (Airway between KATOL and VPG VOR)

Destination Airport: Beijing Capital International Airport (ZBAA)

سب طے تھا، لیکن کچھ صحیح نہ تھا۔

کو پائلٹ کی کرسی پر نشست اسامہ عامر کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے کی سفیدی گھل کر نیلی ہو چکی تھی اور گھنی پلکیں اس کے نرم گالوں پر ایسے قید تھیں جیسے وہ دس پانچ منٹ کا وقفہ لینے لیٹا ہو۔ اس کا سر گردن پر جھکا تھا اور جسم بے حرکت تھا۔ وہ سو چکا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اس کے برابر بیٹھا پائلٹ جاگا تھا۔ ہمارا منظر دھندلا کر صاف ہوتا ہے تو ہیزل آنکھوں کی پر گناہ تندی جھلکتی ہے۔ کیپٹن کے گلابی ہونٹ سلے تھے اور گھنی، سیاہ بھنوؤں کے بیچ شکنیں پڑی تھیں۔ اس کے کان ہیڈ فون سے بند تھے اور سفید ڈریس شرٹ کا کالر کھلا تھا۔ یونیفارم کا نیلا کوٹ پیچھے اسٹوریج کمپارٹمنٹ میں بے ترتیبی سے پڑا تھا۔

اس کے ماتھے پر پسینہ ٹمٹمار ہا تھا۔ وہ بد حواس لگتا تھا اور اس کے اجلے گالوں کی گلابی گاڑھی ہو کر سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

رانج نے ایک خیال سے بھاری نگاہ نیویگیشن ڈسپلے پر چلتے وے پوائنٹس کی طرف ڈالی۔ IGARI بحیرہ جنوبی چین کے راستے میں مقیم ایک وے پوائنٹ تھا جسے ملائیشیاء اور ویتنام کے درمیان گزرنے والے طیاروں کی معلومات پتا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ رانج نے اس سے رابطہ نہیں جوڑا تھا۔

ٹرانسپونڈر بند کر کے، اس نے ویتنام یا اپنے ملک کے کسی بھی ادارے یا ائیر ٹریفک کنٹرول سے بات نہیں کی تھی۔

اسے یقین تھا اب تک کنٹرول سینٹر میں بھگ دڑ مچ چکی ہو گی۔ بوئنگ ۷۷۷ کا نامور ماڈل جو کہ ایک روٹین فلائٹ پر قابض تھا۔۔۔ غائب ہو چکا تھا؟ اگلی صبح کی ہیڈ لائنز کیا بولیں گی؟ اگر پلین مل گیا تو کچھ اور، نہ ملا تو کچھ اور۔

رانج آدم کو پانچ سال لگے تھے اس لمحے کے لیے۔ اس رات کے لیے۔ اس موقع کے لیے۔ اس منصوبے کے لیے۔ اس قتل کے لیے۔ ایم ایچ تھری سیون زیرو کے لیے۔ اس کا منصوبہ بے نقص نہیں تھا، نہ ہی کامل۔ لیکن رانج وہ سب کر چکا تھا جو وہ کر سکتا تھا۔ اس نے باقی کی کہانی تاریخ اور تاریخ نگاروں کے ذمے چھوڑی تھی۔

ایک خیال اس کے دماغ میں دوڑا تو وہ سیدھا ہوا اور طیارے کی حالیہ حالت دیکھ کر آٹو پائلٹ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی کرسی میں آگے ہوا اور ساتھ بیٹھے اسامہ کی جیب تک ہاتھ بڑھایا۔ ایک دو بار کپڑا تھپتھپانے کے بعد اسے یاد آیا کہ فون تو اس نے اپنے سامنے بنے خانے میں ڈالا ہو گا۔ رانج کو جھنجلاہٹ ہوئی اپنی بیوقوفی پر۔

اس نے سفید سیمسنگ گیلیکسی کا ماڈل ہاتھ میں تھاما اور اسکرین آن کی۔ وقت تھا ایک بج کر پینتیس منٹ۔ ایک سانس اس کے ہونٹوں سے چھوٹی اور اس نے فون الٹا کر اس کا ڈھکن نیچے کیا۔ اندر موجود بیٹری اور سم کو بہت احتیاط سے ہاتھوں میں تھاما اور فون جیکٹ سے ڈھکی میز پر رکھا۔ اس کی آواز دب گئی۔

رانج نے سم دانتوں کے بیچ کاٹی اور بیٹری سامنے ڈالی۔ سم ٹوٹ گئی تو اس نے اسے نیچے پھینک کر اپنے جوتے سے مسلا اور جیب سے چمکدار پیپر کلپ باہر نکالی۔ عادت کہو یا معمول، وہ چھوٹی اور غیر معمولی سی پیپر کلپ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا، لیکن آج اس کا استعمال منفرد تھا۔

اس نے آگے جھکتے اپنے کمپارٹمینٹ میں پڑا فون اٹھایا اور اس کا کوور دور کیا۔ کوور کے اندر سے رول ہوئے ربڑ کے دستانے اس کی گود میں آ گرے۔ یہ اسی نے یہاں رکھے تھے۔

دستانے ہاتھوں پر چڑھائے اور انگلیاں کھل بند کیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا، خالی۔ شاید وہ اپنے گناہوں کے وزن کا عادی ہو چکا تھا۔ شاید اسے یہ سب ٹھیک لگتا تھا۔ شاید۔۔۔

ربڑ والے ہاتھوں سے اس نے ایک میں بیٹری پکڑی اور دوسرے میں وہ پیپر کلپ۔ ٹھہر کر ایک سانس خارج کی اور پھر پیپر کلپ کے کونے بیٹری کے دونوں سروں (terminals) سے ٹکرائے۔ بجلی کی رمق اٹھی تو اس نے آنکھیں بچانے کے لیے سر پھیر لیا۔ بیٹری میں شارٹ سرکٹ ہوا تھا، اور اس کا مطلب تھا کہ وہ مکمل طریقے سے فارغ ہو چکی تھی۔ خراب۔ بے کار۔ سم، بیٹری اور GPS کے تحت طیارے کو کھوجنے کے سارے عمل رد کر دیے گئے تھے۔

اس نے اپنا فون پکڑا اور اس کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا۔ اب دونوں فون خالی تھے۔ دونوں ڈیوایسز (devices) سامنے ڈالیں اور ساتھ رکھی لوہے کی بوتل اٹھائی۔ اس نے لب زبان سے تر کیے اور رک کر ایک لرزتی سانس لی۔ وہ کیا کر رہا تھا؟ وہ بیرونی دنیا سے سارے رابطے ختم کر رہا تھا۔ اپنے واحد سہارے کو بھی لات مار رہا تھا۔

وقت ہے، رانج۔ سنبھل جاو۔ چھوڑو یہ ضد۔ واپس چلتے ہیں۔ اس کا دماغ کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ اس دوغلے دماغ کی بالکل نہیں سنے گا۔ جھوٹا تھا وہ، فریبی۔ پانچ سال سے اسے یہی کہتا تھا کہ، وقت سب بدل دے گا۔ وقت سب سدھار دے گا۔ وقت میں یقین رکھو۔ رانج نے یقین رکھا تھا۔ رانج آدم نے اپنے علاوہ ہر چیز میں یقین رکھا تھا۔ کچھ نہیں بدلا تھا۔ کچھ نہیں لوٹا تھا۔ سب ویسا ہی تھا۔

تاریک۔ گم۔ لاانت۔

اس نے سر جھٹکتے بوتل کا کنارہ فون کی اسکرین پر مارا۔ دھم۔ دھم۔ دھم۔ وہ ایک طرف سے چیخ گئی تو اس نے اور قوت لگائی، جب تک کہ اسکرین ریزہ ریزہ ہو کر نہ رہ گئی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، لیکن اس نے دھیان نہیں دیا۔ اس کے سارے رابطے تو پہلے ہی منقطع تھے۔ دنیا والوں کو یہ گمان تھا کہ رانج آدم ایک تھا۔ کامل اور ترقی یافتہ۔ لیکن وہ ایک نہ تھا۔ رانج آدم حصہ حصہ تھا۔ وہ پورا اور بال تھا، روح اور گوشت تھا، دل اور دھڑکن تھا۔ صرف اپنی نہیں، دو سو جانوں کی۔ تین سو پچاس شہیدوں کی۔ وہ ان کی زندگی کے سب سے تاریک لمحے، سب سے بڑے خوف میں تھا۔ ان کی چیخوں کی آواز، ان کی آخری سانسوں کے جوش میں تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ ایک کب تھا؟

پانچ سال میں تو کبھی نہیں۔

پانچ سال گزر گئے تھے اور اسے حال میں جھونک دیا گیا تھا۔ وہ ماضی سے داغا ہوا سانچہ حال کے رنگ نہیں اپنا سکتا تھا۔ وہ جی چکا تھا اور مزے کی بات، وہ مر بھی چکا تھا۔

ان پانچ سالوں میں اسے ایم ایچ تھری سیون زیرو کا خیال کب آیا، یہ کہنا مشکل تھا۔ کب اس نے یہ منصوبہ ترتیب دیا، کب اس نے بلندیوں میں رہ کر نزول کا سوچا، کب اس نے زندگی کی قیمت جانی اور کب

اسے چکانی چاہی، اس کا کوئی مقررہ لمحہ نہیں تھا۔ لیکن اسے ایک بات پتا تھی، وہ وحی جو بحر الہند کے ساحل کنارے زندہ ہوتے اس کے دل میں اتری تھی۔

رائج آدم کی زندگی بدل چکی تھی۔ تاحیات۔

★★★

پانچ سال قبل

۲۰ نومبر ۲۰۰۹

(کریش کے دو روز بعد)

بحر ہند کی وسعت میں روپوش سبز نگینوں میں جڑے جزائر انڈمان و نکوبار میں سورج تیز تھا۔

گہری نیلاہٹ میں پھیلے آسمان کو سوں تک دوڑتے بھاگتے ساگروں سے جا ملے تھے، ایک ایسی دھن کی رکھوالی کرتے جو امن و سکون کے رنگ اوڑھی تھی۔ یہ دنیا، یہ جزیرہ ایسا ہی تھا۔ یہاں ہر طرف ہریالی تھی، سانس تھی، زندگی تھی۔ خلیج بنگال (bay of bengal) کی جنوبی مشرق میں واقع ہلالی شکل کا یہ جزیرہ ہریاول سے گھرا ایک بیابان تھا۔ یہاں کا پانی گھر تھا، پودے ارکان اور آسمان چھت۔ یہاں واقع پانچ سو بہتر جزائر اپنے شاداب اور گھنی گل کاری پر مغرور تھے، اپنے فیروزی سمندروں کی شہانت میں گم اور بہتی ہوا کے ناچ سے محظوظ۔

جزائر انڈمان اور نکوبار گھمنڈی تھے، اور دنیا کو وہ ایسے ہی بھاتے تھے۔

شہر پورٹ بلیئر میں صبح چست و چاق مچھیروں کے فخریہ نعروں اور تازہ پکڑی مچھلیوں کی سگھند میں ڈھونڈی جاتی تھی۔ گرم سورج شہر کے چپے چپے پر ایک سا برستا تھا، اور انڈین مصالحوں میں پکتی کری کی مہک ناک سے ہو کر دل تک اترتے ذرا وقت نہیں لیتی۔ یہ جگہ اپنے بازاروں اور مارکیٹوں کی وجہ سے جانی مانی جاتی تھی۔ اس میں سے ایک قابلِ ذکر مثال ہے شہر کے بیچ و بیچ قائم ابیر دین بازار کی۔ کلاک ٹاور پر

صبح کی روشنی تاباں تھی۔ آس پاس بنے ہوٹل اور ریستوران روزمرہ کی دوادش کے لیے نئے سرے سے تیار ہوتے کرسیاں لگا رہے تھے، کچھ 'CLOSED' کے تختے 'OPEN' کی طرف پلٹ رہے تھے۔

پورٹ بلئیر میں ہر نیا دن خاص تھا۔

اٹلانٹا پوائنٹ کے قریب واقع گووند بلبھ پنت اسپتال میں مریضوں کی چہل پہل تھی، مگر مقابلتاً کم۔ ویٹنگ روم میں لگی گہری بھوری گھڑی بھارتی معیاری وقت کے حساب سے صبح کے دس بجا رہی تھی۔ لمبی کھڑکیوں کے شیشوں پر دھوپ تیز تھی۔ ایک سیٹ پر ایک ماں اپنے بیمار بیٹے کو گلے لگائے بیٹھی۔ نظر موڑو تو راہداری میں ایک عورت آنکھوں میں ڈھیروں نیند لیے غسل خانے تک کا سفر طے کر رہی تھی۔ کاؤنٹر پر استقبالیہ کنندہ چمچماتے چہرے لیے آنے والے مریضوں کے ہر سوال کا جواب دینے میں مگن تھے۔

اسپتال کے دوسری منزل پر قدم رکھو تو کمروں کی قطار لمبی تھی، لیکن ہمارا مرکز تھا علیحدہ طور پر بنا فراخ کمرہ جس کے دروازے کے اوپر لال بتیوں میں الفاظ جگمگا رہے تھے۔ INTENSIVE CARE UNIT (ICU) اس گھنٹے کمرہ خاموش تھا۔ سیلنگ پر لگی سفید ایل ای ڈی لائٹ کے ساتھ ہلکی دھوپ پردوں کے درمیان سے چھن کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ آئی سی یو کے وارڈ میں ایک پلنگ اور دو چھوٹے صوفوں کے ساتھ دیوار پر چھبیس انچ کی ٹی وی اسکرین بھی نصب تھی جس میں اس وقت صرف اندھیرا چھایا تھا۔ کمرے کی وسعت میں دل کی شرح ناپنے والے آلے (heart rate monitor) جیسی دیگر طبی آلات کی ہلکی ٹن ٹن سنی جا سکتی تھی۔

اس لمحے، پلنگ کے ساتھ ایک زنانہ وجود کھڑا تھا۔ بھوری چیکر ڈ شرٹ پر سفید ڈاکٹروں کا گاؤن اور ہلکی نیلی ڈینم جینز میں ملبوس۔ آئی وی IV بیگ کو چھیڑتی اس کی انگلیاں لمبی اور خوبصورت گندمی صورت کی تھیں،

اور کلائی کے گرد سونے کی چین کا بریسلیٹ تھا۔ اس کی حرکات میں ٹھہراؤ تھا، ایسا ٹھہراؤ جسے مہارت سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔

کھڑکی سے آتی ہوا میں یک دم تیزی ہوئی تو پردہ ایک طرف ہوا اور سنہری روشنی گندمی رنگت پر ٹھہر گئی۔ اب اس لڑکی کی شکل واضح تھی۔ اس کی عمر تقریباً انتیس سے تیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گاؤن کے اوپر جڑے بیج پر اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔

DR. DURGA RATHORE

ڈاکٹر نے پوری توجہ کے ساتھ آئی وی بیگ میں جڑے رولر کلیمپ کو دبایا تاکہ اندر رواں فلوئیڈ ضائع نہ ہوں۔

وہ روٹین چیک اپ کے تہت پلنگ پر لیٹے مریض کا پرانا آئی وی بیگ بدل کر نیا لگا رہی تھی۔ مریض کی شکل پٹیوں اور بینڈ ایج سے ڈھکی تھی، لیکن جسمانی طور پر وہ ایک جوان مرد معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے کے گرد نرم کپڑے سے پٹی کی گئی تھی اور گہرے بھورے بال بدحواس سے ہر جگہ پھیلے تھے۔ گردن میں کمر کو سیدھا رکھنے والا کالر تھا اور چہرے پر جگہ جگہ واضح سوجن۔ کہیں لال، کہیں جامنی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

پلنگ کی دوسری طرف اس کا ایک پیر جرّی کساوٹ (traction brace) سے باندھا گیا تھا، جو کہ ٹوٹی ہڈی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ بازو پر بلڈ پریشر کا کف اور شہادت کی انگلی پر رفتارِ نبض گننے کا آلہ۔ وہ آدمی سو رہا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے۔

ڈاکٹر راٹھور نے آگے جھک کر اس کے ہاتھ میں لگا کینیتھیٹر چھوا اور آہستگی سے باہر نکالتے ٹرے میں سجا نیا آئی وی بیگ تھامنے پیچھے گھومی۔ اسی پل ایک گہری سانس کی آواز نے اس کا دھیان بٹایا۔

وہ سامنے گھومی تو بیڈ پر لیٹا مرد اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا۔ آہستہ، آہستہ۔ خون میں دوڑتی مسکن ادویات کے برخلاف وہ خود کو اٹھے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر ایسے ہی دیکھتا رہنے کے بعد اس کی آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں تو اس نے جھنجھلا کر ایک اور سانس لی۔

"جیوت لوگوں کی دنیا میں خوش آمدید۔" ڈاکٹر نے اسے مخاطب کیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور لہجے میں ایک خوش گوار سا طنز تھا۔ شاید، وہ بولتی ہی ایسا تھی۔

مریض نے اس کی آواز سنی تھی لیکن دماغ نے پہچانی نہیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو سنبھالنا چاہا۔ پلین سے گر کر آئی کئی چوٹوں میں ایک سر کی چوٹ بھی تھی، جسے از روئے طب concussion کہا جاتا ہے۔

"اوویٹ، تمھیں ہندی نہیں آتی ہو گی۔" ماہر ڈاکٹر خود سے بڑبڑائی۔

"English works for you, Mr Pilot?"

اب وہ مسکرا کر اس سے پوچھ رہی تھی۔ رابح نے جواباً آنکھیں میچ کر ایک کراہ نکالی تو وہ محظوظ سی ہو کر نیا آئی وی بیگ ٹیوب کے ساتھ جوڑنے لگی۔

"یہ کہاں ہے۔۔۔؟" مریض نے سوال کیا۔ اس کی آواز خشک تھی، روکھی، بے جان۔ ہیزل آنکھوں نے سمت موڑ کر اپنی ڈاکٹر کو دیکھا۔ "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

"پورٹ بلئیر۔ جزائر انڈمان۔" وہ ٹیوب پر انگلیاں پھیرنے لگی، کسی جھول یا خرابی کو ڈھونڈتے ہوئے۔ "تم اور تمھارے پلین نے غیر متوقع طور پر راستے بدل لیے تھے۔"

اس نے پلکیں جھپکیں، شاک اس کی رگوں میں ایسے دوڑا جیسے بجلی۔ سر میں اچانک اتنا شدید درد ہوا کہ وہ چیخ کر رہ گیا۔ "میرا سر۔۔۔" اس نے بے اختیار آئی وی لائنز میں قید ہاتھ اوپر اٹھانا چاہا۔ درگا راٹھور کو یہ ردعمل بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نے اس کا ہاتھ سختی سے تھامے رکھا۔

"پتا ہے۔ گر نہیں رہا۔" اس نے اسے دیکھا۔ عجیب عورت تھی۔ اب وہ ٹیوب سے تھوڑی مقدار میں مادہ گزار کر اس میں لیکیج کے نشانات چیک کر رہی تھی۔ جب سب صحیح معلوم ہوا تو اس نے ضرورت کے مطابق رفتار سیٹ کی اور پھر ٹیوب اس کے ہاتھ کے قریب لائی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ہونٹ ہلائے۔ درگا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ "یہ وہ ہے جو دو دن سے تمھیں زندہ رکھے ہوئی ہے۔ تھینک یو بولو سر کرسٹوفر رین کو۔" اس نے سوئی اس کی نبض میں پروئی تو رانج نے دانت پیسے۔

"کون کرسٹوفر رین؟" اس نے منہ بگاڑا۔ درگا نے اس کے آئی وی بیگ کو آگے پیچھے کرتے فلوئیڈ کا بہاؤ جانچا۔ سب صحیح تھا۔ وہ مطمئن سی اس کی جانب گھومی۔

"جنہوں نے intravenous administration ایجاد کی۔ سولہویں صدی میں۔" رانج نے سر پکڑنا چاہا۔ کہاں اسے اپنا پورا نام یاد نہیں آ رہا تھا اور کہاں یہ لڑکی کسی قدیم بابا کو اس کا تشکر بھجوانا چاہتی تھی۔

"میں کب سے یہاں ہوں؟ میرا۔۔۔" اچانک اس کا دماغ حقیقت کے تھوڑا قریب آیا۔ پلین، ریڈیو، کریش، پانی۔ کئی تصاویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھلتی چلی گئی۔ وہ سیدھا ہونے آگے جھکا تو گردن میں بندا کالر ایک دم کھینچا۔ درگا کی آنکھیں بڑی ہوئیں۔

"کیا کر رہے ہو؟" وہ سرگوشی میں غرائی۔ "عقل نہیں تم میں؟"

"کیا ہوا تھا؟" اس نے پٹیوں اور ہزار قسم کے طبی آلات میں جکڑے اپنے جسم کو دیکھا۔ آنکھوں نے خاموش کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کیا تھا؟ وہ یہاں کیسے آیا تھا؟ سب انتہائی غیر معمولی تھا۔

"خاموش رہو۔ تمھارے اندر جتنی بھی قوت ہے وہ اس پتلی جھلی IV لائن کی وجہ سے ہے۔ اس پر رحم کھاؤ۔ کرسٹوفر رین کے بھوت تمھیں ہانٹ کریں گے ورنہ۔" درگا اس کے ساتھ کھڑی بولنے لگی۔ اس

نے ہاتھ اٹھا کر اپنا چہرہ چھونا چاہا۔ انگلیوں کی پوریں اس کے گال سے ٹکرائیں تو اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی۔ ہر چیز کٹی تھی یا تو سوجی تھی۔

"میں۔۔۔" سر دوبارہ دکھ رہا تھا۔ وہ اس درد سے نجات چاہتا تھا۔ شاید، اس بار درگا کو اس کی تکلیف واقعی محسوس ہوئی تھی اسی لیے وہ آگے جھک کر شرحِ قلب ناپنے والے آلے پر بنتی حرکات دیکھنے لگی۔

"اوکے، ہیرو۔ اب میرے چند سوالات کے جواب دو۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ رانج کا دل کیا بولے، تم نے کون سے دیے ہیں؟

"تم کہاں پر ہو؟ تم جزائر انڈمان کے شہر پورٹ بلئیر میں ہو۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر اسے بتا رہی تھی۔ رانج اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ درگا نے اس سے الفاظ دہرانے کو کہا۔

"جزائر انڈمان۔۔۔" اس کی آواز بھاری تھی۔ "پورٹ بلئیر۔"

"گڈ۔" وہ مطمئن لگی۔ "کیا تم مجھے اپنا نام بتا سکتے ہو؟"

ہیزل آنکھوں والے نے سر ہلایا۔ "رانج۔۔۔" وہ رکا۔ اس کا لاسٹ نیم کیا تھا؟ اچانک اس کے وجود پر یادت تاری ہوئی۔ "رانج۔ میں رانج۔۔۔"

"ڈونٹ پینک۔ سب ٹھیک ہے۔ یاد کرو۔" وہ اطمینان سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا۔۔۔" وہ ہانپ رہا تھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لال تھیں۔

ڈاکٹر نے نرمی سے اس کا کندھا پکڑا۔ "آرام سے۔ اٹس اوکے۔ ادھر دیکھو۔" اس نے سر موڑا تو درگا نے لمبی لمبی سانسیں لینے کو کہا۔

"تمھارا نام رانج آدم ہے۔" وہ رکی۔ "کیا میں ٹھیک ہوں؟" اچانک دماغ میں ایک بتی جلی اور وہ آنسوؤں کے ساتھ سر اوپر نیچے کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے اس کا بازو سہلایا۔ "تمھیں اپنی عمر یاد ہے؟"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اٹھائیس۔" اس بار اسے جواب یاد تھا۔ درگا نے اثبات میں سر نیچے کیا۔ یہ اس کی دماغی حالت جاننے کا مینٹل ٹیسٹ تھا۔

"چلو، رابح۔ اپنے کسی گھر والے کا نام مجھے بتاؤ۔ کوئی بھی جس سے تم کلوز ہو۔"

اس کا ذہن دھندلا تھا، آوازیں کمزور تھیں اور یادیں پانی۔ گھر والے؟ وہ کون تھے؟ اس نے آنکھیں موندیں تو ڈھیروں لمحات یک بعد دیگرے گزرتے چلے گئے۔ کسی سپنے پر وہ ایک بوڑھی عورت کی گود میں سر دیے بیٹھا تھا، کسی دوسرے میں اس سے عمر میں بڑی ایک لڑکی اس کے سر میں تیل کی چمپی کر رہی تھی، کسی دوسرے میں شادی ہال تھا اور وہ مہمانوں سے ہنس کر مل رہا تھا۔ کون تھے وہ لوگ؟ کہاں تھے وہ لوگ؟

درگا اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بھی اپنے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنی یادیں تھیں، اتنے نام تھے۔ وہ اکیلا تو نہیں تھا، اس کی زندگی تو بہت خوش تھی۔ اس کے گھر والے ہر قدم پر اس کے ساتھ تھے۔ پھر اسے کوئی نام کیوں نہیں یاد آ رہا تھا؟

ایک اور منظر اس کے ذہن سے گذرا تو وہ شل پڑ گیا۔

چھ سال پہلے بائیس سالہ رابح ہاسپٹل کی راہداری میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سر پر ہلکی بینجنی رنگ کی چادر اوڑھی فربہ خاتون ایک ایک کر کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے سرکا رہی تھیں، ساتھ ہی ان کے ہونٹ اللہ کے کلام سے زیر حرکت تھے۔ رابح نے کالی جیکٹ پہنی تھی اور ایک کان میں پرو یا موتی ہلکی روشنی میں واضح تھا۔ وہ بے چینی اور بے تابی کے ملے جلے تاثرات میں سفید لوفر چکنے ٹائلز پر رگڑ رہا تھا۔ پسینے سے شرابور ہتھیلیاں جینز پر صاف کرتا، پھر آپس میں پھنسا لیتا۔

وہ پریشان لگتا تھا۔

"عجیب سست ڈاکٹر ہیں۔ میں نے کہا تھا آپ سے یہاں مت کروائیں ایڈمٹ۔ میرے دوست کی بھابھی بھی—"

اس کی ماں نے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں اسے گھورا۔ "Tenang dulu. "صبر رکھو۔" دعا تو تم کر نہیں رہے۔ بک بک تمھاری چلے جا رہی ہے۔"

رابح نے آنکھیں گھمائیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ وہ کیا مانگے؟ اسے کچھ نہیں چاہیے تھا، بس اپنی بہن چاہیے تھی۔ یا اللہ، رباب کو صحت دے۔

"کیا دعا کر رہے ہو؟" اس کی ماں نے ابرو اٹھائی۔ رابح نے انھیں دیکھا۔ "کیا مطلب؟ دعا پولیس بھی آگئی ہے کیا؟ کچھ بھی مانگوں میں۔ چیک پوسٹ سے تھوڑی جائے گی میری دعا۔"

ایک ہاتھ اس کی ٹانگ پر گرا تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ "کیا ہے، اماں؟"

"کچھ بھی نہیں مانگنا، پاگل لڑکے۔ اپنی بہن اور بہنوئی کی خوشی مانگو۔ ان کی اولاد کی صحت اور تندرستی مانگو۔ ان تینوں کی لمبی زندگی مانگو۔ دعاؤں میں کنجوسی نہیں کرتے۔"

"اچھا بھائی۔" وہ سر جھکا کر منہ میں دعائیں مانگتا گیا۔ اماں کی تسبیح پوری ہو گئی تو انہوں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ رابح انھیں دیکھ کر مسکرا دیا۔ اتنے میں او پی ڈی کا دروازہ کھلا اور ایک لیڈی ڈاکٹر باہر آئی۔ رابح نے بے اختیار اماں کی چادر پکڑی، دل سینے میں کود رہا تھا۔ ڈاکٹر نے منہ سے سرجیکل ماسک اتارا اور انھیں مسکرا کر دیکھا۔

"Congratulations, it's a girl."

مبارک ہو۔ لڑکی ہوئی ہے۔

رابح نے سر اپنی ماں کے کندھے پر رکھا۔ اس کی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کی ماں نے سر موڑ کر اس کا ماتھا چوما۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں اندر تھے۔ بیڈ پر رباب لیٹی تھی۔ وہ کمزور لگتی تھی، لیکن خوش۔

نیلے مریضوں کے گاؤن میں ملبوس، اس کے ہلکے بھورے بال بستر پر بکھرے تھے، ہاتھ پر ائی وی ڈرپ تھی اور چہرے پر تکان اور سرخی۔ اس کے ساتھ اسٹول پر بیٹھا مرتضیٰ اپنا ماتھا اس کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اپنی شہادت کی انگلی سے نہایت نرمی کے ساتھ اس کے چہرے پر پھیلی لٹیں ہٹا رہا تھا۔

رانج اور اماں اندر داخل ہوئے تو وہ ان کی موجودگی محسوس کر کے سیدھا ہو کر کھڑا ہوا اور بڑی چوڑی مسکان کے ساتھ کالی جیکٹ پہنے اپنے سالے سے جا لپٹا۔ رانج ہنس کر اس کی پشت تھپتھپانے لگا۔ اماں نے رباب کے برابر کرسی سنبھالی اور بہت شفقت سے اس کا ماتھا چوما۔

-"congtrats، ابانگ۔" (ابانگ مالائی میں بھائی کو کہتے ہیں۔)

رانج نے مبارکباد پیش کی تو مرتضیٰ کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک تیس کے قریب ایک خوش شکل مرد تھا۔ گہرے بھورے بال جو ہمیشہ تھوڑے بکھرے ہی رہتے تھے، گھنی شیو اور چمکدار آنکھیں جو اس کی ناک پر لگی پتلے فریمز والی سیاہ عینک کے پیچھے چھپی تھیں۔

"رباب کی ناک اور تمھاری آنکھیں۔ میں صرف اتنی امید رکھ سکتا ہوں کے باپ کی طرح کفایت شعار ہو۔"

"شکر حسنِ اخلاق نہیں کہا۔" رباب پیچھے سے بولی تو وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔ رانج اس کے ساتھ بیڈ کے نزدیک آیا تو اماں کے ہاتھوں میں پکڑے روئی کے گلابی گدے میں لیٹی چھوٹی سی جان کا چہرہ اس کے سامنے آیا۔ گول مٹول گال، گلابی صورت اور پھولی ہوئی ناک۔

وہ ان کے کندھے پر جھک گیا اور اپنی بھانجی کی سوتی صورت دیکھتا رہا۔

رباب نے اپنی آئی وی لائن درست کرتے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ "ابھی سو رہی ہے بٹ she has your eyes. عجیب، اب مجھے غصہ آ رہا ہے۔" اس نے چہرہ ساتھ کھڑے اپنے شوہر کی جانب موڑا۔ نیلی ٹی

شرٹ اور ہلکے سفید پجامے پہنا مرتضیٰ جھک کر جگ سے پانی نکال رہا تھا۔ "اب پتا کیسے چلے گا یہ ہماری بیٹی ہے؟ ابی چرا لے گیا تو؟"

وہ گلاس بھر کے سیدھا ہوا اور ایک سپ لیا۔ "تمھاری پختون ناک ہے نا۔ بیسٹ ٹریڈ مارک۔"

بستر پر لیٹی مریضہ کے ہونٹ کھل گئے اور پھر اس نے ساتھ پڑا تکیہ اٹھا کر اپنے مزاجی خدا کو دے مارا۔

مرتضیٰ ہنس کر دور ہو گیا لیکن اماں نے یہ کارروائی بغور دیکھی تھی۔

"رباب!" برسوں کی ماں چند منٹوں کی ماں کو گھور رہی تھی۔ رباب نے ہاتھ اپنے سینے پر لپیٹے۔ اب اماں آگے جھک کر اس کی صحیح والی کلاس لے رہی تھیں۔ رابح نے بچی کو ان سے لیا اور اسے آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ کتنی چھوٹی تھی وہ، کتنی نازک۔ اس نے اتنا چھوٹا بچہ کبھی اپنے اتنا قریب نہیں دیکھا تھا۔ اپنے گھر میں تو وہ ہی سب سے چھوٹا تھا۔ وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا جب ننھے ہاتھوں نے حرکت کی۔ شاید وہ انگڑائی لینا چاہتی تھی یا شاید ہاتھ لمبا کر کے چاند تک پہنچنا چاہتی تھی۔ رابح کو کیوں ایسا لگا تھا کہ اس کا جو بھی انتخاب ہو گا وہ اس کے لیے جی جان لگا دے گا؟ بچی نے بادامی صورت آنکھیں جھپکیں تو ان میں اسے اپنا عکس دکھا۔ سونے میں رنگا، روشنی سے تراشا۔ ہیزل۔ وہ واقعی اس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے جھک کر اپنی ناک اس سے ٹکرائی۔

میری جان۔ "Hatiku..."

"کوئی یاد آیا؟" درگا نے سر ترچھا کیا۔ وہ بستر پر تھوڑا سا ٹیڑھا ہوا اور گردن اوپر نیچے کی۔ "ادا۔۔۔" اس کی آواز سوکھ چکی تھی، ایسی کانٹے دار جیسے زمین پر بچھاؤ تو تلوؤں سے خون نکل آئے۔ "ادا مرتضیٰ عباس۔ میری۔۔۔ میری بھانجی۔"

نہ جانے کیوں اس کے الفاظ سن کر سامنے کھڑی ڈاکٹر چند ثانیے اس کا چہرہ تکتی رہی تھی۔ اس کے تیکھے نقوش پر واضح بھوری آنکھیں کسی گہرے وچار میں گم لگتی تھیں، ایک ان دیکھے سائے کے پیچھے ان میں چمکتی دھوپ دو پل کے لیے ماند پڑ گئی تھی۔ پھر وہ تھوڑا سا مسکرا دی۔

"اوکے۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"پلیز۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ "میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں کوالالمپور جا رہا تھا۔ میں ملائیشیاء ائیر لائنز کا پائلٹ ہوں۔ ہم نے دبئی انٹرنیشنل سے ٹیک آف کیا تھا۔ میری شادی ہے ایک ہفتے بعد۔ میری بہن اور۔۔۔"

"رانج، رانج! کام ڈاؤن۔" وہ اس کا کندھا سہلانے لگی۔ "تمھارا پلین کریش ہو گیا تھا۔ تم اکیلے زندہ بچے ہو۔" وہ رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "تم چوبیس گھنٹے پہلے یہاں آئے تھے۔ آج بیس نومبر ہے۔"

وہ سر اٹھا کر اسے بنا پلک جھپکائے دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ وہ یہ کہہ ہی کیوں رہی تھی؟ اتنی خراب بات کوئی کیسے کر سکتا تھا؟ کیا ایسے ہوتے تھے انڈمان و نکوبار کے لوگ؟ بے رحم، منکرین؟ اگر ہر لفظ بولنا اس کے سر میں سو ہتھوڑوں جیسا درد نہ چھیڑ رہا ہوتا تو وہ ضرور تردد کرتا، چیختا، چلاتا، شور مچاتا، لیکن اس وقت وہ کچھ بھی پروسیس نہیں کر پا رہا تھا۔

"میرا پلین۔۔۔؟" اس نے تصدیق چاہی۔

درگا نے ٹھوڑی اوپر نیچے ہلائی۔ "تمھاری ائیر لائنز سے رابطہ ہو گیا ہے، لیکن تمھاری فیملی۔۔۔"

رانج نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ ضبط سے آنکھیں بھینچ گئی۔ یقیناً اس کے لیے بھی یہ سب کٹھن تھا۔

"ہمیں پتا نہیں تھا کس سے کانٹیکٹ کریں۔"

"سب مر گئے؟" وہ دیوار پر جڑے دور کسی نقطے کو گھور رہا تھا۔ "تین سو پچاس لوگ؟"

"رانج۔۔۔"

کچھ یاد آیا تو وہ اچانک چہرے پر امید لیے اس کے جانب پلٹا۔ "پلین میں میری بہن بھی تھیں۔ رباب۔ رباب مرتضیٰ۔ ان کی بیٹی بھی تھی۔۔۔"

"جانتی ہوں۔ ادا مرتضیٰ۔ ان دونوں کی اموات کنفرم ہو چکی ہیں، لیکن ہم نے میڈیا کو نہیں بتایا ہے اب تک۔"

بیپ، بیپ، بیپ۔ ڈاکٹر درگا کی آنکھیں ساتھ لگے ہارٹ ریٹ مانیٹر تک گئیں جہاں رانج کی ایک ایک دھڑکن ناپی جا رہی تھی۔ دھڑکنوں میں چڑھاؤ آیا تھا، اس کا چہرہ سرخ ٹمٹما رہا تھا اور آنکھیں کہیں دور تھیں، بہت دور۔

"تم جو ابھی محسوس کر رہے ہو وہ غم ہے، ملال۔ میڈیکل میں اسے grief کہتے ہیں۔ گریف نقصان کا فطری جواب ہے۔ تمھیں نقصان ہوا ہے۔"

وہ خاموش سا لیٹا رہا۔ اس کی سانسوں کی آواز ان دونوں نفوس کے درمیان واحد رابطہ تھی۔ ڈاکٹر چند ثانیے اس کے پاس ایسے ہی کھڑی رہی پھر جھک کر بیڈ کی لوہے کو آہستہ سے تھاما۔ "تم جب بھی تھوڑا بہتر کرو تو مجھے بتانا۔ پولیس اور ایئر لائنز آفیشلز تم سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ابھی انھیں روک کر رکھا ہے کیونکہ۔"

"میں اٹھ کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔" اس نے کھردری آواز میں اسے مخاطب کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے بالکل سٹپٹا گئی، پھر سانس روکتے آگے جھکی۔

"ابھی تم پوری طرح ریکوور نہیں ہوئے ہو۔ تمھاری گردن۔۔۔"

وہ اپنے آپ ہی بستر پر ترچھا ہونے لگا تو ڈاکٹر نے اس کا بازو پکڑا۔ "اچھا، ٹھیک ہے۔ صبر رکھو۔ میں تمھارا بیڈ ایڈجسٹ کر دیتی ہوں، لیکن پلیز بی ہیو، رانج۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ منہ پھیر کر انتظار کرنے لگا۔ درگا نے اس کے ہیڈ ریسٹ کو اوپر کی طرف کیا، ساتھ ہی اس کی آنکھیں بلڈ پریشر میں کوئی بھی تبدیلی ناپ رہی تھیں۔ رانج تھوڑا سا سیدھا ہوا۔ پلنگ کو برابر کرنے کے بعد وہ کمرے کی دوسری طرف گئی اور وہاں رکھے تکیے اٹھائے۔ واپس آکر اس نے دو تکیے رانج کی گردن اور کمر کے پیچھے ٹکائے اور دو اس کے اطراف میں۔

"یہ ٹی وی چلتا ہے؟" وہ تکیے کے اوپر اپنا بازو سجاتے اسے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے زبان سے ہونٹ تر کیے۔

"ہاں، مگر تم آرام کرو۔" وہ غیر آرام دہ معلوم ہوتی تھی، جیسے کوئی چیز چھپا رہی ہو۔ رانج اسے دیکھتا رہا۔

"ٹی وی کھول دیں، ڈاکٹر۔"

"تمھیں آرام کی ضرورت ہے! تمھاری ٹانگ ٹوٹی ہے، تمھاری نسیں ڈیمج ہوئی ہیں۔ ابھی تک تمھیں concussion کے آثار محسوس ہو رہے ہیں۔" درگا نے ابرو میچیں۔ "پاگل مت بنو۔ جس نے بھی کسی بنگالی کا دماغ گھمایا ہے زندگی بھر پچھتایا ہے۔"

وہ یونہی اسے دیکھتا رہا پھر چہرہ موڑ کر اپنے آس پاس ہاتھ مارنے لگا۔ درگا نے اسے اچھنبے سے گھورا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"ٹی وی کا ریموٹ کہاں پر ہوتا ہے؟"

میں اب کچھ نہیں بول رہی۔ "(Ami kotha bolchi na!) "আমি কথা বলছি না!"

وہ قدم پٹختی اسٹینڈ تک گئی۔ "تم جیسا ضدی مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" اب وہ ریموٹ اس کے حوالے کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایک نرس نے اندر جھانکا۔

"ڈاکٹر راٹھور، آپ کو OPD میں بلایا ہے۔"

درگا نے سر ہلایا اور نرس چل دی۔ اس نے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈالے اور رانج کی طرف گھومی۔ "تمھیں کچھ بھی چاہیے ہو تو نرس کو بتا دینا۔ میں ایک گھنٹے بعد راؤنڈ پر آؤں گی۔"

کمرے کا دروازہ بند ہوا تو رائج نے اندرونی طور پر ایک سانس لی۔ ٹی وی جل اٹھا تھا لیکن ہر ہیڈ لائن ایک نئی زبان میں لکھی تھی۔ اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ وہ یہ کیسے پڑھے؟ انگوٹھے کی پشت سے بٹن دباتے وہ جب تک کہ ٹی وی چلاتا رہا اور پھر اسکرین کسی امیریکی چینل پر جا رکی۔

"**BREAKING NEWS:** MALAYSIAN PLANE CRASH CLAIMS 175 LIVES, CONFIRMATIONS UNDERWAY."

بریکنگ نیوز: ملائیشیائی طیارے کا کریش ایک سو پچھتر جانیں لے گیا، تصدیقات جاری ہے۔

اس کا دل تھم گیا۔ وہ بے زبان سنتا گیا۔

"انڈمان جزائر کے قریب ہونے والا دو دن پرانا سانحہ۔ گر کر تباہ ہونے والا ملائیشیائی طیارہ دو سو جانیں لے گیا، باقیوں کی تصدیقات جاری ہیں۔" نیوز اینکر کی آواز خالی تھی، پوری دنیا خالی تھی۔ کسی کو کوئی غم نہیں تھا۔ "بچ جانے والا واحد مسافر پلین کے فرسٹ آفیسر رائج آدم اس وقت پورٹ بلئیر کے اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔"

وہ ٹھٹک کر بیٹھا۔

"اہل خانہ، اپنے پیاروں کی قسمت کی سرکاری تصدیق کے منتظر، غم سے نڈھال ہیں۔ مقتولین کی شناخت کا عمل جاری ہے۔ حادثے کی جگہ نے تفتیش کاروں اور عوام کے درمیان یکساں سوالات اٹھائے ہیں۔"

وہ سانس لینے کو رکی اور رائج کو اپنی سانس کہیں دور رکتی محسوس ہوئی۔

"سانحے میں پائلٹ کے کردار کے بارے میں کچھ قیاس آرائیوں سے شکوک و شبہات جنم لے رہے ہیں۔ جب کہ فرسٹ آفیسر زندہ ہیں، دیدہ دانستہ کارروائیوں کے امکان پر انگلی اٹھائی جا رہی ہے۔ حکام نے ابھی تک اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی ہے۔ بات کرتے ہیں CNN کی گرائونڈ کورسپونڈنٹ جو جائے حادثے سے قریب ہیں۔ کیا آپ کو میری آواز آ رہی ہے، نٹیلی؟"

ہارٹ ریٹ مانیٹر سے آتی اپنے ہی دل کی دھڑکنوں کی آواز اسے بہرا کر رہی تھی۔ گلابی ہونٹوں کی نچلی طرف ایک کٹ تھا اور چہرے پر واضح سوجن۔ پٹیوں میں جکڑا اس کا سر، ٹریکشن ڈیوائس میں قبض اس کا ٹوٹا پیر اور سنسان ہیزل آنکھیں۔ وہ تھا رائج آدم۔

نیوز چینل کی نچلی طرف ایک پٹی چلتی جا رہی تھی جس میں ان مقتولین کے نام گھوم رہے تھے جن کی شناخت ہو چکی تھی۔ وہ پڑھتا گیا۔ وہ نام آئیں، وہ الفاظ آئیں۔ وہ نہیں آئے۔

داکٹر درگا نے ٹھیک کہا تھا۔ ان کی اموات کو ابھی عام نہیں کیا گیا تھا۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ اس کے گھر پر بھی کسی کو نہیں پتا ہو گا کہ رباب اور ادا۔۔۔؟

گھر والوں کا سوچ کر اس کا دل پھر سے پر امید ہوا۔ اسے گھر جانا تھا۔ اماں۔ اس کی ماں اس کا انتظار کریں گی، جیسے ہر بار کرتی تھیں۔ تسبیح اٹھائے، جائے نماز پر کرسی رکھے۔

وہ قدم دروازے سے اندر رکھے گا اور اپنا سوٹ کیس وہیں چھوڑ دے گا۔ وہ انھیں دیکھ کر مسکرائے گا اور اپنی پائلٹ کی مخصوص ٹوپی اتارے گا۔ وہ اندر آنے کے لیے قدم بڑھائے گا اور اماں چلتی ہوئی آئیں گی۔ وہ گلے لگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا اور اماں اسے وہیں روک دیں گی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

"جوتے اتارو پہلے، کپتان۔"

وہ سوچ کر مسکرا دیا۔ اس کا خمار جب ٹوٹا جب اسے اپنی کلائی پر گرم آنسو گرتے محسوس ہوئے۔ اس نے سر اٹھایا تو بھاری جوتے چپلوں کی آواز کمرے کے قریب بڑھ رہی تھی۔ اس نے فوراً اپنے نم رخسار رگڑے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور دو، تین مرد اندر داخل ہوئے۔ اونچے، گھنی شیو والے تگڑے رعبدار مرد۔ ان کے پیچھے ایک شناسا چہرہ بھی واضح ہوا۔ اس کے دماغ نے تھوڑی قوت لگائی تو اسے یاد آ گیا وہ کون تھا۔ وہ مالائیشیا ایئرلائنز کا منتظم بحران (crisis manager) تھا، جو اس وقت ایئرلائنز کے نمائندہ کے طور پر حاضر ہوا تھا۔

"صبح بخیر، مسٹر آدم۔" سربراہی مرد نے بھاری مگر گرم جوش آواز میں اسے انگریزی میں مخاطب کیا۔ اس کے الفاظ میں علاقائی ہندی کا بھی اثر تھا۔ وہ سیاہ جیکٹ کے نیچے ہم رنگ شرٹ پہنا تھا جو کہ ایک طرف سے بیلٹ میں اڑسی تھی۔

اس نے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھایا تو رانج نے بے تاثر چہرے سے اپنی پٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔۔ ہاتھ نہیں ملا سکتا، ٹوٹا ہے۔

وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔۔"کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟ دو دن سے سو رہے ہیں۔ ہم تو آپ کے انتظار میں ہی بیٹھے رہ گئے۔۔"

اس نے سر اوپر نیچے کیا۔ کون تھا یہ مرد اور وہ کیوں اسے غیر آرام دہ کر رہا تھا؟

"مائی سیلف ابھیجیت کوہلی۔ میں CID کے لیے کام کرتا ہوں۔ یہ میرے ساتھی روشن اور نکھل۔۔" اس نے ہاتھ سے پیچھے کھڑے دو لوگوں کی طرف اشارہ کیا، رانج نے انھیں دیکھا تک نہیں۔ "سی آئی ڈی کے معنی۔۔۔"

"کرمینل انویسٹیگیشن ڈیویژن۔ مجھے پتا ہے۔" سرد لہجہ۔ ابھیجیت کی مسکان بدلی۔ اس نے ہاتھ جیبوں میں ڈالے اور سر ترچھا کیا۔ "ویری ویل۔ مجھے ناز ہے آپ کی خبر گیری پر۔ ویسے مالائیشائی لوگ کبھی ذہین نہیں لگے تھے مجھے۔"

رانج اسے گھورتا رہا پھر ایک سانس باہر نکالی۔ "یہ آپ کا نہیں، آپ کے اندر بھری نسل پرستی کا قصور ہے۔" پھر اسے دیکھا اور طنزیہ مسکرایا۔ "It's not your fault you're racist."

پیچھے موجود آفیسرز نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی تو ابھیجیت نے گلا کھنکارا۔

"ہمیں آپ سے پوچھ گچھ کرنی ہے، مسٹر رانج۔ اب تک آپ کی میڈیکل حالت کو دیکھ کر تفتیش ٹل رہی تھی لیکن آج آپ مجھے تندرست لگتے ہیں۔" وہ کڑواہٹ سے مسکرایا۔ "شروع کریں؟"

اچانک کمرہ سنسان پڑ گیا تھا۔ کون تھا اس کے ساتھ اس لمحے، انجان لوگوں کے درمیان، ایک انجان ملک میں قید؟ کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ وہ تنہا تھا، اور وہی رائج تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شروع کریں۔

★★★

چار روز بعد

۲۴ نومبر، ۲۰۰۹۔

کوالالمپور انٹرنیشنل ایئرپورٹ۔

وہ جگہ جہاں کہانیاں کبھی پرانی نہیں پڑتیں، کم از کم یہ کہانی تو بالکل نہیں۔

ہوائی جہاز نے KL ایئرپورٹ کے رن وے پر ٹیکسی کیا تو اندر بیٹھے سارے مسافرین نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کی مسافرت تمام ہوئی تھی۔ راہداریوں کے درمیان ٹہلتی فلائٹ اٹینڈینٹ نے اشاروں کی مدد سے نرم آواز میں احکامات دینا شروع کیے۔ طیارے کے مکمل توقوف تک وہ سب کو اپنی جگہوں پر براجمان ہونے کی ہدایت کر رہی تھی۔ ان تکان آلود مگر پر امید چہروں کے مابین ایک شکل معروف تھی۔ سفید رنگ کا بینڈایج اس کے ماتھے کے گرد لپیٹا گیا تھا، گالوں کی سوجن چار روز قبل کے برعکس کچھ حد تک ماند پڑ چکی تھی لیکن جلد پر لگے آدھے ادھورے کٹ اور خراش واضح تھے۔ اس نے سفید ٹی شرٹ کے اوپر سرخ چیکرڈ بٹن شرٹ پہنی تھی جس کے سارے بٹن کھلے تھے۔ نیلی جینز میں قید دو ٹانگوں میں سے ایک پٹیوں میں ڈھکی تھی اور اس ہی کے اوپر والا بازو بریس brace میں بندھا تھا۔

طیارہ رک چکا تھا۔ Smooth halt. کوئی اور موقع ہوتا، کوئی اور رائج ہوتا تو تبصرہ ضرور چھیڑتا۔ پائلٹ کون ہوگا؟ وہ سوال کرتا۔ لیکن آج کی تاریخ میں وہ اپنی زندگی سے اتنا بیزار تھا کہ ساری معلومات غیر ضروری لگتی تھی۔ کہاں گیا تھا وہ رائج آدم جو زندگی کا ہر قدم لطف و مزہ کے خاطر اٹھاتا تھا؟ جو مشکل سے

مشکل وقت میں بھی اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنے کا تریقہ کھوج لیا کرتا تھا؟ وہ مر چکا تھا۔ پینتیس ہزار فٹ کی بلندی سے گر کر اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔

سیٹ بیلٹ ایک کلک کے ساتھ کھل پڑی تو اس نے سر آس پاس گھمایا۔ ہر کوئی اپنی نشست سے کھڑا ہو رہا تھا۔ سب کو ہی منزل کا انتظار ہوتا ہے۔ وہ اکیلا تھا جسے اپنے نقطہ آغاز کی طلب تھی۔ وہ بہت آگے آ چکا تھا۔ اسے بلندیوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے سہارا چاہیے تھا۔ اسے زمین چاہیے تھی۔

''اٹھنا نہیں ہے؟'' اس کے برابر بیٹھا مرد بولا تو اسے اس کی موجودگی کا بھی احساس ہوا۔ سفید عینک، سلوٹوں والے کھچڑی جیسے سیاہ سفید بال اور حد سے دبلی صورت۔ یہی تھا منتظم بحران جو اس کے لیے پورٹ بلیئر آیا تھا، بلکہ جسے اپنی روزی حلال کرنے کے لیے پورٹ بلیئر بھیجا گیا تھا۔ وہ چار دنوں سے اس کے ساتھ مارے مارے پھر رہا تھا، اور کل آخر کار رانج کو میڈیکل کلیئرنس مل ہی گئی تھی۔ وہ ہوائی جہاز میں سفر کر سکتا تھا۔ منتظم الجھن سے اسے دیکھ رہا تھا، نیند اس کے پپوٹوں کے گرد ہلکوں کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

رانج بغیر آواز کیے واکر کے سہارے کھڑا ہوا، لگڑاتی ٹانگ نے بمشکل وزن سنبھالا۔ وہ اپنی چال پر مغرور شخص چند قدم اٹھانے کے لیے لوہے کے ڈنڈوں کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔

''چل لو گے؟'' مینیجر نے اس کی مشکل دیکھی، آنکھیں التجاء کر رہی تھیں کہ 'ہاں' کے علاوہ کچھ نہ بولنا۔ اس نے بس ہلکا سا سر ہلایا تو وہ مطمئن سا ہو کر آگے چل دیا۔

ایئر پلین کا دروازہ کھلا تو باقی سارے مسافروں کے ساتھ اس نے بھی قدم اس طرف بڑھائے۔ راستے میں ایک دو فلائٹ اٹینڈینٹس نے اس کی حالت پر مسکین مسکراہٹیں سجائیں جو اسے پانی پانی کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اس نے احتیاط سے قدم سیڑھیوں سے نیچے اتارے، واکر اور اپنی اصل ٹانگیں دونوں سنبھال کر زمین پر جمائیں اور بالآخر پہنچ گیا۔

کوالالمپور کی گرم ہوا اس کے رخسار چھو گزری۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا، لیکن اس کی مسکراہٹ خالی تھی۔ اس کا تو آپ خالی تھا۔ لبوں کا صرف ایک کنارہ اوپر اٹھا تھا۔

سست چاپ کے ساتھ وہ دو سولوگوں کے یکساں ٹرمینل تک جاتی پتلی راہداری پار کرنے لگا۔ ساتھ ہی کرائسز مینیجر تھا۔ وہ چلتے چلتے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دی تھی؟"

گھر اور گھر والے۔ یہ دو الفاظ اسے اتنا زخمی کیوں محسوس کرواتے تھے؟ وہ خاموش رہا، بس سر نفی میں ہلایا۔ مینیجر نے اسے 'عجیب ہو' والی آنکھوں سے دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد نرمی ظاہر کرتے وہ کہنے لگا۔ "رائج، تم کلین ہو۔ سی آئی ڈی والوں کو کچھ نہیں ملا۔ اپنے آپ کو اتنا برا محسوس مت کرواؤ۔ تفتیش ختم ہو چکی ہے۔ تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ، ان کے ساتھ رہو۔ پتا نہیں کس حال میں ہوں گے بیچارے۔"

ہیزل آنکھوں نے لمحہ بھر کر اسے دیکھا اور سوچا، کاش۔ کاش کہ یہ تفتیش ختم ہو۔ وہ سوگ میں تھا۔ اس کی بہن اور بھانجی شہید ہو گئے تھے، اس کی بیوہ ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی ماں کو اس کی زندگی کی خبر تھی بھی یا نہیں۔ پھر بھی وہ آفیسرز اسے ایسے دیکھ رہے تھے، اس سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے۔

"کیا ہوا تھا پلین میں؟"

"آپ کی کیپٹن حلیزہ امانی سے کیسی قرابت داری تھی؟"

"آپ کو اپنے اندر کچھ تبدیلیاں نوٹ ہوئی تھیں فلائٹ سے پہلے؟"

"پلین میں کوئی مشکوک؟ کچھ غیر معمولی؟"

"آپ دونوں پائلٹس کو فیول لیکیج کا پتا کیسے نہیں چلا؟"

"ATC سے رابطہ ٹوٹا تھا یا توڑا تھا؟"

اس کے آخری سوال پر تو رابح نے اسے واضح بے یقینی سے دیکھا تھا۔ کمرے میں موجود تقریباً سارے آفیسرز شل پڑ چکے تھے۔ انسپیکٹر ابھیجیت کو جب احساس ہوا تھا کہ وہ اپنے شبہات بالکل بھی چھپا نہیں پا رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر اپنی کافی کا گھونٹ لیا تھا۔ "سوری۔ مسٹری لفظ سن کر میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ڈونٹ وری مسٹر رابح، آپ آگے بولیں۔"

اور وہ آگے کیا بولتا۔ وہ اپنی طرف کی ساری بات، ساری گواہیاں دے چکا تھا۔ پلین کے ٹیک آف ہونے سے لے کر فیول لیکیج سے لے کر ATC کی خرابی تک، وہ سب کچھ ان کو بتا چکا تھا۔ جب انسپیکٹر نے اس سے ایئرپورٹ پر اس کی بہن سے ملاقات کا پوچھا تو وہ تھوڑی دیر خاموش پڑ گیا۔ وہ اپنی یادیں بھی کھل کر نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ داغ چکی تھیں۔ اسے نہیں پتا تھا اس کی کہانی کا کون سا جزو اٹھا کر اگلی ہیڈ لائن بنا دیا جائے گا۔

محصول اور ترک وطن ڈیپارٹمینٹ کی طرف قدم بڑھاتے اس نے کمر پر بندھی ٹریول بیلٹ میں سے اپنا پاسپورٹ برآمد کیا۔ مینیجر نے اپنی چیکنگ کروا کر اس کا بازو ہلکا سا چھوا اور اشارہ کیا کہ وہ اپنا بیگیج لینے جا رہا تھا۔ رابح نے سمجھ کر 'اوکے' کہا۔

اپنا پاسپورٹ کائونٹر کے پار بیٹھے افسر کو دکھاتے اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اپنی کاروائی میں مشغول افسر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تو وہاں موجود مشہور نام پڑھ کر اس نے سر اوپر اٹھایا۔ ظاہر ہے وہ اسے جانتا تھا۔ رابح آدم کو کون نہیں جانتا تھا؟

اس نے ایک مؤدب مسکراہٹ کے ساتھ کاغذ پر مہر لگائی۔ "ویلکم ہوم۔"

وہ بیگیج کلیم ایریا کے لیے جانے مڑا تو پس منظر میں سرگوشیوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔

"یہ تو وہی پائلٹ ہے ناں جو۔۔۔"

وہ پوری بات سننے نہیں رکا۔

★★★

ملائیشیا ایئرلائنز صدر دفتر۔

فرسٹ فلور، اڈمنسٹریشن بلڈنگ۔

راہداری کی چھت پر نصب ٹیوب نما بتیوں کی مکانیکی بھنبھناہٹ آفیس کے بے شور ماحول میں واحد خلل تھی۔ استقبالیہ ڈیسک پر نشست لڑکی نے اس کے واکر اور پٹیوں میں گھرے جسم کو دیکھ کر آنکھیں چوڑی کیں تھیں، لیکن پھر بغیر آواز کیے اسے انتظامی لفٹ کی طرف ارسال کر دیا تھا۔ اس کے انداز میں خاموشی تھی۔ رابح کے اطراف ہر چیز ساکت تھی، بے جان، جیسے وہ اسے کسی بڑے امتحان کے لیے کمربستہ کر رہے ہوں۔

کوریڈور پر لفٹ کے دروازے کھلے تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا پھر واکر کا ایک ڈنڈا باہر رکھا۔ مشکل تھا، لیکن جینا تھا۔ دوپہر کے وقت ایئرلائنز آفیس میں دوادوش ہوتی تھی، لیکن رات کے بہ نسبت بہت کم، اور انتظامیہ زینوں پر تو خاموشی کا بے تاج راج تھا۔ وہ باہر نکلا تو چکنی، سفید دیواروں نے اسے سلامتی بخشی۔ ایک جانب کمپنی کی ترقیات کی یادیں تصاویروں کی صورت سنہرے فریمز میں قید تھیں۔ ہیزل آنکھیں نہ جانے کیوں اس طرف راغب ہو گئیں۔

سب سے اونچائی پر کمپنی کی فتوحات کے سرٹیفیکیٹس لٹکے تھے۔ اخبارات اور نیوز لیٹیرز کے پنے جس میں بین الاقوامی اعتبار سے ایئرلائنز کو سراہا گیا تھا۔ چند اور تصاویر میں الگ الگ ملازمین کو ان کی مشقت پر مختلف ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ تاریخ تھی، تاریک تھی۔

اس نے سر ترچھا کیا، ایک قدم دائیں جانب لیا۔

کمپنی کی طرف سے منظم کردہ ضیافتیں اور بے تکلف ڈنرس، پریس ریلیز اور وسیع بورڈ میٹنگز۔ یادیں۔ خوشیاں۔ اس کا ماضی۔ اس نے دس سے زیادہ جگہ خود کو پایا، ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا۔ کہیں بھورا تھری پیس سوٹ پہنے، چھوٹے بال چمکتی آنکھیں، کہیں سیاہ بلیزر میں تیار، انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتے، آس پاس کھڑے پائلٹس کے کندھوں پر وزن ڈالے۔ اس کے گرد سارے پائلٹس سینیر تھے، لیکن وہ جب اس کے ساتھ کھڑتے ہوتے تو اسے اپنا مقابل سمجھتے۔ اسے کوئی نہیں بھلا سکتا تھا۔ جتنا اس نے ملائیشیا ایئرلائنز کو اٹھائیس سال کی عمر میں دیا تھا، اتنا قابل کوئی اور ریٹائرمینٹ سے دو ماہ پہلے ہی مانا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں نے ایک بار پھر مرکز بدلا۔

اب کہ جو تصویر تھی وہ نیلے آسمانوں اور سورج کی کھلتی روشنی میں رنگی تھی۔ وہ کسی رن وے پر کھڑا تھا اور اپنے چہرے سے بائیس برس سے زیادہ عاقل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پائلٹ کا مخصوص یونیفارم پہنا تھا اور سفید بٹن شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک مڑی تھیں۔ کالر میں سیاہ شیڈز اٹکے تھے اور ہونٹوں پر عریض ترین مسکراہٹ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا تھا اور سامنے کھڑا مرد اس کے اوپر برفیلے پانی کی بالٹی ڈالنے لگا تھا۔ فریم کے نیچے حروف چھپے تھے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

PILOT'S FIRST SOLO!

اس ہی کے برابر والی پکچر میں درجنوں شرٹس کٹی رکھیں تھیں اور ہر ایک کے پیچھے پائلٹ کا نام اور 'فرسٹ سولو' کے ساتھ اس دن کی تاریخ لکھی تھی۔ یہ طیران (aviation) کا ایک نامی گرامی رواج تھا کہ پائلٹ کی پہلی سولو فلائٹ کے بعد اس کی شرٹ کا پچھلا حصہ کاٹ دیا جاتا۔ یہ اس کی ٹریننگ کا آخری دن مانا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے ایک کامل پائلٹ تصور کیا جاتا ہے، جو بغیر کسی معلم یا استاد کے اپنے فیصلے خود لے سکتا ہے۔ ان میں سے ایک ہلکی نیلی رنگ کی قمیص پر انگریزی حروف میں 'آدم' لکھا تھا۔

دور بنے کانفرنس روم کے دروازے کے پار سے ہلکی کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں تو کانچ کا سا خمار لمحوں میں چٹخ گیا۔ اس کا اصل کچھ اور تھا اور حقیقت سے دور نہیں بھاگا جا سکتا تھا، لیکن وہ کوشش تو کر سکتا تھا نا۔

★★★

''اندر آؤ، رائج۔''

سرسراتے لیدر کی کرسی پر براجمان بورڈ ممبرز میں سے ایک نے اسے دروازے سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کمپنی کے چیف ایگزیکوٹو تھے، جن کے آدھے بال سر سے چھٹ چکے تھے اور آدھے کناروں پر سفید تھے۔ کالے سوٹ میں ملبوس، وہ رعب اور ساخ کا نمونہ لگتے تھے۔ ان کے دائیں جانب بیٹھا مرد ہیڈ سیفٹی آفیسر تھا اور بائیں جانب والا ایئر لائنز کا ناظم حادثات۔ ان کے سامنے کاغذات اور فولڈر کے پلندے سجے رکھے تھے اور کمرے کا AC اس کے تازہ زخم کھرچ رہا تھا۔ اس نے بے ساخت آنکھوں سے نظر موڑی تو لمبی ٹیبل کے دوسرے جانب نشست لیگل کاونسل نے اسے ایک مصروف سی مسکان پیش کی۔ اس میں کہیں بھی گرم جوشی نہیں تھی۔ وکیل تو ہوتے ہی دو نمبر تھے۔ اس کے برابر تنگ سا HR مینیجر تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ واکر کی آواز کمرے کی چمکتے ٹائلز پر رگڑ کھا رہی تھی۔ پانچ آنکھوں کی جوڑیاں اشتباہ اور دردمندی سے اس کی حرکات کو گھورتے رہے۔ بے یقینی تھی۔ کیا ہو گیا تھا اس پائلٹ کو جس کی چال کیا، اڑان تک مغرور تھی؟ ملال تھا۔ کمرے کی ہوا میں نقصان کی بو سب کا دم گھوٹ رہی تھی۔ سیٹ پر بیٹھے وکیل نے اپنی ٹائی ڈھیلی کی۔ اس کے لیپل پر اس کا نام درج تھا۔ جو ہان حاضر۔ برہمی تھی۔ جہاں درد اٹھتا ہے، وہاں سے آہ بھی نکلتی ہے۔ وہاں موجود ہر نفس اپنے خسارے کا قصوروار تلاش رہا تھا۔

''راستے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟'' سیفٹی آفیسر نے اسے ابرو اٹھا کر دیکھا، لیکن اس کے سوال پر CEO نے اسے گھوری بھری، جیسے یہ استفسار نہیں کرنا تھا۔

اپنی بیساخیاں ساتھ ٹکاتے اس نے گھومنے والی کرسی سنبھالی۔ "میری یادداشت ٹھیک ہے، سر۔"

"نہیں، میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ میں تو۔"

"مسٹر رانج آدم۔" جوہان کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب کی۔ وہ تیس سے پینتیس برس کا نہایت قابل کورپوریٹ لایر تھا جو ملائیشیا ایئرلائنز کے ساتھ پچھلے کئی سالوں سے جڑا تھا۔ اس نے امید نہیں کی تھی کہ وہ بھی اس کی عزت کا تماشہ دیکھنے حاضر ہو گا۔ شاید اس نے اپنے آپ کو ہلکے میں لے لیا تھا۔

"ہمیں خوشی ہے آپ کو ہمارے درمیان دیکھ کر۔ جو آپ نے ایکسپیرینس کیا وہ بھیانک ترین تھا۔" اس کے الفاظ پر خلوص تھے لیکن کیا وہ واقعی اس کی دل جوئی قبول کر سکتا تھا؟

"آپ مجھے جانتے ہوں گے۔ اصل میں ان چند بورڈ ممبرز سے میں نے ہی گزارش کی تھی کہ زیادہ لوگوں کو آج نہ بلایا جائے، کیونکہ ہمارا مقصد آپ کو پریشر کرنا بالکل نہیں ہے۔ میڈیا پہلے ہی۔۔۔"

"میڈیا کو رہنے دیتے ہیں، جوہان۔" سی ای او کا انداز غیر معمولی تھا۔ رانج کی آنکھیں ان کی جانب گھومیں جواب اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ "تم ٹھیک ہو، رانج۔ ہمیں تمھاری بہن اور بھانجی کے بارے میں پتا چلا تھا۔ ہمیں بہت دکھ ہے۔ تمھیں ایک بریک کی ضرورت تھی۔ تم نے جو دیکھا وہ بالکل بھی نارمل نہیں۔ تمھارا loss بہت بڑا ہے اور۔"

"آپ کو تعزیت کرنی ہو تو میرے گھر تشریف لائیے گا۔" اس نے رخ موڑ کر وکیل کو دیکھا۔ "آپ مجھے legalities بتائیں۔"

"دیکھو، رانج۔" اس بار ناظم حادثات نے خاموشی کا روزہ توڑا۔ "جو بھی ہوا ہے اس میں بہت ڈیمیج ہوا ہے۔ تمھارا، ہمارا اور۔۔۔"

"کمپنی کی ایمیج کا۔" وہ اس کیمنگی سے ہنسا کہ پانچوں آدمی دنگ رہ گئے۔ گال پر آدھا چاند واضح ہوا جو کہ سرخ ہوئے نشانات کے پیچھے چھپ چکا تھا۔

"ہاں۔" ناظم نے اعتراف کیا لیکن وہ غیر آرام دہ لگتا تھا۔ وہ اور لطف سے ہنس دیا اور ہنستے ہنستے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگایا، آنکھیں محظوظ انداز میں بند ہوئیں۔

"لیکن ہم تم پر ہار نہیں مان رہے۔ تم ہمارا بہت اہم اثاثہ ہو۔" سی ای او نے زور دیا۔ "بس تھوڑے وقت کے لیے ایک لو پروفائل رکھو۔"

اس کے یخ ہوتے ہاتھوں نے شیشے کی میز کا کنارہ تھاما اور پھر ہیزل آنکھوں نے ایک ایک چہرہ سنبھل کر دیکھا۔ جب وہ بولا تو الفاظ نوکدار تھے، جیسے برسوں سے اس کے سینے میں تراشے گئے ہوں۔ "چار دن پہلے ایک پلین کریش ہوا تھا جس میں تین سو پچاس لوگ گر کر ڈوبے تھے۔ تین سو پچاس لوگ جنہوں نے وہ کھارا پانی اپنے اندر جاتے محسوس کیا تھا۔ جنہوں نے اپنی سانس رکتی، نالیاں پھولتی محسوس کی تھیں۔ جنہوں نے موت کا خوف سچ ہوتے دیکھا تھا۔" اس نے سانس لی، لرزتی انگلیوں نے میز کو جان لگا کر پکڑا۔ پسینہ نشانات چھوڑ گیا۔

"میں بھی ان تین سو پچھتر میں شامل تھا۔ میں بھی ڈوبا تھا۔ مجھے بھی سانس نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بھی مدد کے لیے چیخنا چاہا تھا۔ میں نے بھی شہادت لی تھی۔ مجھے بھی۔۔۔" اچانک بحر الہند کا پانی اس کے کانوں تک بلند ہونے لگا تھا۔ سفاک، سیاہ لہریں۔ اس کی کمر تک اکڑ گئی۔ "مجھے لگا تھا میں مر جاوں گا۔ مجھے بچ کر نہیں آنا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا میں سب کھو دوں گا تو میں اس ساحل پر پڑے پڑے اپنا گلا خود دبا دیتا۔"

کچھ نے دلچسپ نگاہوں کا تبادلہ کیا اور کچھ کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔ جوہان اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی نیچے رکھے کاغذات پر نظر ڈالی۔ وہ آج صبح کا انڈین اخبار تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر اس کی ہیڈ لائن چھپالی۔ ابھی اس انکشاف کا وقت نہیں تھا۔

"میں ذمہ داری لوں گا، میں سچ بتاؤں گا۔ لیکن میں یہ نہیں بھولوں گا کہ میں بھی ایک victim ہوں۔"

"تمھیں بھولنا بھی نہیں جاہیے۔ اس طریقے سے تم آگے کیسے بڑھ پاؤ گے؟ تم ہیل کیسے کر سکو گے؟" سی ای او نے نہایت نرمی سے اسے دلاسہ دیا، لیکن اسے ان کا انداز کھٹک رہا تھا۔ اسے اس کمرے کے ہر فرد سے فریب اور ان کہے ارادوں کی بو آ رہی تھی۔

"آپ مجھے بریک پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ اور خدا کا واسطہ یہ مت کہیے گا کہ یہ میرے لیے بہتر ہے۔ میرے لیے کیا بہتر ہے وہ میں خود نہیں جانتا تو آپ کیسے جانیں گے؟" اس کی شکایتی نظریں سب پر تھیں۔

"اس کو بتا دیتے ہیں، باس۔۔۔" ناظم حادثات نے کان میں سرگوشی کی۔ ایچ آر منیجر نے بھی سر اوپر نیچے ہلایا۔ اب رانج کے ابرو سختی سے بھینچے تھے۔

"رانج۔۔۔" ساٹھ کا ہندسہ چھوتے مرد نے اپنے ہاتھ آپس میں پھنسائے اور سیٹ میں آگے جھکا۔ شاید وہ اسے وہ راز بتانے لگا تھا۔

"سعید، ابھی مناسب نہیں۔" جوہان نے اسے ٹوکا تو رانج کو لگا وہ اس کے چار دانت الگ سے پکڑ کر توڑ دے گا۔ اس کی مٹھیاں غصے میں پھڑ پھڑائیں اور ہیزل آنکھوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"مجھے میری زندگی کے معاملات میں آپ کی تصدیق درکار نہیں۔" اس نے چبا چبا کر کہا اور کہیں نہ کہیں احساس بھی ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کٹھور ہو گیا تھا، لیکن وہ پیچھے جانا بھول چکا تھا۔

"آپ کو سچ جاننا ہے؟" سرخ ڈھیلی ٹائی، سلیقے سے ترتیب ہوئے گھنے سیاہ بال اور گہری پر تفکر آنکھیں۔ جوہان حاضر اس کی روح سے سوال کر رہا تھا۔

اس نے بغیر سوچے سر نیچے کیا تو وکیل ایک لمحہ ٹھہر کر اسے یونہی دیکھتا رہا، جیسے انتظار میں ہو کہ وہ اپنا انتخاب واپس لے لے، کہ کاش وہ اس سچ پر کبھی ہاں نہ کہے۔

انتظار تمام ہوا۔ انتخاب جواب ہوا۔

قابل وکیل نے اپنے سامنے رکھے کاغذات میں سے اوپر کے چند اکھٹے کر کے اس کے سامنے ڈالے۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں کچھ پڑھنے کی قوت بھی رکھ پاتیں، اخبار کے پہلے صفحے پر کالے بڑے حروف میں چھپی ہیڈ لائن اس کے دماغ کا ہر کونہ روشن کر گئی تھی۔

"مالائیشائی پائلٹ کا سیاہ راز، کریش کے پیچھے ہم خون مسابقت کا ہاتھ۔"

اس نے بوکھلا کر جوہان کا چہرہ دیکھا پھر ساتھ بیٹھے اپنے باس کا۔ سب صرف اسے دیکھ رہے تھے۔ پوری دنیا اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ پڑھتا گیا، دماغ کو سیدھ میں رکھنے کے لیے اخبار کے الفاظ اپنی انگلی سے سہلاتا گیا۔ ہر ایک سطر اس کی بچی کچی باخبری پر ایک تعین شدہ وار تھا۔ وہ کھو رہا تھا۔ الزامات اور کہانیوں کے درمیان اپنا اصل اپنے سامنے مٹتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

"انڈمان کے ہوائی جہاز حادثے کو گزرے چار دن۔ سانحے میں تین سو سے زائد مسافرین اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ فرسٹ آفیسر رابح آدم نے خود کو میڈیا کی جانچ پڑتال کے خوردبین پایا۔ جبکہ سی آئی ڈی کی تفتیش تھم چکی ہے، میڈیا آؤٹ لیٹس نے مختلف زاویوں سے جانچنا شروع کر دیا ہے، جس میں اس اندوہناک واقعے میں ذاتی حرکیات کے کردار کا امکان بھی شامل ہے۔"

اس کا دل رکا، پھر کانپا اور پھر اس کے سینے میں بہہ گیا۔ اس میں قید خانے نچوڑ گئے، مرطوب گاڑھا خون اس کے پیٹ کی دیواریں رنگ گیا۔ ایک لمحے میں۔ سب ایک لمحے میں۔

"سی آئی ڈی آفیسر ابھیجیت کوہلی نے کل رات ہونے والی پریس کانفرنس میں دیے گئے بیان میں چند اہم نقاط ظاہر کیے ہیں۔ ان کے زخمی پائلٹ رابح آدم سے ہوئی گئی چار روزہ تفتیش اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے اور پائلٹ اب اپنے ملک روانہ ہیں۔ تاہم عوام اور میڈیا نے اس بات پر واضح ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ رابح آدم کو 'easy out' دے کر رخصت کر دیا گیا ہے۔"

جو ہان سیٹ میں آگے جھکا۔ اس کی ابرو تنے تھے، وہ غیر آرام دہ لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں دنگ سے بیٹھے رانج پر تھیں جو اخبار کا ہر لفظ اپنے دماغ کے آر پار ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"پریس کانفرنس میں کیے گئے J NEWS کے رپورٹر نے کریش کی اصلی وجہ کی جانب استفسار کیا تو انسپیکٹر کوہلی کا جواب کچھ مبہم سا سنائی دیا، لیکن ان کے بیان نے میڈیا کو۔۔۔"

رانج نے اخبار دور پھینکا۔ پھٹی آنکھوں سے اس نے گہری سانس اندر کھینچی اور کرسی میں ترچھا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی میراتھن دوڑ کر آیا ہو۔

"کون۔۔۔ کون سا بیان؟" اس کی آواز لرز رہی تھی، باریک نشانات سے چھلے ہونٹ سوکھے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ کی انگلیاں اپنی ران پر جمائیں تو وہ لاشعوری طور پر جینز کے گرد لپٹ گئیں۔

"اں ھیجیت کوہلی۔۔۔ اس نے کیا اسٹیٹ منٹ دی ہے؟" رانج آدم دنیا کہ آگے سچ کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"اس نے..." سی ای او نے گہری سانس لی اور پھر آنکھیں اس کی طرف کیں۔ "اس نے بیان میں کہا ہے کہ پرسنل کانفلکٹ بھی اس کریش کی وجہ ہو سکتے ہیں۔ کہ۔۔۔" اگلے الفاظ فقط الفاظ نہیں تھے۔ وہ تو سیال ظہر میں ملمع ایک شمشیر تھے جو نوک تا پوچ اس کے جسم کا کھال بال علحیدہ کرنے آئے تھے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

"یہ کریش تم نے کیا ہے۔ اپنی بہن کو مارنے کے لیے۔ انھیں بہن بھائی کی عداوت پر شبہ ہے۔"

وہ سیدھا ہوا، ادھ کھلے ہونٹ سل گئے ولیکن خوف سے تاری سونے کی سی آنکھیں آس پاس گردش کرتی رہیں۔ پانچ چہرے۔ وہ ایک کے بعد ایک سب کو دیکھتا، چند ثانیے ٹھہرتا، پھر آگے بڑھ جاتا۔ ان کے تاثرات سانجھے تھے، سب خاموشی اور بے ثباتی کے پتلے تھے، گوشت سے رنگے لیکن قلب سے پاک۔

"ہم۔۔۔ ہم جانتے ہیں تم یہ نہیں کر سکتے۔"

"لیٹس فیس اٹ باس، ہم کچھ نہیں جانتے۔" ایچ آر منیجر نے تذبذب میں آ کر کہا۔ "ہمیں نہیں پتا تمھارے ذاتی تعلقات کیسے تھے اپنی بہن سے، لیکن ہم پھر بھی آؤٹ آف دی وے جا کر تمھاری مدد کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم ایک پوٹینشل قاتل کو چھپا۔"

اس سے پہلے کے اگلے الفاظ اس آدھیڑ عمر مرد کے ہونٹوں سے چھوٹتے، لنگڑاتا پیر لیا رانج اپنی سیٹ سے اچھل چکا تھا۔ اس نے اچک کر ایچ آر منیجر کا گریبان پکڑا اور پوری قوت سے اس کا چہرہ میز پر مارا۔

"ایک اور لفظ اور تم اس شیشے (انگلی سے کھڑکی کے نازک شیشے کی طرف اشارہ کیا) کے ساتھ تیسری منزل سے گر رہے ہو گے۔"

"رانج! پاگل ہو گئے ہو!؟" جوہان اس کی طرف لپکا جبکہ باقی مرد اپنا سوجتا چہرہ تھامے ایچ آر منیجر کی جانب بڑھے۔ ان سب کی چال بھاری تھی اور دماغ اضطراب میں۔ اب تو انھیں ڈر تھا ٹیبل پر اگلا منہ ان کا نہ ہو۔

"دیکھا! کتنا جنگلی آدمی ہے یہ۔ اسی نے مارا ہو گا اپنی معصوم بہن کو!" ایچ آر منیجر غصے میں تلملا رہا تھا لیکن رانج کی آنکھیں بھی سرخ انگارا تھیں۔ وہ ایک اور بار آگے جانے مڑا تو جوہان نے چیختے ہوئے اسے کندھوں سے پیچھے کھینچا اور ساتھ ہی HR کو ڈانٹ لگائی۔

"شٹ اپ، اکبر! رانج وکٹم ہے۔ اس سے ایسے بات مت کرو۔"

سی ای او الگ پریشان تھے۔ باقی دو مردوں نے زخمی (مگر اتنا بھی زخمی نہیں) ایچ آر کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کی چھوٹی بادامی صورت آنکھیں رانج میں خنجر گھونپ رہی تھیں۔

"میں اسے سچ تک نہیں بتا سکتا لیکن یہ جنگلی بھیڑیا بن کر میرا منہ بھی توڑ سکتا ہے!؟" اب کہ اس کی نظروں کا شکایتی مرکز کمپنی کا سربراہ تھا۔ "آپ کی غلطی ہے! ایسے دو نمبر آدمی کو ائیر لائنز کا نمائندہ بنایا، سڑک چھاپ لڑکے کو 'اسٹار پائلٹ' کا نام دے دیا! اوقات تو دکھائے گا ناں۔"

"خدا کی قسم، میں تمھاری ہڈیوں کا چورا بنا دوں گا۔" رانج نے گھور کر تنبیہ کی۔

وہ کڑواہٹ سے ہنسا۔ "اچھا؟ جیسے اپنی بہن کا بنایا ہے؟ جیسے اس کی چھ سال کی بیٹی کا بنایا ہے؟ یا جیسے ان باقی تین سو پچاس لوگوں کا بنایا ہے؟"

"بس کرو اکبر! ورنہ میں تمھیں فائر کر دوں گا۔ ابھی اسی وقت۔" سی ای او منیب احکام کا لہجہ کرخت تھا۔ وہ تھک چکے تھے۔

ایچ آر منیجر کی آنکھیں بے یقینی سے چمک اٹھیں۔ "واہ، واہ۔ تینگو کی۔" "یہ دیکھو ذرا۔ "ابھی تک آپ نے اپنے لاڈلے قاتل سے ایک سوال نہیں کیا۔ مجھے شرم آتی ہے آپ پر اور اس گھٹیا کمپنی پر جہاں جانبداری کی کوئی حد نہیں۔ تھوکتا ہوں میں!"

اس نے غصے سے رال اگلی۔ جوہان کی قید میں رانج اسے گھورتا رہا۔ اس کا بس چلتا وہ واقعی اسے شیشا توڑ کر نیچے پھینک دیتا۔

"جا رہا ہوں میں، باس! آئی کوئٹ۔ اور مجھ سے کوئی امید مت رکھیے گا۔ میں میڈیا کو یہاں کی ہر بے ایمانی بتاؤں گا۔ کس طرح رانج آدم ہمارے سر پہ چڑھ کر ناچتا ہے اور آپ اسے نچواتے ہیں۔"

"اکبر!" وہ اسے روکنا چاہتے تھے۔ سیفٹی آفیسر اور ناظم حادثات اس کے پیچھے دوڑے، جبکہ سی ای او اپنی کرسی پر ڈھے گئے اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ رانج اب تک کانپ رہا تھا۔ جوہان نے آہستگی سے اس پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ وہ اس کی آدھی شکل دیکھ سکتا تھا۔ اس کا سر جھکا تھا اور گھنی پلکیں گالوں کے اوپر ٹھنڈے سائے کھینچ رہی تھیں۔ غصہ نہیں تھا وہاں، کچھ اور تھا۔ جو غصے سے زیادہ لغوی، اس سے افضل جذبہ تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

رائج آدم کے جسم کا بال بال ساکت تھا۔ خاموش۔ شانت۔ جوہان حاضر نے اپنے دس سالہ وکالت میں انگنت مجرم دیکھے تھے، ان کے جرم جانے تھے، انھیں سلاخوں کا منہ دکھایا تھا۔ وہ اس جذبے کو جانتا تھا لیکن اپنے قانونِ فوجداری کے ذریعے نہیں، بلکہ اپنی قدیم انسانیت کے ناطے۔

خوف۔ وہ خوفزدہ تھا۔ دنیا نے اسے کھونٹ کر دیا تھا اور اس کے چاروں اطراف تعصب کے شعلے دہک رہے تھے۔ اس کا فرار ناممکن تھا اور آگ کا داغ ناگزیر۔

اس نے اس کے لبوں کا ایک کنارہ جھٹکتے دیکھا۔

بلندیوں میں اڑان ڈالا آئیکارس سورج کے بہت نزدیک آن پہنچا تھا۔ اس کے پنکھ جھلس رہے تھے، اس کا آپ سلگ رہا تھا۔ اونچائی کی حوس نے اسے اندھا کر دیا تھا، اور پتا ہے اونچائی کا اختتام کیا ہوتا ہے؟

نزول۔

رائج آدم کا نزول اصل ہو چکا تھا۔

★★★

وہ کانفرنس روم سے چھوٹا تو اس کے گرد ہوا ٹھنڈی اور بے رحم تھی۔ چکنے ٹائلز اس کے واکر کی ہر ٹک کے ساتھ اس کے لیے راہ جوڑتے جا رہے تھے۔ دماغ کی جھلی پر ڈھیروں مناظر دائیں بائیں سفر کر رہے تھے اور کان کے پردوں پر لاکھوں آوازیں اپنا روگ سنا رہی تھیں۔ اس کی ٹانگ دکھ رہی تھی اور سر میں ایسا درد تھا جیسے اسے بیچ سے پھوڑ دیا گیا ہو۔ چند منٹ پہلے ہوئی میٹنگ کا ہر سطر وہ نہ چاہتے ہوئے دہرا رہا تھا۔

اکبر ایاز کی رخصتی کے بعد وہ، جوہان اور چیف ایگزیکٹو منیب احکام تنہا تھے۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے اسے دیکھا تھا۔

"تمھیں نہیں پتا رانج۔ ٹوئٹر پر لاکھوں کی تعداد میں ہیش ٹیگز چل رہے ہیں۔ تمھارا نام وائرل ہے۔۔۔ ساری غلط وجوہات کے باعث۔ تمھیں انٹرنیشنلی ڈی فیم کیا جا رہا ہے۔" انھوں نے رک کر اپنی ٹانگ مسلی۔ جوہان نے آگے جھک کر لیپ ٹاپ کی اسکرین اس کے سامنے کی۔ رانج نے نظریں اس کی جانب کیں۔ جوہان آہستہ آہستہ اسکرول کرتا گیا لیکن برابر بیٹھے پائلٹ کی آنکھیں تو اوپر چمکتے ہیش ٹیگ پر تھیں۔

#RABEHTHEVILLAIN

"تمھیں کینسل کر دیا گیا ہے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" بنجر پتھر کی سی اس کی آواز احساسات کی آبشار تلے چیخ رہی تھی۔ "ابھیجیت کوہلی نے مجھے خود بے قصور مانا تھا۔" اس بار جوہان نے جواب دیا۔ "دیکھو، رانج۔ ضروری نہیں ہے کہ سی آئی ڈی نے یہ بیان واقعی ہی تمھیں ڈی فیم کرنے کے ارادے سے دیا ہو۔ کافی دفعہ میڈیا پریشر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ تمھاری وطن واپسی پر خوش نہیں تھے۔ انھوں نے ابھیجیت کو بمبارڈ کیا۔" اس کی انگلیوں کی پوروں نے کرسر کو چھیڑا۔ "اس نے غلطی کی کہ اپنا ذاتی شبہ باہر آنے دیا۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ہاں لیکن اب جو صورتحال ہیں ان سے میں اور تم دونوں واقف ہیں، جوہان۔" منیب احکام نے تکان سے سر دائیں بائیں ہلایا پھر رانج کو دیکھا۔ "تم کسی بھی میڈیا آؤٹ لیٹ پر کوئی جواب مت دینا۔ Stay silent۔ جوہان تمھارا وکیل ہے۔ ہم جلد از جلد ایک پریس کانفرنس ارینج کرواتے ہیں۔ تم اپنی طرف کی ساری بات وہاں کلئیر کر دینا۔ کریش، ATC کی خرابی، فیول لیکیج، سب۔ سمجھ گئے؟"

"اور میری فیملی۔۔۔" اس نے سر اٹھا کر پوچھا، بے جان مرد کی آنکھیں دونوں چہروں کے ارتکاز میں ٹھہریں۔ "میں انھیں کیا بتاؤں؟"

جوہان نے سر ترچھا کیا۔ اس کے بائیں جانب سے آتی دھوپ کی سنہری پٹی سیاہ زلفوں کے کنارے سے ٹکرا گئی۔ ہلکی شیو لیے چہرے پر گہرا وزن رکھتیں دوستانہ آنکھیں یک دم ڈھیروں جذبے سے بھر گئیں۔

"سچ، رائج۔۔۔" اس نے نگاہ داری میں خلل کیے بغیر اپنا ہاتھ اس کے اوپر تھپتھپایا۔ "صرف سچ۔"

اور سچ تو یہ تھا کہ وہ سارے سچ اور حقائق بھول رہا تھا، صداقت اور دروغ کی بو میں فرق نہیں کر پا رہا تھا۔

ویٹنگ روم تک جاتے اس کی ٹانگ کی تکلیف بڑھ چکی تھی۔ راہداریاں سنسان پا کر اس نے کمزور ہاتھوں سے واکر دیوار سے ٹکایا تو وہ فوراً ہی زمین پر جا گرا۔ اس نے بمشکل خود کو کچھ غلط بولنے سے منع کیا اور بگڑا ہوا چہرہ لے کر بینچ پر ڈھے گیا۔ سر کی پشت نے ٹھنڈے ماربل سے سہارہ مانگا۔

اس کا نام بن گیا تھا، وہ مشہور ہو گیا تھا، دنیا اسے جان گئی تھی۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ اسی لیے ہی تو کی تھی اس نے اتنی محنت۔ اس سے کثیر خواب تو اس نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ لیکن کیا اتنی بھاری قیمت چکانا لازم تھا؟ کیا لازم تھا کہ لوگ اسے دیکھتے، جانتے مگر دل میں نفرتوں کے ساتھ؟ کیا لازم تھا کہ دنیا کے لوگ اسے اپنی ہی بہن کے خون میں لیپ دیتے، اس کی معصوم بیٹی کی چیخوں سے چیر دیتے؟ کیا لازم تھا کہ اس کی اڑان کا تقاضا تین سو پچاس اموات ہوں؟

BEING THE STRING OF YOUR KITE

ماربل کے فرش پر دور سے کہیں ٹک ٹک کی آواز سنائی دے تھی۔ اس کا خمار بہت گہرا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکائے سیلنگ پر لگیں بتیوں کو دیکھ رہا تھا، آنکھوں کا ایک ایک کونہ بنجر تھا۔ سرخ شرٹ اس کے جسم پر کسی چاک ہوئے راس کی مانند لپٹی تھی۔ سب دور تھے، کوسوں دور۔۔۔

اس کی بصری میں اچانک سیاہی آن گھری۔ اس نے پلک مچکاتے اس نقطہ پر مرتکز کرنا چاہا لیکن وہ مٹ رہا تھا۔ اس کی جگہ کسی اونچے سائے نے لے لی تھی۔ بھاری آنکھیں بند کھل ہوئیں۔ بار بار۔ اس کا منظر تھوڑا صاف ہوا۔

آسمانی نیلے رنگ کی بٹن شرٹ اور سیاہ پینٹس۔ کمر پر بیلٹ اور آستینیں کہنیوں تک، گھنگریالے بھورے بال بکھرے ہوئے اور سیاہ فریمز والی عینک ناک کی نازک ہڈی پر اٹکی تھی۔ اس کے پس پشت سایہ ڈالتی روشنیاں اس کے چہرے سے دور تھیں۔ مرتضیٰ عباس اس کے روبرو تھا۔

رابح کی سانس خلاف ضابطہ تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت، خوشی، خوف، رنج سب ایک ساتھ ابھرے تھے۔ وہ واکر کے بغیر ہی کھڑا ہونے لگا۔ آنکھوں میں پانی موٹے گرم آنسوؤں کی صورت ابل رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگے آیا، نم پلکیں جھکائیں اور ادا کرنے کو الفاظ کھوجے۔

"ابانگ۔۔۔"

اچانک اس کا جسم پیچھے کھردری دیوار سے جا لگا تھا۔ اس کا متوازن بگڑا اور ٹوٹی ٹانگ کی نسیں بری طرح کھنچیں۔ اس کا چہرہ درد سے پھٹ رہا تھا، گال کے پار خون دانتوں کے درمیان رس رہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سر مرتضیٰ کی طرف گھمایا، آنکھیں شاک سے فراخ تھیں۔

سامنے کھڑا مرد ہاتھوں کی مٹھی بنائے مستعد تھا، ایک اور مکا جھاڑنے کے لیے تیار۔ اس کی نرم بھوری آنکھیں لال لکیروں سے رنگی تھیں، ابرو طیش میں جڑے تھے۔ اس کا جسم لرز رہا تھا، بند مٹھی کانپ رہی تھی۔

اس سے ایک اور مقتول اپنے خون کا حساب مانگنے آیا تھا۔

رابح کو اپنے منہ میں کچھ ٹوٹتا ظاہر ہوا اور زبان کے ساتھ محسوس کرتے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس کا اپنا دانت تھا۔ اس نے تھوک کر اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بہنوئی کو دیکھا۔

مرتضیٰ نے نفرت اور حقارت سے دانت پیسے۔ چشمے کے پار اس کی آنکھیں بھی گیلی تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس ناک سے اندر کھینچی، گلے کی گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی، اور پھر اپنی جیب سے کچھ نکالا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

رائج دھندلی بصارت اور عبث زبان لیے اسے تکتا رہا۔ اس کے ہونٹ خون میں رنگے تھے اور گال آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ مرتضیٰ اس کا بھائی تھا، اس کے لیے بھائیوں سے زیادہ تھا۔ وہ اسے گلے لگانا چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا کہ اس کے اوپر کیا الزامات لگائے گئے ہیں۔ وہ اپنا دکھ بانٹنا چاہتا تھا، اپنے بھائی کا غم سمانا چاہتا تھا۔

انگلیوں کے درمیان وزیٹنگ کارڈ تھامے مرتضیٰ اب اس کے عین مقابل کھڑا ہوا۔ نیک اور بد۔ سچ اور جھوٹ۔ حقیقت اور فریب۔ مقتول اور قاتل۔

"تمھارا خاندان ختم ہو رہا ہے۔۔۔" چبا چبا کر الفاظ باہر اگلے۔ رائج نے ایک تنہا آنسو اس کے گال پر پھسلتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور سامنے کھڑے مرد کے سینے پر ٹھوکر لگی۔ مرتضیٰ نے کارڈ اس کی چھاتی پر مارا۔

"Pay a visit."

شرٹ کی آستین سے اپنا گال رگڑا اور پھر وہ چل دیا۔ اس کا سفر بہت لمبا تھا۔ رباب کی چمچاتی آنکھیں اور بے روک ہنسی دم توڑ گئی تھی۔ ادا کے کھلونوں میں رنگا اس کا ڈرائنگ روم ویران پڑ گیا تھا، ناشتے کے سامنے کرتے اس کے احتجاجات اپنا اختتام ڈھونڈ چکے تھے۔ وقت کٹا نہیں، بہا تھا۔

رائج نے گردن جھکائی۔ کپکپاتی انگلیاں اپنے سینے کے ساتھ کارڈ تھامی تھیں۔ اس کے منہ میں خون کا دھاتی مزہ گھل رہا تھا، زبان بری طرح کٹ کٹی تھی۔ آنکھوں نے کارڈ پڑھا۔

COLUMBIA ASIA HOSPITAL

★★★

لوہے کا واکر زمین پر گھسیٹتے وہ ایک دروازے کے سامنے جا رکا۔ اسپتال کی راہداریوں میں مریضوں کے اہل وعیال ٹہل رہے تھے، طبی املا جیسے نرس اور ڈاکٹر بھی مصروف شیڈیول کے ساتھ یہاں سے وہاں ڈیوٹی پر رواں تھے۔ اس نے ان پیشہ ورانہ مگر انجان چہروں کے درمیان کوئی سہارہ کھوجنا چاہا، کوئی اپنا ڈھونڈنا چاہا۔

کھڑکی سے باہر دھوپ کٹ کر سہ پہر کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اس نے ہال وے کے کنارے بنے پرئیر ہال کا دروازہ چرچراتے سنا۔ وہاں سے لوگ عصر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ سر سے ٹوپی اتارتا مرتضیٰ بھی انہی میں سے تھا۔ بے داغ گندمی رنگت انگلیوں کے گرد تسبیح کے دانے لپٹے تھے اور اس کے لب کسی کلام سے زیر حرکت تھے۔ سر پر پٹی اور بازو پر بریس باندھے مرد کو دیکھتے اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ رابح آج دوپہر کو ہونے والا ردعمل بھول کر ایک قدم آگے بڑھا، اس کی آنکھوں میں امید تھی۔ سب ٹھیک کر دینے کی چاہت، معافی کی درخواست۔ لیکن اس کے قدم تب موقوف ہوئے جب مرتضیٰ نے گردن موڑ کر اسے نظر انداز کر دیا۔

اس کے دل سے جڑی ساری لڑیاں ٹوٹ گئیں۔ مرتضیٰ نے میڈیا کی کہانی اپنائی تھی۔ وہ بھی اسے اپنی بیوی اور بیٹی کی موت کا قصوروار قرار دے چکا تھا۔ اس نے بھی رابح آدم کے اوپر ابھیجیت کو ہلی کا انتخاب کیا تھا۔

اس نے بھی۔۔۔؟

اپنی گھائل روح کو دو پل کے لیے فراموش کرتے رابح نے مرکز بدلا اور ایک ڈاکٹر کی طرف رخ کیا۔

"عدیلہ آدم؟" اس نے مریض کا نام بتایا۔ ڈاکٹر نے اول تو اس کی اپنی حالت پر تھوڑی تشویش ظاہر کی، پھر اسے روم نمبر بتا دیا۔ راستے میں اسے مرتضیٰ کی ماں بھی نظر آئیں جو کینٹین سے کھانے کی اشیاء خرید رہیں تھیں۔ ان کے پر وقار مگر عمر رسیدہ چہرے پر واضح تکان تھی۔ اپنے بیٹے کی زندگی ایک رات میں اجڑتے

دیکھنا کس ماں نے تصور کیا ہوتا ہے؟ رابح آج ملائیشیاء پہنچا تھا لیکن وہ لوگ تو کریش کی رات سے اس جہنم میں جٹے تھے۔ چار دن سے۔

مرتضیٰ نے اپنی بیوی کھوئی تھی، بیٹی کھوئی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی بہو کھوئی تھی، پوتی کھوئی تھی اور بیٹا کھویا تھا، تاعمر رنج کی نظر۔

وہ آئی سی یو کے باہر پہنچا تو ایک نرس نے اسے تنبیہی نظروں سے روکا۔ "پیشنٹ کے کون ہیں آپ؟"

"بیٹا۔" وہ لفظ کہتے اس کا سینا جل رہا تھا، ایک ایک شریان آگ برسا رہی تھی۔

"ہمم۔" نرس نے رک کر اسے اوپر سے نیچے تک اسکین کیا۔ "آئی سی یو میں ملاقات موئکد ہوتی ہیں، لیکن میں آپ کو اجازت دے رہی ہوں۔ مریض اسٹیبل ہیں لیکن انھیں آرام چاہیے۔ پچھلے چار دونوں میں انھیں دو ہارٹ اٹیک آئے ہیں۔ ایک میجر، ایک مائینر۔ اتنا تو پتا ہو گا ناں آپ کو؟"

اس نے شیشے کے پار بنے کمرے میں دیکھتے گم سا سر ہلایا۔

"عدیلہ سو رہی ہیں۔ آپ مل لیں لیکن کوئی ہلچل مت مچایئے گا۔" اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک کنارے ہو گئی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اندر کمرہ سفید روشنیوں میں گھرا تھا۔ وہ پورٹ بلئیر میں بنے اسے اپنے ہاسپٹل روم کی یاد دلا رہا تھا۔ اس نے اچانک ایک بن بلائی جھرجھری لی۔ کمرے میں لگے ہارٹ ریٹ مانیٹر، ECG کی مشینیں اور ہوا میں گھلی ڈیٹرجنٹ اور اینٹی سیپٹک کی بو اس کے مائگرین کو جنم لینے سے روک نہیں پا رہی تھیں، لیکن وہ سب سہلے گا۔ وہ بستر پر لیٹی اس فربہ صورت عورت کے لیے، نالیوں اور آکسیجن ماسک میں جکڑے اس کے جسم کے خاطر سب سہلے گا۔ وہ اس کی ڈھال بنے گا، وہ اس کی چھاؤں بنے گا۔

چار دن پہلے اس کے پلین کریش کا سن کر اس کی صحتیاب ماں کو اپنی زندگی کا پہلا اور خطرناک ترین ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ پسنجر لسٹ فائنل ہونے سے پہلے ہی ایئر لائنز والوں نے اس کی فیملی سے رابطہ کر کے رباب

اور ادا کی اموات کی تصدیق کر دی تھی تا کہ ان کا انتظار نر پھل نہ رہے۔ دوسرا ہارٹ اٹیک انھیں کل شام آیا تھا۔ ابھیجیت کو ہلی کے بیان کے بعد۔ میڈیا کی کہانیوں کے درمیان۔ اپنے بیٹے کو پا کر بھی کھو دینے کے غم میں۔

ڈاکٹر نے اسے یہی بتایا تھا اور رانج نے دو جمع دو کیا تھا کہ یہ ساری معلومات مرتضیٰ نے ہی انھیں فراہم کی ہو گی۔ اسے اچانک جھٹکا لگا۔ مرتضیٰ تو دبئی میں ہو گا۔ اماں کو پہلی رات اسپتال کون لے کر آیا تھا؟

وہ کمرے کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم شل تھا۔ لال بٹن شرٹ اسی طرح اس کے کندھوں سے ڈھلک رہی تھی، چہرے کی ہلکی سوجن ٹوٹے دانت کے باعث بڑھ گئی تھی۔ خون روکنے کے لیے اس نے فارمیسی سے روئی لے کر مسوڑوں میں اٹکالی تھی۔ نرس نے اسے بے حرکت پا کر اکیلا چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور دروازہ قلابے سے ملاتے باہر نکل گئی۔

اس کے آنکھوں کے کنارے نمی سے گھرے تھے۔ وہ قدم قدم چلتا بیڈ کے نزدیک آیا۔ اماں کی سانسیں ہلکی تھیں، آکسیجن پاسک کے پار وہ بھاپ کی صورت نمایاں ہو رہی تھیں۔ ہارٹ ریٹ مانیٹر کی مسلسل بیپ بیپ وہ واحد شے تھی جو اس کے کانوں کو اس لمحے میں جوڑے رکھی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ایک آنسو ٹپک کر بیڈ شیٹ میں جذب ہوا۔ اس نے ہاتھ آگے کیا، لغزش کرتی انگلیاں اماں کی کنپٹی پر رکھیں۔ ایک اور آنسو اس کی ٹھوڑی سے نیچے گر کر فنا ہو گیا۔ پھر ایک اور۔ اس نے ان کے ماتھے سے چند لٹیں ہٹا کر پیچھے کیں۔ خاموش کمرہ اس کی آزردگی کا نگہباں بنا رہا۔

اس کی حقیقت، الزامات کا بوجھ، دنیا کی نظروں میں منسوخ کر دیے جانے کا خوف، اپنوں کو انجان ہوتا دیکھنے کا رنج، اپنا گھر اپنے سامنے بنجر کر دینے کا قصور۔ اپنی ماں کی چلتی سانسیں دیکھ کر اسے سب فراموش ہو گیا تھا۔ ماں تھی تو سب تھا۔

اس کی پوروں تلے اماں نے چہرہ ہلکا سا ترچھا کیا تو وہ جھجک کر تھم گیا۔ ان کی آنکھوں نے بھاری نیند سے آزادی چرائی۔ اس کے آنسو اب کہ اور شتابی سے ڈوب رہے تھے۔

"سو جائیں، سو جائیں، سو جائیں۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی اور ہاتھ کی پشت سے گیلی ناک سکھائی۔

"را۔۔" انہوں نے لب آدھے کھولے، ہلکی بھوری آنکھیں ترغیبی نیند کی کسر چھوٹی تھیں۔ وہ اور بے تابی سے مسکرایا اور سر اوپر نیچے کرنے لگا۔ "میں، میں اماں۔ نی رانج۔ آپ کا رانج۔ میں ادھر ہوں۔ آپ کے پاس۔"

انہوں نے ایک گہری سانس اندر لی۔ وہ کرسی کھینچ کر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ سو طرح کی مشینوں میں قید اس کی ماں اسے دیکھتے نہیں تھکی تھی۔ جہاں ان کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے ہوا کرتے تھے، وہاں دل کی شرح ناپنے والا آلا تھا۔ جو ہاتھ سبزی بناتے کچن میں کیبنٹ کھول بند کر رہے ہوتے تھے، وہ آج ان کے اطراف میں بے جان بچھے تھے۔ جو پیر گھنٹوں بازار کا چپا چپا چھانتے تھکتے نہیں تھے وہ اب بے مقصد لگتے تھے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے آہستگی سے ان کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ آنسو ان کی نرم کھال بھگو گئے۔ "میں کھو گیا تھا، ماک۔ میں آپا سے الگ ہو گیا تھا۔ میں۔۔۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اور پھر بہت دیر ہو گئی۔" اس کی آواز اس کے گلے میں رک رہی تھی۔ وہ اوندھا ہو کر رونے لگا۔ اس کی پور پور تکلیف میں تھی لیکن وہ سب بے معنیٰ تھا اپنی ماں کی ٹھنڈی نگاہوں کے آگے۔

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے کوئی نہیں سن رہا ہے۔ مجھے کوئی کچھ نہیں کہنے دے رہا۔ میں نے کہیں بھی اپنی صفائی نہیں دی۔ میں آپ کو دوں گا، اماں۔۔۔" اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ اماں کی آنکھیں اس پر تھیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کی قسم، میں نے کچھ نہیں کیا۔"

اس نے اپنی قید میں بندھے ان کے ہاتھ میں حرکت ہوتی محسوس کی۔ وہ رک کر بے زبان سا، بدحواس سا انھیں تکتا گیا۔ عدیلہ بیگم نے اپنی انگلیوں کی پوریں اس کے گال سے ٹکرائیں اور آنسوؤں کی ایک پٹی صاف کی۔ اس نے پلک جھپکاتے سر جھکا کر ان کی ہتھیلی پر بوسہ دیا۔ "مجھے آپا یاد آرہی ہیں، اماں۔ میں انھیں کیسے۔۔۔ یا اللہ میں انھیں کیسے چوٹ پہنچا سکتا ہوں؟ یہ لوگ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ کیوں، اماں، کیوں؟" وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

"ادا میری بیٹی تھی۔ میری جان تھی۔ اس نے مجھ سے کٹ کیٹ مانگی تھیں اماں۔ مجھے اسے کٹ کیٹ دینی ہیں۔۔۔" وہ اور نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے انگلیوں کی پشت سے اپنی ٹھوڑی صاف کی اور نظریں ان سے ملائیں۔

"اماں، تو لونگ لا۔۔۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔ "مجھے ایک بار یہ کہہ دیں، ایک بار کہ آپ کو میرا یقین ہے۔ صرف ایک بار مجھے بتا دیں کہ آپ کو اپنے رائج، اپنے بچے پر شک نہیں۔ ایک بار، اماں۔ کوئی اشارہ، کچھ بھی۔ اللہ لا۔" اللہ کے واسطے۔

چند ثانیے وہ یونہی انھیں دیکھتا رہا، دل کی دھڑکنیں زندگی میں دوسری بار اپنی ماں سے جڑ گئیں تھیں۔ وہ ہی اس کی راستگاری تھیں، اس کی آزادگی۔ ان کا ہاتھ تھام کر وہ اس منکر دنیا میں فاتح ہو گا۔ اسے کچھ نہیں چاہیے تھا سوائے ان کے، ان کے یقین اور اعتماد کے۔

اچانک آس پاس ایک بے ہنگم شور گونجا۔ رائج نے بے کل ہو کر سر یہاں وہاں گھمایا۔ ہارٹ ریٹ مانیٹر پر نمایاں ہوتی نوکیں اچانک یک بعد دیگرے ہموار ہوتی نظر آرہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور طبی املا اندر بھاگے۔ سفید اسکربز میں تیار نرسیں اور ڈاکٹرز ان کے برابر آن کھڑے ہوئے۔ اب وہ کارڈیو گرام پر ان کی حالت کے وائٹل سائنز دسا رہے تھے۔ ایک نرس اماں کی آکسیجن کی رطوبت چیک کر رہی

تھی۔ وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو کر بہت پیچھے پہنچ چکا تھا۔ وہ ہاتھ جو چند لمحات پہلے اماں کے دست میں قید تھا پسینے سے خنک پڑ چکا تھا۔

وہ بے نور آنکھوں سے سارا نظارہ اپنے سامنے کھلتے دیکھتا رہا؛ کیسے نرس نرم آواز میں اس کی ماں کا نام بار بار پکار رہی تھی، ان کے حواس جانچنے کی مشقت میں۔

"عدیلہ؟"

"عدیلہ؟"

"عدیلہ؟"

ڈاکٹر اب ان کے سینے پر وزن ڈال کر خون کو جسم میں رواں کرنے کی کوشش میں تھے۔ ہر طرف ایک برہم سی افراتفری تھی۔ اس کا دماغ بھی اسی شور کا حصہ تھا۔ وہ چیخ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔ نہیں، ایک اور نہیں۔ نہیں، میری ماں نہیں۔ لیکن اس کا بیرونی جسم شانت تھا، ساکن۔ ایسا لگتا تھا وہ ہر مشکل، ہر دشواری کو فنا کرنے کھڑا ہو۔ شاید قدرت کو بھی یہی دھوکہ ہوا تھا۔

ایک نرس نے سر موڑ کر اسے دیکھا اور تحمل بخش مسکراہٹ دینی چاہی۔ رائج وہ بھی نہ کر سکا۔ اس کے ہوش و خرد پر تو بس ایک ہی فقرہ بہ آواز بلند تھا۔

اماں نے جواب نہیں دیا۔

اماں نے اشارہ نہیں کیا۔

وقت کب ٹل گیا، وہ لمحہ کب بیت گیا، خبر نہ ہوئی۔ جیسے سردیوں کی راتوں میں اماں کے ساتھ مونگ پھلی کھاتے نہیں ہوئی تھی، جیسے گھر والوں کے ساتھ پکنک پر سوئمنگ پول میں نہاتے نہیں ہوئی تھی، جیسے اپنی بہن کے طرح طرح کے قصے سنتے نہیں ہوئی تھی، جیسے ادا کی چوہتی سالگرہ پر نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو ابھی ہی پیدا ہوئی تھی۔

"ناٹ فیئر! اتنا جلدی بڑی نہیں ہو سکتی تم، شاطر لڑکی!" اس نے اسے گود میں اٹھاتے ڈانٹ لگائی تو وہ اپنی چنچل سی ہنسی ہنس دی۔

"آپ بھی تو بڑے ہو رہے ہیں!" وہ کھکھلا کر بولی۔ شاطر لڑکی کا احتجاج ٹھوس تھا۔ رابح نے اپنے دفاع میں منہ اس کی گالوں سے لگا کر پیار کیا۔

ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آ کر تھما۔ اس کے جسم سے بے اختیار کپکپی چھوٹی۔ سامنے کھڑا ڈاکٹر اپنے کوٹ کی آستین اوپر کر کے گھڑی میں ٹائم نوٹ کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑی نرس اماں کا آکسیجن ماسک آہستگی سے ان کے چہرے سے جدا کر رہی تھی۔ رابح کی سانس اٹکی رہی۔ اس نے خالی نگاہوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ زندگیوں کا رکھوالا کیا پیغام لایا تھا؟

"آئی ایم سوری فار یور لوس۔" بہت تحمل سے اس کا کندھے مسلا۔ "عدیلہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

ساری مشینیں ایک ایک کر کے آف کی جا رہی تھیں۔ کیا فائدہ ان کا، ان سب کا؟ اسپتال کا وہ کمرہ اچانک سکڑ کر ایسا سرد ہو گیا تھا جیسے کوئی برف کی سل۔ اس کی کھال کا ذرہ ذرہ سوکھ رہا تھا، پور پور تنگ تھی۔ نرس نے اب کہ چادر اماں کے منہ پر چڑھائی۔ ڈاکٹر اسے اطلاع کر کے جا چکے تھے۔ ان کے لیے یہ معمول تھا۔

اس کے سر کے عقبی حصّے میں ایسی ٹیس اٹھ رہی تھی جیسے سو سوئیاں ساتھ چبھو دی گئی ہوں۔ گردن کے گوشت سے سفر کرتے اس کی ریڑھ کی ہڈی تک جم گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا ایک ایک جوڑ پیچ سے علحیدہ ہوا ہو۔ پینتیس ہزار فٹ سے دواں دیے جانے کا صدمہ، چار دن مسلسل تشویش اور شک کا پتلا بننا، اپنے ہر قریبی کو خود سے اجنبی ہوتا دیکھنا، وہ سب اس گھڑی کے آگے کچھ نہ تھا۔

اس کی ماں چلی گئی تھی۔

اس نے پٹیوں میں لدے اپنے پاؤں کو دیکھا پھر نظر ٹوٹے بازو تک گئی، ساتھ ہی اس کی کپکپاتی ہتھیلیاں۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آس پاس سنائی دی۔ کوئی اندر آیا تھا یا کوئی رخصت ہوا تھا، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اس کے دماغ کا ہر گوشہ صرف ایک ہی اعلان کر رہا تھا۔ بار بار۔

اماں نے جواب نہیں دیا۔

اماں نے اشارہ نہیں کیا۔

★★★

اگلے روز

۲۵ نومبر، ۲۰۰۹

تمان ٹُن ڈاکٹر اسماعیل، کوالالمپور

گھر کے لان میں جگہ جگہ دریاں اور سفید پلاسٹک کی کرسیاں بچھائی گئیں تھیں۔ آسمان میں شفاف نیلے بادل اپنا رقص درسا رہے تھے، روئی کے سے چمکدار، بیش بہا موتیوں جیسے انمول۔ سورج کی تپش آج مقابلتاً دھیمی تھی اور جنوب سے شمال کی اور ٹھنڈی ہوائیں سفر کر رہی تھیں۔

سبز گھاس کی پٹی کی ابتداء پر کافوری رنگ کے شلوار قمیص میں وہ کھڑا تھا۔ چھوٹے بھورے بال پیچھے کو مڑے بلا کوشش نفیس نظر آ رہے تھے۔ سر پر پٹی اسی طرح لپٹی تھی، بس آج وہ تھوڑی صاف لگتی تھی۔ سپید رنگت اور گلابی گال بے اثر تھے لیکن گھنی سیاہ بھنویں آپس میں ملیں تھیں۔ آستینوں کو باہوں تک موڑے، وہ صحیح والے ہاتھ سے ساتھ کھڑے کم عمر لڑکے کو ایک جانب اشارہ کر کے کچھ سمجھا رہا تھا۔

جنازے پر مردوں کی بیٹھک کا انتظام لان میں کیا گیا تھا اور عورتوں کا گھر کے لاؤنج روم میں۔ لیکن چند دس لوگوں کے علاوہ اتنی آبادی تھی نہیں۔

لڑکا سمجھ کر چل دیا تو اس نے کندھے ڈھیلے چھوڑے۔ کثرتی ڈھال اور باوزن پشت ایک پل کے لیے ہر بوجھ سے آزاد تھی۔ سب ہوا تھا کیونکہ ہونا تھا۔ یہ قسمت تھی۔ یہی قدرت تھی۔ اس نے ایک سانس اندر کھینچی اور اچانک سینے میں وہ چبھن لوٹ آئی۔ یہ سازش تھی۔ یہ رابح آدم کی شیطانیت تھی۔

"چچ چچ!" کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے سر دائیں جانب گھمایا تو گھر کے مین دروازے پر اس کی خالہ کی بیٹی زرین کھڑی تھی۔ سر پر کس کے اسکارف اوڑھے وہ لمبی دبلی رباب کی ہم عمر لڑکی تھی۔ ہلکے گلابی سوٹ میں کھڑی وہ اسے پاس آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ رابح قدم قدم اس کے پاس پہنچا۔

"ہو گیا غسل؟" اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میں اکیلے نہیں کر سکتی رابح۔ اماں کا تو سین پتا ہے تمھیں۔ وہ زیادہ ہل جھل نہیں سکتیں۔ باقی سب چھوٹے ہیں۔" وہ واقعی پریشان نظر آ رہی تھی۔ رابح نے دو پل کے لیے ضبط سے آنکھیں بند کیں۔ اس کی نیک نام ماں کو ایک غسل بھی نصیب نہیں ہو رہا تھا، صرف ان کے بیٹے کی بدبختی کی وجہ سے۔

"خاندان کا کوئی اور نہیں آیا؟" اس نے آگے جھکتے احتیاط سے پوچھا۔ وہ ہمدرد تھی۔

"دکھ رہا ہے؟" جواباً مرد نے طنزیہ باہیں آس پاس گھمائیں۔

"اچھا، اچھا۔ تم تو انگارے چبا رہے ہو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔۔۔ اوہ، ظبیہ آؤ آؤ۔"

رابح کی کمر اکڑ گئی، سانس سینے کے اوپر والے حصے میں ہی پھنس گئی۔ وہ پیچھے مڑنا بھول گیا اور اطراف میں گرے ہاتھ وا کر کے لوہے پر تنگ ہوئے۔

وہ اس ملاقات کے لیے تیار نہیں تھا۔

"سلام۔۔۔" نرم، جھجکتی ہوئی آواز۔ رابح سن سکتا تھا، سمجھ بھی سکتا تھا، وہ کیا محسوس کر رہی ہو گی، کیسے خود کو قابو کیے ہو گی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کی تصویر بھی کھینچنا آسان تھا۔ بھوری رنگت پر ابرو جھکے ہوں گے، گہری پر فکر آنکھیں اسے کھوج رہی ہوں گی، انگلیاں آپس میں تنگ ہوں گی اور ایک پیر

دوسرے کو سہارہ دیے ہو گا۔ سیدھا الٹے کو۔ کیونکہ پریشانی میں استوار کھڑے رہنا، ظبیہ یمین کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس نے نظریں جھکالیں۔ وہ نہ ہٹ رہا تھا نہ گھوم رہا تھا، نہ اسے دیکھ رہا تھا، نہ ہی اس سے فاصلہ اختیار کر رہا تھا۔ اس کا دماغ خود کے ساتھ ہی دنگل میں تھا۔

"بیٹا، رانج۔۔۔" یہ آواز وہ جانتا تھا اور یہی اس کا نقطہِ شکستگی تھا۔ ظبیہ اکیلی نہیں تھی، ساتھ اس کی خالہ بھی تھیں۔ ظاہر ہے۔

وہ آہستہ سے پلٹا، واکر کو اطمینان سے اپنے سامنے رکھا اور سفید پڑتی انگلیاں اس کے لوہے کے گرد لپیٹ لیں۔ اس نے چہرہ اب بھی اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ زرین اس کی دشواری دیکھ رہی تھی، وہ اسے راحت دینا چاہتی تھی، لیکن سمجھ نہیں آرہا تھا کہاں سے شروع کرے۔ اس کا غم اور خسارہ تو ہوش مندی سے بہت بالا تر تھا۔

"السلام و علیکم۔" اس نے گھاس کو دیکھتے الفاظ باہر نکالے۔ ظبیہ کے پاؤں اس کے سامنے تھے۔ سفید پٹے والی چپل میں انگوٹھا باقی چار انگلیوں سے علحیدہ تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

خالہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور قریب پہنچیں۔ نرمی سے اس کا گال چھوا اور پیروں کی چوٹی پر کھڑے ہوتے ماتھے پر بوسہ دیا۔ دھیمی آواز میں تعزیت کرتے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ رانج نے کپکپاتی انگلیاں واکر سے نہیں ہٹائیں۔ اسے اندازہ تھا وہ سیدھا نہیں کھڑا رہ پائے گا۔ ظبیہ یمین کے سامنے استوار کھڑے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"یہ کیا ہو گیا میرے بچے؟" وہ بار بار ایک ہی سوال کر رہی تھیں۔ ان کے آنسو اس کی قمیص بھگو رہے تھے، اس کا بدن جھلسا رہا تھے۔ اس کی ہر چوٹ دس گنا زیادہ دکھ رہی تھی۔ وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ ظبیہ کے سامنے ٹھیک نہیں بن سکتا تھا۔

"صبر کریں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔ الفاظ خالی تھے، سب سے بڑھ کر وہ فریبی تھے۔ اسے اپنا آپ کوئی اور لگتا تھا۔ یہ دلاسہ، یہ تسلی کون دے رہا تھا؟ اس نے ایک ہتھیلی سے خالہ کی پشت تھپتھپائی، اب تک نظریں اوپر اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"آپ کو کیا ہوا؟" آخر کار وہ آواز دوبارہ آئی۔ رابح نے واضح طور پر ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ سامنے کھڑی لڑکی کی آواز میں اتنا خلوص، اتنا درد تھا کہ وہ ایک پل کے لیے جم کر رہ گیا تھا۔ وہ اس سے اس کی حالت پوچھ رہی تھی، اس کے زخموں کا جواب چاہتی تھی۔ وہ پہلی تھی اور شاید، آخری بھی۔

اس کی دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ "معمولی چوٹیں ہیں۔۔۔" اس نے بغیر دیکھے جلدی جلدی بولا اور چہرہ زرین کی طرف موڑا۔ "کاک، انھیں اندر لے جائیں۔"

"معمولی تو نہیں ہوں گی۔" لڑکی اب احتجاج کر رہی تھی، اس کے انداز میں شکوہ تھا۔ وہ شکوہ جو آج کے دن اس کی بیوی بنتی لڑکی کا حق تھا۔ آج ان کے شادی ہونی تھی۔ اچانک وہ خیال ہوا کے پھٹکے کی طرح اس کے منہ کو لگا تھا۔ شادی والا گھر میت والا گھر بن گیا تھا، گانوں کی دھنیں سوگ کی پکاروں سے تبدیل ہو گئی تھیں، ہر رنگ کفن کا سا سفید پڑ چکا تھا۔ اسے اپنے قدم لرزتے محسوس ہوئے۔ خدا کا واسطہ تمھیں ظبیہ، میری مشکل آسان کر دو۔ مجھے خود سے دور کر دو۔

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں کہ اس بار مستحکم انداز میں اپنا بیان دے گا، لیکن سامنے کھڑی صورت دے کر رابح آدم کا کیا اور کب کچھ مستحکم رہا تھا؟ وہ ڈھے گیا، اس کا اندرون تک خالی ہو گیا۔ ہیزل آنکھیں بھوری آنکھوں سے جا ملیں۔ وہ الگ ہونے کے لیے تھوڑی بنی تھیں۔ کہتے ہیں ناں کچھ روحوں کا ملن آسمان اور زمین آپ لکھتے ہیں۔ ماسوا ان کے، ہر زمان اور تاریخ میں ان کا ہجر ارقام کیا گیا تھا۔ وہ ملے تھے بچھڑنے کے لیے۔

سامنے کھڑی لڑکی، اس کی چہرے کی سادگی، ہلکے گلابی ہونٹوں کی ڈھلوان، کتھئی آنکھوں کی ناراضگی، سر سے لٹکا شیفان کا مدھم نیلے رنگ کا دوپٹہ اور ساتھ ہی چوڑی ہم رنگ فراک، وہ کسی خواب سے کہتر نہیں تھی۔ کاش، وہ اصل نہ ہوتی۔ پھر رانج کو اس کے چھن جانے کا غم نہ ہوتا، بیدار ہو جانے کا خوف بھی نہ ہوتا۔ کاش، کچھ اصل نہ ہوتا، ظبیہ۔ ہمارے درمیان۔

"معمولی ہیں۔" اس نے بھر کم لہجے میں دہرایا۔ "نہ ہوتیں تو ٹھیک نہ ہوتیں۔"

"مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہیں۔۔۔" وہ بھی ضد پر اڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں چبھن تھی، وہی چبھن جو سامنے کھڑے مرد کے سینے میں تھی۔ اس کی خالہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا، اسے سنبھالنا چاہا۔ خاموش ہو جاؤ، ظبیہ۔ لیکن وہ یونہی بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

"تھوڑا وقت دو۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس نے نظریں چراتے کہا۔ جاؤ ظبیہ، خدایا، جاؤ۔ اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔

"پکا؟" سامنے کھڑی لڑکی نے نم گالوں سے اسے دیکھا۔ نہ جاؤ۔ رک جاؤ، ٹھہر جاؤ۔ مجھے کچھ اور کہنے دو۔ اس کا دل الگ پیشی لگائے ہوئے تھا۔

"آؤ، ظبیہ۔۔۔" زرین نے گفتگو کی تنگی بھانپ کر راستہ چھوڑا۔ "اندر آؤ۔"

"رانج، پکا؟" اس نے زور دیا۔ اس بار اس کی خشک آواز اپنے وزن سے لرز رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آن پہنچی تھی۔ ان کے درمیان کا فاصلہ بہت پتلا تھا۔ اس کی خالہ کلائی کھینچ کر اسے پیچھے کر رہی تھیں لیکن وہ ڈٹی رہی۔ سامنے کھڑا مرد نیچے دیکھتا رہا، منہ کے دانت ایک دوسرے میں دھنسے تھے۔

"ظبیہ، اندر چلو!" خالہ نے سرگوشی میں ڈانٹ لگائی، لیکن شل کھڑی لڑکی کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"کہو رانج۔۔۔" وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ "ٹھیک ہو جاؤ گے ناں؟"

اس نے چہرہ اٹھاتے اسے دیکھا، ہیزل آنکھیں خالی تھیں۔ "ظبیہ، اندر جاؤ۔"

"میں چار راتوں سے سوئی نہیں ہوں، رابح۔ مجھے برے خواب آرہے تھے۔ تم کہاں تھے؟ تم نے کال نہیں کی، تم نے ٹیکسٹ نہیں کیا۔ تم زخمی تھے۔ نیوز والے۔۔۔"

"ظبیہ، اندر جاؤ!" وہ بھرپور جوش سے غرایا تھا۔ آس پاس بیٹھے مرد، مرتضیٰ اور اس کے آفیس کے دو تین آدمی، کام کرتے لڑکے سب ہر چیز چھوڑ کر انھیں دیکھنے لگے۔ اندر بیٹھیں چند عورتوں نے بھی سر نکال کر مزے لوٹنے چاہے تھے۔

ظبیہ نے کندھے ڈھیلے چھوڑے۔ ایک ہاری ہوئی سانس اس کے لبوں سے چھوٹی اور ایڑھیاں چپلوں سے جا لگیں۔ بھوری آنکھیں اپنی آس کے پیوند لیے اسے تکتی گئیں اور تنہا آنسو ٹھوڑی سے نیچے ٹپکا۔

وہ بھی بن آواز اسے دیکھتا رہا۔ ان کی نگاہ داری میں خلل تب آیا جب خالہ اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اندر چل دیں۔ زرین نے ایک آخری نظر اس پر روشن کی اور پھر وہ بھی ان دونوں کے ساتھ بڑھ گئی۔

تنہائی پا کر اس نے ایک ہتھیلی اپنے منہ پر رگڑی اور وسرام شدہ سانسیں بحال کیں۔ چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو مرتضیٰ اسے گھور رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آئندہ وقتوں میں اس راہداری میں ادا کیے الفاظ درست ثابت ہونے والے تھے۔

رابح آدم کا خاندان در حقیقت ختم ہو رہا تھا۔

★★★

صبح کی روشنی اس کے کمرے کی کھڑکیوں سے سیپ کر داخل ہو رہی تھی۔ ایلومینیئم کے قلابے سنہری روشنی میں قیمتی زیور کی سی تصویر کھینچ رہے تھے۔ آسمان میں نئے دن کی رونق تھی، ہوا میں نومبر کے اختتام کی اداسی تھی۔ موسم اب بھی گرم تھا۔ ملائیشیاء کے موسم کی پیش گوئی کرنا صراحت کو مقرر کرنے

کے مقابل ہے۔ آج بھی گرمی ہو گی، کل بھی گرمی ہو گی اور اومائی گاڈ، پرسوں بھی گرمی ہو گی! کسے پتا تھا؟

باتھ روم کا دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا اور لکڑی کو واپس چوکھٹ سے دھکیلا۔ سفید شرٹ کی آستینیں اس کی گیلی باہوں سے اوپر کہنیوں پر مڑی تھیں اور انگلیاں سیاہ پینٹس کے گرد چمڑے کی بھوری بیلٹ گزار رہی تھیں۔ بھرپور توجہ کے ساتھ وہ ایک ایک ہک سے کھینچ کر بیلٹ اپنی کمر پر کس رہا تھا، ساتھ ہی قدم پھرتی سے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب تھے۔ ایک پر مقصد نظر اس نے بیڈ کے ساتھ رکھی ڈیجیٹل کلاک پر ڈالی جہاں نو بجنے میں بیس منٹ تھے، اور گلابی ہونٹوں سے ماندگی بھری سانس چھوٹی۔

آج اماں کے انتقال کو چار دن گزر گئے تھے۔ زرین، اس کا شوہر، خالہ پچھلے دو دنوں میں جا چکے تھے۔ ان سب کی اپنی زندگی تھی۔ جانے والوں کے ساتھ جایا نہیں جاتا۔ مرتضیٰ جنازے کے بعد ایک پل اس گھر میں نہیں رکا تھا۔ اس نے پورے وقت اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ دوریاں دائروں کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ لاانت۔ مسلسل رواں۔

سامنے رکھی سرمئی چاندی کی رولیکس اٹھا کر اپنے کلائی پر لپیٹنے لگا تو ساتھ رکھا دل اور رینبو والا فوٹو فریم اس کی نگاہ میں آیا۔ اس میں آٹھ سالہ رابح اور پندرہ سالہ رباب اماں کی گردن میں باہیں پھنسائے کھڑے تھے۔ رباب کے کھلے بال اس کے چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں چبھ رہے تھے اور وہ اماں کی گردن میں منہ چھپائے ہنس رہا تھا۔ رابح دیکھ کر مسکرا دیا، ہاتھ خودکارانہ طور پر فریم کی طرف بڑھے۔ بچپن میں اس کی آنکھیں بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں اور جب وہ ہنستا تھا تو حلال کی صورت چھپ جایا کرتی تھیں۔ رباب تو ہمیشہ سے ہی پیاری تھی، اپنی پختون ناک کے ساتھ۔

اس کی انگلیوں نے فریم کے اوپر اپنی بہن کا چہرہ چھوا۔ وہ ہنس رہی تھی، وہ ہمیشہ اسے تنگ کر کے ہنستی تھی۔ بقول رباب مرتضیٰ، "چھوٹے بھائی کو رلانے کا الگ سے ثواب ملتا ہے۔" اماں ہر بار اس کی

شیطانیوں پر اسے ایک چپل لگاتیں تو وہ بھاگی بھاگی رابح کے پاس آجاتی اور پورا دن اسے سینے سے چپکائے رکھتی، جب تک کہ اس کی سانس نہ گھٹنے لگتی اور وہ ہانپتا ہوا بول اٹھتا۔ "ہاں، ہاں! معاف کیا۔"

ایک آنسو ٹوٹ کر کانچ پر گرا۔

رباب نے پھر اسے رلا دیا تھا۔ کہاں چلی گئیں تھیں اسے چپل مارنے والی اماں، کہاں گئی تھی پورے دن کی خدمت؟ کہاں گئے تھے وہ پل جب وہ رابح کو سینے سے لگائے پھرتی، اس کی معافی کی درخواست کرتے تھکتی نہ تھی؟ کیونکہ دن کے آخر میں ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ وہ دونوں ہی تھے۔

"مجھے پکنک پر جانا ہے اگلے پیر۔" دس سالہ رابح کمرے کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کے سامنے قالین پر پندرہ سالہ رباب کالے فریم والا چشمہ چڑھائے ڈبے والا ٹی وی دیکھ رہی تھی، بال پنک ہیئر بینڈ میں قید تھے۔

"تو جاؤ۔" اس نے بغیر دیکھے جیسے اجازت دی۔ رابح نے آنکھیں گھمائیں۔ جتنی چھوٹی وہ تھیں، کہیں گھم ہی نہ جاتیں۔

"ہاں تو ابا سے بات کریں آپ۔" اس نے کام کاج پر آنا چاہا۔

"کیوں کروں؟" ریموٹ پر بٹن دباتے اس کی بہن کی ناک تو اچانک سیلنگ سے جا چپکی تھی۔ توبہ توبہ، اتنا غرور۔ (رابح اس سے بھی زیادہ کرتا تھا۔)

"کیونکہ وہ آپ کی بات مانتے ہیں، آپو جانی پلیز!" وہ اس کے قریب گھٹنوں پر جا بیٹھا۔ گلابی صورت لڑکے کی آنکھوں میں ڈھیروں التجاء تھی۔ رباب نے سر موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا اور آنکھیں نرم پڑ گئیں۔ اتنا پیارہ گولو پولو سا بھائی اور اس کی چمکتی معصوم آنکھیں۔ اس نے سمجھ کر سر ہلایا اور اس کا گال تھپکا۔ رابح کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اب وہ سیدھا یہاں سے بھاگ کر اپنا سوئمنگ سوٹ اور گلاسس نکالے گا۔ اسے کیپ بھی لینی تھی اور ٹیوب بھی اور۔۔۔

"چلو نکلو۔" رباب نے نہایت نرمی سے کہا۔ "جاتے وقت دروازہ بند کر دینا۔ غریب لوگ۔"

رانج کے تاثرات تنے اور شروع ہوا اس کا نائن ٹو ٹو ئلو کا واویلا۔ "آپ میری کبھی نہیں مانتیں! میں نے آپ کو جانے دیا تھا! میں ہمیشہ مدد کرتا ہوں۔ آپ بہت بری ہیں، بہت مطلبی ہیں۔ آئندہ میں بھی ایسے ہی کروں گا! میرا اتنا دل تھا سوئمنگ پول جانے کا! کوئی میری نہیں سنتا۔ میری آپ کی کٹی۔ میں آپ کو آپ بھی نہیں بولوں گا، جائیں۔۔۔ میرا مطلب، جاؤ!"

رباب نے اس کی شکل دیکھی۔ وہ بمشکل اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ "اچھا، رکو۔ ابا۔۔۔" اس نے اس کے پیچھے کسی کو دیکھا۔ رانج کی کمر اکڑ گئی۔

آئے ہائے میرا نصیب، ابا کے سامنے معصوم سلجھے ہوئے بیٹے والی ایمیج غارت ہو گئی۔

"ابی کو آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

اتنی سی بات تھی اور وہ بنا شکل دکھائے غسل خانے بھاگ چکا تھا۔ دروازہ سختی سے بند کیا اور اپنے سرخ پڑتے گال چھوئے۔ وہ ابا کے سامنے ہمیشہ شرمگین ہو جایا کرتا تھا۔

باتھ روم کے باہر ابا نے آگے جھک کر رباب سے تالی ماری۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ جاتے جاتے انہوں نے پچاس رنگٹ کا نوٹ بڑی بہن کی طرف کھسکا دیا۔

"ابی کی شاپنگ کے۔"

اس نے تصویر واپس ٹیبل پر سجائی۔ ماضی درد دیتا تھا۔ ماضی اذیت دیتا تھا۔ آئینے میں واضح اس کے ماتھے کی بیچ دو انچ لمبا زخم کافی حد تک سوکھ چکا تھا۔ سوائے اس ضرر کے لمبے نشان کے، ٹانکوں سے جوڑی گئی کھال اب مل چکی تھی۔ دو انگلیوں کی پوروں سے ابھری ہوئی چام کو چھوتے اس نے اس کی ابتری نوٹ کی۔ چہرے پر لگے بقیہ چوٹیں بھی شکل بدل رہی تھیں۔ کچھ سرخ سے جامنی، جامنی سے بھورے۔ تکلیف

کی ٹیس اچانک اس کے سیدھے بازو میں دوڑی تو کندھے بے اختیار خمیدہ ہوئے۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں نے اسے تھاما۔ نہانے کی وجہ سے اس نے آرم سلنگ (arm sling) اتارا ہوا تھا۔

چار کمرے کے بنگلے میں چھائی خاموشی یک دم گھنٹی کی آواز سے چکنا چور ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر صحن کی جانب دیکھا۔ کون آ گیا تھا؟ وہ واکر کے سہارے دروازے تک پہنچا اور مشکل سے ایک ہاتھ سے قلابے ہٹائے۔

سورج کی چمکدار روشنی اچانک اس کی آنکھوں میں گری۔ اس نے چبھن سے آنکھیں جھپکیں پھر ماتھے پر ہاتھ رکھتے اپنی بصارت سدھاری۔ اس کے روبرو کھڑی لڑکی نے سفید پرنٹڈ باجو قمیص (مالائی عورتوں کے روایتی لباس 'باجو کورونگ' کا ایک حصہ) اور اس کے ساتھ ڈھیلی جینز کی پینٹس زیب تن کی تھیں۔ سر پر دوپٹہ اس ہی طرح ڈلا تھا جیسے وہ لیتی تھی۔ اس پر وہ اچھا لگتا تھا۔ رائج کو بھی اس پر وہ اچھا لگتا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر کچھ دیکھ رہی تھی تو اس کے دروازہ کھولنے کا اندازہ فوراً نہ کر سکی۔

ہاتھ نے دروازے کا کنارا پکڑا۔ "تم یہاں؟" اس کا دل بری طرح بھاگ رہا تھا۔ وہ اس کی آواز پر سیدھی ہوئی، تنگ نقوش امید سے جاگے۔

"سلام۔" وہ اتنا خوش لگ رہی تھی اسے دیکھ کر۔ رائج کو یقین نہ آیا کوئی اسے دیکھ کر بھی اتنا خوش ہو سکتا تھا۔ اب بھی۔

"واعلیکم۔"

"میں ناشتہ لائی ہوں۔" اس نے لب کاٹتے اپنے ہاتھ میں قید ٹپرویئر کے ڈبے کی طرف ٹھوڑی ہلائی، پھر ان ہی پر نور آنکھوں سے رک کر اسے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا وہ چار دن پہلے ہونے والا سارا تماشہ بھلا کر آئی تھی، یا شاید وہ تماشہ صرف رائج کے لیے تھا۔ ظبیہ کا مقصد اس کے قریب رہنا تھا، اور وہ اپنے عزم سے بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" اس کی تیار شدہ ہلیے پر سوال کیے بغیر وہ رہ نہ سکی۔

رانج اب تک اسے دیکھ رہا تھا۔ دس دنوں بعد اس کا چہرہ ٹھہر کر سرہایا تھا۔ اسے لگا تھا وہ بھول جائے گا، یا بھول چکا تھا، لیکن حرف نفی۔ وہ چہرہ اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

"میں۔۔۔"

"ارے ظبیہ، چابی لی تھی ناں گھر کی۔ تمھارا باپ تو کب گھر آئے اللہ ہی جانے۔" اس کی خالہ پیچھے سے پرکت ہو گئیں تو وہ اپنے الفاظ وہیں پی گیا اور دروازہ لمبا کھولا۔ بڑے ڈھیلے جامنی عبائے میں تیار خالہ کے ہاتھ میں پرس کے ساتھ ایک بڑا تھرمس اور کئی منزلوں والہ ٹفن باکس بھی تھا۔ رانج کو بالکل اچھا نہیں لگا وہ لوگ اس کی وجہ سے اتنا تھک رہے تھے۔ اس نے انھیں سلام کیا تو انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔ وہ احترام میں نیچے جھک گیا۔

"خالہ، اس سب کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میرے بچے، میری جان ہو تم۔ تمھاری ماں نہیں، بہن نہیں تو کیا ہوا؟ ہم تو ہیں ناں۔" خالہ گھر کے اندر بڑھیں تو وہ بھی سر جھکا کر ساتھ چل دی۔ رانج نے ہونٹ پیسے اور دروازہ بند کرتے ان کی پیچھے ہو لیا۔ وہ اندر پہنچا تو خالہ اس کے کچن کی ساری حدود پار کر کے فرج چھانٹ رہی تھیں۔ ظبیہ کھانے کے ڈبے اس کے کاونٹر پر سجا رہی تھی، نظریں جھکی تھیں۔ اس نے گڑبڑا کر سر آس پاس گھمایا۔ خدایا اس کا لاؤنج روم کوڑادان بنا تھا۔ اچانک اس کے کان اہانت سے کھول اٹھے۔ وہ واکر کے سہارے پیچھے ہوا اور صوفے پر سے اپنے میلے کپڑے سمیٹنے لگا۔

"میرے چندا، تم اتنے دن سے کیا کھا رہے ہو؟" خالہ نے پیچھے مڑتے پریشانی ظاہر کی۔ اس نے پھرتی سے کپڑوں کا گولا کمر کے پیچھے چھپایا۔ آہ، میرا بازو۔

"بس۔۔۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔"

"آپ بیٹھ جائیں۔۔میں سمیٹ دوں گی۔" ظبیہ اس کے سامنے کھڑی نرم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ وہ بغیر کچھ کہے اسے دیکھے گیا۔ صوفے کی چادر اٹھا کر سلیقے سے بچھاتے اس نے سر آس پاس گھمایا۔ "بلکہ جھاڑو بھی لگا دوں گی۔ آپ چابی چھوڑ جایئے گا۔"

اس نے احتجاج میں ہاتھ اٹھایا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر ضرورت۔" خالہ اسے چپل مار دیتیں اگر وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا نہ ہوتا۔ "بیٹا ہم پڑوسی ہیں، اور پڑوسی رشتہ دار سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔" پھر وہ مسکرا دیں اور اس کے اور ظبیہ کے درمیان دیکھا۔ "اور تم سے تو دونوں ہی رشتے ہیں۔"

ظبیہ کے رخسار گلابی ہوئے اور وہ مصروف سی میز پر سے اخبار اکھٹے کرنے لگی۔ رابح اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ خالہ اب کہ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھیں۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ ظبیہ واقعی اس کی (بے تکی) مدد کے بغیر کافی اچھے سے ہر کام کر رہی تھی تو وہ وہاں سے ہٹ گیا اور کچن اسٹول پر جا بیٹھا۔ ایک ہاتھ نے دوسرے کو پکڑ رکھا تھا۔

"اماں کو دورہ کب پڑا تھا؟" اس نے سر اٹھاتے خالہ سے پوچھا۔ کیتلی سے تھوڑا پانی کم کرتے ان کے ہاتھ ہوا میں رک گئے۔ ظبیہ بھی دو پل کے لیے تھم گئی لیکن پھر جھک کر قالین ٹھیک کرنے لگی۔

"انیس کو، جب کریش کی خبر آئی تھی۔۔لیکن اٹھارہ کی پوری رات بھی وہ مصلے پر بیٹھی رہیں تھیں۔ میں اور ظبیہ ان کے ساتھ تھے۔"

اس نے نظریں نیچی کیں۔ اچانک اسپتال کا وہ سفید کمرہ اس کے دماغ پر حاوی ہو گیا تھا۔

"اماں کو ہاسپیٹل کون لے کر گیا تھا؟"

خالہ نے ایک پل رک کر نگاہیں لاؤنگ روم میں کھڑی ظبیہ کی جانب کیں جو اس کے میلے کپڑے ایک طرف کر رہی تھی، چہرے پر مصنوعی سنجیدگی تھی۔ وہ بھی درد میں تھی۔ رابح نے بھی اسے دیکھا۔ اس کا دل اچانک بہت بھاری تھا۔

کاؤنٹر پر رکھے ان کے ہینڈ بیگ میں کسی کا فون بج رہا تھا۔ خالہ نے بڑی مشکلات سے اسے باہر نکالا اور پھر اسکرین دیکھتے ظبیہ کو پکارا۔

"چائے دیکھنا، بیٹے۔ الطاف کی کال ہے۔" وہ اندر والی راہداری کی جانب چلی گئیں۔ ظبیہ اس کے کپڑے لے کر برابر سے جانے لگی تو وہ اپنی نشست میں ترچھا ہوا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

اس کی آواز پر اس کے قدم رکے۔ "انھیں دھونے۔"

"یہ تمھارا فرض نہیں ہے، ظبیہ۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے نرمی سے جتایا۔

"کبھی تو ہو گا ناں۔" وہ مسکرا دی۔ "اور ویسے بھی ہم پڑوسی ہیں۔ کیا ہوتا ہے وہ انگریزی میں؟ نیبرس۔"

وہ مسکرا کر تھوڑا سا ہنس دیا۔ "یس، neighbours. کس نے سکھایا؟"

اس نے کپڑے اپنے بازو پر لپیٹے۔ "سیکھ گئی خود ہی۔ بڑی تیز ہوں میں۔"

رابح خود کو مسکرانے سے روک نہ سکا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں پھر سے غم سے گھر گئیں۔

"اماں کو ہاسپیٹل لے کر جانے کا شکریہ۔"

ظبیہ نے نظریں نیچے کیں۔ ماربل کا فرش چمک رہا تھا۔ اس میں ان کا عکس دھندلا تھا۔ "لیکن وہ بچ نہیں سکیں۔"

"اللہ کی مرضی۔" جس آسانی سے وہ یہ الفاظ کہہ دیتا تھا، کاش اتنی ہی آسانی سے انھیں مان بھی لیتا۔ اس کا دفاعی میکانیہ یہی تو تھا۔ دنیا کو آسودگی کی چادر چڑھا کر وہ خود بے گھر جاگتا تھا۔

ظبیہ نے اس کی خاموشی دیکھ کر بات جاری رکھنا چاہی۔ "رانج، ٹی وی پر۔۔۔"

"تمھیں چائے دیکھنے کہا تھا خالہ نے۔" وہ سیٹ میں پیچھے ہوا اور اپنا رخ موڑ لیا۔ ظبیہ کو اچانک ٹھوکر لگی، لیکن اس نے سمجھ کر سر ہلایا اور کچن کے اندر چلی گئی۔ وہ سچ چاہتی تھی، لیکن اسے گھیر کر نہیں۔ اپنے اور رانج آدم کے رشتے پر اسے اتنا یقین تھا کہ وقت کی مار میں وہ کچھ خراب نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کرسی سے کھڑا ہو کر ڈرسینگ روم تک گیا اور اپنا آرم سلنگ اٹھا کر لایا۔ اس کا بازو شدید دکھ رہا تھا اور اسے فوراً باندھنے کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی اس نے گھڑی دیکھی۔

آج اس کی پریس کانفرنس تھی، اور منیب احکام نے اسے ہدایات کی تھیں کہ اسے اپنی طرف کی ساری بات وہیں کلئیر کرنی تھی۔ وہ ایک پرچے پر سب لکھ چکا تھا، ماجرے کے اندر باہر کے سارے بیانات اور زاویے۔ اب بس یہ امید کر سکتا تھا کہ اس کا پیغام ان دلوں کو چھو جائے جو اس کی طرف سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ ایک بار وہ میڈیا کی جنگ جیت گیا تو سب ٹھیک کر لے گا۔ اپنے خاندان کو بھی، اپنے کریر کو بھی، اپنے پیار کو بھی۔

وہ لاؤنج روم تک آیا تو اس کے تاثرات جھنجھلائے ہوئے سے تھے۔ سلنگ بار بار اس کی پہنچ سے دور پھسل جاتا یا کندھے میں اٹک جاتا۔ کبھی اس کے بازو کا کونہ ٹھیک نہ بیٹھتا تو کبھی گانٹھ میں اس سے کوئی چوک ہو جاتی۔

ظبیہ نے چائے کپ میں نکالتے اس کی دشواری دیکھی تو بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں کچھ مدد کروں؟"

"یہ مجھے آتا ہے۔ آرتھوپیڈسٹ نے سکھایا تھا۔" اس نے شرمندگی سے آنکھیں چرائیں۔ وہ آہستہ سے مسکرا دی اور کپ میں چینی گھول کر وہیں چھوڑ آئی۔

"ہٹیں۔ بیٹھیں ادھر۔" اس نے اس کے ہاتھ سے بریس تھاما اور اسٹول کی جانب اشارہ کیا۔ رابح بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے سنجیدگی سے ٹھوڑی اس طرف کی۔ بیٹھو!

وہ فوراً نشست ہو گیا۔ سفید بٹن شرٹ کی آستینیں ایسی ہی کھلی تھیں، استری شدہ کڑک سیاہ پینٹس ٹخنوں سے اوپر نفاست سے مڑیں تھیں۔ بھورے بال پیچھے بنے تھے اور گلابی، نرم گال کٹ اور نشانات پر لگائی کریم کی وجہ سے چمک رہے تھے۔

"زخم دکھائیں۔" اس نے نرمی سے درخواست کی۔

"کیا کرو گی؟" رابح کہے بنا نہ رہ سکا۔ ظبیہ نے اسے واضح طور پر گھورا تو وہ مسکرا کر اپنی آستین اوپر کرنے لگا۔

وہاں کی جلد سرخی میں دھیمی پڑ گئی تھی لیکن سوجن اب بھی ظاہر تھی۔ چوٹ کا رنگ بدل رہا تھا اگرچے جنبش میں اب بھی دقت پیش آتی تھی۔ ظبیہ نے اس کا ہاتھ آگے پیچھے کیا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگا اس سب کے دوران؟" اس نے اس کا بازو درمیانی اونچائی پر تھاما اور گل پٹی کو اس کے متعلق جمایا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رابح نے آنکھیں موڑیں۔ نازک ہیزل نور سورج کی روشنی میں بھورا دمک رہا تھا۔ لب خشک تھے اور زبان لوہا۔ ظبیہ نے پٹی اس کے اثر انداز ہاتھ کے گرد گھمائی، اس کی کہنی اور ہاتھ کو ہوا میں تحلیل رکھا۔

"اب لگ رہا ہے۔"

خاموش اعتراف۔ ظبیہ کے ہاتھ رکے، دل تیز رفتار تھا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ گرم ہونے لگا تو اس نے ٹھوڑی نیچے کی اور جلدی جلدی اس کے اسٹریپ باندھنا شروع کیے۔ کلائی سے کندھے تک۔

پٹی کس کر وہ پیچھے ہوئی تو اس نے کندھا ہلا کر اپنی نقل و حرکت چیک کی اور کرسی سے کھڑا ہوا۔ ظبیہ نے چائے اس کی جانب سرکائی۔ خالہ اب کال ختم کر کے واپس آ رہی تھیں۔ وہ کپ لینے آگے جھکا تو ظبیہ وہیں کھڑی رہی۔

"میں انتظار کر رہی ہوں، رابح۔۔۔" مجہول الفاظ، التماس سے لیس۔ سامنے کھڑے مرد کا ہاتھ پرچ پر رکا۔ ظبیہ نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ وہ بدل چکی تھیں، خوف اور دہشت سے سرخ۔

اس کی زبان اس کے حلق میں تنگ ہوئی، ہاتھ میں بے اختیار کپکپی طاری ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دے پاتا خالہ واپس آ چکی تھیں۔

ظبیہ اس سے دور ہوئی اور ڈبا کھول کر سینڈوچ پلیٹ میں نکالنے لگی۔ خالہ اس سے آ کر کچھ کہنے لگیں تو وہ مسکرا دی، آنکھیں پھر نرم ہو گئیں۔ لیکن وہ بھول نہ سکا۔ وہ الفاظ، وہ لمحہ، وہ آنکھیں۔

اگلے پانچ سال میں وہ انھیں یاد کرے گا۔

★★★

وہ جوہان کے ساتھ ٹویوٹا اٹلس سے اترا تو کیمروں کا ہجوم اس کے منہ پر تھا۔ مختلف چینلوں کے رپورٹر کرم شب تاپ کے چھتے کی مانند سوال کے پل باندھتے اس تک آن پہنچے تھے۔ اس نے واکر کا سہارہ لیا اور جوہان نے احتیاط سے اسے اپنے ساتھ کھڑا کیا۔ کیمروں کی میکانکی کلک ہر سو بلند تھی، پس منظر میں ازروئے شک کی گئی سرگوشیاں اس کے اندر تک آگ جھلسا رہی تھیں۔

"پائلٹ۔۔۔"

"قاتل۔۔۔"

"شیطان۔۔۔"

جوہان مائک کو اس کے منہ سے پیچھے ہٹاتا جا رہا تھا۔ وہ بھی اپنے مخصوص سفید سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا، لیکن رابح کی طرح چہرے پر برسوں کی تکان نہیں تھی۔

"آپ نے اپنی بہن کا قتل کیوں کیا؟" ایک نسوانی آواز اس کے برابر چلتی جا رہی تھی، نیلا پیلے لوگو والا مائک اس کے ہونٹوں پر تھا۔ اس نے ضبط سے دانت کسے۔ جوہان نے اس کی بے چینی بھانپی تو رپورٹر کو سنجیدگی سے باز رکھنا چاہا۔

"Show some professionalism."

پیشہ ورانہ رویہ اختیار کیجئے۔

وہ اس کی ڈانٹ کو نظر انداز کرتے ایک اور قدم آگے بڑھی اور مائک رابح کے منہ پر گھسایا۔ اسے اپنے چاروں طرف سیلاب بہتا محسوس ہوا۔ کیمرے، مائک، شور، آوازیں، دنیا کی نظروں میں دیکھے جانے کا وہ رستا ہوا خوف۔

"لوگوں کا کہنا ہے کہ فیول لیکیج میں آپ کا ہاتھ تھا، فرسٹ آفیسر آدم۔ اس بارے میں کیا کمنٹ دینا چاہتے ہیں آپ؟"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

شکل پر بیزاری کے باوجود اس نے ترتیب شدہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس کا جواب میں پریس کانفرنس میں دوں گا۔"

ایچ ایکس سی (HXC) گرینڈ بال روم میں بلند و بالا ہوائی جھاڑ سنہری روشنیوں میں کھل رہا تھے۔ ہوا میں قوی پیش بندی گھلی تھی اور ایئر کنڈیشنر کے ٹھنڈے جھونکے پوڈیم پر لگے تازہ کٹے پھول اڑا رہے تھے۔ نرم گدوں والی کرسیاں قطار در قطار ہال کی وسعت گھیرے ہوئی تھیں۔ جرنلسٹس، لیگل نمائندے اور دل سے تجسس رکھنے والی روحیں جیسے کسی تیوہار کی آس میں تیار بیٹھے تھے۔

سخت لکڑی کا بنا مہونگنی رنگا پوڈیم ہوٹیل کے سنہرے لوگو سے دمک رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی ائیر لائن کا سربراہ کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ استری شدہ سوٹ اور چمکتا بالوں سے خالی سر، چھوٹی بھوری آنکھیں اپنے سامنے لشکر پر تھیں۔ آج تو منیب احکام نے شیو بھی کی تھی۔

رپورٹران کی تعزیت کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے گردن کے پٹھے اکڑا رہے تھے، کیمروں کی ہلچل بلند تھی۔ ہلکی سورج کی روشنی پردوں کر درمیان سے چھن کر وال پیپر پر نقشے کھینچ رہی تھی۔

منیب احکام اپنی بات پوری کر کے دو پل رکے اور سانس متوازن کی، کیمروں کی میکانکی گنگناہٹ اس دوران پیک پر تھی۔

"مشتہر ہوئی افواہوں اور قیاسات پر روشنی ڈالنے میں فرسٹ آفیسر رانج آدم کو بلانا چاہوں گا۔" انہوں نے پیچھے مڑ کر تھری پیس سوٹ میں ملبوس نوجوان کو دیکھا۔ "رانج، اپنی براہِ راست تفصیلات آپ میڈیا سے شیئر کریں۔"

وہ خاموشی سے چل کر اسٹیج کے بیچ پہنچا۔ اس کے جوتوں کی ایڑھیاں واکر کے پوچ سمیت چکنے فرش پر ٹھوکر کھا رہی تھیں۔ تصویروں اور ویڈیو کی آندھی یکایک اور قوی ہوئی۔ کیمرا مین نے زوم اس کے چہرے پر مرکوز کیا۔

"تھینک یو۔" اس نے مستحکم لہجے میں شروعات کی۔ "اولاً، میری تمام ہمدردیاں شہداء کی اہلِ خانہ کے ساتھ ہیں۔ نہ صرف ایک پائلٹ، میں آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کے حیثیت سے کھڑا ہوں جو ضائع ہونے والی ہر زندگی کا بوجھ محسوس کرتا ہے، خاص کر میری بہن اور بھانجی۔"

وہ سانس لینے رکا۔ ماہر ہاتھوں کی اٹل انگلیوں میں آج کپکپاہٹ تھی۔

"میں ساری قیاس آرائیوں سے آگاہ ہوں۔ ذاتی تنازعات کے حوالے سے کی گئی دل بازیاں۔ اینڈ لیٹ می بی کلئیر: اپنے مسافرین کی سلامتی میرے لیے ہمیشہ غیر مشروط رہی ہے۔" لمحہ بھر کر وقفہ لے کر آواز

ساکن رکھی۔ بھنوؤں کا ایک کونہ تنا تھا۔ "یہ سوچ کہ ذاتی تنازعات میرا فرض مجھے بھلا دیں گے، میری ڈیوٹی پر اثر ڈالیں گے، یہ میری تذلیل ہی نہیں بلکہ سچائی کے خلاف زیاں کاری ہے۔"

کمرے کے چوگرد الزام اور دفاع کی بساط بچھی تھی۔ سپید چہرے ہر فلیش لائٹس چمک ڈال رہی تھیں۔ اس کے پیچھے کھڑے باقی ایئر لائن آفیشلز بھی اس کا ہر لفظ غور سے سن رہے تھے۔ ان کے ساتھ کھڑا جوہان خیال سے بھاری نگاہ لیے اسے تک رہا تھا۔

"میری بہن اور بھانجی اس پلین میں تھے۔۔۔" آواز کی سختی ایک کونے سے چیخ رہی تھی۔ "ان کا نقصان میرے لیے ناقابلِ بیان ہے۔" کیمرہ اس کے چہرے پر گول ہوا۔ جرنلسٹس نے بہت کچھ اپنے کاغذات پر اتارا۔

"مجھے اپنی بہن عزیز تھی۔ اس کی بیٹی میری جان تھی۔ یہ الزامات صرف بے بنیاد ہی نہیں بلکہ میرے لیے اذیت رساں ہیں۔"

کمرے کا سکوت چند لمحات قائم رہا۔ رابح نے انگوٹھے کی پشت سے ناک کی ہڈی دبائی۔ پٹی میں قید بازو سن پڑ رہا تھا۔ رپورٹرز نے اپنے سوالات کا آغاز کیا۔ وہ ہر چیز ٹھہر ٹھہر کر بتاتا رہا۔ کچھ کے رویے اوروں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ اس نے خود پر جبر کیا۔ سچ کی راہ کانٹوں کی باڑ ہوتی ہے۔

جب وہ اے ٹی سی کی خرابی سے انھیں آگاہ کر رہا تھا، تب ہی کمرے کے ماحول میں یکایک بدل آیا۔ پہلے وہ صرف ٹھٹکا، زبان خاموش ہوئی۔ سب ایک ساتھ۔ اس نے دوبارہ بات وہیں سے جوڑنا چاہی جب دوپٹ والا عالیشان دروازہ دھکیلتے روتے پیٹتے لوگوں کا لشکر اندر آن گرا۔

اس کی ابرو اوپر اٹھے، آنکھیں شاک سے فراخ تھیں۔

وہ مظلوم کے اہل و عیال تھے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، آدمی۔ ہر عمر، ہر قومیت کے۔ ان میں صرف دو چیزیں سانجھی تھی۔ اپنوں کو کھو دینے کا رنج اور رابح آدم کے لیے ابلتی نفرت۔ وہ بے اختیار پیچھے ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں بینرز تھے اور گالوں پر آنسو۔ وہ چیخ رہے تھے، چنگھاڑ رہے تھے۔

"رابح آدم نے میری بیٹی مار دی!"

"اس نے میرا بھائی مجھ سے چھین لیا!"

"رابح آدم کیوں زندہ ہے اگر میرا خاندان نہیں!؟"

سیکیورٹی انھیں قابو کرنے کی کمر توڑ کوشش کر رہی تھی لیکن وہ حد سے زیادہ تھے۔ دو سو تین سو لوگوں کا لشکر جو اسے تباہ کرنے نکل آئے تھے۔ ان کے دل سخت نہیں، سنگ تھے۔ رابح نے پوڈیم سے ہاتھ ہٹائے۔ وہ بے نور آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ رپورٹرز اب گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے، کیمروں نے بھی اپنے رخ موڑ لیے تھے۔

ایک ماں رو رہی تھی، اس کے بال کھلے تھے اور گال سرخ پھولے تھے۔ ایک باپ اپنا سینا پیٹ رہا تھا۔ ایک بھائی میڈیا کہ آگے فون پر اپنی بہن کی تصاویر دکھا رہا تھا۔ ایک شوہر اپنے بلکتے بچے چپ کروا رہا تھا۔ وہ سب مظلوم تھے۔ ان سب نے اپنا کوئی بہت عزیز کھویا تھا۔ اس کی طرح۔ وہ اس جیسے تھے، انھیں ہی اس کا غم سمجھ آنا چاہیے تھا۔

لیکن افسوس۔ رابح آدم ان کا ساتھی نہیں، ان کے خواب اور مستقبل کچل دینے والا ہاتھی تھا۔ اس کی سانسیں انھیں چبھتی تھیں، اس کی زندگی انھیں خود پر حملہ لگتی تھی۔ وہ جی رہا تھا، ان سب کے دل مار کر، روحیں چھین کر بھی زندہ تھا۔

وہ اپنے ٹرانس سے تب جاگا جب ایک ثابت انڈا اس کے سینے سے لگ کر ٹوٹا اور اس کا سیاہ کوٹ زرد رنگ گیا۔ اس نے نیچے دیکھا۔ ایک اور انڈا اچھالا گیا جو اس کے دوسرے کندھے سے ٹکرایا۔

"ماتی!" مرو۔

ایک پانی کی بوتل اس کے منہ پر پھینکی گئی۔ وہ بگڑ کر ترچھا ہوا، سنبھلنے کے لیے پوڈیم کا سہارہ لیا۔

"ماتی!" مرو۔

اس بار پھینکی گئی پانی کی بوتل ہوا میں ہی پھٹ گئی۔ اسپرٹزر کا ٹھنڈا پانی اس کے منہ پر لہروں کی صورت پڑا۔

"ماتی!" مرو۔

سب اس کے آس پاس جما تھے۔ دو تین سیکیورٹی گارڈز اسے اسٹیج سے نیچے اتار رہے تھے۔ منیب احکام کے تاثرات بگڑے تھے، جو ہان پریس کو مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ سب خراب ہو گیا تھا۔ رانج آدم جہاں قدم رکھتا وہ جگہ پر نقص کیوں ہو جاتی؟

اس کا جسم بھاری تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے آس پاس دیکھتا رہا، منہ میں قید زبان پتھر کی ہو چکی تھی۔ آخری سیڑھی سے اترتے آفیشلز اسے بیک روم لے کر جا رہے تھے جہاں سے خارجی دروازہ تھا۔ اس کے کانوں میں پانی تھا۔ بحر ہند کا پانی۔ اس کے کانوں میں چیخیں تھیں۔ تین سو پچاس مقتولین کی چیخیں۔ اس کی ہستی پر الزام تھا۔ ہزاروں لوگوں کے خاندان ہڑپنے کا الزام۔

دنیا بھول چکی تھی کہ رانج آدم بھی ایک وکٹم تھا۔ دنیا سے بڑھ کر، وہ خود بھول چکا تھا۔

★★★

تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل کے اس بنگلے میں خاموشی طاری تھی۔ عرصہ ہوا تھا یہاں کا شور چھٹ چکا تھا۔ لاؤنگ روم میں لگے تچ اسکرین ایل ای ڈی ٹیلیوژن پر نو سے دس کا ڈرامہ چل رہا تھا۔ ڈھیروں میک اپ لگائی عورتیں اور ان کے ساتھ کھڑے چوڑے خوبرو اداکار اپنے رول میں مگن تھے۔

ان کے منہ حرکت میں تھے لیکن آوازیں دبی تھیں۔ گھر کے رہائشی نے وولیوم زیرو جو کیا ہوا تھا۔ نشست گاہ کا قالین نرم بھورے اور زرد کے درمیان کسی زندہ دل رنگ کا تھا۔ اس پر گاڑھے سرخ سردا کے پھول چھپے تھے۔ ان ہی کے درمیان وہ بیٹھا تھا۔ سیاہ جینز اور نیوی بلو پوری آستینوں والی شرٹ میں۔ اس کے گھٹنے سینے سے ٹکے تھے اور بازو ان کے چوگرد بندھے تھے۔

چہرہ ڈھلکا ہوا تھا اور گھنی پلکیں نیم دراز آنکھوں پر بچھی تھیں۔ وہ انگلیوں کی پوروں سے اپنے پیر کے ناخن کو چھو رہا تھا۔ گھر میں چھایا سکوت اس کا سانس روک رہا تھا۔

"Rabeh Adam ni macam syaitan lah!"

"رابح آدم زي الشيطان!"

"Rabeh Adam is a demon!"

"رابح آدم ایک شیطان ہے!"

اس نے بے اختیار اپنے کان ہاتھوں سے چھپائے۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے، سانس ٹوٹ ٹوٹ کر آزاد تھی۔ گھٹنے اور سختی سے آپس میں ملے۔ پریس کانفرنس میں کہا گیا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں تراش چکا تھا۔

اس کا سر پھٹ رہا تھا، دل دکھ رہا تھا۔ دنیا اسے خون میں رنگ چکی تھی۔ اپنے آپ کو صریح ثابت کرنے کی حتمی کوشش بھی دم توڑ گئی تھی۔ کیا وہ ایسا ہی رہے گا؟ کیا اسے تاریخ میں ایسے ہی حفظ کیا جائے گا؟ بہن کا دشمن، تین سو پچاس لوگوں کا قاتل۔ دماغی مریض رابح آدم جو اپنی چھ سالہ بھانجی کو بھگوس گیا۔ پیسوں کا لالچی، خونی عداوت میں ہر حد سے تجاوز کر جانے والا درندہ۔

"ابی، ابی، ابی۔"

بیس سالہ رانج اپنے اسٹڈی میں بیٹھا فائنل پرچاجات کی تیاریوں میں جٹا تھا۔ ایک ٹانگ کرسی پر اوپر رکھی تھی اور ایک لمبی کی ہوئی گھومنے والی کرسی آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ گود میں رکھے طیر برقیات (avionics) کے نوٹس ہرے رنگے ہائی لائٹر میں چمک رہے تھے۔ اسے تو دیکھ کر ہی آنکھوں سے پانی نکل آئے۔ وہ پڑھ کیسے رہا تھا؟

"بعد میں کھالوں گا۔ ابھی پڑھ رہا ہوں۔" اس نے ایک سطر کے نیچے لکیر کھینچی اور پینسل کا ربڑ اپنے دانتوں کے بیچ دبایا۔

"اوہو، تمھیں کھانے کا نوتا دینے کون آیا ہے؟" رباب جلدی جلدی اس کے کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی۔ اس نے گڑبڑا کر اوپر دیکھا۔

"کیا ہو کر رہ گیا؟"

"قسم سے اماں والی ٹرمینولوجی استعمال کرتے ہو تم۔ عورت لگتے ہو پوری۔" وہ اس کے سامنے سادی لکڑی والی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ وہ ہنس دیا اور چہرہ ترچھا کر کے اپنے بہن کو دیکھنے لگا۔

"مرچیں زیادہ تھیں کیا کھانے میں؟" اس نے محظوظ ہوتے اسے چڑھایا۔ رباب نے گھیر والی شلوار پہنی ٹانگیں اوپر رکھیں اور بال پیچھے ہٹائے۔ سفید باجو کرتا اس کے اوپر نچ رہا تھا۔

"تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" وہ آگے جھکی۔ رانج نے 'ھمم' کہتے کتابیں ادھر اُدھر کریں۔ رباب چڑ کر اس کے پاس مڑی اور ایک بار میں ہی اس کے سارے کاغذات اکھٹے کر کے دور رکھے۔

"مجھے دیکھو! صرف مجھے۔"

رانج نے گہری سانس لیتے مسکان دبائی اور کرسی گھما کر اسے دیکھا۔ ٹھوڑی کے نیچے مٹھیاں جمی تھیں۔

"حکم، جناب اعلیٰ۔"

رباب نے جھجکتے ہوئے اپنے دامن سے کھیلا۔ "وہ۔۔۔ میں آفیس جاتی ہوں نا۔"

"گھر سے تو یہی کہہ کر نکلتی ہیں۔"

"میں نے تمھیں چانٹا مارنا ہے! چپ کر کے سنو میری بات، رائج ابی آدم!"

وہ تھک کر ہنس پڑا اور انگوٹھے سے ناک مسلی۔ "اوکے، سوری سوری۔ چلیں، بولیں۔"

"میرے آفیس میں۔۔۔ آئی مین یونیورسٹی سے ہی جانتی ہوں میں تو لیکن۔" اس نے زبان سے ہونٹ گیلے کیے۔ "ایک لڑکا ہے۔ وہ۔۔۔ مطلب، وہ فائنانس سنبھالتا ہے۔"

رائج نے آنکھیں بڑی کیں۔ "کہیں، کہیں۔"

رباب کے گال ٹماٹر جیسے سرخ ہوئے۔ "ام۔۔۔ اس کا نام مرتضیٰ عباس ہے۔ وہ بہت اچھا ہے، مطلب اتنا اچھا بھی نہیں۔ کافی بونگا سا ہے۔ گرم کافی ٹھنڈی کر کے پیتا ہے۔ آئی مین، رئیلی؟ اس سے بونگا ہو سکتا ہے کوئی؟"

رائج نے اپنی تیوری کھجائی۔ "آئی ڈونٹ نو۔ آپ بتائیں۔"

رباب کا دل کیا فرش کھود کر اندر دفن ہو جائے۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ مطلب، فوراً نہیں ہوا کچھ۔ میں اسے پانچ سالوں سے جانتی ہوں۔ ایسے ہی باتوں باتوں میں۔"

"کیا آپ کو مرتضیٰ عباس پسند ہے، آپا؟"

رباب کا جبڑا فرش سے جا لگا، آنکھیں پوری کھل گئیں کہ سارا کمرہ اپنے اندر سمو لیں۔ رائج نے اس چار سیکنڈ کے وقفہ کے جی بھر کر حظ اُٹھائے۔ ابرو اوپر کرتے اس نے اپنی بہن کو چیلنج کیا۔

"بتائیں۔"

اور قبل پاسخگویی ہی اس کے منہ پر روئی کا تکیہ اچھال دیا گیا تھا۔ رباب اس کے گدے میں چہرہ چھپائے چیخ رہی تھی، البتہ اس کے الفاظ تھے کسی غیر ذالک بھاشا کے۔

رائج خوش دلی سے ہنس دیا۔ "کیوٹ۔" اپنے نوٹس واپس کھولتے اس نے پینسل پیچ سے اٹھائی۔

"بھاگے گا تو نہیں ناں؟"

رباب سیدھی ہوئی اور ہونٹ کاٹتے اسے دیکھا۔ پھر اس نے چہرہ ہلکے سے نفی میں ہلایا۔ رابح نے ٹھہر کر اس کی شکل دیکھی پھر کیلکولیٹر سامنے رکھا اور سیٹ میں آگے جھکا۔

"دو چیپٹر رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ڈیٹیلز پلیز۔"

اس نے ہتھیلی اپنے گال پر رگڑی جہاں آنسو دراڑیں پیدا کر رہے تھے۔ اس گھر کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا وہ اتنا نازک، اتنا کمزور لگتا تھا۔ اس کی ساری کامیابیاں دم توڑ گئی تھیں۔ رابح آدم یہ، رابح آدم وہ۔ رابح آدم ایسا، رابح آدم ویسا۔

کون تھا رابح آدم؟

ایک معمہ، ایک معجزہ، ایک حادثہ۔

اس کے ساتھ قالین پر اوندھا پڑا اس کا فون تھر تھرا رہا تھا۔ زوں زوں کی آواز ساکت بیٹھک میں وزنی ہتھوڑوں کے مقابل تھی۔ اس نے پسینے میں شرابور انگلیوں کی مدد سے فون پلٹا۔ ظبیہ کالنگ۔ اور وہیں اس کی بچی کچی آس بھی بھاپ بن گئی۔ وہ کیا جواب دے گا؟ وہ کس منہ سے یہ رشتہ بچائے گا؟ اس نے آج صبح اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس امید میں کہ وہ سب صحیح کر لے گا۔

اس نے فون کے کنارے بنا بٹن دبایا۔ فون خاموش ہو گیا۔ ظبیہ خاموش ہو گئی۔ اس نے صوفے سے سر ٹکرایا۔ بھوک، پیاس، درد، نیند، تفاوت رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ آنکھیں خودکارانہ طور پر بند ہونے لگیں۔ اس کا آپ بھی خاموش ہو گیا۔

★★★

گھنٹی بج کر تھک گئی اور فون کٹ گیا۔ ظبیہ نے ریسیور دور رکھا۔ بھوری آنکھیں ساکت تھی لیکن ان میں چمکتی دکھ کی لہریں نمایاں۔ کچن کے چھوٹے بلب کو چھوڑ کر صحن میں اندھیرا چھایا تھا۔ ابا ہمیشہ کی طرح باہر

نکلے ہوئے تھے۔ کہاں گئے، کیوں گئے، کب آئیں گے، نہ ہی اسے سوال کرنے کا حق تھا اور سچ کہے تو، نہ ہی شوق۔

وہ خاموش قدموں سے چل کر کھڑکی تک آئی۔ شیشے کے پار رات گھنی تھی۔ دسمبر آنے والا تھا۔ اس نے بازوؤں کے اطراف میں ہاتھ لپیٹتے آسمان کو دیکھا۔ ننھے تارے سیاہ غالیچے پر دمک رہے تھے۔ اچانک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کھڑکی کے پٹ سے ٹکرایا تو کڑکڑ کی آواز گھر میں سنائی دی۔ وہ آگے جھکی اور کہنیاں سیمنٹ کی سل پر سجائیں۔

اسے آج صبح یاد آئی، جب گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اس کا باپ اس بڑے عمر کے آدمی کو خوش آمدید کہتا اندر بلا رہا تھا۔ اتنی مان اور عزت دیتا تھا اس کا باپ اس مرد کو۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ اسے ہی کیوں؟ کبھی رابح کو کیوں اس طرح قبول نہیں کیا تھا انہوں نے؟

اسے اس مرد کی گہری نظریں یاد آئیں، بھرکم اور حاکمیت سے بھرپور آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

چائے کے لیے ظبیہ نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے چہرہ ترچھا کرتے جان بوجھ کے اس کے بند انگشت سے اپنی انگلیاں ٹکرائی تھیں۔ وہ ٹھٹک کر رکی اور بمشکل آنسوؤں پر جبر کرتے اپنے باپ کو دیکھا۔ انہوں نے ایک کمزور سی ہنسی باہر نکالی اور فوراً موضوع تبدیل کر دیا۔

وہ لمحہ چلا گیا، لیکن اس کا غم بڑھ گیا۔

اس نے چہرہ جھکاتے اپنے چوہتی انگلی کو دیکھا۔ وہاں کی نرم بھوری جلد خالی تھی۔ بے جا طور پر دوسری ہاتھ کی انگلی سے گوشت کو چھونا شروع کیا تو ایک غیر معنیٰ خیز مسکراہٹ اس کے لبوں کے کنارے چھو گزری۔

"اب میں راستہ بھی نہیں ڈھونڈتا، ظبیہ۔ مجھے پتا ہے میرا آخر تم ہو۔"

شامیں بیت چکی تھیں، مسکراہٹیں فنا ہو گئیں تھیں۔ چھت پر کھڑے نفوس اب کہیں نہ تھے۔ دو ہفتہ پہلے کا وہ خیال کسی مووی کا سین لگتا تھا۔ اس نے کھڑکی آہستگی سے بند کی اور کمرے کی طرف جانے مڑ گئی۔

ایک اور رات وہ بے آسرا سوئے گی۔

★★★

دروازے کی بیل چنگھاڑ رہی تھی۔

سورج کی تپتی شعاعیں اس کے گال کی ایک طرف گرمی برسا رہی تھیں۔ وہ قالین پر اوندھا ہوا لیٹا تھا، تکیے کے پھول اس کے جلد پر سرخ نشانوں کی صورت چھپ چکے تھے۔ اس نے بازو کے بل خود کو بٹھایا اور نیند میں پلکیں جھپکیں۔

صبح ہو گئی تھی؟

اس نے جھنجھلاہٹ سے چہرہ مسلا اور ساتھ گرا اوا کر اٹھایا۔ صوفے کے سہارے کھڑے ہو کر وہ ٹیڑھے میڑھے کپڑے پہنے چوکھٹ تک پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹک کر کھلا تو سامنے کھڑی شکل دیکھ کر اس کا دل کیا وہیں دوبارہ بند کر دے۔

سامنے جو ہان کھڑا تھا، سرمئی ٹریک پینٹس اور سفید سوئٹ شرٹ میں ملبوس۔ کانوں میں ہینڈ فری لگے تھے اور گلے میں اس کی تار۔ اس کا سانس چڑھا تھا اور ہاتھوں میں پلاسٹک کی تھیلی تھی۔

اس نے ایک ترچھی مسکان سے اسے دیکھا۔ "امید کرتا ہوں تم نے ناشتہ نہیں کیا ہو گا۔"

"یہ کورٹ نہیں۔"

"اتوار کو میں کورٹ جاتا بھی نہیں۔"

رانج نے ابرو اونچی کر کے آنکھیں بڑی کھولیں، خود کو ہوش میں رہنے پر مجبور کیا۔ "کیوں آئے ہو میرے گھر؟" اس کا سوال سیدھا تھا، سو وہ جواب بھی سیدھا چاہتا تھا۔

"میرا دل کیا ہم ناشتہ ساتھ کریں۔" وہ اس کی دروازے کے ساتھ دیوار پر ایک بازو ٹکاتے تکان سے بولا۔ ہینڈ فری اب اس کی گردن میں ڈلے تھے۔

"مسٹر حاضر میں آپ سے اتنا فرینک نہیں۔"

"مسٹر آدم کیا آپ کو کروسنٹ پسند نہیں؟"

"کیا؟" رانج نے چڑ کر کہا۔

جوہان نے ایک گہری سانس لی اور دو قدم پیچھے ہوا۔ اب کہ اس کا اندازہ تھوڑا سنجیدہ تھا۔ "میں کل کے بعد سے شرمندہ ہوں البتہ جو ہوا اس میں کسی کی غلطی نہیں۔ پریس کانفرنس خراب ہو گئی اور تمھیں اس طرح جانا پڑا۔ مجھے لگا تمھیں اکیلے چھوڑنا درست نہیں ہو گا۔ کہیں تم۔"

"کہیں میں خود کو مار نہ دوں۔" اس نے تلخی سے فقرہ مکمل کیا۔ "فکر مت کرو۔ پینتیس ہزار فٹ سے گر کر بھی تمھارے سامنے کھڑا ہوں۔ میں رج کے منحوس ہوں۔"

"اکیلے رہتے ہو تم؟" جوہان نے آس پاس دیکھتے پوچھا۔

"اٹھارہ نومبر کے بعد سے۔" اس کا بھی میٹر شاٹ ہو گیا تھا۔ وکیل مسکرا دیا۔ "ٹھیک ہے۔ تمھیں کمپنی سے مسلہ ہے۔ میرا ناشتہ قبول کر لو۔ میں چلا جاتا ہوں۔"

"تمھیں میرا پتہ ملا کیسے؟" اس نے تنے تاثرات کے ساتھ استفسار کیا۔ جوہان نے پسینے سے ترماتھا آستین سے صاف کیا۔ "ایسے ہی تو اپنے ذرائع عام نہیں کر سکتا۔ وکیل ہوں۔"

"تمھارے کورسس میں 'stalking' بھی شامل ہوتا ہے کیا؟"

جوہان ہنس دیا۔

"سورج کٹھور ہے اور تم نردئی۔ ناشتہ یہاں چھوڑ رہا ہوں، کھا لینا۔ فارغ ہو تو پولیس اسٹیشن چکر لگانا۔ اٹوپسی کے لیے باڈیز جانا شروع ہو گئی ہیں۔"

وہ سیدھا ہوا، اچانک جسم میں کرنٹ دوڑا۔ "کیا اس سے کچھ ثابت ہو گا؟" اس نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔ وقت لگے گا۔ باڈی کاؤنٹ تین سو پچاس ہے اور میڈیکل ٹیمز گنتی کی۔ یہ کیس ہائی پروفائل بن چکا ہے۔ میڈیا کی چھان بین عروج پر ہے۔"

رانج نے لب کاٹے۔ گزری ہوئی شام اس کی آنکھوں کے سامنے چکر کاٹنے لگی۔

"ماتي! ماتي! ماتي!"

"رانج۔" اس کے سامنے چٹکی بجاتے جوہان نے اسے پکارا۔ وہ سنبھل کر سیدھا ہوا۔

"تمھیں ایک خبر دینی تھی۔"

اس نے خاموش رہ کر اسے آگے بولنے کا اشارہ کیا۔ جوہان نے ٹھوڑی آڑی کی اور ایک پل کے لیے نظریں چھپائیں۔

"تمھارے بہنوئی نے بھی اٹوپسی کے لیے دستخط کیے ہیں۔"

★★★

عباس قصر کے وسیع و عریض لان کو پھلانگ کر سیمنٹ کی پتلی سفید پٹڑی کے دونوں اطراف موتیا کے پھول اگے تھے۔ خوب سیرت سگھند نتھنوں سے گزرتی دماغ تک اثر کر جاتی۔ آسمان میں نیلے بادلوں کے سائے میں مغرب کا گلابی نور بکھرا تھا، سورج دور کوالالمپور کے اسکائے اسکریپرز کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔

سفید پلیٹڈ پینٹس اور سیاہ آدھی آستینوں کی ٹی شرٹ میں اس کی کسرتی ڈھال صاف نمایاں تھی۔ سیدھا ہاتھ بریس میں قید تھا، اور وہ قدم قدم واکر اپنے ساتھ چلاتا اس تنگ راہ کو پار کرتا مین دروازے تک جا رہا تھا۔ اچانک لان کی دوسری طرف سے ایک ننھا وجود اس کے جوتوں کی سمت دوڑا۔ وہ چونک کر ٹھہر گیا اور 'ووڈی' کو اپنے ٹمبر لینڈ پر آکر جھکتے دیکھا۔ ووڈی مرتضیٰ کے گھر والوں کا خاندانی پومرانیان کتا تھا۔

وہ مسلسل بھونک رہا تھا، اس کے ہونٹ اسی طرح کھلے تھے جسے رباب اس کا 'اسمائلنگ فیس' کہا کرتی تھی۔ اپنی ناک اس کی ایڑھیوں سے رگڑ کر وہ رابح کے ارد گرد اچھلنے لگا۔

وہ ہنس دیا، گال کا چاند نکھر کر سامنے آیا۔

"اوہ، ووڈی!" وہ جھک کر اسے سہلانا چاہتا تھا لیکن اس کا ڈاکٹر پہلے ہی اسے ڈانٹ لگا چکا تھا۔ وہ بالکل آرام نہیں کر رہا تھا اسی لیے اس کی ٹانگ کی ریکوری بہت آہستگی سے سرانجام ہو رہی تھی۔

"ووڈی؟" اس کے پیچھے کسی نے دہرایا۔ اس نے بے اختیار اپنا طرز سدھارا، دل نے سینے کے حدود میں جنگ شروع کی۔

وہ آہستہ سے پیچھے گھوما تو مرتضیٰ اس کے سامنے تھا، بھنویں سکیڑے، ہونٹ بھینچے۔ سیاہ فریمز، بکھرے ہوئے بال اور بڑی شیو۔ سیفد کرتے کی شکنیں نمایاں تھیں اور آنکھوں کی نیچے گڈھے سیاہ۔ رابح کا دل بیچ سے آدھا ہوا۔

"سلام، بھائی۔"

ووڈی اب بھی ان کے درمیان کود رہا تھا، مسکراتا، دم ہلاتا۔ مرتضیٰ نے پلکیں نیچی کرتے سانس بحال کی، جواب پھر بھی نہیں دیا۔ رابح نے اپنی بے چینی مسکراہٹ میں تبدیل کی۔

"بھائی میں نے سلام کیا ہے۔"

"جانتا ہوں۔" سفید کرتے والے مرد کے نگاہیں تیر تھیں جو پل بھر میں اس کی روح کے آر پار ہو گئیں۔

"میں جواب نہیں دینا چاہتا۔ مجھے نہیں لگتا تمھیں سلامت رہنا چاہیے۔"

ایک کوا ان کے سروں سے گذرا۔ دور اذان اپنے آخری کلمات پر تھی۔ ووڈی بھی پلٹ کر اندر دوڑ گیا۔ رابح نے ٹھہر کر ہوا اندر کھینچی۔

"آپ کو واقعی لگتا ہے میں نے۔۔۔؟"

مرتضیٰ نے اس کی شکل دیکھی اور پھر اس کے ہونٹوں کے کنارے اوپر اٹھے، اور جلد ہی وہ ہنس رہا تھا۔

"مجھے لگتا؟" اس نے ہتھیلی سے منہ چھپاتے پوچھا۔ "او، مجھے لگا تو بہت پہلے تھا، رائج۔ اب تو بس اعتماد ہوا ہے۔"

سیاہ ٹی شرٹ والے مرد کا اضطراب قابلِ لمس تھا۔ "آپ کو میں ایسا لگتا ہوں؟ میڈیا جھوٹ بول رہا ہے، بھائی۔ لوگوں کو بس ایک scapegoat چاہیے ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔"

مرتضیٰ نے نظریں پھیریں۔

"آپ تو جانتے ہیں میں آپا اور ادا سے کتنا مانوس تھا۔ وہ دونوں میرے لیے۔۔۔" آنسو، گرم آنسو اس کا حلق کس رہے تھے۔

"میں جانتا تھا۔ رباب تم پر کتنا بھروسہ کرتی تھی۔" اس کے ہاتھ پیچھے بندھے تھے اور چہرے کا تاثر نہایت گھمبیر تھا۔ "بس اتنا پتا ہوتا کہ اس کا بھروسہ جان لیوا ثابت ہوگا، تو اسے تمھارے اتنا پاس کبھی نہ آنے دیتا۔"

"میں کیوں ماروں گا انھیں؟" کہتے اس کی سانس پھولی۔ یہ دوسری بار تھا جب وہ کسی کو الگ سے صراحت بخش رہا تھا۔ پہلی اماں تھیں۔ اماں جو اسے چھوڑ گئیں۔

مرتضیٰ چند لمحات ٹھہر کر اس کی شکل دیکھتا رہا۔ مغرب کی نرم روشنی اور چاند کی مٹتی جھڑتی نقرئی چمک اس کے چہرے پر بوند بوند نازل ہو رہی تھی۔

"میں نے خود سے وعدہ کیا تھا تمھیں آئندہ اپنے قریب نہیں آنے دوں گا، لیکن واٹ ایور اٹ ٹیکس۔" وہ کہتا مین دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رائج نے بھی راستہ ناپا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اندر آئے تو گھر تاریکی میں دوبا تھا۔ وہ مرتضیٰ عباس کی بے رنگ زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ رابح اس گھر میں کتنی بار تو آیا تھا۔ وہ نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ ادا کے دادا دادی کا گھر تھا۔ جب بھی وہ لوگ دبئی سے کوالالمپور آتے تو ادھر ہی ٹھہرتے تھے۔

مرتضیٰ نے رخ سیدھا اپنی لائبریری نما اسٹڈی کی طرف کیا تھا۔ نارنجی روشنی لکڑی کے اونچے شیلفوں پر امڈتی گئی اور قطار در قطار کتابیں واضح ہوئیں۔ رابح بے آواز قدموں سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ مرتضیٰ کی حرکات میں پھرتی تھی۔ وہ سب نظر انداز کر کے سیدھا لمبے ڈوائڈر تک گیا اور شیشے کے پٹ کھولے۔ اکڑو بیٹھ کر وہ دراز سے کچھ نکالنے لگا۔

"آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے تھک کر پوچھا لیکن اس کے بہنوئی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلد ہی وہ سیدھا ہوا اور فائلوں کا دستہ لیے اس کی جانب پہنچا۔

"تم نے پوچھا تھا ناں کہ تم کیوں مارو گے رباب کو؟" اس نے نفرت بھرے انداز سے ایک ایک لفظ اس کے منہ پر مارا۔

"میں پوچھتا ہوں تم سے: تم کیوں نہیں مارو گے رباب کو؟" ساتھ ہی فائلز ٹیبل پر دھر دیں۔ رابح نے گڑبڑا کر اسے دیکھا اور پھر ان کاغذات کو۔ وہ آگے جھکا اور ان کے پنے پلٹنے لگا، ساتھ ہی اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

"مونٹ کیارا والا فیملی ہوم! مشترکہ بینک اکاؤنٹس! جوہر باہرو والی سیداپ حلال فوڈز شاپ! تمھارے ابا کی وراثت! میوچل انشورنس پالیسیاں!"

مرتضیٰ کا چہرہ جتنا سرخ تھا اتنی ہی سیاہ اس کی آنکھیں تھیں۔ بنجر، خالی۔ "رباب ہر جگہ تھی جہاں تم اسے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ تم کیوں نہیں مارو گے اسے؟"

"یہ سب۔۔۔ یہ سب مجھے نہیں چاہیئے۔" اس کی ہاتھ لغزش کر رہے تھے، آنکھیں گھبراہٹ سے چت تھیں۔

"چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اب ان پر صرف تمھاری مالکیت ہے۔ رباب کہیں نہیں ہے اور اس کی موت کا فائدہ صرف اور صرف تمھیں ہوا ہے، مسٹر پائلٹ۔"

"آپ مجھ سے یہ لے لیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں آپا کو چند پیسوں کے لیے ماروں۔"

"Thirty point two six million ringgit."

رابح کی سانس رکی۔

"جو آج کی تاریخ میں، آٹھ ملین نو سو اٹھارہ ہزار چھ سو چالیس US ڈالر کے مقابل ہیں۔ یہ چند پیسے نہیں ہوتے، رابح۔" کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور فائلز سمیٹنے لگا۔

"میں تم سے لوں گا، ضرور لوں گا۔ لیکن پیسے نہیں۔" سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ "تمھارا سکھ چین۔"

اس کے گال پر ایک آنسو ٹوٹ کر کانچ ہو گیا۔ مرتضیٰ نے آخری فائل بھی ڈبے میں ڈالی اور ڈھکن بند کیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"کل صبح کی ہیڈ لائنز دیکھنا مت بھولنا۔ سیلا مت تنگال۔"

وہ زمین پر پھسل گیا، گرم تپتے آنسو اس کی جلد بھگو رہے تھے۔

"خدا کا واسطہ بھائی۔ میری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

مرتضیٰ، جو پلٹنے ہی لگا تھا، ایک پل کے لیے رکا اور اس کی طرف سر پھیر کر دیکھا۔ گھٹنوں پر گرا رابح آدم آنسوؤں سے بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا واکر کنارے پڑا تھا اور بریس میں بندھا ہاتھ ہوا میں بلند تھا۔

وہ مسکرایا لیکن آنکھوں کی ویرانی قائم رہی۔

"Welcome to the club."

★★★

آئندہ چند دن سابقہ اسٹار پائلٹ کے لیے عذاب تھے۔

ٹوئٹر کا کونہ کونہ اس کا نام جانتا تھا، ہر طرح کے ہیش ٹیگ میں اسے مختلف زاویوں سے کھنگالا گیا تھا، یوٹیوب اور نیوز چینلز پر سائیکولوجسٹ اور مشہور کریمنجولوسٹ کو بلا کر رابح آدم کی مینٹل ہیلتھ کو جانچا جا رہا تھا۔ کون تھا وہ اور کیسے بنتا تھا کوئی اس جیسا؟ پیسے کی اس قدر حوس کے اپنا خون مار دیا جائے، اتنا اندھا پن کہ معصوم جانیں چلی جائیں اور آپ کا بال نا دکھے؟ انھیں اس خبر سے غرض نہ تھا کہ اب تک تفتیش کی کوئی حتمی رپورٹ یا اعلان نہیں جاری کیا گیا تھا۔ میڈیا کو ایک ولن چاہیے تھا، جس کے لیے رابح آدم کو کاسٹ کر لیا گیا تھا۔

اٹوپسی ٹیسٹنگ وقت مانگتی تھی، طیارے کا حصہ حصہ پڑھنے والے بھی ہفتوں سے بحر ہند کے پانی ناپ رہے تھے اور بلیک باکس کے لیے کیے گئے سرچ آپریشن اب تک صرف نرپھل ثابت ہوئے تھے۔ یہ دو ہزار نو تھا، جب ٹیکنولوجی کی جڑیں کمزور تھیں اور طبعیات کے ذرائع محدود۔ لیکن ایک چیز صاف واضح تھی۔ اس کے زوال کے ساتھ ہی ملائیشیاء ائیر لائنز کا زوال بھی اصل ہو چکا تھا۔

اسٹاک مارکیٹ میں اس کے شئیر دیکھتے رابح نے شاک سے اپنی ٹھوڑی چھوئی۔ یہ دسمبر کی شروعاتی دن تھے اور صبح کی روشنی لاؤنگ روم میں گرے بھاری پردوں کے باہر سے ہی رخ موڑ جاتی تھی۔ تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل میں وہ ہنستا بستا گھر کوئی کھنڈر لگتا تھا، مٹی اور دھول میں اٹا ہوا۔ اس کا اپنا آپ بھی کچھ خاص مختلف نہ تھا۔

سپید رنگت پر شیو گھنی اور بے ترتیب تھی، گہرے بھورے بال بر خلاف اصول بڑھ کر اس کے ماتھے پر نقشے کھینچ رہے تھے۔ چہرے کے نشانات ہلکے تھے، اور اس کے ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ جلد ہی اپنا بریس کھول سکتا تھا، البتہ لوہے کا واکر چند اور دن اس کا ساتھی رہے گا۔ کاؤنٹر پر لیپ ٹاپ سجائے وہ برسا ایکسچینج

کی ویب سائٹ پر اسکرول کر رہا تھا، دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا لاشعوری طور سے داڑھی کے بال نوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکان تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پچھلے تین ہفتوں میں وہ دس گنا بڑھ چکا ہو۔ مسکراہٹ اور نرمی تو چہرے سے ایسے فق ہوئی تھی جیسے ہوا سے انجرے۔

لاؤنگ روم میں صبح کے وقت بھی نیم روشنی تھی۔ گہرے کاسنی رنگ کے مخملی پردے ساکت لٹکے تھے، باد و بہار کو ہر آنچل سے روکتے۔ اس نے نشست میں پیچھے ہوتے ساتھ رکھے مگ تک ہاتھ بڑھایا اور ہونٹوں سے لگایا۔ وہ خالی واپس آیا تو اس نے سر نیچے کرتے اندر جھانکا۔ کافی ختم ہو چکی تھی۔

کھڑے ہوتے اس نے ایک ایک کر کے سارے کیبنٹ چھانٹ لیے تو تھک کر کرسی کی پشت پکڑی۔ گھر کا سودا سلف ختم تھا اور کھانے کو اپنی کھال کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔

وہ باہر کیسے جائے؟

اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین گرائی اور قالین پر چلتے کھڑکی کے کنارے پہنچا۔ ایک طرف کھڑے ہوتے اس نے دو انگلیوں کے درمیان سے پردہ تھاما اور ذرا سا دور کیا۔

اس کے گھر کے ٹھیک نیچے رپورٹرز کا جمہ غفیر تھا۔ سیاہ سفید بلیزر پہنے، ہرے بھرے لوگو والے مائکرو فون ہاتھوں میں اٹھائے وہ گھر کے مین دروازے کے آگے پہرا ڈالے تھے۔ کچھ تھک کر کیاریوں کے ساتھ بنی پٹڑی پر ستا رہے تھے اور کچھ آس پاس گلی کا شوٹ کر کے ناظرین کو آگاہ کر رہے تھے۔

"یہ ہے وہ جگہ جس نے رابح آدم جیسے درندے کو پناہ دی، یہ تھی وہ عمارت جو دغابازیاں برداشت کرتی رہی۔ بھائی بہن کا خون کر گیا اور ان دیواروں نے کان بند کر لیے۔"

وہ لوگ تھکنے والے نہیں تھے۔ اس نے پردہ چھوڑا اور پیچھے دیوار سے ٹک گیا۔ پچھلے کئی دن یہی معمول تھا، یہی دستور تھا۔ لیکن اب اذیت برداشت سے باہر ہو گئی تھی، اب تلاشِ رزق ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے

ایک اور دن خالی پیٹ پر کشمش کھائیں تو وہ اپنی عقل کھو دے گا۔ وہ ٹھہرا تو اسے یاد آیا کہ اب تو کشمش بھی ختم ہو چکی تھیں۔

منصوبہ بنانا پڑے گا۔

اس کے گھر میں پچھلا دروازہ نہ تھا، لیکن کمروں کے کنارے سے گزرتا ایک کوریڈور ضرور تھا، جہاں اماں اکثر فاضل سبزیاں رکھا کرتی تھیں۔ اس کی دیواریں چھوٹی تھیں اور گلی کی عقبی طرف کھلتی تھیں۔ نیم ٹوٹے پیر کے ساتھ چھلانگ لگانا مشکل تھا۔

گروسری خرید کر وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اپنے بدن کو سیاہ ہوڈی اور ماسک سے ڈھک دینے کے باوجود وہ اپنے سفر کے ایک بھی پل محفوظ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اسے مسلسل اپنے پیچھے سائے ہلتے جھلتے دکھ رہے تھے۔ کبھی کوئی آواز اس کے کندھے کے بہت قریب آ کر کچھ بولتی تو کبھی کسی کے کیمرا جھپکنے کی کلک اس کی روح تڑپا جاتی۔

مین سڑک پر آتے اس نے ماسک کا کنارہ پکڑ کر منہ بہتر طریقے سے چھپایا۔ اب وہ سائڈ واک پر چل رہا تھا، اتنا تیز جتنا ایک واکر اور نیم مجروح بازو کے ساتھ چلا جا سکتا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی دودھ کی تھیلی سرسرا رہی تھی۔

"رائج!" غیر مترقب پکار اس کے کانوں سے لگی تو اس نے بغیر خیالِ ثانی اپنی چاپ تیز کر دی۔ پیچھے آتا شخص بھی ہار نہیں مانتا تھا۔

"رائج!" دوبارہ اسے پکارا گیا۔ جسم کا درجہ حرارت چڑھتا جا رہا تھا اور اس کے تیوریوں پر نووارد پسینہ پھیل چکا تھا۔ اب کہ وہ ایک ٹانگ کو گھسیٹتے تقریباً بھاگ رہا تھا۔

اس بار کسی بلاوے نے اس کا راستہ نہیں روکا بلکہ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آن گرا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی برف ہوئی اور رابح نے قوت لگا کر اپنا آپ اس شکنجے سے آزاد کرایا۔ ماسک کے پار اس کی سانسیں بلند و بے ضابطہ تھیں۔

وہ ترچھا ہوا، ہیزل آنکھیں دہشت سے کھلیں تھیں۔ ظبیہ نے چشم داشت اور نراسی کے ملے جلے جذبات میں اسے دیکھا۔ وہ سر تا پا ہلکے نیلے عبائے میں تیار تھی۔ سورج کی روشنی اس کی بھوری رنگت پر گر کر اسے ضرورت سے زیادہ پر کشش بنا رہی تھی۔

"یہ تم ہی تھے۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی شاپنگ بیگ تھے۔ "میں نے تمھیں ڈھونڈ لیا۔"

گھنے درختوں کے سائے میں چھپے مجنون اصول دانوں سے وہ تجاہل نہیں برت سکتا تھا۔ ان کے کیمرے اب بھی تیار تھے، ان کے منہ اب بھی گیلے تھے۔ وہ رابح آدم کا بال بال الگ کر دینا چاہتے تھے۔

"کیا ہے تمھیں، کیوں روکا ہے؟" اس کے الفاظ اس کے روح سے زیادہ سنگ نہ تھے۔ ظبیہ نے حیرت سے پلکیں مچکائیں۔

"تم میرے مسیجز کیوں نہیں دیکھتے، رابح؟ نہ ہی کالز اٹھاتے ہو۔ تمھارے گھر کی بتی بھی ہمیشہ بند رہتی ہے۔ میں تم سے کیسے رابطہ کروں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

کلک، کلک، کلک۔

رابح نے اشتعال میں سر دائیں بائیں کیا۔ لڑکیوں کا چھتا درخت کی آڑ میں کھڑا اس کی تصویر بنا رہا تھا، ان کی سرگوشیاں ان کے درمیان بلند تھیں۔

"کھینچو، کھینچو، کھینچو!"

اس نے جبڑا بھینچ لیا اور سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ "کیا ہو گیا ہے؟ جیسے تمھیں پتا ہی نہیں، جیسے تم سا پارسا تو کوئی ہے ہی نہیں۔" وہ بلاوجہ چڑ رہا تھا۔

"رانج۔۔۔" وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک قدم آگے بڑھی اور اس کا بازو چھوا۔ ہوڈی والے مرد نے بے دردی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم مجھے جج نہیں کر سکتی، ظبیہ۔ میں یہ نہیں ہونے دے سکتا۔"

"میں تمھیں جج نہیں کر رہی۔" وہ اس قدر بے آس تھی کہ اسے اپنے الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ "میں تمھیں سمجھنا چاہتی ہوں۔ تم نے خود کو بند کر دیا۔ تم نے مجھے دور بھیج دیا ہے۔ مجھے اپنے پاس رہنے دو۔"

کوئی ان کے پیچھے سے بھاگا۔ رانج کی بے آرامی اس کی پیٹھ چڑھ رہی تھی اور اس کا دماغ حصوں میں تھا۔

ظبیہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ وہ ہل بھی نہ سکا۔

"میرے ابا مجھے دھمکا رہے ہیں۔ وہ مرد۔۔۔ وہ مرد بار بار میرے گھر چکر لگا رہا ہے۔ وہ امید کھو رہے ہیں۔" اس کے انگوٹھے نے اس کے ہاتھ کی پچھلی طرف دائرہ کھینچا۔ "میں تمھیں تنگ نہیں کر رہی، رانج۔ اَنا اَقسم باللہ، میں تمھیں تنگ نہیں کر رہی۔ میں تمھارا غم نہیں بھولی۔ لیکن پلیز۔۔۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"پلیز کیا؟" ظبیہ کے ہاتھ میں قید اس کا ہاتھ ٹھنڈا لوہا تھا۔ بے جان، بے حرکت، سنگ۔

لڑکی نے پلکیں جھپکیں۔ وہ رنج سے نڈھال تھی، الفاظ تمام تھے، لیکن اسے پتا تھا اس مرد سے اپنا دکھ بانٹ کر وہ کبھی نراس نہیں رہا کرتی تھی۔ رانج آدم اس کا گیٹ اوے (getaway) تھا۔

"پلیز۔۔۔" اس کے انتر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

مرد نے گہری سانس لی۔ یہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی آخری کوشش تھی۔ "میں نے ان چیزوں کے لیے سائن اپ نہیں کیا، ظبیہ۔ میں تمھارے مسائل سلجھانے کے لیے نہیں بنا۔ دنیا پہلے ہی مجھے اپنا پسندیدہ ترین ولن بنا چکی ہے۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے کھلیں۔

"اور میں کیوں کروں؟" وہ ہاتھ چھڑا کر اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لڑکیاں اس کے پیچھے کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ "ہو کون تم میری؟ تم تو نہیں تھی جو پلین کریش سے گر کر تقریباً موت کے گھاٹ اتری تھی۔ میں تھا! تم تو نہیں تھی جس نے اپنا پورا خاندان دو راتوں میں کھویا تھا۔ میں تھا!"

کاجل سے سنواریں اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ سورج اس کا چہرہ دہکا رہا تھا، جلد کا کونہ کونہ گرم تھا۔ رانج ایک اور قدم آگے آیا۔ اس کے الفاظ کسی بھی جسمانی تکلیف سے زیادہ زخم دیتے تھے۔ کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ بہت بری طرح ختم ہو رہا تھا۔

"تمھارا مسئلہ ہی یہ ہے۔ کبھی کسی کے سہارے ہوتی ہو، کبھی کسی کے۔ تمھیں اپنی ویلیو ہی نہیں پتا!"

وہ یکایک بازگشت ہوئی۔ سب ختم ہو رہا تھا، اور کوئی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ہیزل آنکھوں کی تپش اوپر ٹھہرے سورج سے زیادہ بے رحم تھی۔

"ہر وقت کے تمھارے رونے۔ میری ماں نہیں، میرا باپ نہیں۔ لو دیکھ لو، اب میری بھی نہیں۔" وہ کڑواہٹ سے ہنسا۔ "لگا دی نظر؟"

BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، نگاہیں خاموش اور ابرو تنگ۔ یہ وہ رانج تو نہ تھا جسے وہ جانتی تھی۔

"خوش ہو گی نا تم تو۔ میں بھی تم جیسا ہو گیا۔ بے سہارا، بے آسرا۔" الفاظ بن اجازت اس کے لبوں سے اپنا راستہ ناپ رہے تھے۔ پیچھے کیمروں کی کلک کلک مسلسل تھی۔ اس نے ماسک کے اوپر ہی اپنی انگلیوں سے چہرہ مسلا۔

"یہ تم ہی ہو؟" سامنے کھڑی لڑکی کی آواز سرگوشی تھی۔

رانج نے ٹھوڑی اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہوا کی لہر ماتھے پر گرے بال اڑا گئی۔

"میں ہی ہوں۔ لکھ کر دوں؟ اوہ نہیں، تم تو پڑھ بھی نہیں سکتی۔ کاش میں بھی دنیا سے تم جتنا بے نیاز ہوتا۔"

فاصلے، ان الفاظ نے ان دو وجود کے درمیان ان گنت فاصلے پرو دیے تھے، دو دلوں کو ایک دوسرے سے گمراہ کر دیا تھا، دہ زندگیاں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے تغیر کر دی تھیں۔

بغض اور کچھ نہیں تو ہے دلوں کی مار۔

"مجھے اسپیس چاہیے۔ تم سے۔ اس سے (اس کے اور اپنے بیچ فاصلے کو ناپا) اور خود سے۔"

وہ چلا گیا۔ دودھ کی تھیلی ایک پل ہوا میں لہرائی، درخت کے پتے سڑک سے طیر ہوئے اور اس کے عبائے کا کنارہ اس کے ٹخنوں سے گذرا۔ وہ ثابت کھڑی رہی، بے سخن، بے آواز۔

"میں نے بھی نہیں کیا تھا۔ سائن اپ۔۔۔" وہ خود سے بڑبڑائی۔

★★★

حال

جگہ: کاکپٹ

02:01 AM

ایروناٹیکل انجینئرنگ کے کورسوں میں اگر اسے کوئی اپنے بال نوچنے پر مجبور کرتا تھا، تو وہ صرف اور صرف ایک تھا۔

نیویگیشن، جسے سادہ اردو الفاظ میں جہاز رانی بھی کہتے ہیں۔

جہاز کی راہ ناپنا اور جانچنا، اپنے جگہ اور اونچائی کا پل پل دھیان رکھنا اور دنیا کہ اس گولے میں اپنی جگہ سے قطعاً فراموش نہ ہونا، رائج آدم اس میں وہی تھا جو آپ کہتے ہوں گے۔ کوڑ مغز۔

اپنی چار سالہ ڈگری میں کیسے گرتے پیٹتے اس نے نیویگیشن پاس کیا تھا، کوئی اس سے دوبارہ پوچھ لیتا تو وہ وہیں نبض کاٹ کر جان دے دیتا۔ لیکن پانچ سالوں نے اسے نکھار دیا تھا، کیونکہ اب واقفیت تکلف نہیں، ضرورت بن چکی تھی۔ بوئینگ ۷۷۷ کے طیارے کو بیچ آسمان سے غائب کرنا کسی موٹی عقل والے کا کام نہیں ہو سکتا تھا، سو اس نے خود کو سنوارا تھا۔

رات کی سیاہی اس کی روح میں گھل سی گئی تھی۔ ہیزل آنکھوں والا پائلٹ وہی تھا جسے آپ کہانی کے مختلف حصوں میں، مختلف ترجمات میں دسار چکے ہیں۔ لاتعداد چہروں والا آبی سانپ ہائیڈرا یا دوزخ کا رکھوالا قریبروس، دنیا کی نظروں میں عاقل فاضل ڈاکٹر جیکل یا بدخواہ اور مکار ہائیڈ؟

کیا اچھا ہو جو سب اتنا آسان ہو، برائی اور اچھائی دو الگ وجود نمایاں ہوں، لیکن وہ تو امتزاج تھا، ایک ایسا امتزاج جس میں سے شر کا سیاہ اور نیکی کا سفید علیحدہ کرنا دشوار تر امر تھا۔

اس نے زبان سے اوپری ہونٹ تر کیا۔ کاکپٹ کی خاموشی ایک بوجھل گٹھڑی کی طرح اس کے کندھوں پر گری تھی۔ MH370 کو کوالالمپور انٹرنیشنل ایئرپورٹ چھوڑے سوا دو گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے، ویتنام ایئر ٹریفک سے رابطہ توڑے بھی چالیس منٹ سے اوپر بیت چکے تھے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ماضی کا داغا، حال میں پختہ اور مستقبل سے منقطع رابح آدم آخر چاہتا کیا تھا؟

اس نے ایک ہاتھ کی انگلی ابرو پر چمکتے پسینہ پر پھیری۔ سیاہ ٹمبر لینڈ میں قید اس کے پیر رڈر پیڈل پر آہستگی سے جمے تھے، ہاتھوں کی انگلیاں یوک تھامی ہوئی تھیں۔

اچانک سکوت کو توڑتی ہوئی 'پنگ' کی آواز اس کے کانوں پر لگے ہیڈ سیٹ میں چہکی۔ یہ الرٹ تھی؛ فلائٹ کریو اس سے رابطہ کرنا چاہتے تھے۔

"ہیلو؟" اس نے آڈیو پینل سیٹ کیا، ساتھ ہی ایک باریک نگاہ گڑبڑا کر آس پاس ڈالی۔ برابر کرسی پر اسامہ بے آواز، بے حرکت گرا تھا۔ اب تک تو فینوبار بیٹل اس کے انتر ہلا چکی ہو گی۔

"کیپٹن آدم، میں لورا۔ آپ کے پاس ایک لمحہ میسر ہے؟" فلائٹ اٹینڈنٹ کی درخواست پر اس نے خود کو پرسکون رکھا۔

"جی، کہیے۔"

سب ٹھیک ہے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ بار بار خود سے دہراتا۔

"ہم ان فلائٹ میلز تیار کر رہے ہیں۔ آپ کچھ خاص آرڈر کرنا چاہتے ہیں؟ یا پھر فرسٹ آفیسر عامر؟"

اس کی جان میں جان آئی۔ رابح نے ایک نگاہ اسامہ پر روشن کی۔

"آئی ایم گڈ۔" اس نے پر لحاظ لہجے میں کہا۔ "تم بتاؤ اسامہ۔" اور مردہ جسم کیا جواب دیتا؟ رابح نے ایک لمحہ خود ہی وقفہ لیا جیسے واقعی اسامہ کے جواب کا انتظار کر رہا ہو، پھر وہیں سے رابطہ جوڑا۔

"نو؟ او چلو ٹھیک ہے۔ ہم فٹ ہیں لورا۔ اگر ضرورت ہوئی تو ول لیٹ یو نو۔"

لورا انٹر کام کا کنیکشن کاٹنے ہی لگی تھی جب پتا نہیں کیا سوچ کر وہ بول پڑا۔

"مسافرین ٹھیک ہیں؟" اس کے لب خشک تھے۔ "آئی مین، کوئی مسلہ تو نہیں۔۔۔ کسی کے ساتھ بھی؟"

"یس، کیپٹن۔ سب ٹھیک ہیں۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ایک چہرہ تھا جو اسے نہیں بھولتا تھا۔ وہ اس کا گناہگار تھا، اور پانچ سال سے ضمیر کی سلاخوں میں قید تھا۔

"سب؟" اس نے زور دیا۔ خدا جانے وہ کیا کر رہا تھا۔ جس راستے وہ اس طیارے کو گزار رہا تھا وہاں سلامتی تو بس ایک افسانہ تھی، پھر بھی کیوں؟ "آپ ایک بار کنفرم کر دیں مجھے۔ ٹوئنٹی ففتھ روسے۔"

"اوکے۔ کوئی مخصوص نام، سر؟"

وہ نام تو شہادتِ قلب تھا، لیکن اسے ادا کرنا اس کی روح پر بوجھ تھا۔ اس نے ہونٹ چباتے خود کو لگام ڈالا۔ "نہیں ایسے ہی۔" اس کا ضبط نفس آخری لمحے ماند پڑ گیا۔ "کرلی ہیئر، بلیک عبایہ۔ آپ بس دیکھ کر بتا دیں کہ وہ ٹھیک ہیں۔"

کا کپٹ کا دروازہ بھلا کر اگر ہم پسنجر کیبن میں قدم جمائیں تو نیم پیلی بتیوں میں اجاگر ہوئی راہداری کے دونوں اطراف مسافرین کشیدہ کرسیوں پر پھیلے تھے، ہونٹ نیند میں ادھ کھلے اور آنکھیں موندے۔ نیلے پرنٹڈ یونیفارم میں ملبوس دبلی صورت فلائٹ اٹینڈنٹ اپنی سیاہ ہیلز سے چلتی پچیسویں رو کی جانب بڑھ رہی تھی، مائک اس کے ہونٹوں کے قریب جڑا تھا۔ قطار در قطار وہ سب کے چہرے دیکھتی حال پوچھتی D25 سیٹ تک پہنچی تو خارجی سمت پر نشست لڑکی مرون شال تانے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ بھوری رنگت پر خفیف سفید روشنی بکھرے ستاروں جیسی دکھتی تھی۔

اس سے اندر والی نشست پر بیٹھا سیاہ لیدر جیکٹ والا مرد گردن موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پلین اندھیر آسمانوں پر گامزن تھا اور اس کی سرمئی آنکھیں اس کی ٹمٹماتی بتیوں میں ہر کچھ لمحات بعد چمک اٹھتیں۔ ہری، لال، ہری، لال۔

"آپ کو کچھ چاہیے، سر؟" فلائٹ اٹینڈنٹ نے اسے مخاطب کرتے مسکراہٹ پیش کی۔

اکائر نے گھوم کر اسے دیکھا اور خفیف سا سر ہلایا۔ "آئی ایم گڈ۔"

ان کی دھیمی گفتگو پر ظبیہ نے آنکھیں جھپکیں اور انگلی کے کنارے سے سوتی آنکھیں مسلیں۔ فلائٹ اٹینڈنٹ اسے دیکھ کر چہک اٹھی۔

"سلام، میم۔ کیا آپ سفر انجوائے کر رہی ہیں؟"

"ہونہ؟" اس کے دماغ کے شٹر اب بھی گرے تھے۔ اکائر لطف اندوز ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "چائنہ آ گیا کیا۔۔؟" وہ یکایک پریشان سی ہو کر اپنا سامان دیکھنے لگی۔ اکائر ہنس پڑا اور رابطے کے دوسری طرف بیٹھے رانج نے بھی اس کی آواز پر ٹھوڑی جھکائی۔ ایک نرم مسکراہٹ اس کے لبوں کے کنارے چھو گزری۔

فلائٹ اٹینڈنٹ نے رحم دلی اور تعجب میں چہرہ نفی میں ہلایا۔

"ہمارے کیپٹن ذاتی طور پر مسافرین کے عیش و عشرت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کے لیے کوئی تبصرہ؟"

اور جہاں وہ مسکرا مسکرا کر گلابی پڑ رہا تھا، لورا کے اگلے الفاظ سن کر سرخ غبارہ بن گیا۔ اس نے بے اختیار ہتھیلی ماتھے پر ماری۔ میری قسمت!

ظبیہ نے گڑبڑا کر پلکیں جھپکیں۔ ساتھ بیٹھا اکائر تو اب کہ بھرپور جوش سے ہنس رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ سے ناک کی مرمری ہڈی دبائی۔ (ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش)

"اپنے کیپٹن سے کہیں میری عیش و عشرت کی کوئی انتہا نہیں۔ تھینک یو۔" اس نے اپنا کمنٹ پاس کیا۔

ظبیہ نے چڑ کر اسے دیکھا۔ اب کہ اس کی آنکھیں نیند سے مکمل تہی تھیں اور رخسار نیم گلابی۔

"آپ کے کیپٹن کا پلین اڑانے کے علاوہ ہر چیز پر دھیان ہے۔"

لورا بھی ہنس دی اور مائک پر بنا بٹن دبایا۔

"Did you get that, captain?"

سنا آپ نے، کیپٹن؟

"Yes, now retreat."

جی، اب واپس آجائیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے جلدی جلدی کہہ کر رابطہ منقطع کیا۔ توبہ توبہ۔ اس کے گال تپ رہے تھے۔ سیٹ میں پیچھے ہوتے اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہاں خلا تھی، ہر احساس، ہر شے سے مکمل تہی۔

دو گھنٹے پہلے کے لمحات ٹک ٹک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے کھلتے گئے۔ وہ سانس روکے سامنے دیکھتا رہا۔ MH370 کی ناک روئی جیسے بادل چیرتے ویتنام کی فضاء پار کر رہی تھی۔ پلین کی رفتار دھیمی تھی، اسی نے کی تھی۔ کنٹرول یوک کے کالے لوہے تھامے اس کی گرفت ہلکی ڈھیلی ہوئی، جیسے وہ خود کو اس لمحے سے علیحدہ کر رہا ہو، اور ایسے ہی منظر بدل گیا۔

KL ائیر پورٹ کی چمکتی اجلی بتیوں سے نکلتی روشنی بے نشان ٹائلز پر بوند بوند گر رہی تھیں۔ آس پاس کا شور شرابہ اسپیکروں سے آتے اعلانات کو ہڑپ کر جاتا تھا۔ سوٹ کیس کھینچتے، فلائٹ کی معلوماتی اسکرین پر نظریں دوڑاتے، کرنسی ایکسچینج کاؤنٹر پر جھکے لوگوں میں سے ہر ایک اپنی مسافرت کے لیے بے چین اور منزل کے لیے بے تاب تھا۔

فلائٹ بریفنگ کے بعد ٹرمینل ون عبور کرتے دو پائلٹ پردے پر آتے ہیں۔ ان میں سے ڈھیلے نیلے کوٹ اور ادھ سفید بالوں والا خوش اخلاق مرد فرسٹ آفیسر اسامہ عامر کے علاور کوئی اور نہ تھا۔ اس کے ہم قدم یونیفارم پہنا کیپٹن رانج ہنستے ہوئے اس سے کچھ کہہ رہا تھا، انگلی کی نوک کان کی لو آہستگی سے مسل رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ چہک رہا تھا، ہر جملہ رک رک کر وزن ڈالتے ادا کر رہا تھا۔ رانج ایسا نہ تھا، پانچ سال میں وہ ایسا کبھی نہ تھا لیکن دنیا والوں نے غور نہ کیا۔ خوش ہے، چلو خوش رہنے دو۔ اتنی خوش اخلاق، وہ بھی ایک ایسے مرد سے جسے توڑ دیا گیا ہو، جسے بکھیر دیا گیا ہو اور جس کے پرزے چھپا دیے گیے ہوں۔ یہی خطرہ ہونا تھا، لیکن دنیا لاعلمی کا ڈھونگ رچاتی رہی۔

پسنجروں کی قطار اور بورڈنگ سے اس کا بطور پائلٹ کوئی غرض نہیں تھا۔ ہر مسافرت سے پہلے وہ یہاں سے گزر کر اپنے بورڈنگ گیٹ جاتا تھا، تو یہ اس کے لیے معمول کا عمل تھا، ولیکن دور کھڑی سیاہ عبائے والی مسافرہ کی پریشان صورت دیکھ کر رانج آدم کے قدموں کو یکدم قفل لگے۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی، بھوری نگاہوں میں اضطراب اور بے یقنی کھل کر واضح تھی۔

پانچ سال ہیزل آنکھوں کے سامنے رقص کر گئے، سینے کے حدود میں بندھے بے جان دل میں پہلی بار دھڑکن محسوس ہوئی۔ اس نے آس پاس دیکھا، سانس بدحواس تھی۔ اسامہ اس کے برابر رکا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"کیا ہوا؟" وہ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کی اطراف میں گری انگلیاں مٹھی میں تنگ ہوئیں۔ ظبیہ یمین یہاں تھی۔ ظبیہ یمین اس کی مسافر تھی۔ ظبیہ یمین MH370 کی مسافر تھی، وہ فلائٹ جس کی منزل غیب تھی۔

اسے لگا وہ مر جائے گا۔

"رائج۔" فرسٹ آفیسر نے اس کا بازو چھوا۔

"مجھے ایک کال کرنی ہے، اسامہ۔ تم چلو میں آتا ہوں۔" وہ اس وقت بہترین جھوٹ گھڑنے کی حالت میں نہیں تھا، سو جو سمجھ میں آیا کہہ گذرا۔ اسامہ مان گیا اور اپنی راہ اس سے الگ کی۔ اب کہ رائج اکیلا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دور کھڑی ظبیہ کو دیکھا جو اپنے سرخ سوٹ کیس کو دیکھتی اس کے وجود سے بے نیازی کا ناٹک کر رہی تھی۔ کاش وہ بھی کر سکتا۔ کاش وہ بھی اپنے ارادوں سے لاعلم رہ سکتا۔

MH370 کا انت اسے پتا تھا، کیونکہ وہی تو تھا اس کا انجام کار۔ وہی تو تھا دو سو انتالیس لوگوں کا فریب کار۔

قریب بڑھتے اس نے چہرے پر سنگ دلی کی تصویر اوڑھی۔ وہ ظبیہ کو یہ فلائٹ نہیں لینے دے سکتا تھا، سب جانتے بوجھتے تو قطعاً نہیں۔ وہ معصوم تھی اور اس سے کئی بڑھ کر خوشیوں کی حقدار بھی۔ سب سے اول، رائج کے برعکس، اس کی زندگی اہم تھی۔

"دوبارہ مہر لگوانی ہو گی۔"

سب سے پہلے تو وہ مسافرین کی بورڈنگ میں دخل دے رہا تھا، جو کہ بطور پائلٹ ایک نہایت غیر معمولی عمل تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ وہاں کے عملہ نے اسے سیدھا سیدھا دھکے نہیں لگائے تھے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ ظبیہ کے ویلڈ دستاویزات پر بے جا انگلی اٹھا رہا تھا۔ لیکن اس کا مقصد صرف ایک تھا۔ ظبیہ کو اس فلائٹ سے دور بہکانا، کچھ بھی کر کے اسے وہیں روک دینا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمھارا، رابح؟" وہ درد سے چلائی تھی۔ اس کی آواز کی چبھن نے اندر تک اس کی ضبط کی تاریں چھیڑ دیں تھیں۔ وہ اسے کیسے بتاتا؟

یہ میرا خود پر آخری احسان سمجھ لو، ظبیہ۔

وہ شرمندہ سی ہو کر معذرت کرنے لگی تو اس نے نظریں چرائیں۔ اب وہ پر امید ہو کر اسے نرمی سے ہر چیز سمجھا رہی تھی، اس سے ری چیک کرنے کو کہہ رہی تھی، لیکن وہ نہیں سن سکتا تھا۔ ہر گز نہیں۔ اگر وہ مان گیا تو کہانی ختم، اسی لیے اس نے ایک الگ درجے کی بے رحمی دکھائی۔

"مجھے یہ ڈاکیومنٹ فورج لگتے ہیں۔" اور ظبیہ کے چہرے پر امڈتے غصے نے اسے یقین بخش دیا تھا کہ اب وہ دور ہو جائے گی۔

"مجھے نہیں لگا تھا کہ میں کبھی تم سے اور نفرت کر سکتی ہوں۔ لیکن آج مجھے تم سے گھن آ رہی ہے۔"

بس! یہی تھا نقطہِ شکستگی۔ اب وہ چلی جائے گی، اپنے سرخ سوٹ کیس کے پہیے چلاتے، سیاہ دوپٹے کو کندھے پر سنبھالتے۔ وہ چلی جائے گی اور رابح آدم اسی طرح اس کی زندگی کا ولن مقرر ہو جائے گا۔ کچھ تبدیل نہیں ہو گا۔ وہ زندہ رہ کر اسے کوسے گی اور وہ موت میں بھی اس کا الزام بردار کرے گا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

دی پرفیکٹ اینڈ۔ بس ذرا سے دھکے کی ضرورت تھی۔

نیلی وردی پہنے گارڈ سے مخاطب ہوتے اس نے اس کے سوٹ کیس کو دیکھا۔ "ان کا سامان چیک کریں اچھے سے۔"

یہ تو ہراسمنٹ تھی اور یہ تو وہ بالکل برداشت نہیں کرے گی۔ وہ بلاوجہ اس کا بیگ کھلوا رہا تھا، اسے سب کے سامنے ذلیل کر رہا تھا، یہ تو کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ہے ناں؟

لیکن اس کم سن پائلٹ کو کیا معلوم تھا کہ ظبیہ یمین کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ تو حقوق و قوانین کی دنیا سے کبھی جڑی ہی نہیں تھی۔ وہ اس عورت سے پلٹ جانے کی توقع کر رہا تھا جس نے پانچ سال غلط کو صحیح

مانتے گزارے تھے، اس عورت سے عزتِ نفس کو ترجیح دینے کہہ رہا تھا جس نے ایک مرد کی رضامندی پانے کے لیے خود کو سر تا پا ڈھال دیا تھا۔

اسے بس بیگ کھلوانا تھا، وہ نہیں بھی پلٹی تو کچھ نہ کچھ کر کے وہ اسے ناحق ثابت کر دے گا۔ ظبیہ تو پڑھی لکھی بھی نہیں تھی، اسے پھنسانا آسان تھا۔

اور سب صحیح ہو جاتا اگر وہ نہ آتا۔ اس کی چھ فٹ ایک انچ کی بدبختی جو سیاہ لیدر جیکٹ پہنتی تھی۔ اس نے قدم رکھے اور اس کے فضول تماشے کی وجہ سے معاملہ رابح کے دستِ قید سے رہا ہو گیا۔ اس کی توجہ بٹ گئی اور اس افراتفری کے عالم میں ظبیہ کب چھو منتر ہو گئی اسے اندازہ بھی نہیں ہوا۔

"Acair Zamora, I will find you in hell."

"اکائر زمورا، میں تمھیں جہنم میں بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔"

وہ جا چکی تھی اور اب اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ دو سو، تین سو لوگوں کے درمیان وہ اسے کیسے روکے گا؟ اس کی حتمی چاہت، ظبیہ کو دور بھیجنے کا آخری جتن، سب ماند پڑ گیا تھا۔ زندگی ہمیشہ انھیں جدا کرتی رہی تھی، اب کیوں ساتھ کر دیا تھا؟

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے مجمعے سے دور ہوتے اپنے قدم سنبھالے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ برسوں بعد اسے ان میں وہی اذیت محسوس ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اتنے عرصے واکر کا احسان مند رہا تھا۔ اس نے ہال کے کنارے بنے ستون کے ساتھ ٹک کر خود کو استوار کرنا چاہا۔ اس کی سانسیں چڑھ رہی تھیں۔ سب غلط کرنے کے بعد بھی کچھ صحیح نہیں ہوا تھا۔ "تم کیوں مظبوط پڑ گئی، ظبیہ؟ کیوں تم سے نفرت نہ ہوئی؟" اس کا سر چکرا رہا تھا۔ "کیوں تم نے پیٹھ نہیں دکھائی؟ کیوں تم نے ہار نہیں مانی؟"

اسپیکروں سے آتی آوازیں اسے سن کر رہی تھیں۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کے گالوں سے پھسلنے لگے۔

"میں نے اپنے واسطے تم سے صرف ایک چیز کی درخواست کی تھی۔ بے پناہ، لازوال نفرت۔ اور تم وہ بھی نہیں کر پائی۔"

★★★

پانچ سال قبل

۱۱ دسمبر ۲۰۰۹

تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل میں اتری رات ساکن تھی۔ اس کم متوسط بستی میں جہاں ایک طرف ایک سے دو اسٹوری بنگلے قریبی فاصلے پر تعمیر کیے گئے تھے وہیں دوجی جانب کچھ بہتر حالات رکھتی کئی منزلہ عمارتیں بھی گھنے درختوں سے رنگی سڑکوں کے کنارے آباد تھیں۔ تمان تُن کا تعمیراتی طرز حد سے زیادہ پرکشش یا مستحسن نہیں تھا، مگر کچھ تھا اس کی ہوا میں جو ہر معمولی سانس کو خاص بنا دیتی تھی۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں ہر کسی کو دوسرے کا نام معلوم تھا، جہاں یاسمین کے پھولوں کی سگھند گھریلو پکوان کی مہک میں گھل کر دن بھر کی تنگیوں کو مٹا دیا کرتی تھی۔ پیچھے صرف خوشیاں رہا کرتی تھیں، فتح اور ستائش میں سنواری ہوئیں۔ قطار کی صورت بنے چھوٹے دو اسٹوری بنگلوں کے مجموعے میں ایک گھر کی جانب بھی ستائش کا ایسا ہی تماشا بچھا تھا۔ ہلکے گندمی رنگ کے دروازے کھلے تھے اور تنگ گلی میں گاڑیوں کی تعداد معمول سے بڑھ کر تھی۔ مین گیٹ کو فیری لائٹس اور رنگین پھولوں کی لڑیوں سے سجایا گیا تھا، گھر کے لاؤنج سے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں۔ یہ رات کا دوسرا پہر تھا اور آدھی رات ہونے کے در پر تھی۔ اس گھر کا چراغہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس گھر میں کوئی وسیع تقریب اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہو۔

گھر کے اندر آؤ تو لاؤنج روم میں اونچی سنہری گدیوں والے صوفے پر دو نفوس بیٹھے تھے۔ سیدھی طرف بیٹھا غزار سیاہ باجو کرتے اور پجامے میں ملبوس تھا، سر کے کھچڑی جیسے سیاہ سفید بال نفاست سے پیچھے بنے تھے اور چہرے کی سنجیدگی عیاں تھی۔ اس کے ہاتھ کی چوہتی انگلی میں چاندی کا چھلا چمک رہا تھا۔ برابر

نشست سرخ سونگٹ کبائے میں ملبوس،(سونگٹ کبایاپیچیدہ کڑھائی سے مزین بلاؤز اور سونے یا چاندی کے دھاگوں سے تیار پر تعیش کپڑے میں سلے اسکرٹ سے جڑ کر بنا دلہنوں کا روایتی مالائی لباس ہے۔)

ساتھ ہی ہم رنگ ڈھیلا حجاب اور کانوں میں چمکتے سونے کی بالیاں لیا وجود دلہن بنی ظبیہ کا تھا۔ اس کی گھنی پلکیں خمیدہ تھیں اور ہلکی بھوری میٹ لپ اسٹک میں رنگے نرم ہونٹ سختی سے قید۔ وہ خوبصورت لگ رہی تھی، وہ ہر کچھ لگ رہی تھی جو ایک دلہن کو لگنا چاہیے تھا۔

اس کی خالہ نے آگے جھکتے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے خالی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ ان کے جھری زدہ گال اور غم آلود آنکھیں بھی اسے دیکھتے اپنا درد نہ چھپا سکیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟

"بارَکَ اللہُ لَک، وَبارَکَ عَلَیک، وَجَمَعَ بَیْنَکُما فِي خَیر۔" انھوں نے شیفان کے دوپٹہ کے اوپر ہی اس کے سر پر بوسہ دیا۔ غزار نے مسکرا کر اسے دیکھا اور وہ تو اپنے ہونٹ بھی نہ ہلا سکی۔ اس کے ابا کمرے کی دوسری طرف کھڑے کسی سے بات کر رہے تھے۔ اسی کے دوران وہ قریب آئے اور غزار کا تعارف کروانے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اب کہ وہ تنہا بیٹھی تھی۔ چند گھنٹے قبل اس کا نکاح ہو گیا تھا، اس نے وہ تین بول اتنی آسانی سے کسی دوسرے مرد کے لیے کہہ دیے تھے، اس کے دل کو چوٹ پہنچی تھی لیکن روح نے شکوہ نہیں کیا تھا۔

رابح کو اسپیس چاہیے تھی، لیکن وہ بھول گیا تھا کہ ظبیہ خود ایک تنگ گلی میں کھڑی تھی۔ اس نے کتنی کوششیں کی تھیں اس رشتے کو بچانے کی، رابح کو پاس رکھنے کی، اس کا غم بانٹنے کی لیکن انجام کیا ہوا تھا؟ ذلت، حقارت، لاپرواہی۔ اس کے احساسات کو تین جملوں کے وار میں کرچی کرچی کر دینا۔

وہ نہیں سوچنا چاہتی تھی اس کے بارے میں۔ غزار اچھا ہو گا، وہ بہت اچھا ہو گا۔ لیکن کچھ چبھتا تھا، بہت کچھ دکھتا تھا۔ پانچ سالوں کی محبت، دس سالوں کی حسرت اور چودہ سالوں کا رشک تین بول سے ختم نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہ بدل ضرور گیا تھا۔ تپتے، گرم لاوے جیسی نفرت میں۔

اچانک اسے اپنے قریب ایک سایہ آتا محسوس ہوا تو اس نے سر اوپر اٹھایا۔ خالہ سامنے تھیں اور ساتھ ہی اس کی پرانی سہیلی ریٹا۔ وہ نیلی میکسی ڈریس میں تیار ہوئی تھی اور ڈائے شدہ بھورے بال سیدھے کر کے اس کی کمر سے نیچے جھول رہے تھے۔ دونوں عورتوں کے چہرے پر فکر تھے۔

ظبیہ نے ابرو اونچی کی۔

ریٹا نے لب کھل بند کیے۔ "تم باہر چلو گی؟" دلہن نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ ابا میری ٹانگیں توڑ دیں گے۔"

اس بار خالہ نے دخل دیا۔ "چلی جاؤ، ظبیہ۔ تمھیں جانا چاہیے۔" اس نے اچھنبے سے انھیں دیکھا اور سر ترچھا کیا۔

انھوں نے نرمی سے اس کا کندھا تھاما۔ "کوئی تم سے ملنے آیا ہے، اور مجھے لگتا ہے یہ ملاقات ضروری ہے۔" پھر ایک نازک مسکراہٹ پیش کی۔ "بھائی صاحب اور غزار کو میں سنبھال لوں گی۔"

★★★

گھر کی کھڑکیوں سے آتی نرم سنہری روشنیوں کے علاوہ گلی سنسان اور اندھیر تھی۔ اس کے کبائے کا نچلا حصہ ہوا کے دم پر لہرا رہا تھا، حجاب کا پلو بھی ٹھنڈی سائیں سائیں کرتی رات میں یہاں سے وہاں جھول رہا تھا۔ ہیل میں ٹک ٹک کرتے اس کے پیر اسفالٹ کی پکی سڑک پر قدم رکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ریٹا تھی، جو بے چینی میں اپنے ہونٹوں سے ساری لپ اسٹک چبا چکی تھی۔

"ظبیہ، آرام سے۔۔۔" اس نے اپنی دوست کو لگام دینے چاہے، مگر آج وہ کسی کی سن کر بھی نہیں سنے گی۔

"کس طرف؟" اس نے ٹھنڈی سرگوشی میں سوال کیا تو ریٹا نے سہم کر فوراً ہاتھ کے اشارے سے سائڈ واک کی جانب راستہ دکھایا، اور وہیں اسے وہ کھڑا دکھ گیا۔ سرخ ہوڈی پر سیاہ بامبر جیکٹ تانے وہ واکر کے

سہارے سڑک کے کنارے بنی فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس کی آہٹ پر سیدھا ہوا اور چہرہ اس جانب کیا۔ ظبیہ کو اپنے گوشت اور کھال سب ایک نعرہ لگاتے سنائی دیے۔

دغاباز۔

وہ اسی پھرتی سے اس کے قریب آئی، ریٹا بھی اس کے پیچھے گامزن رہی۔ رابح نے اسے سر تا پا ٹھہر کر دیکھا، ہیزل آنکھیں گم سی نظر آتی تھیں۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا، لیکن اس سے پہلے کے کوئی خیال حقیقت بن بھی پاتا وہ پھولتی سانسوں سے اس کے سامنے جا رکی۔

"کیوں آئے ہو تم؟" رات کے سکوت میں اس کا استفسار کسی صور کی پھونک تھا۔ گلی کے پار شادی والے گھر سے آتے مردوں کے قہقہے بلند تھے۔

رابح کی آنکھوں نے اس کے چہرے کی پور پور چھو لی۔ "میں یہیں رہتا ہوں، ظبیہ۔"

"بکواس مت کرو!" وہ غصے سے دو قدم آگے بڑھی۔ سامنے کھڑا مرد نہ ایک ذرہ آگے ہوا نہ پیچھے۔

ریٹا نے تذبذب میں انھیں دیکھا۔ "میں چلی۔۔۔"

"خبردار۔" ظبیہ نے اسے بھی چیتاونی دی، سامنے کھڑے رابح کے ساتھ اس کی نگاہ داری قائم رہی۔

"خبردار جو تم یہاں سے ہلیں۔"

ریٹا کے سینڈل والے پیر وہیں جم گئے، گھبراہٹ سے چھوٹی ہوئی آنکھیں سامنے کھڑی اپنی دوست اور اس کے مجرم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔

"چلو آ ہی گئے ہو تو دیکھ لو مجھے۔" وہ فرحت کی فریبی ادا سے پیچھے ہوئے اور اپنے کبائے کا گھیر کھول کر اسے درسایا جیسے فیشن شو میں ہو، لبوں پر ایک کمینی مسکراہٹ تھی۔ رابح کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

"بتاؤ کیسی لگ رہی ہوں؟ کیسی لگ رہی ہوں اپنی زندگی کا سودا کر کے؟" اس بار وہ پوری طرح گھومی، سرخ اسکرٹ کا کنارہ رائج کی زخمی ٹانگ سے ٹکرایا۔ ریٹا کے تاثرات بے آرامی سے کسے رہے۔ ظبیہ ٹھیک نہیں تھی۔

"بتاؤ ناں! اچھا رکو۔" وہ یکایک ٹھہر گئی، چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہوئے، پھر فوراً تین قدم پیچھے ہوئی۔ رائج اسے بے ساخت نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"سوری سوری!" اس نے پیچھے ہوتے اپنا حجاب سنبھالا۔ "سوری، میں اتنا قریب آگئی۔ تمھیں تو اسپیس چاہیے تھی۔ دم تو نہیں گھٹ رہا تمھارا؟ پانی منگواؤں؟"

ریٹا نے آگے بڑھ کر اس کا بازو چھونا چاہا۔ "ظبیہ، ایسے مت کرو۔"

"کیوں یار؟" وہ واضح طور پر جھنجھلائی۔ "ارے قسم خدا کی، اس نے خود کہا تھا۔ پوچھو پائلٹ صاحب سے، اسپیس چاہیے تھی کہ نہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

وہ اچانک ہنس پڑی۔ "مگر کیا؟" چاند کی روشنی میں اس کے چمکتے دانت کھکھلا اٹھے۔ ریٹا نے شکست تسلیم کرتے سر گرا لیا تو اس نے نظریں رائج کی جانب واپس موڑیں۔ اس بار چہرہ مختلف تھا۔ سنگ، کٹھور، بے رحم۔ وہ اس کے اصلی احساسات کی ترجمانی کرتا تھا۔

"یہ مت کہنا کہ میں نے کوشش نہیں کی۔" اس کی آواز سرگوشی تھی۔ "یہ بھی مت کہنا کہ میں نے ہار مان لی اور یہ بھی مت کہنا کہ میں نے انتظار نہیں کیا۔"

رائج نے ایک سانس خارج کی، جیب میں محفوظ اس کا ہاتھ برف ہو رہا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"عزت، محبت، وقار، بھروسہ، دلاسہ۔۔۔" وہ ایک ایک کر کے گنواتی گئی، پھر بھوری نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ مسکارا سے لدی پلکیں اور سرخ لائنز سے نکھری آنکھوں کی نچلی پٹی دونوں نووارد آنسوؤں سے گیلی تھیں۔

"میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کہو مانگا تھا یا نہیں!؟" اب کہ اس کے ہاتھ اس کے گریبان پر تھے۔ ریٹا آنکھیں پھاڑ کر قریب آئی لیکن رانج نے اسے وہیں روک دیا۔ چاند کی باریک نقرئی شعائیں ان کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ دو چہرے، دونوں زخمی۔ دو دل، دونوں ہی خالی از فعلیت۔

"میں نے صرف تم سے ایک چیز مانگی تھی۔ ہر بار، ہر مکالمے میں۔۔۔"

ہیزل آنکھیں اسٹریٹ لائٹ تلے سنہری دمک رہی تھیں، پھر اس کا خراب بلب بجھ جاتا تو وہ بھی بجھ جاتیں۔

"تمھارا نام۔" آنسو اس کی ناک کی ہڈی سے بہہ گیا۔ "اپنے ساتھ۔ بس۔"

اس کے ہاتھوں نے گریبان آزاد کیا اور قدم ہیلز میں لڑکھڑائے۔ ریٹا فوراً اسے پکڑنے آگے بڑھی۔ ظبیہ نے ہاتھ کی پشت سے اپنے گال سہلائے اور ناک سے سانس اندر گھسیٹی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج ایک قدم آگے بڑھا، اندھیر سڑک پر اس کا سایہ ساری روشنیاں ہضم کر گیا۔ ظبیہ اسے دیکھتی رہی، طیش اور رنج، بربادی اور کہیں نہ کہیں انتظار بھی۔ وہ ہمیشہ اس کا انتظار کرتی تھی، اِرادۃً یا غیر اِرادۃً۔ رانج نے پہلو میں گرا ہاتھ بلند کیا۔ وہ بھنچے ابرو لیے اسے تکتی رہی۔ اس نے آہستگی سے اس کے کندھے سے چار رگوں والا ایک پتہ جھاڑا، نگاہیں فہمیدہ رہیں۔ ظبیہ کی ریڑھ کی ہڈی کانپ اٹھی، لیکن وہ اسے روک نہیں پائی۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور بنا کچھ کہے ہونٹ تلخی آمیز شیریں مسکراہٹ میں گول کیے۔

وہ دیکھتی رہی کہ وہ اب کچھ کہے اب کچھ بولے، لیکن اس کا انتظار جلد ہی ختم ہو گیا۔ رابح نے دونوں ہتھیلیاں اوپر اٹھائیں اور کندھے آہستہ سے اوپر کیے جیسے کہہ رہا ہو، 'اب کیا ہی ہو سکتا ہے؟'

ظبیہ کے آنسو آنکھوں میں ہی جم گئے۔ اس نے جبڑا سختی سے بند کیا اور ریٹا کے ہاتھ سے کچھ جھپٹ کر چھینا، دوسرے ہاتھ سے رابح کی آستین کھینچی اور اس کی ہتھیلی اپنی طرف موڑی۔

"شکریہ مجھے ہمیشہ عزیز رکھنے کے لیے۔ اور شکریہ اُس ایک لمحے مجھے سب سے حقیر محسوس کروانے کے لیے۔"

اس کے ہاتھ میں کی چین جھونکتے وہ اپنی ایڑھیوں پر گھوم گئی۔ ریٹا بھی اس کے ساتھ بھاگی۔ وہ پیچھے نہیں مڑی تھی۔ وہ پیچھے نہیں مڑے گی کیونکہ مڑ کر دیکھنا شبہ کی نشانی تھی، جھجھک کی ادا تھی۔ وہ رابح آدم کو چھوڑ کر آگے بڑھے گی۔

پیچھے کھڑے مرد نے ہاتھ میں رکھی کی چین کو دیکھا۔ بوئنگ ۷۴۷ طیارے کا چھوٹا نمونہ اور اس کے نیچے کنندہ الفاظ۔

Queen of the Skies.

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے سر ترچھا کیا اور سفید اور نیلے پلین ماڈل کو ہوا میں موڑا۔ وہاں اس کا اپنا لکھا پیغام درج تھا۔

May your dreams take flight, my queen.

خدا کرے آپ کے خواب پرواز لیں، میری ملکہ۔ اس نے مٹھی بند کر لی اور ایک سانس خارج کی۔

★★★

اپارٹمنٹ کا دروازہ میکانکی گنگناہٹ کے ساتھ ایک طرف ہوا۔ راہداری میں لگے سینسر نے اس کی موجودگی کا اندازہ کرتے نیچے کھڑی مجروح صورت پر سنہری روشنی کی بوچھاڑ پھیلائی۔ اس کی حرکات سست، جاں گداز تھی، اور ہر ہر قدم میں بستی تعزیر چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

بائیں ہاتھ کی سرخ و سفید انگلیوں میں قابض بیساکھی کا ڈنڈا اس کے قلاب تلے مدفن تھا۔ ہر چھوٹے ڈگ کے ساتھ لوہے کی چرچراتی آواز کمرے میں تیرتی اجیرن خاموشی میں دراڑیں پیدا کر رہی تھی۔

لال ہوڈی اور سیاہ بامبر جیکٹ پر جگہ جگہ دھول واضح تھی۔ جیکٹ کا چمڑا ابھی اس کے کندھوں پر بھاری تھا، گویا کہ اس کی غموں میں برابر کا حصے دار ہو۔ اس نے اپنے پیچھے دروازے کو بند ہوتے سنا۔

صحن میں روشنی کی قلت تھی، لکڑی کے فرش پر بے ربط اور پر اسرار سائے نمودار ہوتے جنھیں چاندنی کی پٹی پل بھر کے لیے بہالے جاتی، اور اگلے ہی لمحے نئی اشکال سے تبدیل کر دیتی۔ اس نے واکر کا سہارا لیتے دم بھر کا وقفہ لیا، پھیپڑوں سے آزاد ہوتی سانسیں غیر متوازن اور لپلپی تھیں۔ ہیزل آنکھیں کانچ سی چمکدار مگر بے ٹھکانہ تھیں۔ ان کا مرکز کچھ بھی نہیں تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اسے لگا تھا وہ صبر کر جائے گا، اسے لگا تھا وہ سہہ جائے گا، گمان کیا تھا کہ وہ الم کی سر اٹھاتی ٹیسوں کو مقفل کر کے دن گزار دے گا، لیکن اب تنہائی میں خود کا سامنا کرتے کوئی نہیں تھا جسے وہ دھوکہ دیتا۔ کوئی نہیں تھا جس کا مان رکھتا۔ کوئی نہیں تھا جس کے لیے اپنا دل مارتا۔

واکر دروازے کے پاس زیر ہوا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے صوفے کے ہتھے تک پہنچا۔ اس کا جسم بد ذوق سے انداز میں گدے میں ٹکڑا ٹکڑا ہوا۔ چمڑے کی سرسراہٹ نے اس کے نیچے سر نکالا۔ سیلنگ پر پردوں کے

جھلانے کے سائے واضح ہوئے۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالوں میں دفن کر لیا۔ کپکپاتی انگلیوں نے نفرت بھرے انداز میں بھورے بالوں کے تنکے جکڑے۔

اس کا وجود پہلے پہل کپکپاہٹ سے نیست ہوا، ایسی لرزش جو غیر معین آنکھ سے منہ چھپالے، لیکن پھر جیسے سیلاب کی آمد پر جانفشانی کرتا کوئی ڈیم۔

ایک بھاری، پھنداکن آواز اس کے ہونٹ چیرتے باہر لپکی۔ ادھ ہوک، ادھ پھونک۔ وہ ایسی آواز تھی جو اس کی روح کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر نکلی تھی، ناپختہ اور ادھوری۔ اس کے کندھے پھول گئے اور جسم اپنے آپ میں مڑتے مڑتے باریک سے باریک تر ہوا۔ جیسے دعا گو ہو کہ اس صوفے میں پگھل کر فنا ہو جائے۔

اس کا دماغ ٹوٹتی جڑتی یادوں کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کی ہنسی، اس کا لمس، اس کے موجودگی کی اطلاع پر چمک پکڑتی بھوری آنکھوں کا بڑا ہو جانا۔ کسی کے لیے وہ اتنا اہم تھا۔ اور اب، سرخ، عروسی لباس کی زینت، صفات حسن سے بہرہ ور، لیکن کسی اور کے نام، کسی اور کے ساتھ۔ اسے لگا تھا اس نے خیر کے لیے بڑا قدم اٹھایا تھا، اسے خود سے دور بھیج کر اپنی ریزہ ریزہ، شکست خوردہ ذات سے، اس خلا سے جو وہ بن گیا تھا، محفوظ کر لیا تھا۔ مگر وہ ناکافی تھا، وہ سب ناکافی تھا۔

رائج آدم ظبیہ یمین کو کھو چکا تھا، اور اس کی کمی نے اسے تاعمر کھوکلا کر دیا تھا۔

آنسو، گرم سیسے کی مانند، اس کے چہرے سے پھسل کر بہہ رہے تھے، پسینے اور دھول میں اٹے گالوں کے درمیان ناہموار راستے نکالتے۔ اس نے انھیں پونچھنے کی جہد نہیں کی، وہ کر ہی نہیں پایا۔ اس کے ہاتھ اپنا

گریبان، ماتھے پر رائیگاں بال اور سینا نوچنے میں مگن تھے، گویا کہ اس کرب کو اپنے دل سے کھینچ کر نکال دینا چاہتا ہو۔ بلند ہوتیں سبکیاں اس کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔

اس کی بصارت پر دھند چھا گئی تو اس نے آنکھیں بھینچ کر بند کیں، مگر دماغ کے پردے پر حملہ آور تصاویر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ ظبیہ کا نرم چہرہ، تبسم بکھیرتا، پھر زخموں کی مالا اوڑھا اور آخر کار، نفرت کے انگاروں سے سلگتا ہوا۔ سب اس کے لیے۔

اس کا ہاتھ خودکارانہ طور پر جیب کی جانب بڑھا اور اپنا بٹوا ٹٹولا، پھر کپکپاتی انگلیوں سے اسے باہر نکالا۔ مختلف کارڈوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے درمیان ہاتھ گھماتے اس کی انگلیوں کی پوریں ایک چھوٹی، خستہ تصویر سے جا ٹکرائیں۔ اس نے بے حد دھیرج سے اسے باہر کھینچا۔

پاسپورٹ سائز تصویر میں ظبیہ سیاہ حجاب باندھے تھی۔ اس کا نوعمر چہرہ زندگی سے بھرپور اور مسکراہٹ بے لگام تھی۔ وہ مستقبل کے خراشوں سے مکمل تہی تھی۔ بھوری آنکھیں، ہمیشہ نرم اور التجا کن، کس دل سوزی سے اسے جانچا کرتی تھیں۔ اسے اپنے کانوں میں اس کی ہنسی گونجتی سنائی دی، اور اس آواز نے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کے اندر مخصوص پاتال میں روشنیاں بکھیر دیں۔ اس کے کھنڈرات میں دن کر دیا۔ لیکن جس تیزی سے وہ آواز ابھری تھی، اتنا ہی جلدی معدوم ہو گئی۔

اس نے تصویر کے کنارے نہایت نرمی سے اپنے انگوٹھے سے سہلائے، گویا وہ اس کی آخری نشانی کو چوٹ پہنچانے کے ڈر میں جکڑے ہو۔ ہیزل آنکھوں نے ہر ہر تفصیل اپنے حصار میں لی۔ اس نے ظبیہ کے تحفظ کے خاطر ان کے راستے جدا کر دیے تھے، اپنی برباد شدہ زندگی کے ڈھیر میں اس کا نام شمار ہونے سے روک دیا تھا، لیکن اس کو پناہ دیتے وہ خود کو اجاڑ کر چکا تھا۔

تصویر میں واضح چہرہ نئے آنسوؤں کے پار ملگجا ہو گیا، مگر اس نے پلکیں نہیں جھپکیں۔ کاغذ کا باریک ٹکڑا اس کے سفید پڑتے بند انگشت میں قابض رہا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

اس نے آنکھیں موندتے تصویر ہونٹوں کے قریب کی، اور چند ثانیے یونہی گزار رہا۔ وقت کا حساب معنی نہیں رکھتا تھا، گھڑی کی سوئیاں، کھڑکیوں کے پار گہری ہوتی رات، کچھ بھی وجود نہیں رکھتی تھی۔

یکبارگی وہ کسی احساس کے تحت اٹھ بیٹھا۔ اس شتابی سے ہلنے پر اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ ظبیہ یمین اس کی نہیں تھی، کبھی نہیں تھی، تو وہ کیا حق رکھتا تھا اس کی پرزے سمیٹنے کا؟ نووارد آنسو اس کی آنکھوں میں اترنے لگے، مگر اس نے انھیں ہاتھ کی پشت سے صاف کیا، اور بمشکل کھڑا ہوا۔

اس کے پیروں تلے فرش چکرا رہا تھا، اور جسم لہک رہا تھا۔ اسے لگا اس کی ٹانگیں سیسے کی بنی تھیں اور گھٹنے ڈھے جانے کو تھے۔ آگے بڑھ کر واکر کا لوہا تھاما اور ایک ہاتھ سے پاس کھینچا، دوسرے میں تصویر قید تھی۔

ہر قدم تکلیف تھا۔ چکنے فرش پر واکر کو گھسیٹ کر وہ باورچی خانے کی چوکھٹ تک پہنچا۔ اس کی ہر سانس ادھڑی ادھڑی تھی اور ہر چھوٹی بڑی حرکت درد کی نئی ٹیس کو دعوت دیتی تھی۔ کاؤنٹر تک پہنچ کر اس نے کمزور انگلیوں سے ماچس کا ڈبہ ٹٹولا۔ آخر کار وہ اسے برآمد ہوا اور اس نے ایک تیلی باہر نکالی۔

اس کے ہاتھ اس برہمی سے لرز رہے تھے کہ ایک ماچس کی تیلی جلانے میں اسے کئی بار شکست ہوئی، لیکن بلآخر لکڑی نے شعلہ تھام لیا۔ روشنی کی نازک کرن نے اندھیر کمرے میں جنم لیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے تصویر کو جانچا۔ ہیزل آنکھیں ہزارہا جذبات سے پل پل ناس ہو رہی تھیں۔

"یہی ٹھیک قدم ہے۔" اس نے دل سے شک کے بیج کھود کر نکالے۔ اسے ظبیہ کو چھوڑنا تھا، اسے اپنی زندگی میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھنا تھا، جیسے وہ بڑھ چکی تھی۔

لیکن ظبیہ کی آگے کیا تھا؟ ظبیہ کے بعد زندگی کیا تھی؟

اس کی آخری نشانی کو مسمار کرنے کا خیال اس کے اپنے دل میں آبلے ڈال رہا تھا۔

اس نے فوٹو کو بیسن کے کنارے تھاما اور تیلی قریب لایا۔ شعلے نے تصویر کا کنارا اپنی لپیٹ میں پکڑا، اور پھر آہستگی سے سارے کاغذ کو چاٹتے، اسے سیاہ راکھ میں مروڑ ڈالا۔ وہ محو سا دیکھتا رہا۔ آگ ظبیہ کی تصویر کو مکمل نگل گئی، اور اس کی نارنجی شعلوں کا عکس رابح کی آنسوؤں سے بھاری آنکھوں میں بنتا مٹتا رہا۔

درد فوری اور لاانتہا تھا۔ اس کے سینے میں چبھن یکدم تیز ہوئی۔ رابح نے تیلی کو آزاد کیا جو بیسن میں گر کر مرطوب ہو گئی، اور ہاتھوں سے اپنا سینہ تھاما۔ اس کی سانس اٹک رہی تھی۔

وہ بیسن سے پیچھے لڑکھڑایا، ٹانگیں اسے کھڑا رکھنے سے انکاری تھیں۔ بھاری ہچکیوں کی درمیان وہ ٹھنڈی زمین پر ڈھے گیا۔ وہ روتا رہا، روتا اور پھر اور روتا۔

ظبیہ، ظبیہ، ظبیہ۔ اس کی ہر یاد آج اسے ستا رہی تھی، ڈس رہی تھی، کلس رہی تھی۔ کس قدر مان سے دیکھا کرتی تھی وہ اسے گویا وہ دنیا کا پہلا اور آخری مرد ہو۔ اس کی ہستی میں اس نے اپنے لیے وہ محافظ ڈھونڈا تھا جو زندگی نے اسے کبھی نہیں بخشا تھا۔ کتنی محبت، کتنا خیال۔ اس نے اپنی ذات سے بڑھ کر بھروسہ کیا تھا اس پر۔ وہ تو ہمیشہ مشکور رہا تھا اس کا، اس کے ساتھ کا، تو اس کا کون سا عمل اسے اتنا دور لے گیا تھا؟

کسی اور کی چھت تلے، کسی اور کی پناہ میں۔

اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔

کسی اور کے نکاح میں۔

وہ اس فرش پر نہ جانے کب تک لیٹا رہا، سخت ٹائلز کی خنکی اس کی ہڈیوں میں جھانکتی رہی۔ اس کے جسم میں اب بھی کپکپاہٹ رینگ رہی تھی۔ کوئی فرار نہیں تھا۔ نجات کی قیمت ہمیشہ جرم سے زیادہ ہوتی ہے۔

چھت کو تکتی اس کی خالی خالی نگاہوں میں آنسوؤں کے ہمراہ رات سمو گئی، اور وہ ماضی کی تڑپ میں کبھی نہ ملنے والی محبت کا سوگ مناتا رہا۔

★★★

وہ دنوں کی گنتی بھول رہا تھا۔

اسے یاد رہتا تو بس اتنا کہ کسی ذی روح پر بھروسا نہیں کرنا تھا، کسی کی باتوں میں نہیں آنا تھا اور کوئی بھی رپورٹر چاہے جتنا بھی خوش اخلاق اور پر خلوص ہو، اس کا دشمن تھا۔ جہاں پہلے وہ سڑک سے گزرتے دس طرح کے حفاظتی اقدامات لیتا تھا اب سر اٹھائے روڈ پر نکل آتا تھا۔ کیمرے اب بھی اس کی جانب جھپکتے تھے، قاتل اور دغاباز کے نعرے اب بھی اونچے ہوتے تھے اور لوگ اب بھی اسے دیکھ کر سوالات چبھوتے تھے، لیکن اس نے رد عمل ظاہر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے احساس کرنا چھوڑ دیا تھا، اس نے وضاحتیں دینا ترک کر دی تھیں کیونکہ اس کی زبان نے راہ بدل لی تھی۔

اب وہ تھا، اپنے ساتھ بھی اور اپنے مقابل بھی۔

ٹریڈ مل کی سیٹنگ آہستہ کرتے اس نے گردن میں پڑے تولیے کی مدد سے اپنے گال پونچھے۔ پسینہ بوند بوند اس کی چمکتی جلد پر نمایاں تھا۔ سفید ٹی شرٹ اس کے اوپری جسم پر چت تھی اور آخر کار دونوں بازو پٹی کی قید سے رہا۔ آج وہ واکر کے بغیر پہلی بار چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

قریب اسٹینڈ پر رکھا اس کا فون تھرتھرایا تو اس نے جھک کر اسکرین دیکھی۔

باس کالنگ۔

"یس سر؟" اس کی آواز روکھی تھی، آنکھیں بھی ساخت۔

"ہیڈ کوارٹر پہنچو۔ ارجنٹ ہے۔"

تھوڑی دیر میں رائج آدم ملائیشیا ایئر لائنز آفیس کے شفاف زینے احتیاط سے عبور کرتا سربراہان کے کمرے کی جانب جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرمئی فٹنگ والا سوٹ اور پینٹس زیب تن کی تھیں، آنکھیں سنجیدہ اور بھورے بال برابر کٹے ہوئے۔ اس کی داڑھی بھی اب کہ ترتیب شدہ تھی۔ سی ای او کے دروازے پر دستک دیتے وہ اندر داخل ہوا تو منیب احکام نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔ وہ کسی اور ملازم کے ساتھ زیرِ گفتگو تھے تو اسے دیکھتے خاموشی سے اپنی بات ختم کی۔

واکر کو ساتھ چلاتے وہ لیدر کی کرسیوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور بازو سامنے باندھے۔ دوسرا آدمی جا چکا تو انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے اسے دیکھا اور سیٹ میں پیچھے ہوئے۔

"کیسے ہو رائج؟ تمھاری ریکوری؟"

"الحمد اللہ۔" وہ نیچے دیکھتا رہا۔

"میڈیا تمھیں تنگ تو نہیں کر رہا؟" وہ جو پوچھ رہے تھے اس کی استہزاء سے وہ دونوں ہی آگاہ تھے۔ رائج کو میڈیا تنگ نہیں کر رہا تھا، اجاڑ رہا تھا، بلکہ اجاڑ چکا تھا۔ اسے بڑھاوا دینے میں بھی اس کے بہنوئی کا ہاتھ تھا جسے لگتا تھا وہ اپنی بہن کو وراثت کے نام پر بھگوس گیا ہے۔

"زیادہ نہیں۔" اس نے جھوٹ کہا اور انہوں نے اس کا جھوٹ مان لیا۔

"دیکھو کیس کی تفتیش تو چل ہی رہی ہے۔ اب تک نہ بلیک باکس ملا ہے نہ ہی اٹوپسی ٹیسٹنگ سے کچھ ٹھوس ہاتھ آیا ہے۔ پولیس اس میکانک کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے پلین ماڈل بنایا تھا لیکن وہ۔۔۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "ملائیشیا میں نہیں ہے۔ ہمیں اس کی لوکیشن کا اندازہ نہیں۔"

وہ خاموشی سے سنتا گیا۔ اسے سب پتا تھا، ظاہر ہے اسے سب پتا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری ڈسکس کرنا تھا۔ بیٹھو گے؟"

بیٹھو کے بجائے بیٹھو گے، رائج نے ان کے رویے میں دور جلتی لال بتی دیکھ لی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے۔" وہ مطمئن لگے اور دراز سے کچھ نکالنے میں مگن ہوئے۔ ان کی حرکات سست تھیں جیسے وہ خوفزدہ ہوں یا شرمندہ یا پھر دونوں۔

"یہ۔۔۔" انہوں نے ایک لمبا کورا کاغذ اس کے سامنے رکھا، دانت ہونٹ چبا رہے تھے۔

رائج نے سوالیہ نظروں سے بغور اسے دیکھا اور پھر انھیں۔

"تمھارا سسپنشن لیٹر ہے۔ چھ ماہ کا۔" وہ بے چین تاثرات سے اسے دیکھتے رہے اور وہ ساکت کھڑا اس کاغذ کو۔ پھر اس نے آگے جھک کر اسے اٹھایا اور اپنی طرف موڑا۔ وہاں انگریزی کے سطور درج تھے، دو ڈھائی سو الفاظ کی فضول بکواس۔ اسے ایک جملے سے زیادہ کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن پوچھنے کی تھی۔

"آپ مجھے فائر نہیں کر رہے؟"

"اللہ اللہ بالکل نہیں۔ بس اس انویسٹیگیشن کے اختتام تک تم سسپنڈ ہو، ورنہ تو تم ہم میں سے ہو رائج۔"

اس نے پیپر تہہ کر کے جیب میں ڈالا۔ "آپ کو کیسے یقین ہے تفتیش کے آخر تک میں مجرم ثابت نہیں ہوں گا؟"

"کیونکہ تم بے قصور ہو۔"

رانج نے چہرہ ہلکا سا ترچھا کیا۔ "وہی تو۔ آپ کو کیسے پتا؟"

منیب احکام کے ہونٹ سل گئے اور آنکھیں گھبراہٹ میں کھل بند ہوئیں۔ اچانک آفیس کا وہ کمرہ سکڑنے لگا تھا۔ انھیں بے اختیار اپنی ٹائی ڈھیلی کرنی پڑی، گردن کے نیچے لٹکتا گوشت آزاد ہوا۔

رانج ان کی بے آرامی پر مسکرا دیا۔

"چھ مہینے بعد۔" اس نے دو انگلیوں سے سلام پیش کیا اور دروازے کی جانب مڑ گیا۔

★★★

چھ ماہ کا عرصہ سننے میں جتنا اذیت ناک لگتا تھا، درحقیقت اس سے کئی گنا زیادہ تھا۔ سسپنشن کے پہلے ماہ سے اس کے دن آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے، رات دن اور دن رات لگنے لگے تھے۔ وہ کبھی لاؤنج کے صوفے پر سویا رہتا تو کبھی کمرے میں رکھی شیشے کی سینٹر ٹیبل کے گرد قالین پر آنکھیں موند لیتا۔ وہ سوتا جاتا، کبھی پوری رات، کبھی پورے دن۔ جب جاگتا تو اس کا ہلیہ بگڑا ہوتا، گھر کوڑادان لگتا۔ ایک ہاتھ سے مکھن لگی ڈبل روٹی کھاتے وہ دوسرے سے بکھرے بال درست کرتا، تھوڑی دیر جاگتا اور جگہ دیکھ کر پھر کہیں سو جاتا۔ سونا اس کا فرار بن گیا تھا، وہ واحد لمحات جب وہ دماغ کے کونے کونے سے اٹھتے شور کو قابو کر پاتا۔ جب وہ اماں کی مسکراہٹ بھلا پاتا، رباب کی چھیڑ خانیوں سے بے نیاز رہ سکتا، ادا کی ہنسی سے ہوتے دل کے درد کو محسوس نہ کرتا اور ظبیہ کے آرات جیسے الفاظ کا بوجھ اپنے سر نہ لیتا۔ سونا اس کی رہائی بن گیا تھا۔

اس کا فون بجتا تو وہ خواب کی سی کیفیت میں اسکرین دیکھتا۔ اسے دن میں درجنوں کالیں موصول ہوتی تھیں، ساری اسپیم، متجسس عوام جو اس کے منہ سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

وہ اکثر نمبر بلاک کر کے کروٹ بدل لیتا، کبھی نیند زیادہ خراب ہوتی تو اٹھا کر غلط زبان استعمال کر لیتا۔ پھر کال خود نہیں آتی تھی۔

دن کٹ رہے تھے، اس کا وزن گھٹ رہا تھا۔ اتنا سونے کے باوجود جب اسے اپنے آنکھوں کے گرد حلقے گول ہوتے نظر آئے تو اس نے حیرت سے ابرو اٹھائے۔ اسے اپنا جسم ڈھیلا پڑتا محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ پورا دن کچھ نہیں کرتا تھا۔ نہ کسی سے بات کرتا، نہ فون اٹھاتا، نہ کھانا ٹھیک سے کھاتا اور نہ گھر سنبھالتا۔ وہ چھت کو تکتے رہتا تھا، گھنٹوں گھنٹوں یونہی اس سفید سیلنگ کو گھورتا رہا۔ پہلے عصر کی اذان ہوتی، تھوڑی دیر بعد مغرب۔ وہ ہاتھ سے دیوار پر بنتی نارنجی دھوپ میں طوطے کا عکس بناتا۔ ادا اس پر ہنس دیا کرتی تھی۔ عشا کی اذان تک ساری روشنیاں پھیکی پڑ جاتی تھیں۔ وہ یونہی لیٹا رہتا۔ اسے ظبیہ یاد آتی تو وہ کھڑکی میں جھک کر اس کے گھر کی جانب دیکھتا۔ وہاں اب صرف اس کے ابا رہتے تھے۔ وہ شادی کر کے چلی گئی تھی، اس کی خالہ بھی چین شفٹ ہو گئی تھیں۔

وہ زیادہ یاد آتی تو وہ پلنگ پر گر جاتا اور اپنا فون کھول لیتا۔ پرانی چیٹ کے چار سطور پڑھتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ اسے حیرانی تھی کہ وہ کتنی آسانی سے نیند کا عادی بن گیا تھا، بغیر کوئی منشیات یا مخدرات کے استعمال کے۔ ہنسی بھی آتی تھی، لیکن منہ ہلاتے اس کا چہرہ دکھتا تھا۔

وہ فون پر گروسری کا آرڈر لکھواتا تو اسے اپنی آواز پہچان میں نہ آتی۔ وہ ہفتوں ہفتوں بعد منہ کھولتا تھا۔ ایک روز آرڈر لکھواتے اسے اپنا نام بھول گیا تھا۔ وہ سر کھجاتا رہا اور پورا گھر ڈھونڈ کر اپنے یونیورسٹی کے پرانے نوٹس میں سے پڑھ کر سنایا۔

جب وہ پورا دن سوتا تو اس کی راتیں سنسان گزرتیں۔ وہ بنا پلک جھپکائے آس پاس دیکھتا رہتا، اپنی ہتھیلیاں آنکھوں کے سامنے کر کے کھل بند کرتا، ایک سے سو تک گنتی گنتا اور پھر سو سے واپس ایک تک، بیڈ شیٹ کے پھول انگلی کی پوروں سے سہلاتا اور آخر میں خود ہی ہنس دیتا۔ کبھی کبھی وہ رباب کے نمبر پر کال ملاتا۔ اوپریٹر اسے پیغام سنا کر کال کاٹ دیتی لیکن وہ بولتا رہتا۔ کیا بولتا، اسے خود یاد نہ رہتا۔ اس کے الفاظ مل جل جاتے، باتیں اور ہنسی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوتی، اور پھر دن چڑھ آتا۔

تیسرا مہینہ گزر رہا تھے، لیکن دنیا کیس نہیں بھولی تھی۔ ان کی نفرتیں اتنی ہی اٹل تھیں۔ مارچ کے ایک دن جب وہ باتھ روم میں کھڑا منہ پر پانی پھینک رہا تھا تو اس کا فون بجا۔ وہ چہرہ سکھاتے کمرے تک آیا تو کال پر جوہان تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے رک کر آس پاس دیکھا پھر آخر کار ہر ابٹن دبا کر فون کان پر لگایا۔

"یا اللہ تم زندہ ہو؟" اس کے پیچھے گاڑیوں کا شور سنا جا سکتا تھا لیکن اس کی اپنی آواز کی حیرانی سب سے نمایاں تھی۔

رانج نے کچھ کہنے کے لیے لب ادھ کھولے، آواز گلے میں اٹک گئی۔ اس نے گلا صاف کیا۔ "اگر تم پھر سے مجھے کورٹ آ کر کسی ڈیفینس وکیل سے ملنے کا مشورہ دو گے تو تھینک یو۔ میں مردہ ہی ٹھیک ہوں۔" اس نے فون اسپیکر پر کیا اور میٹرس پر پھینکا، خود وہ الماری سے دوسری ٹی شرٹ نکالنے آگے بڑھا۔

"نہیں دیتا اور انشاء اللہ اب تمھیں ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔" جوہان کی آواز میں دبی دبی سی خوشی تھی۔

وہ سیاہ ٹی شرٹ لے کر پیچھے ہوا اور پٹ بند کیا۔ قدم قدم پلنگ تک آتے اس نے شرٹ سر کے اوپر کھینچی۔ "کیا مطلب؟"

"سچ کی پہلی سیڑھی، رانج۔ تم اسے عبور کر چکے ہو۔"

حرکت کرتے اس کی ہاتھ تھم گئے۔

"اٹوپسی رپورٹس! میں ابھی فارنسک لیب سے آ رہا ہوں۔ وہاں کی ڈاکٹر امبر سفا، اس نے خود کہا ہے مسافرین کی موت کی وجہ صرف اور صرف کریش کا امپاکٹ (زور) ہے۔ No foul play detected."

اچانک اس کے گرد دنیا نے اپنے چکر میں تیزی اختیار کی۔ اسے کھڑا رہنے میں دقت ہوئی۔

"سچ؟" امید۔ کیوں نہیں چھوڑتی تھی یہ شے انسان کو؟

"ایک دم۔ اس کی میڈیا سے گفتگو ہے شام میں۔"

"آج شام؟"

"کل شام رائج۔ ابھی رات ہو رہی ہے۔" وہ ایک منٹ ٹھہر گیا، اس کی لہجے کی فکر مندی ظاہر ہوئی۔ "تم اب اٹھے ہو؟"

رائج نے چہرہ پھیر لیا۔ "خدا حافظ۔" فون پر بنا سرخ بٹن دبا کر وہ پیچھے ہٹا تو اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس نے چہرہ موڑ کر اپنے کمرے کے کھلے پردوں کو دیکھا جو چند لمحات پہلے اس ہی نے ہٹائے تھے، اس سوچ میں کہ دھوپ اندر آئے گی۔

وہ رات کے نو بجے دھوپ کے لیے پردے کھول رہا تھا۔

اسے اپنے پیٹ کے نچلے حصے میں الجھن محسوس ہوئی تو وہ واش روم کی جانب بھاگا۔ پچھلے دو دن میں پیا سارا پانی باہر آ چکا تھا۔

★★★

امبر سفا کے بیان سے دنیا اتنی ہی اس کے ساتھ ہوئی تھی جتنا پہلے تھی۔ صفر فیصد۔ میڈیا سے گفتگو میں اس نے واضح الفاظ میں اپنا غم پیش کیا تھا اور بتلایا تھا کہ رائج پر لگائے گئے الزامات میڈیکل سائنس کی نظر میں بے بنیاد اور ناقابل یقین ہے، لیکن کچھ عقل والوں کے سوائے باقیوں نے اسے جھوٹ کی رکھوالی مان لیا تھا۔ گزرے تین ماہ میں میڈیا کی قائم کردہ تصویر اتنی پختہ اور مضبوط ہو چکی تھی کہ عوام کا اس پر سے یقین ہلانا دشوار تر ہو گیا تھا۔

رائج کی امیدیں ایک بار پھر کانچ بن گئیں، لیکن اس نے شکوہ نہ کیا۔ جو ہان اس کے گھر کے لاؤنگ میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر اسکرول کر رہا تھا، گھنی ابرو آپس میں ملیں تھیں۔

"لوگوں کا دماغ خراب ہے!" اس نے کسی ہیٹ ٹویٹ کا جواب دیتے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔

کچن سے باہر آتے رائج کے ہاتھوں میں دو مگ تھے۔ اس نے جوہان کی طرف ایک بڑھایا اور اپنا لے کر کھڑکی کے ساتھ رکھے بین بیگ کرسی پر ڈھے گیا۔ ہیزل آنکھیں باہر پھیلتی مغرب کو دیکھتے ذرہ برابر پر فکر ہوئیں۔ رات ہو رہی تھی۔

جوہان نے اپنے ہاٹ چاکلیٹ کا سپ بھرا ہی تھا جب تھوڑے فاصلے پر نشست مرد کی گہری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تم گھر جاؤ گے؟"

اس نے سر اوپر اٹھایا، آنکھوں میں تھوڑی حیرت تھی۔ "نہیں، میرا سارہ کے ساتھ پلین ہے۔" اس کی منگیتر۔ رائج کو اتنا تو پتا چل ہی چکا تھا اس کے بے وقت میسجز سے۔ اس نے خاموشی سے اپنی کالی کافی کا گھونٹ پیا۔

"کیوں؟" جوہان اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس نے بس ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"تم چاہتے ہو میں رک جاؤں؟"

رائج نے گردن اکڑائی۔ اس ایک لمحے کے وقفے میں اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا، ہونٹوں کے کنارے میں لغزش ہوئی تھی، پھر اس نے کافی کا ایک اور گھونٹ بھرا اور بین بیگ میں پیچھے کو ہو کر لیٹ گیا۔

"سارہ۔" صرف ایک لفظ کہا اور آنکھیں موند لیں۔

★★★

اگلے سال کا پانچواں مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ کمرے کے بیڈ روم میں رکھے لیپ ٹاپ پر کوئی انیس سو ساٹھ کی فلم چل رہی تھی، باہر دن چڑھے کے باوجود پردے برابر تھے۔ کمرے میں الگ قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی، بوسیدہ اور حامضی کا ملا جلا امتزاج جو چوکھٹ سے اندر قدم رکھتے ہی منہ پر لہروں کی صورت

رسید ہوتا۔ کہیں میز پر ادھ پیے کافی کے کپ ہوتے تو کہیں سینٹر ٹیبل پر دنوں پرانے ڈبل روٹی کے کنارے کٹے رکھے ہوتے۔ پھپھوندی لگی اشیا اور ان دھلی چادریں۔

وہ پلنگ پر اوندھا لیٹا تھا جب اس کا فون تھرتھرایا۔ وہ معمول کے تحت بے حرکت رہا اور اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی داڑھی اوپر نیچے تھی اور آنکھیں اندر دھنس سی گئی تھیں۔ جبڑا اسکڑ گیا اور وزن کئی کلو گھٹ چکا تھا۔

سر کے ایک طرف ہتھیلی جمائی وہ اسکرین پر چلتے اداکاروں کو سنسان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا شوق تھا۔ نیو ہالیووڈ کی فلمیں اسے ہمیشہ سے جدید سنیما سے زیادہ پرکشش لگتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مگر لگتی تھیں۔ اس کی نظر میں، ان کی معتبری کا مقابلہ آج کی کہانیاں نہیں کر سکتی تھیں۔ رباب اسے اس کی پسند پر 'بڈھی روح' کہا کرتی تھی۔

اس کا فون دوبارہ تھرتھرایا۔ اس نے بری سی شکل بنائی اور سوئچ آف کرنے ہی بڑا تھا جب فون پر چمکتا نوٹیفیکیشن دیکھا۔ ایک کے بعد ایک ٹویٹس اسے موصول ہو رہے تھے۔ اس کا دل اچانک تیز بھاگا۔ وہ پلنگ پر سیدھا ہوا اور فون ان لاک کرتے جلدی جلدی ایپ پر ہاتھ چلائے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

پانچ مہینوں کے بعد یہ پہلی بار تھا جو کیس میں اتنی جان آئی تھی۔ اب کیا ہو گیا تھا؟

"نومبر اٹھارہ کو کریش ہونے والے مالائی ایئر بس طیارے کے میکانک ظفر علی نے اپنا بیان جاری کر دیا ہے۔"

اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ پسینہ، پسینہ، پسینہ۔ آرٹیکل پر کلک کرنے سے قبل اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ سو جھوٹ کے بعد وہ پہلا سچ ہو گا یا ایک سو ایک نمبر دھوکہ؟

اس نے ایک سانس اندر کھینچی اور لنک کھول ہی دی۔ اس کے فون پر کئی تصویریں چمکیں اور پھر پورا آرٹیکل کھل گیا۔

"ظفر علی مالدیپ میں اپنے چھ ماہ اسٹے کے بعد کوالالمپور لوٹے ہیں۔ ایک قابل میکانکل انجینئر اور ملائیشیا ایئرلائنز کے بھروسامند ملازم، ان کا بیان کیس کے لیے فیصلہ کُن ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ موجودہ جال سے تفاوت رکھتا ہے۔"

وہ اسکرین پر بٹن دبا کر نیچے آیا۔ سامنے کسی ٹی وی شو کی براہ راست لنک تھی جہاں ظفر کو انٹرویو کیا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے یوٹیوب وڈیو پلے کی۔

"آج رات ہمارے ساتھ انڈمان کریش کے whistleblower موجود ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ایئر بس G5400 کی تیکنیکی شگافوں کے بارے میں پہلے ہی ایئر لائنز کو چیتاونی دے دی تھی۔ ظفر اپنا نقطہ سامنے رکھیں۔"

ظفر علی کی کھردری آواز اس کے گھر کے خالی کمرے میں گونج اٹھی۔ "شکریہ مجھے بلانے کے لیے۔ میں نے G5400 کے فیول سسٹم کے بارے میں ایئر لائنز کو کریش سے مہینوں قبل ہی اطلاع کر دی تھی۔ انہوں نے مجھے نہ سننے کا فیصلہ کیا۔"

انکر نے ابرو اٹھائے۔ "آپ نے کیا بتایا تھا ایئر لائنز کو؟ ہمیں کھل کر بتائیں۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظفر نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے ایک ڈیٹیلڈ رپورٹ تیار کی تھی، ثبوت اور دلائل سمیت جس میں G5400 کے فیول سسٹم کے خرابیاں واضح تھیں۔ میں نے انھیں سارے طیارے گراؤنڈ کرنے کہا تھا تاکہ مکمل طور پر جانچ ہو سکے، لیکن انہوں نے مجھے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ منیب احکام کے لیے سیفٹی سے زیادہ عزیز منافع ہے۔"

انکر نے ہاتھ آپس میں پھنسائے۔ "کیا آپ کا اشارہ کریمنل انٹینٹ کی جانب ہے؟"

ظفر علی اٹل تھا۔ "بالکل۔ یہ جانتے بوجھتے اندھے پن کا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ منیب احکام کو کمپنی کی بوٹم لائن کی فکر ہے۔ ظاہر ہے اتنے طیارے فارغ ہو جاتے تو انھیں کروڑوں کا نقصان برپا کرنا پڑتا۔"

انکر نے اپنے ائیر پیس کو چھوا اور پھر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "بریکنگ نیوز جسٹ ان! منیب احکام کو ان کے گھر کے باہر سے حراست میں لے لیا گیا ہے۔ پولیس اہلکاروں نے انھیں اپنے ٹریول بیگ کے ساتھ پایا۔ شبہ ہے کہ وہ ملک سے فرار ہونے کے سفر میں تھے۔ کیا کہنا چاہیں گے، ظفر؟"

ظفر نامی آدمی مسکرا دیا اور چہرہ ترچھا کیا۔ "اگر میرے الفاظ انصاف دلا سکتے ہیں تو میں ہر بار، ہر مظلوم کے لیے آواز اٹھاؤں گا۔"

"آپ کی پلین کے پائلٹ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اب کہ جب ہمیں پتا ہیں وہ بے قصور تھے؟" اب کہ انکر پرچے پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ظفر نے ایک ٹھنڈی سانس اندر کھینچی۔

"کیپٹن رابح نے سنگین الزام تراشیاں برداشت کی ہیں۔ سربراہان کی ناکامیوں کے لیے انھیں قربانی کا بکرا بنا لیا گیا تھا۔ پائلٹس ہر روز ہزاروں فٹ اوپر اپنی جان داؤ پر لگاتے ہیں تاکہ کسی اور کا سفر آرام بخش بنا سکیں، ان پر کسی نظامی مسئلے کا ملبہ ڈالنا نہ صرف نہ انصافی بلکہ اصل مسائل سے دغا بھی ہے۔"

اس نے سستی کے ساتھ اپنے پیر پلنگ سے نیچے اتارے، پس منظر میں ظفر علی اب بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی قوتِ سماعت دھیمی پڑ رہی تھی، ہر لفظ اس کے کانوں سے دور ہی اپنے معنیٰ کھو جاتا۔

اس نے ایک ہاتھ سے میٹرس کی چادر کس کے تھامی، آنکھیں دیوار پر جڑے کسی ان دیکھے نقطے کو سراہتی گئیں اور پھر وہ آہستگی سے مسکرا دیا، چہرے کی تکان مکمل غائب ہو گئی اور گال پر آدھا چاند واضح ہوا جو اپنی جگہ بھول چکا تھا۔

لیکن اگلے لمحے ہی اس کا چہرہ بدل گیا، آنکھوں سے چمک اتر گئی، لبوں سے مسکراہٹ دور ہوئی، سانس اتنی باریک ہوئی کہ اسے خود آواز نہ آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے حسی اس کے عملِ تنفس کو بھی جھنجھوڑ رہی ہو۔

بے حس۔ یہی ایک لفظ تھا اس مجسمے کے لیے جس سے دنیا اپنے شبہات واپس لے سکتی تھی، لیکن اسے اس کا آپ کبھی نہیں لوٹا سکتی تھی۔

★★★

ملائیشیا ایئر لائنز کے باوقار بریفنگ روم میں پروجیکٹر کی نیم نیلی روشنی دیواروں پر سائے کھینچ رہی تھی۔ ایئر لائن کے انتظامیہ کمرے کے چوگرد جما تھے، آنکھوں میں ڈھیروں پیش بندی اور تحقیق لیے۔ یہ واقعہ تھا دو ہزار دس اکتوبر کا، انڈمان کریش کے گیارہ ماہ اور سچ کے کھل جانے کے پانچ ماہ بعد۔ دنیا جان چکی تھی رانج آدم وہ نہ تھا جس کی تصویر برسوں تک میڈیا نے مشہور کی تھی۔ ایسا نہیں تھا ہر ذی روح ہی اس کی معصومیت کی گواہی دینے نکل پڑی تھی، لیکن بے جا ہونے والی تفتیش اور الزام تراشیاں کافی حد تک دم توڑ گئی تھیں۔ جہاں کسی آرٹیکل میں رانج کے مشکوک ہونے کو نقتہ اٹھایا جاتا اس کے برابر ہی دوسرا آرٹیکل منیب احکام کی بے ایمان منصوبے کا ہوتا جس نے ایک مظلوم آدمی کے پیچھے چھپ کر معصوم لوگوں پر وار کیے۔ ساٹھ کا ہندسہ چھوتا وہ محترم چہرہ پیسے کا اتنا کثیر پجاری ہو گا کسی کو نہیں پتا تھا، نہ ہی یہ کہ اس کی رانج کا ساتھ دینے کی وجہ صرف اور صرف ایک تھی۔ اپنا اور ایئر لائن کا نام خراب نہ ہونے دینا۔

سی آئی ڈی افسر ابھیجیت کے بیان نے جہاں رانج کے مجرم ہونے والے پرچم کو ہوا دی، وہیں منیب احکام نے اپنا کھیل ٹیڑھا کر لیا۔ اسے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑا۔ رانج کا ساتھ دے کر وہ ایک نرم دل شخصیت بھی بنا رہا اور اسے اسکیم سے ہٹا کر اس کی ایئر لائن کا نام بھی صاف رہا۔

لیکن نہ تو اب اس کا نام تھا (سوائے گالیوں اور لعنتوں کے) نہ ہی ملائیشیا ایئر لائنز کا۔ پچھلے ایک سال میں ملائیشیا ایئر لائن نے اپنی اعتمادیت ہر طرز سے کھو دی تھی۔ شروعاتی چند ماہ ان کے خلاف مالائی سول ایوی ایشن اتھارٹی کی طرف سے قانونی مقدمے چلتے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اقتصادی خمیازے عروج پر تھے۔ ان کی ساکھ پر اٹھتے سوالات کی وجہ سے ان کی مسافرین کی تعداد بھی پر از مطلب کم ہو چکی

تھی۔ کیونکہ اصل عقدہ ایئرلائن کی قیادت سے بلند ہوا تھا تو بورڈ آف ڈائیرکٹرز نے انتظامیہ ٹیم میں کئی قابلِ توجہ ردوبدل کیے تھے۔ وہ لوگ ہر طریقے سے اپنا غرقاب ہوا اعتماد واپس حاصل کرنے کی جست میں تھے۔

ائیرلائن کے بقیہ اور نئے آنے والے سربراہان نے کیس کی تحقیقات میں بھی پولیس کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا تھا۔ وہ یہ صاف گوئی سے بتلا چکے تھے کہ ان کا جھوٹ اور کسی بھی جھوٹے انسان سے کاروباری یا نجی کوئی بھی معاملہ طے نہیں، نہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی کمر توڑ کوششوں نے عوام کے دل ذرہ برابر ان کی طرف سے پگھلائے تھے، اور گیارہ ماہ سے ہوتے مسلسل بائیکاٹ دھیمے دھیمے چھٹ رہے تھے۔

ان کا پسنجر کاؤنٹ بظاہر نہ سہی، لیکن افزوں ضرور ہو رہا تھا۔ قدم قدم۔

منیب احکام پر بے حساب مقدمات درج ہو چکے تھے اور فی الوقت وہ مقامی پولیس ڈٹینشن سینٹر میں قید تھا۔ سب کو معلوم تھا اس جیسے بڑے آدمی کا کیس اتنی آسانی سے نہیں گلنے والا تھا، اسی لیے سچ کو ٹھوس کرنے کے لیے پزل کی آخری کنجی کی تلاش تھی۔ اور وہ تلاش جب مکمل ہوئی تھی جب دس ماہ بعد پلین کا بلیک باکس سرچ ٹیموں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ رابح کی کوشش اور پریشان بیانات سن کر، اس افسوسناک حادثے کو براہ راست جی کر جو لوگ اس پر ذرا بھی مشکوک تھے، وہ بھی ہار مان گئے تھے۔

رابح آدم بے قصور تھا، اور یہی تھا دی نیو ٹرینڈ۔

اس کو راست گو ماننے والے کہتر سے بیشتر ہوئے تھے۔ کافی مقتولین کی اہلِ خانہ نے اس سے معذرت کرنے کے لیے پہل کی تھی۔ کبھی سادہ پھول بھیج دیے تو کبھی میڈیا کے سامنے اپنا نیا بیان جاری کیا جس میں وہ اسے سارے گناہوں سے پاک مانتے تھے، کہیں عدالت میں کیے مقدمات واپس لے لیے تو کہیں اسے بطورِ خصوصی ای میل کر کے معاوضہ ادا کرنا چاہا۔

تازہ ولایت رکھتے ائیرلائن کے چیف ایگزیکٹیو نے مائیک کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پوڈیم پر آگے جھکے۔

"خوش آمدید خواتین و حضرات، اور معزز ساتھیوں۔ آج کا دن ملائیشیا ائیر لائنز کے لیے عظیم ہے کیونکہ ہم اپنے ہی ایک دوست کی خوش اسلوب کامیابیوں کو سراہنے یہاں جما ہوئے ہیں۔"

پروجیکٹر اسکرین کے سامنے کرسیوں کی قطاریں ائیر لائن کے اسٹاف سے بھری پڑیں تھیں۔ وینیو کے آخر میں لگے نیم سنہرے پردے اے سی کی خنک ہوا کے دم پر آہستگی سے حرکت کر رہے تھے۔ پیچھے اسکرین سے اٹھتی روشنیاں ائیر لائن کا لوگو اور کمپنی کے مخصوص رنگ ہر طرف بکھیرے تھیں۔

"آج ہم اس مقام پر کھڑے رہ کر فرسٹ آفیسر رابح آدم کی توصیف کرتے ہیں، ان کی فلائٹس کے گھنٹوں یا کتنے میل لاگ طے کیے اس بنیاد پر نہیں، بلکہ ان کی قابلِ ستائش ہمت پر، جس کا نمونہ انہوں نے ملائیشیا ائیر لائنز کے ساتھ اپنی مسافرت میں ظاہر کیا۔"

چند چہروں نے پوڈیم کی پچھلی طرف آنکھیں گھمائیں۔ وہ لوگ وہاں کسی کو دیکھ رہے تھے۔

عزالدین اپنی اسپیچ میں بے روک رہے۔ "ایسی آفتیں جو ہم میں سے مضبوط تر تک کو جھنجھوڑ دیں، رابح آدم نے اس طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس سے فتح مند برخاست ہوئے۔ اس بدنصیب حادثے کے بعد جب میڈیا نے ان کے نام کے اوپر سائے بچھائے تو وہ امتحان صرف ان کی پیشہ ورانہ زندگی کو نہیں، بلکہ انسانی طور پر انھیں کوستا تھا۔"

پوڈیم کے پچھلی طرف کھڑے مرد نے ہلکی نیلی شرٹ کے کالر کے نیچے اپنی گردن کھجائی۔ اتنے لوگوں کی نگاہیں اس کی کھال پگھلا رہی تھیں، ایک ایک نظر سیدھا اس کی نسیں چھیڑ رہی تھی۔

"لیکن آج۔۔۔" عزالدین کے الفاظ ختم نہیں ہوتے تھے۔ "جن آزمائشوں سے ہم گزرتے ہیں، وہ ہمیں بیان نہیں کرتیں، بلکہ ہماری پہچان اس سے ہے کہ ہم کس طرح ان کا سامنا کرتے ہیں۔ فرسٹ آفیسر رابح آدم کی کارکردگی مستحق تعریف ہے۔ انتیس سال کی عمر میں، وہ ہماری ائیر لائن کی تاریخ کے سب

سے کم عمر کیپٹن کے طور پر اڈگ ہیں، اور یہ ان کی برتر مہارت اور لگن کا ثبوت ہے۔ کیپٹن رانج اپنے ساتھیوں کے لیے تلقین کی روشنی لے کر ابھرے ہیں۔"

کمرے کی مجموعی نگاہ اس پر تھی۔ گہری سانس باہر چھوڑتے، اس کی تنگ انگلیاں آہستگی سے ڈھیلی ہوئیں۔ اس نے دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ بڑا کرتے اپنا طرز چوڑا کیا، کندھے بھی آرامی سے اکڑائے۔ اب کہ وہ اٹل لگتا تھا، وہی بہادر مجاہد جسے سب داد دینے وہاں اکھٹے ہوئے تھے۔

اس نے چہرہ اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ ہیزل آنکھیں ساخت تھیں، کناروں سے روشنی میں نہائیں اور بیچ سے سیاہی میں رنگی وہ اخفاء دورخی کی مہارت رکھتی تھیں۔

"خدا کرے کیپٹن آدم کا سفر ہم میں سے ہر ایک کو حوصلہ دے کہ ہم آزمائشوں کا مقابلہ استقامت کے ساتھ کریں، اور ان سے مضبوط برخاست ہوں۔"

کمرہ مشترکہ طور پر تالیوں کی گونج سے بھر گیا۔ رانج نے اپنے نام پر قدم پوڈیم کے جانب کیے۔ پس منظر میں کھڑے کیپٹن رحمان نے اسٹیج کے بیچ اشارہ کیا جہاں لکڑی کی چھوٹی سی میز سجائی گئی تھی، جس پر کیپٹن کے عہدے سے منسلک امتیازی نشانات کی جھلک تھی۔ وہ بنا سوال کیے اس طرف چل دیا۔

کیپٹن رحمان نے اس کے مقابل کھڑے ہوتے مسکرا کر اسے دیکھا پھر جھک کر میز سے کیپٹن کے سنہرے بیج اوپر اٹھائے۔ "آج تمھارے کیریئر کا ایک سنگ میل عبور ہوا ہے۔ مبارک ہو، کیپٹن۔"

گہرے نیلے یونی فارم میں ملبوس چت کھڑے رانج نے ان سے نظریں ملائیں۔ ملائیشیا ایئر لائنز کی شان اور مان، ان کا ٹوٹا ستارہ اور پورا ہوتا خواب۔ اس نے ہلکا سا سر خم کیا تو کیپٹن رحمان نے مسکرا کر اس کا کندھا تھاما۔ سنہرے بیج کی پہلی پٹی اس کے سیدھے کندھے کے ساتھ پروتے ان کی حرکات میں عزت تھی اور فخر بھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ہماری دعا ہے کہ یہ سنہری پٹیاں ملائیشیا ایئر لائنز اور تمھارے ساتھی پائلٹس کی طرف سے کیے گئے اعتماد کی یاد دہانی ہوں۔"

اس نے نظر پھیر کر کمرے کے آس پاس دیکھا۔ چہرے، شناسا شکلیں جو اسے ٹھہر کر دیکھ رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھ میں تصویر بنانے والے چھوٹے کیمرے تھے، کچھ اس کی کامیابی پر کھکھلا کر مسکرا رہے تھے، گویا ان سے خوش تو کوئی تھا ہی نہیں۔ اگر وقت کے چابک ایک سال پیچھے چلاؤ تو یہی تھے وہ لوگ جنھوں نے اس پر لگی الزام تراشیوں کے جواب میں راست گوئی کا ایک بول نہیں بولا تھا۔ ان لوگوں کا اعتماد تھا اس کے ساتھ؟

وہ تھوکتا تھا۔

اس کے تنے تاثرات دیکھ کر کمرے میں سناٹے کا وار ہوا۔

"رائج؟" کیپٹن رحمان نے اسے تھوڑا سا آگے پیچھے کیا۔ اس نے فوراً سنبھل کر اوپر دیکھا اور جبراً ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

کمرہ ایک بار پھر کھل اٹھا۔

وہ سناٹا اس کے اندر جو جا بسا تھا۔

★★★

افق سے ٹوٹتی شام بیت کر سیاہی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دھرتی پر پھیلی چاندنی آج اپنے ساتھ ستاروں کی چمک بھی لائی تھی۔ گھنے بادلوں میں چھپی ہوا کی سرگوشیاں سرد اس جلان کے علاقے میں با آواز بلند سفر کر رہی تھیں۔ کیونکر کوالالمپور کی رات تھی اتنی اخفاء، اتنی روپوش؟ ہم کب جان پائیں گے؟

کیا ہم کبھی جان بھی پائیں گے؟

گہری نیلی رنگ کی چمکتی نسان نوارا کی گاڑی رش میں پھنس سی گئی تھی۔ ڈرائیور سیٹ پر نشست جوہان نے شیشا نیچے کرتے کہنی کھڑکی پر جمائی اور اپنی ٹھوڑی مسلی۔ ہر بدھ کو اس علاقے کا یہی حال ہوتا تھا۔ رش اور شور، لوگ اور گاڑیاں۔ بے پناہ ٹریفک! اور یہ سب تھا تمان کناٹ کی نائٹ مارکیٹ کا جہاں کے سات سو سے زائد اسٹال لوگوں کو اپنی جانب مقناطیسی کشش سے راغب کرتے تھے۔ مسافر سیٹ پر بیٹھی سارہ بیک ویو مرر کو پکڑے اپنے بھرے بھرے ہونٹ اسٹابیری لپ گلوس سے رنگ رہی تھی۔ عریض پیشانی اور قدرے ابھری ہوئی ٹھوڑی، وہ فلپائن کی خوبصورتی کے معیار پر حروف با حروف اترتی تھی۔ مس روز لپ گلوس کی لڈ تھامی انگلیوں میں سے تیسری پر ڈائمنڈ کی چھوٹے نگینوں والی انگوٹھی تھی، جو منہ دکھائی پر جوہان نے ہی اسے دی تھی۔ دو ہزار گیارہ سال کے شروع میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ اب مہینہ تھا مئی کا۔

میٹ بھورا رنگ اس کے ہونٹ چمکا گیا تو گھنیری پلکیں اٹھا کر سارہ نے پچھلی سیٹ میں براجمان مرد کو دیکھا جو گم سم آنکھوں سے شیشے کے باہر دیکھ رہا تھا۔ کنپٹی کی چپٹے حصے پر بھورے بال چھوٹے ہوئے تھے اور بیچ سے تھوڑے بڑے۔ رائج آدم کا ہیئر اسٹائل پتھر کے زمانوں میں بھی یہی رہنے والا تھا۔ پلکوں کا انحنا اور ناک کی کمزور ہڈی، ہیزل آنکھوں میں گرتی رات کی نیون روشنیاں اسے ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں کر رہی تھیں۔ کریم رنگ کا ویسٹ کوٹ پہنے وہ سر تا پا فارمل کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کے آگے بیٹھا جوہان بھی سرمئی سوٹ پہنا تھا۔ سارہ نے مرون مڈی ڈریس کا انتخاب کیا تھا جس کے کناروں اور کندھے پر سنہرے دھاگوں کا کام ہوا تھا۔

وہ لوگ کسی جاننے والے کی شادی سے لوٹ رہے تھے۔

"مجھے اگلے اسٹاپ پر اتار دینا۔ میں چلا جاوں گا۔" رائج نے بغیر کسی کو مخاطب کیے کہا۔ وہ اب بھی باہر دیکھ رہا تھا۔ نائٹ مارکیٹ کے قریب بڑھتی گاڑی سے طرح طرح کے پکوانوں سے اٹھتا دھواں نظر آ رہا تھا۔

"گھر تک چھوڑوں گا۔" جوہان نے اثر نہ لیتے اسٹیرنگ گھمایا۔ رائج کو اس شادی تک گھسیٹ کے لانے والا بھی وہی تھا۔

"تم دونوں کو لیٹ ہو جائے گا۔"

"ناٹ یور پرابلم۔"

سارہ اپنے شوہر کی غیر خم پذیری پر مسکرا دی۔ رائج بھی خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے دوست سے نہیں جیت سکتا تھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ جوہان حاضر کو اتنا جان چکا تھا کہ ضد نہ کرتا۔ رش گھٹا تو جوہان نے گاڑی کاٹ کر ایک گلی میں موڑ لی۔ اب کہ تمان کناٹ کی مارکیٹ روڈ کے دوسری طرف تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بینک کے پاس رفتار دھیمی کرتے وہ سارہ اور اس سے مجموعی طور پر مخاطب ہوا۔

"مجھے کچھ پیسے ایکسچینج کروانے ہیں۔ دس منٹ لگیں گے۔" اس نے سیٹ بیلٹ کھولتے انھیں دیکھا اور مزاحیہ خیز انداز میں مسکرایا۔ "لڑائی مت کرنا تم دونوں۔"

سارہ نے ہنس کر اسے دیکھا اور رائج سیٹ میں پیچھے ہو گیا۔ گاڑی کا دروازہ بند کرتے اب وہ بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ کچھ لمحات میں اس کا وجود دروازوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ پیچھے بیٹھے مرد نے ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر جمائی۔ اب درد نہیں ہوتا تھا۔ وقت نے اس کے زخم بھر دیے تھے۔ شیشا نیچے کرتے وہ مہوسا سبز بتیوں میں پرنور شہر میں پھیلے چراغے کو دیکھتا رہا۔

"یہاں کے اسٹیم بن کھائیں ہیں تم نے؟ کارٹون والے؟" اس کی نظروں کے ارتکاز میں دیکھتے سارہ نے پوچھا۔ سیکھوں پر پڑتے برتنوں کی آوازیں یہاں تک سنیں جا سکتی تھیں۔ رائج نے اس کے سوال پر چہرہ موڑا۔

"کیا میں اپنے شہر سے اتنا فراموش ہوں گا؟ مکی ماوس سے لے کر ہیلو کٹی، سب کھایا ہے۔"

اس کے جواب پر وہ ہنس دی اور کھلے بالوں میں سے انگلیاں پھیرتے انھیں باندھنے لگی۔ "تو تم فوڈی ہو!"

اس بار وہ بھی ہلکا سا مسکرا دیا۔ "جب لوگ ہوتے ہیں تو کھانا انجوائے کیا جاتا ہے۔ اگر نہیں تو وہ بوجھ لگتا ہے۔"

سارہ نے اسے دیکھا۔ اچانک بیتے دو سال کے رنگ اور حالات ایک ساتھ اس کے چہرے پر امڈ آئے تھے۔ اب الزام نہیں تھے اس کی ذات پر، وہ پاک تھا۔ اب پانی نہیں تھا اس کے کانوں میں، وہ بقا تھا۔ اب کوئی نہیں کہتا تھا رانج خونی تھا، اس نے حق مارا تھا۔ پھر بھی ایک غیر شناخت شدہ سکوت تھا اس کے وجود پر جو کسی بھی بانگ وندا کو بھسم کر دیتا۔

سارہ کو محسوس ہوتا تھا۔

وہ زخمی تھا۔ وقت نے کچھ نہیں بھرا تھا۔

"تم جب چاہو ہمارے گھر آسکتے ہو، رانج۔" اس نے چہرہ اپنی سیٹ سے ٹکاتے دعوت دی تو وہ تھوڑا سا مسکرا دیا۔ "شکریہ مگر مجھے گھر سے نکلتے موت آتی ہے۔"

سارہ نے استہزا سے سر ہلایا۔ وہ جوہان سے کتنا الگ تھا۔ بال باندھ کر اس نے سیاہ ہیئر ٹائی گھنی لٹوں پر کسی اور ڈھیلی چھوڑ دی۔ اب پونی ٹیل لہرا رہی تھی۔

"تمھارا کیا پروگرام ہے شادی کا ویسے؟ اب تم لڑکے نہیں کہہ لاؤ گے۔ جسٹ سینگ۔" اس نے ماحول ہلکا پھلکا رکھتے اسے چھیڑا تو ایک خشک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کا کنارہ اوپر اٹھا گئی۔ شیشے سے اندر تیرتی ہوا کان کی لو سے ٹکرائی اور رانج نے ماتھا کھڑکی پر رکھا۔

"آپ نے تو ایک جملے میں میری جوانی مار دی۔" اس کے جواب پر وہ ہنس پڑی۔ رانج نے انگلی کے کنارے سے ناک مسلی۔ "ویسے نہیں، کوئی پلینز نہیں شادی کے۔ ابھی صرف کریئر پر دھیان دینا ہے۔"

"اکیلے رہنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا مشورہ ہے تھوڑا ہلکے ہو جاؤ۔ اب تو تم کیپٹن بن گئے ہو، پروموو غیرہ سب مل گیا۔ جسٹ پٹ یور سلف آوٹ دیئر۔"

"آپ کی نظر میں ہے کوئی جو ایک لاش میں انٹرسٹڈ ہو؟"

سارہ نے ابرو اٹھائے، جیسے اس کی چنوتی قبول کی ہو۔ "تم یقین نہیں کرو گے میری گروپ چیٹ میں ایسی دس مل سکتی ہیں اگر تم مجھے دو منٹ دو۔"

رائج نے ہنس کر سر نفی میں ہلایا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔" وہ باہر دیکھنے لگا۔ آسمان کے کھلے قالین پر چمکتے ستارے بھی اسے دیکھ رہے تھے۔ رات، ایک کوسوں تک برباد بستی جس سے فرار کے لیے اس نے کتنی ہی دراڑیں چھان ڈالیں تھیں۔ وہ پھر بھی خود کو وہیں پاتا تھا۔

ایک گہری سانس اس کے لبوں سے چھوٹی اور کنارے سے مسکراہٹ اتر گئی۔ وہاں صرف اب جلد دی۔ روکھی، بے اثر۔ ایک ہاتھ کی انگلی چھوٹی انگلی میں پھنسے چاندی کے چھلے کو سرکاتی اور کنارے سے پکڑ کر واپس نیچے دھکیل دیتی۔

جوہان واپس آیا تو گاڑی کی اعزازی لائٹس جل اٹھیں۔ رائج نے نارنجی روشنی میں چبھن سے آنکھیں میچ لیں۔ اب وہ سیٹ بیلٹ لگاتے سارہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پیچھے بیٹھے مسافر نے چہرہ کھڑکی سے ٹکا دیا۔

ان دونوں کی آوازیں اس سے دور ہو رہی تھیں، حال ہو کر بھی فراموش ہوئی کوئی یاد لگتی تھیں۔ جوہان اس کی کسی بات پر ہنس رہا تھا اور سارہ شرماتے ہوئے اس کا کندھا پیٹھ رہی تھی۔ گاڑی ریورس گیئر میں ڈالتے اب وہ اس کی کسی بات کو پکڑے اسے تنگ کر رہا تھا، اور وہ مسکراتے ہوئے اپنے گال چھپا رہی تھی۔ رائج نے ایک خشک سانس باہر نکالی تو شیشے کا کانچ بھاپ سے داغ گیا۔ اس نے لاشعوری طور پر شہادت کی انگلی چکنی کھڑکی پر پھیری۔

ایک پر، پھر دوسرا پر۔ اس کی دم اور پھر اس کی ناک۔ وقت کے قفس میں قید ایک جہاز جو بھاپ کے مٹتے ہی اوجھل ہو جائے گا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

سارہ کی ہنسی کی آواز ایک بار پھر کار میں سنائی دی تو اسے کوئی یاد آیا۔ جو ہان کے اسے تنگ کرنے پر اس نے کسی اور کو بھی یاد کیا۔

ایک ہاتھ کی ماہر انگلیوں میں جوائے اسٹک سنبھالے، ہیزل آنکھوں کی نرم زریں تپش سامنے رکھی کمپوٹر اسکرین کی روشنی میں نیلی دمک رہی تھی۔ کانوں کے گرد ہیڈ فون چمٹے ہوئے تھے اور دوسرا ہاتھ کی بورڈ پر فر فر حکم جاری کر رہا تھا۔ چمڑے کی سفید اور سیاہ گیمنگ چیئر میں آگے جھکتے، اس کے کندھے خمیدہ تھے اور ابرو مکر ساز (simulated) کا کپٹ کے عقدے حل کرنے میں مشغول۔ جب کمپوٹر کھلا ہوتا تو فلائٹ اسٹمیولیٹر کھلا ہوتا تھا، اور جب فلائٹ اسٹمیولیٹر کھلا ہوتا تھا تب ہی اماں کا منہ کھلا ہوتا۔ پانچ منٹ قبل ہی وہ اس کو دسویں بار سبزی لانے کا کوس کر رگئی تھیں۔ اب تو اس بیٹے سے انہوں نے ہار ہی مان لی تھی۔

ہفتے کے سات دن تو وہ کا کپٹ میں جٹا تھا ہی، اب یہ فضول گیم اسے الگ مل گئی تھی جس سے وہ پلین۔ پلین کھیلتا تھا۔

"کتابیں پڑھا کرو۔ سوجھ بوجھ بڑھتی ہے۔ لڑکیاں پسند کرتی ہیں کتاب پڑھنے والے لڑکوں کو۔" اماں نے اسے کتنی بار کہا تھا اور ہر بار رباب بھی کبوتری کی طرح منڈی ہلاتی رہتی۔

"میری پیاری مدر ڈیئر سٹ۔" رابح آدم بھی مکھن کی جمبو ٹکی تھا۔ "لڑکیوں کو کتاب پڑھنے والے بہت مل سکتے ہیں، مگر نئے سال پر سیسنا 152 کی کا کپٹ سے آتش بازی دکھانے والا کوئی کوئی ہوتا ہے۔"

"استغفر اللہ۔" اماں کے شملا مرچ کاٹتے ہاتھ اچانک پھرتی سے چلنے لگے۔ رباب نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ سیسمی میں ایسا کیا خاص ہے؟"

رابح نے تحمل برتاؤ رکھا۔ "سیسنا 152 ایک ڈبل سیٹر جہاز ہے۔ پرفیکٹ فار آڈیٹ—"

رباب جوتا اٹھانے اوندھی ہوئی۔ "تم زیادہ یہاں وہاں دماغ مت چلاؤ۔ میں صرف تمھاری ATP کی وجہ سے رکی ہوں، ورنہ ظبیہ کو کل لے آؤں بھابی بنا کے۔"

"ہیں؟ وہ تو پودوں کی نہیں ہوتی؟" مرتضیٰ نے پہلی بار سنتے کافی مسعود مرکھتائی میں سوال اٹھایا تھا، تو گھر کے پائلٹ کی آنکھیں چھت کو جا لگیں۔

"اے ٹی پی، بھائی! Airline Transport Pilot! میرا سرٹیفیکیٹ۔"

"اواوکے۔" گھر کے داماد کو رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔

اس کے ہیڈ فون کے ایک طرف دستک ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر پیچھے دیکھا، ساتھ ہی سیدھے پیر سے میز کے نیچے رڈر پیڈل دبائے، فرضی جہاز کی فرضی ٹربیولنس کو روکنے کے اقدامات۔

"جا رہا ہوں نا۔ آپ بٹوالائیں میرا۔" اس نے جان چھڑوانے والے انداز میں کہا۔ مرد پائلٹ ہو یا انجینئر، گھر کی سبزی لانے کے لیے سب ایک سے تھے۔ کاہل!

"کال آئی ہے، ماہ شے۔" رباب نے ٹیلی فون اس کی گود میں رکھا اور رسیور ہاتھ میں پکڑایا۔

کون ہے؟ اس نے ہیڈ فون پرے دھکیلتے منہ ہلایا۔

"ہاؤس نمبر ٹو ینٹی ٹو!" رباب نے کھکھلا کر بتیسی دکھائی۔ رابح نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ریسیور کان پر رکھا، انگلیاں اب کہ لاشعوری طور پر ٹیلی فون کے بٹن سہلا رہی تھیں۔

"ہیلو؟" ظبیہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اس نے گیمنگ چیئر میں اپنی پشت ٹکرائی اور محظوظ سا مسکرایا۔

"آپ کے یہاں سلام دعا کا رواج نہیں؟"

"آپ کے وہاں بھی طعنے ہی ملتے ہیں شاید۔"

اس نے ہنستے ہوئے احتیاط سے چہرہ آس پاس گھمایا۔ رباب نے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

"آج چھٹی ہے نا۔ کیا کر رہے ہیں؟" ریسیور کی دوسری جانب سے موصول ہوتی آواز میں تجسس اور مسرت عیاں تھی۔

"سچ کہوں یا 'کچھ نہیں، بس تمھیں یاد'؟"

ظبیہ نے شرمگین سی نظر ریسیور پر ڈالی پھر گلا صاف کرتے بات جاری رکھی۔ "فارغ ہیں مطلب۔ خالہ کو بات کرنی تھی۔"

رابح نے انگوٹھے سے ناک مسلتے اپنی ہنسی روکی۔ "دو۔" پیروں کو ٹخنوں پر باندھتے وہ آسائش بخش انداز میں بیٹھ گیا۔ "لیکن کال بند میں تمھاری آواز سن کے کروں گا۔" وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ تنگ ہو رہی تھی۔

"خالہ، جلدی آئیں!" ظبیہ کا چہرہ آگ کا گولہ بن چکا تھا۔ خالہ بیچ راستے میں ہی تھیں جب وہ انھیں ریسیور تھما کر چمپت ہو گئی۔

"سو نا مت۔ تمھارا گھر آ گیا ہے۔" سارہ نے دھیمی آواز میں کہتے پیچھے دیکھا تو وہ تھک کر مسکرا دیا۔

وہ انھیں کیسے بتاتا؟

نیند تو اس کی آنکھوں سے کب کی خشک ہو چکی تھی۔

★★★

فلائٹ ٹریننگ سینٹر

کوالالمپور انٹرنیشنل ایئرپورٹ

۱۷ نومبر ۲۰۱۱

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

کمرے کا دروازہ کھلا تو یک بعد دیگرے سوٹ اور فارمل ملبوسات میں تیار پائلٹ سیلاب کی طرح اندر داخل ہوئے۔ کلاس روم میں اے سی کی ٹھنڈی ہوا اور پروجیکٹر سے چمکتی مدھم نیلی اور سفید روشنیاں قطار در قطار لگی چمڑے کی سرسراتی کرسیوں پر اجاگر تھیں۔

نشستوں کے سیدھ میں لگی وسیع ڈسپلے اسکرین پر وقتاً ملائیشیا ایئر لائنز کا لوگو سفید بیک گراؤنڈ پر چمچمارہا تھا۔ پوڈیم کے قریب کھڑے استاد اور انسٹرکٹر آپس میں سرگوشیاں بانٹ رہے تھے۔ کاغذات کے پلندے اٹھائے وہ لوگ گہری گفتگو میں اندر آتے شاگردوں سے بے نیاز رہے۔

پائلٹس کے ہجوم کے درمیان اس نے بھی سیاہ ٹمبر لینڈ فرش پر رکھے اور قدم قدم چل کر اندر بڑھا۔ کمرے میں پیشہ ورانہ پیش بندی محسوس کی جاسکتی تھی۔

"خوش آمدید، حضراتِ طیران۔" ان میں سے ایک انسٹرکٹر نے مائیک کو قریب کرتے کہنا شروع کیا۔ "سب اپنی جگہوں پر نشست ہو جائیں تو شام کا آغاز کرتے ہیں۔"

جیسے ہی سارے پائلٹس اپنی کرسیوں کے ساتھ کمر ٹکا چکے تو کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ رابح نے بھی ان چہروں کے درمیان جگہ سنبھالی۔ سفید سادی بٹن شرٹ پر اس نے یونیفارم کا نیلا کوٹ پہنا تھا۔ کوٹ کے بٹن کھلے تھے اور ہاتھ میں رولیکس کی گھڑی چمکدار۔ سیٹ میں پیچھے ہوتے اس کے چہرے کی فہمیدگی عیاں تھی۔

فلائٹ سمیولیشن کی کلاس آج قابل پائلٹس کو کیا سکھائے گی؟

"جنٹلمین، یہ آپ کا میدان ہے، ہوا آپ کی سواری اور رفتار آپ کا تضاد۔ یہاں بیٹھنے سے پہلے رول بُک کو مکمل طور پر بھول جائیں، اپنی امیدیں کچرے کے ڈبے میں اچھالیں اور بدنظمی سے ہم آغوش ہوں۔"

کچھ پائلٹس نے اسے سنتے سر ترچھے کیے، کچھ کے لب مسکراہٹوں میں اوپر اٹھے اور کچھ بن حرکت اسے سنتے گئے۔ رابح کی طرح۔

سیاہ ٹی شرٹ اس کے کسرتی جسم پر ترغیب انگیز نظر آتی تھی۔ زیمو چین، ملائیشیا ایئر لائنز کا سینیر فلائٹ انسٹرکٹر تھا۔

"کیونکہ یہی دستور رہا ہے تو ہم سب سے بنیادی مسئلے سے شروعات کرتے ہیں۔" اس نے ہتھیلیاں پوڈیم پر ٹکائیں اور نظروں نے کمرے میں بیٹھے ایک ایک نفس کا چہرہ پڑھا۔

"انجن فیلئیر۔ کیونکہ، ظاہر ہے، یہی ہر پائلٹ کا تاعمر خواب ہوتا ہے۔"

کمرے کے لوگ دھیمے سے ہنس دیے۔ رانج نے اپنے پیچھے دو پائلٹوں کو کھسر پھسر کرتے سنا۔

اس نے سر موڑ کر آگے دیکھا۔ پروجیکٹر کی روشنی اس کے نقوش پر سائے کھینچ رہی تھی۔

"اوکے، پائلٹس۔ آپ کیا کریں گے اگر آپ کا انجن مڈ فلائٹ ستانے لگے؟ Any suggestions؟"

نوٹ بک کے کورے کاغذ پر قلم جمائے، اپنے استاد کے سوال کا بوجھ رانج کو کندھوں پر پڑتا محسوس ہوا۔

"آواز نکالیں، حضرات۔ یہاں شعر و شاعری کی محفل نہیں لگی۔ کیا کریں گے آپ اگر آپ کا انجن ہزاروں فٹ اوپر آپ کو دھوکہ دے جائے؟" زیمو نے باہیں پوڈیم پر پھیلائیں، جلد کی رگیں ابھر کر نمایاں ہوئیں۔ اس کی ہر ادا میں خود اعتمادی تھی، اور وہی اسے دلکش بناتی تھی۔ کمروں کے چاروں اطراف آنکھیں گھماتے، اس نے مرکز تیسری قطار میں بیٹھے رانج پر ٹھہرایا، انداز میں دعوت تھی۔

اس نے لب زبان سے گیلے کیے اور پین کو مضبوطی سے تھاما۔ "انجن چیک لسٹ، ایمرجنسی اشو اور قریبی رن وے پر سنگل انجن لینڈنگ۔"

"کتابی جواب۔" اس کے جواب پر زیمو نے مسکراہٹ چھپائی، البتہ آنکھوں میں اطمینان تھا۔ پھر اس نے پرجوش انداز میں ہاتھ میز پر رکھا۔ "اب چلتے ہیں تفریحی حصّے کی جانب۔ The simulations!"

★★★

سمیولیشن روم کا دروازہ کھولتے قطار در قطار لگے مستقبلی سمیولیشن کی مشینیں اس کی نظر میں آئیں۔ دیواروں کے آس پاس جڑی کاکپٹ پینل کی چمچماتی بتیوں میں جگمگا رہی تھی۔ پائلٹوں کا لشکر اندر چل کر آگے بڑھا تو انسٹرکٹر نے ان سب کو ان کی متعلقہ نشستوں تک راہ دکھائی۔ رائج بھی ساتھ چلتا رہا۔ کمرے میں گونجتی سب آوازیں اصلیت کے نزدیک نمایاں ہوتی تھیں، لیکن وہ تھیں تو مکر ساز۔

فلائٹ سمیولیشن طیران کے پیشے کا کمرِ بانس تھا، جو ہر پائلٹ کو خلا میں سرزد ہوتی مشکلات سے قبل، زمین پر ہی انھیں اس سے مزاحم کر دیتا تھا۔

"اپنے اسٹریپ باندھ لیں۔ یہاں سے ون پیس میں باہر جانا آپ کا آج کا گول ہے۔" زیمو نے ان کے سروں پر کھڑے اعلان کیا۔ وہ چست لگتا تھا، ان لوگوں میں سے جنھیں اپنے کام سے عشق ہو۔

رائج آدم بھی ایک وقت ایسا ہوا کرتا تھا۔

اپنی کاکپٹ کی کرسی سنبھالتے رائج نے ہیڈ سیٹ کانوں پر جمائے۔ سمیولیشن روم میں روک لگا کر ہر کاکپٹ کو دوجی سے جدا کیا گیا تھا۔

کنٹرول اسٹیشن کے پار چیئر کو سدھارتے زیمو چین نے اپنی نشست چنی اور براجمان ہو گیا۔ کاہلی سے انگوٹھا گال پر پھیرتے اس نے دو انگلیاں تیوریوں پر سجائیں۔ اس کے ہونٹوں کے نزدیک روئی والا مائیک جڑا تھا۔

رائج نے کنٹرول یوک کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔ مکر ساز کاکپٹ اصلی نمایاں ہوتی تھی۔ اس کی پوروں تلے انجن کی آواز رواں تھی، ہلکی مگر زندہ۔ ہیزل آنکھوں کے سامنے اسکرین پر بادلوں کا پرچم لہرایا۔

"امپاکٹ کے لیے تیار رہیں، کیپٹن۔" زیمو کی آواز میں چنوتی تھی۔ اس نے خود کو استوار رکھا۔

"اوکے، انجن فیلئیر ان۔۔۔ ناؤ!"

وہ ہیڈ سیٹ کے پار سے چہکا تو رانج کا دل ایک انسانی لمحے کے لیے بے ترتیب ہوا۔ یکایک اب تک یکساں انجن کی گنگناہٹ نامبارک خاموشی سے تبدیل ہوئی اور پلین غیر متوازن ہوا۔

رانج نے فطری طور پر کنٹرولز پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"Ensuing engine failure checklist. Preparing for single-engine landing."

اس نے اپنے ارادے با آواز بلند ترجمہ کیے، ساتھ ہی ہاتھ نوٹ پیڈ پر لکھے سطور پڑھتے گئے۔

کنٹرول اسٹیشن کی جانب بیٹھے زیمو نے سنجیدہ نگاہوں سے مانیٹر اسکرین کو دیکھا۔ دوسری طرف بیٹھے پائلٹ کی حرکات اس کی دماغ میں پل پل محفوظ ہو رہی تھیں۔

اس نے سیٹ میں آگے جھکتے مائیک کو چھیڑا۔

"بہت اچھے۔ لیکن ایک ٹوئسٹ ہے۔ پلین مین ٹربیونلس بھی ہو رہی ہے۔"

نقلی ائیر کرافٹ میں گڑگڑاہٹ بلند ہوئیں۔ اس کے سامنے جڑی اسکرین اندھیروں میں سیاہ ہوئی، ویسے ہی جیسے حقیقی ٹربیونلس کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ رانج نے اپنا تریقہ بدلا، جبڑے میں ایک عصب پھڑ پھڑایا۔

"Adjusting for turbulence. Continuing with checklist."

اس نے دانت پیستے کہا۔

زیمو نے ہونٹ چباتے اپنا مزہ چھپایا۔

"او صبر، ایک مسافر کو میڈیکل ایمرجنسی پیش آ رہی ہے۔ اسے سنبھالو۔"

رانج نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ زیمو داڈیول! ٹھیک نام تھا اس کا۔ اس نے جھپٹ کر مائیک منہ کے قریب کیا اور پھر غرایا۔

"Medical emergency. Cabin crew, prepare for assistance."

زیمو اسکرین کے پیچھے مسکرا دیا اور انگوٹھے سے ناک مسلتے اسے محظوظ ہو کر دیکھتا رہا۔ کیپٹن رائج آدم، کچھ تو تھا اس میں۔ زیمو چین لوگوں کو اپنی حدود کے پار پہنچانے میں ماہر تھا، اور اسے رائج آدم کی حد کی تلاش تھی۔

وہ انسان جو چٹانوں جیسی مضبوطی رکھتا تھا، اس کی دراڑیں کہاں تھیں؟ وہ مرد جو اپنی مثال آپ تھا، اس کے نقص کہاں بستے تھے؟ اس کا خوف کیا تھا، اس کا نزول کیا تھا؟

آخر رائج آدم کا بریکنگ پوائنٹ کیا تھا؟

"ہم ایک لیول اوپر جا رہے ہیں، رائج۔ یہاں سے ساری ریڈیو کمیونیکیشن ختم ہو رہی ہے۔ No ATC. Fly solo!"

اور اچانک لائن کی دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ کاکپٹ میں ہوتی ریڈیو کی ٹوٹی پھوٹی نشریات یکدم دم توڑ گئیں۔ کرسی کے ساتھ بیٹھے ماہر پائلٹ نے اپنے آس پاس پھیلتے سکوت کو محسوس کرتے آنکھیں ذرا سی بڑی کیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اچانک اس کی شرٹ کا اوپری بٹن اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔

"زیمو، ریڈیو۔۔۔ ریڈیو خاموش ہو گیا ہے۔" اس نے فکر مندی ظاہر کی۔ اس کی آواز میں شک تھا، ڈر تھا۔ کنٹرول اسٹیشن میں بیٹھے انسٹرکٹر نے پیر دائیں سے بائیں ہلایا اور جواب میں ایک مسکراہٹ پیش کی، بولا کچھ نہیں۔ یہ پہلی بار تھا جب رائج آدم کے ٹھوس رویے میں لچک پیدا ہوئی تھی۔

رائج نے ایک سانس باہر نکالتے کنٹرولز کو آہستگی سے چھیڑا۔ "یہ نقلی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔

"یہ ماضی نہیں، حال ہے۔ It's just a simulation."

اس کی آنکھوں نے آلاتی پینل اور تہی ڈسپلے اسکرین کے درمیان دیکھا۔ وہ خاموشی اسے بہرا کر رہی تھی، بہرے سے زیادہ، وہ اسے مردہ کر رہی تھی۔

"میں نے ٹریننگ لی ہے۔ اے ٹی سی کے بغیر لینڈنگ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ فوکس، رانج، یو فوکس!"

اس نے خود کو جھڑکا۔

زیمو نے ایک انگلی اپنے نچلے ہونٹ پر پھیری، لیکن آنکھوں نے اسکرین پر واضح پائلٹ کی حرکات نہیں جانچیں۔ اس کی جبڑے کی تنگی، ہاتھوں کے رعشے اور آنکھوں کی دوری، زیمو چین انھیں نہیں کھوج پایا۔ کافی دفعہ کسی شے کی جست میں ہم اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ اس سے قبل نظر آتے اشارے آنکھوں کے سامنے ہو کر بھی ہمیں نمایاں نہیں ہوتے۔

"Stay on course. انسٹرومنٹ سے مدد لو۔"

زیمو نے اصلاح دی۔

رانج نے میکانیکی طور پر سر اوپر نیچے کیا۔ اس کی نظروں کا مرکز سامنے بنا نقلی آسمان تھا جس میں نارنجی اور گلابی رنگ بکھرے تھے۔ بادل اس کے چاروں اطراف روئی کی مانند پھولے تھے۔ اس کی آواز سن کر اس کا دل تھوڑا پر امید ہوا تھا لیکن کاکپٹ میں چھائی خاموشی اب بھی اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

"رانج، اونچائی قائم رکھو۔ سیدھ میں آگے بڑھو۔" زیمو کی ہدایات اسے ایک لمحے کے لیے حال میں واپس کھینچ لاتیں، لیکن اس سے کئی قوی چیز اس پر حاوی تھی۔

اس کا ماضی۔

اس نے ڈائل گھماتے درستگی کرنا چاہی، اپنی پرواز کو راستے پر رکھنا چاہا لیکن ڈسپلے اسکرین کی وہ خالی پٹی اسے چڑھا رہی تھی۔

"اپنی پچ درست کرو، رائج۔ پلین اڑان پر ہے۔" کنٹرول اسٹیشن کی اسکرین پر رائج کی پرواز طے شدہ راستے سے تھوڑی بھٹک رہی تھی، سو اصلاح کرنا اس کا فرض تھا۔

لیکن کاکپٹ میں بیٹھے اس فرد کے دل کا حال کون جانتا تھا؟ سیاہی کی راہداریوں میں لپٹا وہ منحوس دن اس کی دماغ میں جس شتابی سے رواں تھا، اس کا حساب وہ خود بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

کاکپٹ، سرخ بتیاں، گہری رات اور تنبیہی اشارے!

اس نے سر دائیں بائیں ہلایا اور نظریں پختگی سے آلات پر جمائیں۔ صرف لینڈنگ کی بات تھی نا، وہ وہ کر سکتا تھا۔

"Mayday, mayday! We've got a fuel leak!"

اس نے چہرہ دوسری طرف گھمایا، سانس کہیں دور رک رہا تھا۔

"یہ فلائٹ 450 ہے! کیا کوئی ہمیں سن سکتا ہے؟"

حلیزہ کی آواز، اس کی پکار اور رات کی سیاہی۔ انھیں کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس رات، رائج آدم نے بھی اپنے سارے جواب کھو دیے تھے۔

"رائج اپنا راستہ ٹھیک کرو۔ تم اب بھی غلط جا رہے ہو۔" زیمو نے میز پر کہنیاں ٹکاتے اسے جتایا۔ دوسری طرف بیٹھے مرد پر ایک ایک لفظ، ایک ایک سانس بوجھ تھی۔ اس کے ہاتھ بنا اجازت لرز رہے تھے اور غیر شعوری طور پر کنٹرولز کو چھیڑ چکے تھے۔

"میں۔۔۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔" اس کی آواز باریک تھی۔

کنٹرول اسٹیشن کی مانیٹر اسکرین پر نمایاں ہوتے سرخ تنبیہی پیغامات یک کے بعد دیگر جھپک رہے تھے، یہ دلالت کرتے کہ پرواز اپنے طے شدہ راستے سے انحراف کر رہی تھی۔

"فوکس کرو، رانج!" اب کہ زیمو کے آواز میں دبا دبا سا غصہ تھا۔ "یہ ایک عام تصیح ہے۔ تم بچوں والی غلطیاں کیوں کر رہے ہو؟"

"کنٹرول، یہ فلائٹ 405 ہے۔ ایندھن کی ایمرجنسی! فوری طور پر ہنگامی لینڈنگ کی ضرورت ہے!" حلیزہ کی آواز، اس کے دل کی دھڑکن اور تین سو پچاس جانوں کی حفاظت کا زمہ، رانج آدم اس لمحے کی قید سے کبھی فرار نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے اپنا دماغ سوچوں کے تلاب میں غرقاب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ گھڑی اور ہوا کے دم پر تحلیل ائیر بس کا وہ ماڈل جو انڈیا کے آسمانوں میں قابض تھا۔ اس چاندنی رات میں لپٹا سانحہ اور بحر ہند کی بھیانک سچائی، سب ایک رات میں کس طرح اس کی زندگی بدل گئے تھے۔

آخر وہ کیسے بھول سکتا تھا؟

سمیولیشن کا کپٹ ہچکولے کھا رہی تھی۔ نامعلوم سی سرخی کیپٹن کی گردن کی پچھلی طرف سے سر چڑھ رہی تھی۔ اس کی جلد دہک رہی تھی، کھال پائلٹ کے لباس میں تنگ تھی۔

"مے ڈے، مے ڈے! کوئی جواب دے، پلیز! ہمارا فیول ختم ہو رہا ہے!" حلیزہ کے آنسو، اس کا پسینہ اور تین سو پچاس لوگوں کا خون۔ اس کے جسم کا بال بال ساکت تھا، شاک سے جلد پر رونگٹے کھڑے تھے۔

وہ کمرہ، وہ تصویر، وہ لمحہ، کچھ جعلی نہیں تھا۔ سب اصلی تھا۔ دو سال پہلے جتنا اصلی۔ وقت نے کچھ نہیں بھرا تھا۔

"ڈسٹریکٹ ہونا بند کرو، رانج!"

"آئی۔۔۔" اس نے ہوا کے لمبے بلبلے اندر اتارے۔ "آئی کانٹ بریتھ۔۔۔"

کنٹرول یوک پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، پیروں نے بھی جہاز رانی کا ہر عمل ترک کر دیا تھا۔ ایک آنسو اس کی ناک کی ہڈی سے بہہ کر ضائع ہو گیا۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہ۔"

پانی۔ لہریں۔ تاریکی۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہ۔"

ہر لمحے کے ساتھ گھٹتا فاصلہ، اس کے راکھ ہوئے پنکھ اور اس کا نزول۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہ۔"

زندگی کی کچی ڈور اور موت کا ڈگمگاتا پُل۔

کیا رائج آدم ہمیشہ کے لیے ایک ایسی قسمت کے تابع تھا؟

زیمو نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپے تو اس کا منہ کھل گیا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے یہ احساس کرنے میں کہ رائج کے ساتھ کیا ہو رہا تھا، اس سے پہلے اس نے جھپٹ کر انٹر کام اٹھایا اور ہیڈ سیٹ میں غرایا۔

"Control, this is Zimo. End the simulation for Flight 849. Repeat, end the simulation immediately."

کنٹرول، میں زیمو۔ پرواز نمبر ۸۴۹ کی سمیولیشن موقوف کریں۔ فوری طور پر۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ سمیولیشن روم کی جانب تقریباً بھاگا تھا۔ جب وہ اندر پہنچا تو پروجیکٹر کی روشنیاں دم توڑ گئیں تھیں اور کمرے کی اجلی سفید ٹیوب لائٹس ان کے سروں پر جل رہی تھیں۔ رائج ادھر ہی بیٹھا تھا مگر اب کہ اس کی کرسی کی چاروں اطراف ایک ہجوم سا جڑا تھا۔ زیمو سب کو دائیں بائیں ہٹاتا اپنی جگہ بناتا آگے پہنچا تو کیپٹن چہرہ گرائے پانی کا گلاس تھامے تھا۔ کسی نے ہوش میں لا کر اسے یہ دیا تھا۔ جی ہاں! وہ درمیان سمیولیشن بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو، رائج؟" زیمو نے سوٹ میں قید اس کا کندھا پکڑا اور اس کی پیٹھ پر جھکا۔

رائج کا جسم شل تھا، پتھر۔ آوازیں اس کے ارد گرد بے قابو تھیں، لیکن پتا نہیں کیوں وہ ان سے بے اثر بیٹھا رہا۔ کانچ کا گلاس تھاما اس کا ہاتھ دھیمے سے لرزش کر رہا تھا، اس کے مطابق بھرا شفاف پانی چھلک رہا تھا۔ وہ اسے تکتا رہا۔ چھت پر نصب بتیوں کی چمک اس میں نمایاں ہوتی، پھر ایک لہر آتی اور اسے بہا لے جاتی۔

اسے کچھ اور یاد آیا۔ وہ رات، جب وہ موت سے زندہ ہوا تھا۔ کئی راتیں، جب وہ زندگی سے موت کی جانب بڑھا تھا۔

کوئی اس کے گرد کمبل لپیٹ رہا تھا کیونکہ وہ کپکپا رہا تھا، اس کے دانت چرچرا رہے تھے۔ زیمو باقیوں کو فوکس کرنے کہہ رہا تھا۔ لیکن اس کا دماغ تو اس کے قابو میں تھا ہی نہیں۔ اسے دو سال سے صرف ایک ہی چیز یاد رہتی۔

خاموشی۔

اس رات کا سکوت اور اس کے اندر چڑھتا بوال۔ اور اس دن، اس نقلی فلائٹ کے درمیان، اپنے ٹراما کے ساتھ روبرو پیش ہونے کے بعد اس کے دماغ کے ایک گوشے سے پردہ اٹھا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے دھیمے سے گلاس کا کونہ لبوں سے لگایا۔ پانی اس کے سوکھے ہونٹ تر کر گیا۔

رائج آدم کو سمجھ آنے لگا تھا اسے کیا کرنا تھا۔

★★★

دبئی مرینہ مال کے رستوران Asia Asia میں سرخ روشنی ہر سو جنم لے چکی تھی۔

شارح الشیخ زید پر واقع وہ چینی طرز کا رستوران اپنے پیش و نوا اور روایتی طور طریقوں کی وجہ سے مشہوری حاصل کر رہا تھا۔ دراز کانچ کی کھڑکیوں کے پار، ساتھویں فلور سے نیچے دنیا بے مقصد اور خفیف سی لگتی تھی۔ چاروں اطراف دبئی کے اسکائے اسکریپرز گہری ہوتی رات میں روشنیاں بکھیر رہے تھے۔

کھڑکی کے قریب بنی لال نشست پر بیٹھا مرتضیٰ عباس میز پر بچھے جامنی رنگ کے ریشمی دستر خوان کو لاشعوری طور پر اپنی پوروں سے سہلا رہا تھا۔ اس نے سرمئی رنگ کا کوٹ سوٹ زیب تن کیا تھا اور گھنے بھورے بال پس پیشانی سجے تھے، ساتھ ہی ناک کی نوک دار ہڈی پر سیاہ فریمز تھے۔

جالی دار چھت سے معلق کاغذ اور سرخ ریشم سے تیار شدہ فانوس چینی تہذیب کی نمائندگی کرتے تھے۔ انھیں عام طور پر چینی ثقافت میں مختلف تقریبات اور تہواروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بخت، خوش حالی اور مسرت کی علامت ہوتے ہیں۔

اس کے سر پر کھڑے کسی نے گلا صاف کیا تو اوپر دیکھتے اس کا دل ایک پل کے لیے رکا۔ سامنے ویٹر تھا۔ اسے اپنی بے تابی پر چڑ ہوئی۔

"سر، آپ آرڈر کرنے کے لیے تیار ہیں؟"

مرتضیٰ نے چہرہ پھیر کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی میزبان تو اب تک نہیں آئی تھی۔

"تھوڑی دیر اور۔ میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

ویٹر سمجھ کر چلا گیا۔ رستوران کے دوسرے حصے میں کلاسیکل موسیقی کی کوئی دھن چل رہی تھی۔ مرتضیٰ کو حیرت ہوئی۔ اتنے رنگ تھے یہاں۔ کچن میں پکتے کھانوں کی خوشبوئیں اور اس کے آس پاس میزوں پر براجمان گاہک، ہر کوئی اس جگہ کی شان میں چار چاند لگا رہا تھا۔

اسے اپنا آپ بے جوڑ محسوس ہوا۔ رباب اور ادا کے بعد سے اس نے فیملی آؤٹنگ کے لطف اٹھانے چھوڑ دیے تھے۔ اختتامِ ہفتہ اور بقیہ دن یکساں لگتے تھے۔ کام، کام اور وقت ملے تو تھوڑا سا آرام۔ ایسی زندگی تھی اس کی۔ سیاہ و سفید۔

"ہیلو، مسٹر ہیمنگوئے!"

کوچ کا ہینڈ بیگ ان کے درمیان سجاتے اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ مرتضیٰ کی حیرت خوش گوار تھی۔ وہ احتراماً سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوا اور ہاتھ سامنے باندھے۔

اس کے مقابل کھڑی لڑکی کی عمر اس کے نزدیک نمایاں ہوتی تھی۔ گہرے بھورے بال مرغولے دار لٹوں میں ڈھیلے ہو کر اس کے کندھوں پر گرے تھے اور گلے میں ہلکے گلابی رنگ کا اسکارف ڈلا تھا۔ سفید جالی دار ٹاپ اور ڈینم جینز میں وہ نفیس اور عمدہ نظر آتی تھی۔

"کھڑے کیوں ہو گئے؟ مجھے بڈھا فیل ہو رہا ہے۔ بیٹھو بیٹھو!" وہ ہاتھ ہلانے لگی تو مرتضیٰ مسکراہٹ روک کر واپس بیٹھ گیا۔

وہ اس کی باس تھی، ایکس پرنٹ پبلشنگ اینڈ ایڈورٹائزنگ کمپنی کی سی ای او۔

زمل اقبال۔

"آپ مجھے ہیمنگوئے کیوں کہتی ہیں؟" اس نے اسے دیکھتے سوال کیا تو اس نے استہزاء سے ابرو چڑھائے۔

"نہ کہوں؟" اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی جمائی۔

"نہیں مطلب۔۔۔" مرتضیٰ کو اپنے رخسار گلابی ہوتے محسوس ہوئے۔ "ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ کوئی خاص وجہ؟"

"کیونکہ تم مجھے ہیمنگوئے کی یاد دلاتے ہو۔ The quiet and broody writer. اتنا کم بولتے ہو، تمھارے سامنے ہیمنگوئے بھی چلبلا لگتا ہے۔"

ہیمنگوئے اور چلبلا ایک جملے میں سن کر وہ خود کو ہنسنے سے روک نہ سکا۔ اور جلد اپنے بے فکر رویے پر وہ خود ہی شاک میں آ گیا۔ یا اللہ، وہ رباب کے علاوہ کب کسی کے ساتھ ایسے ہنسا تھا؟

"تم اچھے لگتے ہو ایسے۔ بڑی چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ۔" زمل نے اپنایت سے کہا۔ مرتضیٰ نے بے آرامی سے رخ بدلا اور لب دانت سے کاٹے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"خیر، تم مصروف تو نہیں تھے؟" اب وہ اپنے پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ چھت پر لگے ائیر کنڈیشنر کی ہوا سے گھنگریالی زلفیں اڑ کر اس کی ناک پر آ رہی تھیں۔

"نہیں، لیکن آپ نے یہاں کیوں بلایا ہے؟" اس نے تجسس میں آس پاس دیکھا۔ زمل کی نگاہ اس پر ٹھہری۔

"کیوں؟ تمھیں چائینیز کھانے پسند نہیں؟ یہاں کے جھینگے ریکارڈ توڑ ہیں۔"

"میں سب کھا لیتا ہوں۔ quiet اور broody ہوں ناں۔ زیادہ اختیارات نہیں ہیں میرے پاس۔"

زمل ہنس پڑی۔ "طعنہ مار رہے ہو مجھے؟"

اس بار وہ بھی مسکرا دیا۔ "ہماری اتنی جرات کہاں؟"

وہ اطمینان سے بیٹھ گئی اور ویٹر کو طائم نامہ (مینو) لانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلا گیا تو زمل فیس پوڈر کے آئینے میں دیکھ کر اپنی لپ اسٹک درست کرنے لگی۔ مرتضیٰ نے تھوڑی دیر اپنی فون اسکرین دیکھی اور پھر اسے سوئچ آف کر کے نظریں اس پر جما لیں۔

سرخ لپ اسٹک کی نوک اپنے ہونٹوں کے کنارے پر ٹھہراتے اس نے اوپری طرف دو لکیریں کھینچی۔

ہلکی گلابی رنگت اور ناک میں پرویا چاندی کا موتی بالا سر لٹکے لینٹرن کی سنہری روشنی میں چمک اٹھا۔

مرتضیٰ دیکھتا رہا۔ پس منظر میں چلتا گانا بند ہوا تو اس کا خمار بھی ٹوٹا۔ یہ وہ کیا کر رہا تھا؟

جگ سے پانی نکالتے اس نے چند چیزوں کے علاوہ کچھ اور سوچنا چاہا۔

"تم سے ایک بات کرنی ہے۔ کھانے سے پہلے کروں یا بعد؟" زمل نے ہاتھ آپس میں پھنسائے۔

"کیا وہ بات ایسی ہے کہ میں کھانا چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟"

وہ محظوظ ہوئی۔ "ہو بھی سکتی ہے۔ کوائٹ اور بروڈی ہو۔ تمھارا کیا بھروسہ؟"

مرتضیٰ مسکرا دیا۔ "ابھی کر لیں۔ جو بھی ہوئی کھانا نہیں چھوڑوں گا۔ کم از کم پیک تو کروا ہی لوں گا گھر پر کھانے کے لیے۔"

زمل کو اطمینان ہوا۔

"تم نو سالوں سے ایکس پرنٹ کے ساتھ ہو۔ جب بابا کمانڈ میں تھے جب بھی وہ تمھیں بہت سراہتے تھے، اور جب سے میں لیڈر بنی ہوں مجھے بھی تمھاری کارکردگی پر فخر ہے۔" اس نے اپنے بیگ سے چند کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

"یہ تمھارا پروموشن لیٹر ہے۔ اب تم ریجنل پبلشنگ ہیڈ ہو۔"

مرتضیٰ اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر کاغذ اٹھایا۔ وہ شکریہ کے لیے لب کھولنے ہی لگا تھا جب پرچے پر درج سطور میں سے ایک اس کی سانس اٹکا گیا۔

ہم آپ کو ہمارے نیویارک کے دفتر میں مقیم پبلشنگ امریکہ کے علاقائی سربراہ کے عہدے پر ترقی کی پیشکش کرتے ہیں۔

اس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے چہرہ اٹھا کر زمل کو دیکھا۔ "کیا؟"

"کیا؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

"اس میں۔۔۔" اس کی آواز گلے کے کانٹوں کے باعث کھردری تھی۔ "اس میں کیا لکھا ہے؟"

"کیا! تم ان پڑھ ہو؟ اتنے عرصے سے ہماری ایجنسی کو دھوکہ دے رہے ہو۔" وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔ مرتضیٰ نے ایک گہری سانس اندر لی، پھر سنجیدگی سے اپنی باس کو دیکھا۔

"اس میں لکھا ہے مجھے پروموشن ملا ہے۔ ہمارے۔۔۔ ہمارے نیویارک آفیس میں؟"

"بالکل ٹھیک!" وہ مسکرا دی۔

"مجھے کیوں پروموشن مل رہا ہے؟ میں نیویارک کیسے جا سکتا ہوں؟ کیا آپ کو یقین ہے آپ کو مجھے ہی یہ دینا تھا؟"

"نہیں۔ اصل میں مجھے تمھیں ٹرمینیشن لیٹر دینا تھا۔ یہ صرف ایک بھونڈا مذاق ہے۔"

مرتضیٰ دنگ سا اس کی شکل دیکھے گیا جب وہ تھک کر ہنس پڑی۔

"ظاہر ہے! تمھیں ہی دینا تھا۔ دیکھو مرتضیٰ، میں جانتی ہوں تمھاری زندگی بہت مشکل رہی ہے۔ شاید تمھیں ابھی لگے کہ تم اس کے لیے تیار نہیں ہو مگر مجھے پتا ہے۔ تم تیار ہو۔ ہو سکتا ہے نیویارک ہی تمھارا کیور (علاج) ہو۔" اس نے آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ سنہری روشنیوں میں ان کے آس پاس سب دھول بن جاتے۔

رباب سے پہلے ایسا کس کے ساتھ ہوا تھا؟

"میں۔۔۔" اس نے پیپر میز پر واپس سجایا۔ "میں تھوڑا وقت لینا چاہتا ہوں۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جتنا چاہے وقت لو۔ میں نے کبھی تمھیں وقت لینے سے روکا ہے؟" پتا نہیں ایک عجیب سی چبھن تھی اس کے الفاظ میں۔ مرتضیٰ نے چہرہ اس کی سیدھ میں کیا۔ زمل اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے نم تھے۔

اس کے دل کو چوٹ لگی۔ واقعی، اس نے کبھی اسے وقت لینے سے نہیں روکا تھا۔

رستوران کی سرخ رنگوں کے پار چلو تو ایک نئی دنیا بے پردہ ہوتی ہے۔ ماضی کی دنیا۔

آفیس کی بان فیئر نائٹ پر سمندر کی لہریں دور سنی جا سکتی تھیں۔ یہ دو سال قبل کی بات تھی، جب رباب اور ادا کے موت کو چھ مہینے گزرے تھے۔ آسمان میں ماہِ کامل نیلی روشنی کے کناروں سے رنگا تھا۔ دور، کوسوں دور۔ وہ خلا میں تحلیل اس کی سیاہ زندگی کا احاطہ لگتا تھا۔

درخت کے تنے پر نشست مرتضیٰ کی جینز ٹخنوں سے اوپر تہ ہوئی تھیں۔ سفید بٹن شرٹ کے کف ڈھیلے تھے اور آستینیں کہنیوں تک مڑی تھیں۔ آنکھوں پر چشمے تھے اور گہری بھوری بالوں کی تہالٹ ابرو پر لہرا رہی تھی۔ گھنی پلکیں پاس جلتی لکڑیوں کو تک رہی تھیں۔ نارنجی شعلے کناروں سے سرخ دہک رہے تھے، ان کی تپتی لکڑی جل کر سیاہ ہو جاتی اور اسی طرح روشنی کا مینار سدا بہار رہتا۔

جلنے کے بعد کا نور اسے عزیز تھا۔

سنگ ریزہ پر جوتوں کی آواز اس کے قریب بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں تھامی مارش میلو اسٹک کے کنارے چھوتے، اس کی حرکات میں جھجک تھی۔ وہ مرتضیٰ کو کئی سالوں سے جانتی تھی۔ وہ اس کے باپ کا ملازم تھا، اس کا ساتھی تھا۔ اس کے غم سے بھی وہ پوری طرح آگاہ تھی۔

شعلوں کی لپیٹ میں الجھا اس کا چہرہ چاند کی نقرئی چمک میں اجلا دکھائی دیتا۔ ایک خاموش سانس اندر کھینچتے، زمل نے اس پتلی لکڑی کی ڈنڈی اس کے جانب بڑھائی۔

مرتضیٰ نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پہلے اس کی توجہ اس کے ہاتھ میں قید مارش میلو تک گئیں اور پھر اس کی آنکھوں تک۔ اس نے ایک نرم تاثر کے ساتھ لکڑی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ مطمئن سی ہو کر اس کے برابر جا بیٹھی۔ ان کے درمیان کئی انچ کا فاصلہ تھا۔

ڈنڈی میں پروئے مارش میلو کو آگ کے کنارے دہکاتے وہ اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔ زمل نے اپنی ڈنڈی میں موجود آخری مارش میلو کو لبوں کے درمیان کھینچا۔

"تمھیں میٹھا پسند ہے؟" اس کا سوال مرتضیٰ کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ تھوڑا سا سنبھلا۔

"نہیں۔ لیکن مجھے میٹھے کا کانسیپٹ پسند ہے۔ میٹھے سے آپ کی اچھی یادیں جڑی ہوتی ہیں، یو نو؟" لکڑی میں سجا مارش میلو اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ سفید سے سنہرا گندمی۔

زمل اس کی بات پر مسکرا دی اور اثبات میں گردن نیچے کی۔ چند لمحات ان کے درمیان کھنچ کر طویل ہوئے۔ مرتضیٰ اب مارش میلو قریب کرتے اسے جانچ رہا تھا۔ وہ مکمل بھن چکا تھا۔ اس نے شہادت کی انگلی سے گرماہٹ چیک کی پھر اسے زمل کی طرف بڑھا دیا۔

"تھوڑا گرم ہے، دیکھ کر۔"

"تم نہیں کھاؤ گے؟ میں چھری دکھاؤں تب بھی نہیں؟"

اس کی بات پر وہ ذرا سا مسکرایا۔ "آپ کو اپنے گفت و شنید کے شعور پر تھوڑے کام کی ضرورت ہے۔"

"ایک کھالو میرے ساتھ۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی تو وہ نجانے کیوں انکار نہیں کر سکا۔

"اوکے، صرف ایک۔" ایک مارش میلو کو انگلیوں کے درمیان پکڑے اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ دور لہروں نے ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکیلا۔

زمل اسے دیکھتے خاموش ہوئی لیکن زیادہ دیر نہیں رہ سکی۔ پتا نہیں کیوں اسے مرتضیٰ عباس کے ساتھ سارے پل اہم لگتے تھے۔

"تم ایک اچھے باپ تھے، مرتضیٰ۔ ادا کو تم سے بہت پیار تھا۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی بات پر وہ ٹھہر گیا، ہونٹوں کے نزدیک پکڑا مارش میلو وہیں سے لوٹ گیا۔ اس نے زبان کی مدد سے لبوں سے اس کی مٹھاس صاف کی۔

"شکریہ۔"

"وہ چھ سال کی تھی نا؟" زمل کی آواز کڑکڑاتی لکڑیوں کے ساتھ یکساں ہوئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ خاموش رضامندی۔

"اور تمھاری بیوی؟"

اس نے ناخن سے درخت کا تنا کھرچ ڈالا۔ "وہ ادا کے ساتھ تھی۔"

لکڑیوں سے اٹھتے انگارے گھنی رات میں سرخ نمایاں ہوئے۔

"کیا تمھارا دل چاہتا ہے کہ تم ان کے ساتھ ہوتے؟"

اس کے سوال نے اس کی سوچوں کو دو پل لگام ڈالے۔ نیلے آسمانوں کے رنگ رنگا قمر بھی اس کے جواب کا منتظر تھا۔

"مجھے ہر دن، ہر پل وہ دونوں یاد آتی ہیں۔ لیکن میرا سفر یہاں ہے۔" دل آج بھی دکھتا تھا، دل برسوں بعد بھی دکھے گا۔ زخم بھر جاتے ہیں لیکن بھولے نہیں جاتے۔

"تم مضبوط آدمی ہو، مرتضیٰ۔"

اس نے چہرہ موڑا تو ان کی نگاہیں جڑ گئیں۔ ایک لمحہ ان کے بیچ ایسے ہی کٹ گیا۔ کسی کی نظروں میں تسلیم ہو جانے کی راحت، مرتضیٰ کو اس دن معلوم ہوا تھا وہ کیا شے تھی۔

"شکریہ۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ زمل مسکرا دی اور خالی پکڑی مارش میلو کی ڈنڈی اٹھائے کھڑے ہونے لگی۔ وہ جا رہی تھی، اسے اس کی سوچوں میں تنہا چھوڑنا چاہتی تھی، لیکن اب کہ راوی یہ نہیں چاہتا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"رکیں۔" اس کی پکار پر وہ پیچھے مڑی۔ مرتضیٰ کے لب خشک تھے۔ توبہ، وہ کیا بولنے والا تھا؟

"بیگ میں اور مارش میلو تھے۔ میں لے کر آؤں؟ ہم ساتھ روسٹ کر سکتے ہیں۔" استغفر اللہ، اتنا بے تکا بہانہ۔ رباب ہوتی تو اس کے منہ پر ہنس دیتی۔ اچانک دل میں ٹیس اٹھی۔ رباب ہوتی تو یہ سب ہوتا ہی کیوں؟ پھر اس نے سر جھٹکا۔ وہ رباب کو کیوں سوچ رہا تھا؟ پھر حیرت ہوئی۔ وہ رباب کو کیوں نہیں سوچنا چاہتا تھا؟

"لیکن میرا پیٹ بھر گیا ہے اور تم مارش میلو کھاتے نہیں۔" وہ شرمگین سا مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم فجر میں پرندوں کو کھلا دیں گے۔"

اب کہ وہ قدم قدم اس تک واپس آئی، آنکھوں میں حیرت تھی۔ "پرندے مارش میلو کھاتے ہیں؟"

"لو۔ ایک پرندہ میرا چوزہ کھا گیا تھا، آپ مارش میلو کی بات کر رہی ہیں۔"

اور اس پر وہ خوب دیر تک ہنسی تھی۔ مرتضیٰ کو خود اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے ایسا بھی کیا مزاحیہ کہہ دیا تھا، لیکن اسے اچھا لگا تھا۔

اسے زمل کا اپنے لیے ہنسنا اچھا لگا تھا۔

★★★

۱۰ فروری ۲۰۱۲

تمان ٹن ڈاکٹر اسماعیل، کوالالمپور

بالائی کھڑکیوں کے کھلے شیشے چلمن کے سفید پردوں سے ڈھکے تھے۔ رات کی چاندنی پردے کے دھاگوں کے درمیان اپنی جگہ بناتی گھر کے فرش پر قطرہ قطرہ اجاگر ہو رہی تھی، اس کی اجلی شعائیں گھر کے لاؤنج میں بکھرے سنہرے بلبوں کے زیرِ اثر پھیکی تھیں۔

رات اپنے دوسرے پہر میں قدم گزار چکی تھی اور بیشتر مخلوقات خواب خرگوش کے حوالے تھے۔ عرش پر بادل گھنے تھے اور کوالالمپور کی فضاء میں پھیلی نمی ایک سی۔ قطار میں کھڑے لاتعداد گھروں میں سے وہ واحد خلوط گاہ لیمپ کی ہلکی روشنی میں ڈوبی تھی۔

پردوں میں چھپی اس کھڑکی کی بھیتری جانب واقع لاؤنج اپنی حالت خود سناتا تھا۔ کمرے کے وسط میں سجی گہری بھوری کافی ٹیبل پر کاغذات کا انبار لدا تھا۔ مختلف قد اور موٹائی کی کتابیں اور نوٹ بک ایک دوسرے کے اوپر رکھی گئی تھیں۔ کچھ کے کنارے چبے تھے، کچھ کے پھٹ گئے تھے۔ پلاسٹک کا اسٹیشنری بٹوا اور اس کے اندر باہر پڑے رنگ برنگے قلم۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

کافی کی میز سے دور ہٹ کر لاؤنج کا بقیہ حصہ کھوجو تو کمرے کی سب سے وسیع دیوار پر ایک سے دو میٹر بڑا دنیا کا نقشہ چپکایا گیا تھا اور اس کے دائیں اور بائیں جانب مختلف کاغذات اٹکائے گئے تھے۔ کیمرہ قریب ہوتا ہے تو ہمیں وہ بہتر دکھائی دیتے ہیں۔

فلائٹ پاتھ اور ائیر ٹریفک کی راہیں، اس کے نیچے ہی مختلف ائیر پورٹس اور ان کی ٹیکسی، رن وے اور ٹرمینلز سے وابستہ معلومات۔ سیاہ و سفید پرچوں پر مختلف پروازوں کا فلائٹ ڈیٹا (جیسے کے اونچائی، رفتار، راہ اور دیگر چیزیں) بھی گم سے چسپاں کی تھیں۔

ہوا کے گرم جھونکے سے پردہ دائیں طرف کو اڑا اور اس کی مداخلت سے میز پر رکھی کتابوں کے پرچے پھڑپڑائے۔ ہر چند صفحات چھوڑ کر ہرے اور نارنجی اسٹکی نوٹس پر بہت کچھ لکھا تھا۔ وہ لکھائی رابح کی تھی۔ دیوار پر نصب گھڑی کی تین سوئیاں اپنے مقررہ دائروں میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ کوئی بھی چیز وقت سے پہلے نہیں ہوتی۔ وقت بھی وقت سے پہلے نہیں ہوتا۔

کمپوٹر کی اسکرین اپنی سفید چمک کے سنگ مختلف تصاویر پیش کر رہی تھی۔ اسکرین پر رواں مناظر ہر تھوڑی دیر بعد شکل بدل لیتے لیکن کوئی بھی آواز گرد و نواح میں سنائی نہیں دیتی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کے مقابل کرسی پر بیٹھے مرد نے ایک پیر اوپر اٹھا کر گھٹنے پر سجایا اور دوسرے کی مدد سے گیمنگ چیئر کے پہیوں کو دھیرے سے چکر دیا۔ پیے آگے پیچھے ہوئے، وہ بھی ہوا۔ کانوں پر سجے نیلے رنگ کے ہیڈ فون سے نکلتی آوازیں اس کی سماعتوں میں پوری اتر رہی تھیں۔ اس کی گود میں ایک کتاب رکھی تھی اور اس کے اوپر بنا ڈھکن کا قلم۔

کتاب کا آدھا صفحہ پہلے ہی سیاہی سے بھر دیا گیا تھا۔ اوپر نیچے ہوتے حروف، ایک دوسرے سے تکرار میں۔ کسی کا ڈنڈا غائب تھا تو کسی کا خم، کوئی خط کے نیچے تھا تو کوئی پہاڑ کی چوٹی کی طرح طغیانی پر۔ ان الفاظ

کے لکھے سے زیادہ ان کی بد نظمی آپ کو حیران کرتی تھی۔ ان میں کچھ الفاظ کو چبھتے ہوئے رنگ کے ہائی لائٹر سے علحیدہ طور پر نکھارا گیا تھا۔

Communication.

چند سطور چھوڑ کر۔

Fuel dumping.

ایک کنارے پر اسٹکی نوٹ سے چھپا ہوا۔

Cabin pressure.

چند صفحات پلٹ کر سرخ روشنائی سے لکھا۔

Mayday.

رائج نے سر جھکا کر کانوں میں پڑتی مؤرخ کی نسوانی آواز پر توجہ دی۔ گہرے بھورے بال ماتھے پر ذرا سے جھکے تھے اور دانت اوپری ہونٹ کی جلد کتر رہے تھے۔ دو سال کے بعد وہ پہلے جیسا رائج لگتا تھا۔ وہ جو اپنی اڑان میں مستقل تھا، وہ جو نزول کا خیال ترک کر کے ہر کام کرتا تھا۔ روزمرہ کی بنیاد پر جم جانے اور سائیکل چلانے کے نتیجے اس کا وزن بھی اپنی کاٹھی پر لوٹ آیا تھا۔ چہرے سے بلا ضرورت کی تھکان چھٹ گئی تھی اور ناک کی کھڑی لکیر نمایاں تھی، ہر جگہ سوائے اس کے گالوں کے۔ وہ ہمیشہ تھوڑے بھرے ہی رہتے تھے، اور دیکھنے والے کو اس پر وہ اچھے بھی لگتے تھے۔

دنیا کو وہ ایسا ہی تو لگتا تھا۔ حال کا رائج، وہ جو سب بھول بھال کر ان کے ساتھ آگے چل دیا تھا۔ حال کا رائج، وہ جو ماضی کے تمام باب دھکیل کر آیا تھا۔ حال کا رائج، جو توڑنے سے بھی نہ ٹوٹتا۔

اس نے ماؤس کے ایک کلک سے وڈیو روکی اور پین اٹھا کر پرچے پر کچھ لکھنے لگا۔

"اسٹینڈرڈ فلائٹ پروفائل۔۔۔" الفاظ جنم لے رہے تھے۔

اس کے کندھے کے اوپر جھکو تو آپ بھی وہ اسکرین دیکھ سکیں گے جو اس وقت خالی گھر میں بیٹھا وہ تنہا مرد سار رہا تھا۔

اس کے ہیڈ فون کے ساتھ کان لگاؤ تو یوٹیوبر کی چہکتی ہوئی آواز آپ اور میں بھی سن پائیں گے۔

"۱۹۹۹ میں، مصر ایئر کی پرواز 990، بوئنگ 767، نیویارک سے قاہرہ جا رہی تھی۔ یہ صرف ایک معمولی بین الاقوامی پرواز تھی، لیکن ہوا کے وسط میں جو ہوا اس سے ہوابازی کی دنیا میں صدمے کی لہر دوڑ گئی تھی، جس کے آفٹر ایفیکٹس آج تک محسوس کیے جاتے ہیں۔"

رانج نے ٹھوڑی کھجاتے پلے بیک کی رفتار تیز کی۔ اب کہ یوٹیوبر کے الفاظ پھرتیلے تھے، اور اسکرین پر نیو یارک سے قاہرہ کا نقشہ واضح۔

"جیسے ہی ہوائی جہاز بحر اوقیانوس پر چڑھا، کچھ ایسا ہوا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

رانج نے ابرو اٹھائے۔

"اچانک، ہوائی جہاز سمندر کی طرف بڑھتا ہوا تیزی سے نیچے آیا۔ کاکپٹ وائس ریکارڈر نے عملے کے درمیان الجھن اور افراتفری کے آخری لمحات کو قید کر لیا۔"

اس نے ہاتھ سے منہ صاف کیا۔ اسکرین کی آوازیں غائب ہوئیں اور فلائٹ ۹۹۰ کی کاکپٹ سے فرسٹ آفیسر کی آخری آوازیں سنائی گئیں۔

"تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ۔"

"پلین کے فرسٹ آفیسر جمیل اں بستوتی کی آواز اور ان کا کہا 'تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ' ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ کیپٹن احمد الہیباشی کے لیوٹری ارسال ہونے کے بعد، جمیل نے پلین کے دونوں انجنوں میں فیول سپلائی بند کر دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی کیپٹن نے لیور کو واپس اپنے انتہا پر کھینچا لیکن افسوس، کوئی فائدہ نہ ہوا۔

فیول کے بغیر پلین کا الیکٹریکل سسٹم بھی جلد دم توڑ گیا تھا جس کی وجہ سے فلائٹ ریکارڈنگ بھی ادھر ہی تھم گئی تھی۔"

رانج کو یہ سب پتا تھا۔ بطور پائلٹ آپ اپنے پیشے کے بھیانک تر واقعات سے تجاہل نہیں برت سکتے۔ لیکن اب وہ ان واقعات کو ہیرت یا شاک کی نگاہ سے نہیں بلکہ ایک اچھنبے سے تکتا تھا۔

جان بوجھ کر کیے جانے والے پلین کریش، پائلٹ کی خودخوشی، مرڈر-سوسائیڈ۔۔۔ اب وہ الفاظ اس کے لیے ایوی ایشن کے چند بول نہیں تھے جن کی عزت میں سر جھکا کر وہ چل پڑتا۔ وہ اس کا کُل تھے۔ کُل بھی اور کل بھی۔

"ریڈار ڈیٹا سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رات کے ایک بج کر اکیاون منٹ، مصری معیاری وقت کے مطابق، ائیر کرافٹ اپنی آخری ڈھلان پر گامزن تھا۔ اس ساری افراتفری کے عالم میں ناگہاں حکمتوں کے کارن پلین کی باڈی سے بایاں انجن اور کچھ ریزے الگ ہو گئے تھے۔"

"ایک بج کر باون منٹ پر طیارہ بحر اوقیانوس میں جا گرا، جس میں سوار تمام ۲۱۷ افراد جان سے چلے گئے۔ اس کے بعد ہونے والی تفتیش پیچیدہ تھی، جس سے حادثے کی وجہ کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے تھے۔ کچھ تفتیش کاروں کا خیال تھا کہ یہ کو پائلٹ کی جانب سے جان بوجھ کر کیا گیا عمل تھا، جب کہ دوسروں نے مکینیکل ناکامی کا مشورہ دیا۔ این ٹی ایس بی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فرسٹ آفیسر نے جان بوجھ کر پلین کریش کیا، لیکن مصر نے اس دلیل سے اختلاف کیا۔"

رانج نے ڈاکیومنٹری روک دی اور سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوا۔ میز سے سرخ موٹی دھار والا قلم اٹھا کر وہ دیوار پر لگے نقشوں تک گیا۔ اس نے ہاتھ سے پردہ دور کیا تو ایک اور شیٹ دیوار پر لگی نظر آئی۔

ملائیشیا ائیر لائنز کریو ممبرز۔

تمام پائلٹس، کیپٹن، فرسٹ آفیسر، فلائٹ اٹینڈنٹ، اپنے نام اور درجے کے ساتھ اس کے گھر کی دیوار پر چسپاں تھے۔

وہ قدم قدم چلتا رہا، آنکھیں ان کے نام پڑھتی گئیں۔ کئی تصاویر، کئی اشکال۔ اس کے دماغ میں دن رات پڑھی سنی باتیں چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ گھنٹوں اور دنوں کا حساب چھوڑ کر بس اسی جست میں مگن رہتا۔ تاریخ میں ہونے والے بدتر سے بدترین کریش کی فوٹیج دیکھتا، اس کی ٹرانسکرپٹ پڑھتا، CVR طلب کرتا، انت گھڑی سے پہلے کی ہلچل کو محسوس کرتا۔

اس نے یہ سب اتنی پابندی سے، اتنی مرتبہ کر لیا تھا کہ اس کی حساسیت صفر ہو چکی تھی۔

پچھلے دنوں میں سنی کسی سائیکولوجسٹ کا بیان اس کے دماغ میں چلنے لگا۔

"پائلٹ اسسٹڈ سوسائیڈ میں جہاں اپرادھی پائلٹ کا جرم ناقابلِ فراموش ہے، وہیں ہم اس کے ساتھ موجود، اس بھیانک تدبیر میں لپٹے جانے والے معصوم شریک پائلٹ کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اکثر پائلٹ سوسائیڈ میں درگھٹنا جب ہی پیش آتی ہے جب ایک پائلٹ دوسرے کو تنہا چھوڑ جاتا ہے، اِرادۃً یا غیر اِرادۃً۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

سرخ مارکر کی موٹی نوک ہوا میں تحلیل تھی اور اس کے سیدھ میں ہی ایک ایک کر کے سارے کریو ممبرز کے اسم۔

کیپٹن فریدہ عبداللہ۔ سینئر فلائٹ اٹینڈنٹ عائشہ بنتِ رحیم۔ کیپٹن اسماعیل ابراہیم۔ فرسٹ آفیسر نورالہدیٰ بنتِ احمد۔ چیف پرسر علی بن یوسف۔ کیپٹن سیتی امینہ بنتِ اسکندر۔ فرسٹ آفیسر اسامہ عامر۔ سینئر فلائٹ اٹینڈنٹ عزیزہ بنتِ عبدالرحمن۔ کیپٹن زینل عابدین بن محمد علی۔ چیف پرسر نورزلینا بنتِ ذوالکفلی۔

اس نے مارکر کا ڈھکن واپس لگایا۔

رائج آدم کو بھی اپنا شریکِ پرواز تلاشنا تھا۔

★★★

بڑے ہال کی چھت سے معلق فانوس شیشے کی بتیوں سے اجاگر تھے۔ سنہری چمک میں ڈوبے وہ ساکت مجسمے سرخ قالین اور بھورے صوفوں کے اوپر نور بکھیرے تھے۔ یہ مالائیشیا ائیر لائنز کی جانب سے اپنے ملازمین کو نوازا گیا آفیشل ڈنر تھا، جس پر تقریباً سارا اسٹاف موجود تھا۔ فارمل ملبوسات اور ہلکے پھلکے رویے۔ بات چیت کرتے وجود کے ہاتھوں میں گول پیندے والے گلاس مختلف رنگوں کے مشروبات سے لبالب بھرے تھے۔ کوئی پلیٹ اٹھائے فرائز کے دانے چگتا جا رہا تھا تو کوئی میز پر بیٹھا سوپ میں چمچہ چلا رہا تھا۔ ایک جگہ سربراہان کا مجموعہ تھا جو کڑک استری شدہ سوٹ بوٹ تانے ساتھ کھڑے آپس میں ہنس رہے تھے۔

اپنی پلیٹ میں وائٹ ساس پاستا نکالتے رائج نے اس جانب دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ اپنا باس بھلا کسے پسند ہوتا ہے؟ البتہ اس نئے سی ای او کو دو سال سے زائد گزر چکے تھے کمپنی میں، رائج اس سے کبھی بھی پوچھے بغیر مکالمہ شروع نہیں کرتا تھا۔ اس سے کیا؟ رائج تونائی کو بھی تب تک ہیئر اسٹائل نہ بتائے جب تک وہ اس کا آدھا سر نہ مونڈ چکا ہو۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ کولڈ ڈرنکس کے اسٹال تک بڑھا تو ایک ہاتھ اس سے پہلے ہی ٹھنڈی بوتل پر قابض تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"او سوری، تم لے لو۔" مسکراتے چہرے نے آم کی جوس کی بوتل اس کے جانب بڑھائی۔ رائج اسے جانتا تھا۔ اسامہ عامر، عمر بیالیس سال۔ وہ ملائیشیا ائیر لائنز میں نیا آیا تھا اور اس سے پہلے کسی چھوٹے فلائٹ اسکول میں استاد تھا۔

"کوئی بات نہیں، میں دوسری لے لوں گا۔" وہ کہہ کر اسٹال کی جانب مڑا ہی تھا کہ وہاں فروٹ جوس ختم تھے، صرف سافٹ ڈرنکس رکھیں تھیں۔ اس نے دانت پیسے اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

اسامہ نے اس کا ردعمل بغور دیکھا۔ "خیریت؟ کوکا کولا سے کوئی بیر ہے؟"

رائج تھوڑا سا مسکرایا۔ "نہیں، میں بس carbonated drinks نہیں پیتا۔ معدے میں مسلہ ہوتا ہے۔ Acid reflux."

اسامہ نے سر اوپر نیچے کیا۔ "اسی لیے کہا تھا بھائی جان، یہ لیں۔" اس نے بوتل اس کی انگلیوں میں پکڑائی۔ رائج نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"میرا معدہ ٹھیک ہے الحمدللہ۔" اس نے اسپرائٹ کی ایک بوتل اٹھاتے کہا۔ "کھانے کا مزہ نہیں آتا جب تک کولڈ ڈرنک نہ ہو۔" وہ ہنستے ہوئے ساتھ ساتھ پلیٹ میں جھینگے رکھتے جا رہے تھے۔

رائج اسے دیکھتے مسکرا دیا۔

اسامہ عامر، عمر بیالیس سال، ملائیشیا ائیر لائنز کا نیا فرسٹ آفیسر انتہائی نرم دل تھا۔

یہ بات اس کے بیک گراؤنڈ چیک میں رائج نے نہیں پڑھی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

تھوڑی دیر بعد وہ دیگر پائلٹس کے ہمراہ گول میز کے ایک طرف بیٹھے تھے۔ رائج اپنی گود میں رومال بچھائے، پاستا کے چھوٹے چھوٹے لقمے زبان پر رکھ رہا تھا۔ اس کی جوس کی بوتل اب تک رسائی سے پرے رکھی تھی۔

جستجو کی گور میں ڈوبے ایک پائلٹ نے نوالہ بناتے اسامہ کی طرف رخ کیا۔ کیونکہ وہ اتنے لوگوں سے واقف نہیں تھا، سو خاموشی سے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔ رائج وہاں سب سے واقف تھا اسی لیے وہ بھی خاموشی سے سب کو سن رہا تھا۔

"اوئے اسامہ، تم نے کبھی ڈھیٹ مسافرین کے ہجوم کو دیکھا ہے؟ چیری اون ٹاپ اگر آپ کا کوپائلٹ بھی کمینہ ہو۔" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اسامہ نے ایک لمحے کے لیے کانٹا دور کیا اور مسکرایا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ لیکن فلائٹ اسکول میں بھی طرح طرح کے قصے سننے ملتے ہیں۔"

اس کے جواب پر ایک اور پائلٹ محظوظ ہوا۔ "شیور۔ اٹھارہ سالہ بچوں کو سیسنا اڑانا سکھانا ایک پیکڈ ائیر بس کے مقابل ہے ناں۔" وہ ہنس رہا تھا لیکن اس کے لب و لہجے سے حقارت ٹپک رہی تھی۔

رانج نے گول پیندے والا گلاس لبوں سے لگایا، ہیزل آنکھیں بے تاثر تھیں۔

اسامہ کے ہونٹ اوپر نیچے ہوئے۔ شاید وہ اس وار کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تمھیں کبھی سیکڑوں زندگیوں کو لائن پر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا پڑا ہے؟ فلائٹ اسکول آپ کو اس طرح کی ذمہ داری کے لیے بالکل تیار نہیں کرتا۔" اضافی لوازمات۔

مسکراتی شکل اب خاموش تھی۔ اسامہ نے بے پناہ دھیرج سے سب کو دیکھا۔ "آپ لوگ جو بھی کہیں، فلائٹ اسکول ہم سب کی بنیاد ہے۔ ویسے بھی، کسی کو کچھ سکھانا، کسی کا 'استاد' ہونا کسی فن سے کم نہیں۔"

"ہاں بھئی، بدتمیز طلباء کی ایک کلاس کو سنبھالنا ہنگام لینڈنگ جتنا ہی خطرناک ہوتا ہے ناں؟"

BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج نے انگوٹھے کی پشت سے گھونٹ صاف کیا اور رومال تہ کرنے لگا۔

اسامہ کے کان اہانت سے سرخ ہو چکے تھے۔ اس کے پاس کہنے کو الفاظ کم تھے۔

اب کہ پہلا پائلٹ کہنی کے بل سیٹ میں آگے جھکا اسامہ کا کندھا مسل رہا تھا۔

"کم اون، تمھیں پتا ہے فلائٹ اسکول چھوٹے بچوں کے لیے ہے۔ It's almost... cute!"

"اتنے کنڈر گارٹن کے تبصرے آج کے لیے کافی ہیں۔" رانج کی نگاہیں برہمی سے چست تھیں۔ یکایک سب خاموش ہو گئے۔ "اسامہ کے پاس بیشک آپ کی ائیر لائنز کی بیج نہیں ہیں، لیکن ایک پائلٹ پائلٹ ہوتا ہے۔"

"ارے، آرام سے ہو جاؤ، رائج۔ ہم صرف مذاق کر رہے تھے۔"

برابر بیٹھے پائلٹ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دینی چاہی مگر وہ آگے جھک گیا، آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔

"مذاق ٹھیک ہے، مگر کسی کے تجربات کی تضحیک کرنا بالکل نہیں۔ فلائٹ اسکول ہی وہ جگہ ہے جہاں سے میں اور آپ 'رئیل' پائلٹ بن کر نکلے ہیں۔" لفظ رئیل کے گرد ہوا میں دو کومے کھینچے۔ "اگر انسٹرکٹر نہ ہوتے تو ہم میں سے بہت سے لوگ اس مقام پر بیٹھے کولڈ ڈرنکس نہ پی رہے ہوتے۔"

"تم بلاوجہ اتنے سنجیدہ ہو رہے ہو۔" ایک نے شرمندگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہونا پڑ رہا ہے کیونکہ مجھ سے کئی بڑھے اور عاقل بالغ لوگ رینک رینک کھیلنے میں مگن ہیں۔" دو انگلیوں سے لاشعوری طور پر ٹیبل کھٹکھٹائی اور سب کو ایک ایک کر کے ٹھہر کر دیکھا۔

"Show some respect, everyone."

کچھ کے سر ندامت سے نیچے ہوئے اور کچھ نے تنگی سے ہنس کر بات ٹال دی۔ رائج نے پلیٹ دور دھکیلتے سر گھمایا تو اسامہ اسے دیکھ رہا تھا، نرم بھوری آنکھوں میں تشکر تھا اور مان بھی۔

وہ بدلے میں مسکرا دیا اور اس کے جھینگوں کی جانب اشارہ کیا۔

"کھانا کھاؤ۔"

★★★

وقت کو پر لگ جانا۔

اس دن سے پہلے رائج آدم کو یہ جملہ ایک محاورہ معلوم ہوتا تھا لیکن اب جا کر اسے علم ہوا تھا کہ جب زندگی میں مقصد ہو تو وقت کو واقعی پر لگ جاتے ہیں۔ اور اب اس نبختا پائلٹ کو بھی اپنی حیات کا سب سے کثیر مقصد دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک ایسی تحریک جس کا زوال غیر موجود تھا۔

اس کے انجام کی تحریک!

سال دو ہزار بارہ کے درمیانے مہینے رواں تھے۔ گرمیاں عروج پر تھیں اور زندگی کی بھگدڑ ہمیشہ کی طرح پھرتیلی۔ ملائیشیا ائیر لائنز کے علمیاتی سہولیات کے ڈسپیچ آفیس میں قدم رکھتے پائلٹ کا عکس شیشے کے دروازوں پر ابھر کر نمایاں ہوا۔ پانچ فٹ نو انچ کا نیلا یونیفارم تانا پائلٹ، وسیع کندھے اور مضبوط بازو۔ اس کے ہاتھ میں دستاویزات سے بھاری ایک خاکی رنگ کا لفافہ تھا اور چال پر مقصد۔ استقبالیہ ڈیسک پر کھڑے ہوتے اس نے انٹری کے لیے اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور پھر اسی ادا سے آگے چل دیا۔

علمیاتی ایریا میں داخل ہوتے اس نے آس پاس نظر گھمائی۔ کمپوٹر اور لیپ ٹاپ اسکرینز، اس کے ساتھ ہی بجتے فون اور کاغذات پر قلم چلاتے آفیسرز، وہاں کی دوادش ہمیشہ ایک سی ہی رہتی تھی۔

نئے طرز کا فلائٹ اور آمد و رفت کا ساز و سامان، وہاں پر سافٹ ویئر کی ایک نرالی دنیا آباد تھی۔

ڈسپیچ آفیس ٹریفک کنٹرول اور اطلاع دہی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تمام فلائٹ سے پہلے ساری تصدیق و توثیق ادھر ہی پیش آتی ہے۔ رائج بھی ہفتے بعد طے ایک پرواز کا فلائٹ پلین جما کروانے آیا تھا، مگر اس کی کہانی میں ایک گھوٹالہ تھا۔

"سیلامت پاگی، اہلی منزہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے میز کے پار بیٹھی سفید حجاب والی کنٹرولر کو آداب کیا۔ آدھیڑ عمر عورت نے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں، ابرو آپس میں تنے تھے۔ "آپا خبار؟"

"اداجے، بھر نافس۔" اس نے سانس باہر نکالتے کہا۔ سانس لے رہی ہوں۔ پھر سر اٹھا کر رائج کو دیکھا۔

"تم کیوں اتنا چہک رہے ہو؟ شادی کر رہے ہو؟"

اس کے اچانک استفسار پر وہ اول تو چونکا پھر جھینپ کر ہنس دیا۔ "نہیں، بھئی۔ آدمی بیوی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا؟"

"مجھے کیا پتا؟ نہ تو میں آدمی ہوں اور نہ ہی خوش۔" منزہ نے ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے جمائی۔ اس کے چہرے کا میک اپ باسی لگتا تھا، پلکوں پر لگا مسکارا بھی مٹ سا گیا تھا۔ رائج نے دوستانہ انداز میں کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائیں۔

"چلیں بتا دیں کس نے چوٹ پہنچائی آپ کو۔ بڑا پرانا ساتھ ہے اپنا، کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

منزہ نے اسے اوپر سے نیچے دیکھا۔ "اتنے میٹھے نہ بنو۔ ضرور ریلیف مانگنے آئے ہو، ہے ناں؟ بھاگ رہے ہو ناں کسی فلائٹ سے؟ بچو، میں نہیں دیتی چھٹی۔"

وہ دوبارہ ہنس دیا۔ "آپ بھول رہی ہیں شاید۔ میں، رائج آدم، صرف پیشے سے نہیں بلکہ دل سے پائلٹ ہوں۔ اپنی ذمے داریاں خوب نبھاتا ہوں۔"

منزہ نے ناک سے ہنسی چھوڑی۔ "چلو، دل سے پائلٹ، ادھر پکڑاؤ فلائٹ پلان۔" اس نے خاکی لفافے کے لیے انگلیاں آگے کیں۔ رائج نے تابع داری سے وہ اس کے حوالے کر دیا اور اسے کاغذات باہر نکالتے دیکھتا رہا۔

منزہ نے آگے جھک کر آپنی عینک اٹھائی اور پھر اس کی جانچتی نظریں کاغذات پر تھیں۔

"یہاں پر الٹی ٹیوڈ میں تبدیلی ہے۔ اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟" اس نے انگلی سے ایک نقطے پر اشارہ کرتے پوچھا۔

"جی، یہ تبدیلی ہوا کے خاکوں (wind patterns) کو دیکھ کر لائی گئی ہے۔"

منزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مختلف ایئر پورٹس، وے پوائنٹس اور دیگر چیزوں کو باری باری پڑھ لینے کے بعد وہ ایک جگہ رکی۔

"رائج، یہاں راستے میں اسٹینڈرڈ پیٹرن سے انحرافات ہیں۔ وجہ؟" وہ اوپر دیکھتے پوچھ رہی تھی۔

"یہ فیول افیشینسی کے لیے کیا گیا ہے۔ مائینر سی تبدیلی ہے۔"

جھوٹ۔ وہ کسی فیول افیشینسی کے لیے وہ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے فلائٹ کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی تجاوزات نہیں سوچے تھے۔ وہ فقط ایک امتحان تھا۔ وہ صرف ائیر ٹریفک کنٹرول کو جانچنا چاہتا تھا، کسی غیر متوقع تبدیلی سے متعلق ان کا پاسخ پرکھنا چاہتا تھا۔

اس وقت کے لیے کہ جب وہ امتحان اس کا نتیجہ بن جائے، جب وہ ہزاروں فٹ بالا ان کو واقعی دھوکہ دے جائے۔ رائج آدم کی ساری تیاریاں ایم ایچ تھری سیون زیرو کے لیے تھیں۔

"فیول افیشینسی؟" منزہ مطمئن نہیں لگی تھی۔ ظاہر تھا۔ "رائج، تمھیں پتا ہے لاسٹ منٹ کی تبدیلیاں سب کو پریشان کر دیتی ہیں۔"

وہ میز پر آگے جھکا، آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"دیکھیں منزہ، ہوا میں ردوبدل آیا ہے پچھلے دنوں۔ چند ڈگریوں کی بنا پر اپنا راستہ بدل لینے سے ہمارا اچھا خاصا فیول بچ سکتا ہے۔ آپ کو یاد نہیں، حال ہی میں ہونے والے سمینار میں باس نے بھی خرچ مؤثر ہونے پر کتنا زور دیا تھا؟"

منزہ نے ہونٹ چباتے فلائٹ پلین دیکھا۔ وہ اب بھی بے آرام لگتی تھی۔

"کیا گارنٹی ہے کچھ خراب نہیں ہو گا؟"

رائج سیدھا ہوا اور ایک ہاتھ جیب میں دھنسا پھر سر ایک طرف کرتے اسے دیکھا۔ "آپ کو پتا ہے یہ میرے لیے پہلی بار نہیں ہے۔ میں نیا کھلاڑی نہیں ہوں۔ اور ویسے بھی یہ قوائد و ضوابط کے مطابق ہے۔"

وہ ہلکے سے مسکرایا۔ "اسے ایک اسٹریٹجک قدم سمجھیں۔ ہم دو چیزیں بچانے والے ہیں، ایندھن اور وقت۔"

منزہ نے آخر کار اس کی بات پر، لاکھ پیش و پیش ہوتے، ہامی بھر لی اور سسٹم اپڈیٹ کیا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"خبردار جو تم نے کوئی ڈومینو ایفیکٹ (Domino effect) شروع کیا اوپر۔ کسی اور ائیر پلین کو تمھاری وجہ سے دشواری ہوئی تو ذمے دار تم ہو گے۔"

اس نے استہزاء میں ہاتھ اٹھا دیے۔ "سب ATC کو خبر کر دی ہے۔ بقیہ پلین اپنے طے شدہ راستے پر چلیں گے۔"

منزہ تھوڑا سا مسکرا دی۔ "اچھا، NOTAMs کا بتاؤ۔"

رابع گفتگو کے بعد حتمی فارم پر اپنے دستخط کر کے آفیس سے نکلا تو شیشے کے دروازے میں اپنے عکس کو دیکھ کر ایک لمحے کو تھم گیا۔ پانچ فٹ نو انچ کا نیلا یونیفارم تانا پائلٹ، وسیع کندھے اور مضبوط بازو۔ دھوپ میں چمکتی سونے کی سی ہیزل آنکھیں اور چہرے پر پھیلی مکرو مسکراہٹ سے نمودار ہوتا آدھا چاند۔

اس نے ٹھوڑی جھکا کر کوٹ سے اپنے سن گلاسز آزاد کیے۔ بھورے شیڈز آنکھوں پر چڑھاتے اس کی مسکراہٹ واپس فنا ہو گئی تھی۔

اور جب تم دیکھو گے کہ ایک بشر اپنے انت کے خیال پر مسکرانے لگا ہے، تو اسے کیسے بچاؤ گے؟

اسے کیسے بتلاؤ گے؟

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

★★★

حال

جگہ: پسنجر کیبن

02:03 AM

بوئنگ ۷۷۷ کا طیارہ ہوا کے سیاہ قالین پر قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے کنارے آسمان پر پنچھی کے پنکھوں کی مانند بستار تھے۔ بادل کے دھلے گولے ایک کے بعد ایک راستے سے ہٹتے گئے اور پلین کی چالان قائم رہی۔ جہاز کے انجن ہلکی گنگناہٹ کے سنگ رواں تھے اور پیروں تلے موجود پایہ دھیمے سے گرج رہا تھا۔

راہداری کی خارجی سمت نشست ظبیہ نے ٹھوڑی اپنی ہتھیلی کے نیچے کی۔ اس کے برابر والی کرسی خالی تھی اور سیٹ کے ساتھ بندھی بیلٹ کھلی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہاں بیٹھا مسافر وقتاً کہیں گیا ہو۔

ظبیہ کھڑکی کی طرف منہ کیے جہاز کے رفتار پر غور کرتی رہی۔ پلین کے کنارے چمکتی بتیاں لال اور سبز دمک رہی تھیں جو دور اس کی بھوری آنکھوں میں جل اٹھتیں۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے کئی خیالات رواں تھے۔ وہ زندگی جو وہ پس پشت دھکیل کر آئی تھی اور وہ مستقبل جس کی خواہش اسے اس موڑ تک کھینچ لائی تھی۔ خیالات تھے، سوالات تھے، جوابات بھی تھے۔ کچھ اوروں سے زیادہ کٹھن، زیادہ نوکیلے۔ وہ چین جا کر کیا کرے گی؟ اس نے کافی دفعہ یہ سوال خود سے دہرایا تھا۔ جب غزار اسے دھتکار دیتا تھا اور وہ غسل خانے میں کھڑی نماز کے لیے کہنیاں گیلی کرتی تھی، جب وضو کے پانی کے ساتھ اس کے آنسو ٹھوڑی سے ٹپکتے رہتے تھے، جب قلبی درد کسی بھی جسمانی تکلیف سے زیادہ حاوی ہوتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی، اس جیسی لڑکی کا مستقبل کیا ہو گا؟

جب اکائر اسے رنج آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہتا تھا، "چھوڑ دو اسے۔" یا جب وہ اتنا بھی نہیں کہتا تھا اور بس گردن جھٹک کر منظر سے رفع ہو جاتا، تب وہ سوچا کرتی تھی، کیا میں واقعی چھوڑ سکتی ہوں اسے؟

لیکن وہ اکائر سے یہ کبھی نہیں پوچھتی تھی، کیونکہ اس کا جواب اسے خوفزدہ کرتا تھا اور حد سے زیادہ پُر امید بھی۔ امید خوف سے بھی کثیر خوف ہے۔

اس کی خالہ نے اسے باتوں باتوں میں کئی مرتبہ تسلی بخشی تھی۔ اس نے کھل کر سارا ماجرا کبھی کسی کو نہیں بیان کیا تھا کیونکہ وہ سب دور تھے، بہت زیادہ دور، لیکن پتا نہیں کیسے انھوں نے بھانپ لیا تھا اور یقین دلایا تھا اس کے لیے ان کے گھر کے دروازے لمبے کھلے تھے۔ لیکن اب خالہ اسپتال میں تھیں اور گھر کا سارا نظام ان کی بہو کے ہاتھ میں۔ ظبیہ زیادہ عرصہ ان کے سہارے پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

"ایسے ہی دیکھتی رہی تو بھینگی ہو جاؤ گی۔" اکائر اس کے سر پر کھڑا تھا، ہاتھوں کو ٹشو سے سکھاتے۔ ظبیہ نے چونک کر سر اٹھایا پھر اپنے پیر پیچھے کیے اور اسے اندر جانے کا راستہ فراہم کیا۔ وہ 'تھینک یو' کہتا اپنی سیٹ تک گھس گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" بیٹھتے ہی ساتھ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ ظبیہ نے چہرہ موڑا۔

"تمھارا غسل خانے کا ایکس پیرینس کیسا تھا؟" وہ بے تکے سوال کرے گا تو وہ بھی کرے گی۔

اکائر نے ایک ہاتھ ہوا میں کر کے ٹیڑھا آڑا کیا اور ناک سکوڑی۔ "سوسو۔ ٹوائلٹ پیپر نہیں تھا مگر ہینڈ واش تھا۔"

"اچھا اچھا۔" وہ جلدی سے بولی تو وہ مسکرا دیا۔ "آپ مجھے off guard نہیں کر سکتیں، ظبیہ پوان۔"

"تم ہمیشہ اتنے چست کیسے رہتے ہو، اکائر؟ تھکتے نہیں؟ دنیا سے ناراض نہیں ہوتے؟" بھوری آنکھیں اسے ٹھہر کر دیکھ رہیں تھیں۔ اکائر نے اس کا سوال سنتے چند ثانیے کا وقفہ لیا پھر سیٹ میں ٹھیک سے ٹک گیا۔

"جس دن میں دنیا کی پروا کرنے لگوں اس دن مجھے اکائر زمورا نہیں کیپٹن رائج آدم کہنا۔"

ظبیہ ٹھٹک کر رکی اور اس کی شکل دیکھی۔ "اس کا کیا ذکر؟" مگر دل ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح بے قابو ہو گیا تھا۔ وہ کبھی بھی اس لقب پر معمولی نہیں رہ سکتی تھی۔

"یونہی۔ دل کیا تھوڑی کیچڑ اچھال دوں اس پہ۔ میرے اور یو جو برباد کیے ہیں بدبخت نے۔"

"اکائر۔" ظبیہ نے اسے گھورا۔ وہ ہنس دیا۔

"اچھا، معذرت۔ اوکے، کیا پوچھ رہی تھی تم؟ میں اتنا خوش کیسے رہتا ہوں؟ تو زندگی کا سمپل تر اصول یہ ہے کہ ہر بندا ہر وقت ایک عدد تھراپسٹ افورڈ نہیں کر سکتا، نہ ہی کوئی ایسا دوست جو آپ کی لاکھ بکواس سن کر بھی آپ کا ساتھ دے، نہ ایسے گھر والے جو آپ کو چوبیس گھنٹے سینے سے لگائے رکھیں۔ زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو خود کو مشکل وقت کاٹنا سکھاؤ۔ اپنی امید خود بننا شروع کرو۔ یہ اعتماد کہ اگر آج کا سورج ہم نے دیکھا ہے تو یہ ہمارے نصیب میں ہے اور ہمیں زندگی میں کچھ اور کرنا ہے۔ زندگی نے ہمیں چنا ہے۔ باقی دنیا کین گو ٹو ہیل فار آل آئی کیئر!"

ظبیہ نے پلکیں جھپکیں۔ "تم موٹی ویٹ کتنا اچھا کرتے ہو، اکائر۔"

برابر بیٹھا مرد کھانس کھانس کر گلے سے نیچے پانی اتار رہا تھا۔ "یہ میں کیا بولا ہوں؟"

ظبیہ نرمی سے ہنس دی۔ "ایسی پیاری پیاری باتیں کیا کرو۔ مجھے یہ والا اکائر پسند ہے۔"

وہ لاکھ کوشش کے بعد بھی چہرے پر پھیلتی مسکان نہیں روک سکا۔ "مجھ سے پوچھو مجھے کیسی ظبیہ پسند ہے۔"

ظبیہ نے سر ریسٹ سے ٹکاتے اسے دیکھا، بھوری آنکھیں بادلوں سے چھن کر تیر ہوتی روشنیوں میں چمچمائیں۔ "میں گیس کروں؟"

سرمئی آنکھیں گرمجوش مسکراہٹ میں چھوٹی ہوئیں۔ ظبیہ نے اسے اس کی ہامی تصور کی۔

"ہمم، تمھیں وہ ظبیہ پسند ہے جو مایوس نہیں ہوتی۔ وہ ظبیہ جو تمام مشکلات کے بعد بھی مسکرا دے گی۔ وہ ظبیہ جو کسی کی سہارے پر نہیں ہو گی۔ وہ جو اپنی راہ خود بنائے گی۔ بتاؤ، ٹھیک پہنچی ہوں ناں؟"

اور وہ تھم گیا۔ یہی تھا اصل جواب، حکمت اور دانش والوں کا۔ ظبیہ مضبوط ہو گی، خوش ہو گی، اپنا ستون خود ہو گی۔ اکائر کو وہ اچھا لگے گا، یہ غلط نہیں تھا۔ پھر کیوں وہ اس جواب پر کھل کے خوش نہیں ہو پا رہا تھا؟ کیا وہ کچھ اور چاہتا تھا؟

"ایک دم۔ سو پوائنٹس۔" اس نے خشکی سے مسکراتے چہرہ موڑ لیا۔ کھڑکی کا شیشہ اسے اب بھی اس ہی لمحے میں قید رکھے تھا۔ ظبیہ مطمئن سی ہو کر اپنا میگزین وہیں سے پڑھنے لگی جہاں ایک گھنٹہ پہلے چھوڑ کر سو گئی تھی۔ مڑا ہوا صفحہ پلٹ کر سہلاتے، بھوری آنکھوں نے کاغذ پر تراشی تصاویر دیکھتے دماغی طور پر سارے ٹوٹکے اپنی پٹاری میں قید کر لیے۔

وہ دو مختلف دنیاؤں سے نازل ہوئے دو لوگ تھے جن کے نام اور شناخت سے لے کر جینے کا سلیقہ اور تریقہ تک سورج اور آسمان جتنا جدا تھا۔ ایک روشنیوں میں گھرا چاند تھا تو دوسرا گرہن میں لپٹا آفتاب۔ لیکن کسی تیسرے کے غور کرنے پر کچھ اتنا مختلف نظر نہیں آتا تھا۔ وہ یکساں لگتے تھے، ایک دوسرے سے مکمل طور پر متعلقہ۔ اکائرز مورا تین ممالک میں اپنی پراپرٹی، ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ جاب اور کئی دہائیوں سے رئیس خاندان کا سہ لسانی جیتا جاگتا چشم و چراغ، اس کے سامنے کبھی زیادہ مشکل انگریزی تک نہیں بولتا تھا۔ وہ دکھاوا نہیں کرتا تھا، شوق نہیں گنواتا تھا اس لیے کہ کبھی ظبیہ کو اپنا آپ اس سے پیچھے نہ محسوس ہو، کہیں وہ اس کا مقام یاد رکھنے کی جست میں اپنی عزت کرنا چھوڑ دے۔

ظبیہ یمین، ٹی ٹی ڈی آئی کی کم پڑھی لکھی چھبیس سالہ لڑکی، ایک سرسبز شادی، صدا کا بکھرا ہوا خاندان، غیر حاضر باپ، پُر جفا شوہر، متوفی ماں، فریب کار منگیتر، اپنی امید کی کرچیاں سنبھالتی اسے دیکھ کر مسکرا دیا کرتی تھی، کیونکہ اکائر کو وہ ایسی پسند تھی۔

★★★

ویتنامی ہوائی فضا

جگہ: کاکپٹ MH370

02:15 AM (MYT)

کہانی کا پنجم حصّہ وجود پا چکا تھا۔

اپنی نشست میں براجمان کیپٹن کی نگاہیں خاموش تھیں۔ آلاتی پینل کی سرخ و سبز چراغ ہزاروں بٹنوں اور سوئچوں میں گھری اس کا کپٹ کو اجاگر کیے تھے۔ بالائی سر سخت ہوئی سفید ٹیوب لائٹ اس کی نرم سپید رنگت پر سائے کھینچ رہی تھی اور گلابی ہونٹوں میں سے نچلا عضو اس کے چبانے کے بائث لال پڑ چکا تھا۔ اس کے دانتوں سے دیا گیا ہلکا زخم بھی وہاں واضح تھا۔

ایم ایچ تھری سیون زیرو ویتنامی فضا کو پار کرتا چین کی اور رواں تھا۔ بیجنگ، اس طیارے کی حقیقی منزل، جہاز میں موجود دو سو اڑتالیس لوگوں کا مستقبل، سوائے ایک کے۔

رانج نے وے پوائنٹس کی جانب دیکھا۔ چین کا فضائی منظر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے اپنے منصوبے کا بقیہ پارچہ جلد بکھیرنا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنے تسخیر ہونے کا خوف کھائے جا رہا تھا۔ اگر ائیر ٹریفک کنٹرول کو معلوم ہو گیا تھا کہ جہاز غائب ہوا تھا تو وہ اب تک الرٹ جاری کر چکے ہوں گے۔ ملائیشیا سے ویتنام اور وہاں سے چین، اس کے اضافے میں موجود بقیہ ممالک۔ دنیا رانج آدم کو کھوج رہی تھی، اور رانج آدم اپنا انت۔

اس نے بالائی سر (overhead) خانے کا بٹن دباتے اس کے قلابے آزاد کیے۔ ہلکی زوں کے آواز کے ساتھ پٹ اوپر اٹھا تو کیپٹن نے ہاتھ یہاں وہاں کرتے اس میں سے پائلٹ کا مخصوص ماسک، جسے عام زبان میں طیارچی ماسک (aviator's mask) کہا جاتا ہے۔ کیبنٹ خودکارانہ طور پر واپس بند ہو گیا۔

رانج نے ایک بھاری سانس خارج کرتے ہاتھ میں قید ماسک کو دیکھا۔ وہ یہ واقعی کرنے لگا تھا۔ اس کی ساڑھے تین سال کی محنت اور لگن اس لمحے کے لیے ہی تو تھی۔ اسے اچانک ہنسنا آیا اپنے حالات پر لیکن اس نے دل کی نا سنی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

طیارچی ماسک ایک آکسیجن ماسک کی نسبت سے کام کرتا ہے، اور کیبن کا دباؤ کم ہونے (depressurisation) جیسے ہنگامی صورتوں کے دوران پائلٹوں کو آکسیجن فراہم کرتا ہے، اس امر کو یقینی بناتے ہوئے کہ پائلٹ ہر صورتِ حال میں جہاز کا اختیار بہترین طریقے سے سنبھال سکیں۔

ربڑ کے پٹے کو کھینچتے، رابح نے اسے اپنے سر کے عقبی حصّے پر چڑھایا، ساتھ ہی اسے ناک اور منہ کے گرد درست کیا۔ اسٹریپ کو فٹ کرتے اس کی شکل اب کہ مکمل طور پر ڈھک چکی تھی، سوائے اس کی آنکھوں کے نزدیک لگے ان براق چشموں کے۔

تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے کے گرد پھیلا تو اسے اپنی ہر حس زندہ ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھل بند کر کے خود کو سنبھلنے کے لیے ایک لمحہ عنایت کیا، اور پھر نظریں ڈسپلے اسکرین پر موجود نظام سربراہی پرواز (FMS) کی جانب کیں۔

ایک دو بٹن دباتے اس نے مینو میں سے جہاز کی اونچائی کو چنا، پھر انگلیوں کی پوریں ٹچ اسکرین پر چلائیں۔ وہ پرواز کی اونچائی تبدیل کر رہا تھا، ایم ایچ تھری سیون زیرو کا تعارف آسمان کی ہر وسعت اور گہرائی سے کروانا چاہتا تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

پینتیس ہزار فٹ سے اوپر کیا تھا؟

اور وہ یہ کیوں کر رہا تھا؟

کی بورڈ پر ہندسے دباتے اس کی انگلیاں اٹل تھیں، آج ان میں لرزش نہیں تھی۔ کیا گناہ انسان کا دل اتنا سیاہ کر دیتے ہیں، یا یہ دل سیاہ ہو جاتا ہے جو انسان کو گناہ کی جانب دھکیلتا ہے؟

اونچائی تبدیل ہو چکی تھی، لیکن چڑھان سے پہلے اسے ایک اور بہت اہم کام انجام دینا تھا۔ وہی، جو اس کے انت کی آخری سیڑھیوں میں سے پہلی تھی۔ اس نے دو پل گردن نشست میں پیچھے جھکائی، ہوا باز ماسک کے پار اس کی ہیزل آنکھیں دھندلی تھیں۔

ایک بار بھی معصوم جانوں کا الزام اس کے سر ہو گا۔ پھر وہ سیدھا ہوا، اب کہ حرکات میں کوئی سستی نہیں تھی۔

پانچ سال پہلے کے برعکس، اس بار وہ حقیقت ہو گا۔

اس نے پریشر کی سطح ناپتے انگلیوں کو ایک سوئچ کے قریب کیا، جس کے نیچے آٹو اور دوسرے کے ساتھ مینوئل درج تھا۔

یہ طیارے کی آؤٹ فلو والوز (outflow valves) کو سُدھ کرنے کا بٹن تھا۔

آؤٹ فلو والوز ہوائی جہاز میں چڑھائی اور نزول کے دوران ہوا کے اخراج کو استوار کرتی ہیں۔ یہ نزول کے اثناء میں بلا مزاحمت کھل کر دباؤ کو بڑھنے سے روکتی ہیں، اور چڑھان کے دوران موند کر کیبن کے ماحول کو آرام دہ بناتی ہیں۔

کتابی جواب، رانج کو حیرت انگیز طور پر زیمو چین کے الفاظ یاد آئے۔ صحیح ہی کہا تھا اس نے۔ پائلٹس کی نوے فیصد زندگی صرف کتابی اصولوں کا پاس رکھتے گزر جاتی ہے۔ کیا رانج بھی ایسا ہی پائلٹ ہو گا؟ اسے ہمیشہ کچھ خاص بننا تھا، کچھ مختلف۔ لوگوں کو وہ اپنے نام سے یاد ہو، اپنی کارکردگی سے، نا کہ کسی حادثے میں لپٹ کر۔ لیکن اس کی زندگی پانچ سال قبل ایک حادثہ بن چکی تھی، اور کیونکہ وہ ان داغوں کو اپنے جسم سے نہیں رگڑ پایا تھا، سو اس نے یہ سوچا تھا کہ کیون نا خود کو ہی ایک داغ بنا دیا جائے؟

وہ آدھا سیاہ، آدھا سفید ہو کر نہیں جی سکتا تھا۔ رانج آدم کے لیے یا رتو آر تھا یا پار۔

سیاہ یا سفید۔

موت یا زندگی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس نے مینوئل کا آپشن چنا تو اسکرین پر کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ آدھے لمحے کے لیے اس نے آنکھیں منچ کر اپنی زندگی کے پچھلے پانچ سالوں کو سوچا، پھر ان سے پچھلے، پھر اور پانچ سال، پھر اور، جب تک کہ ایک چھوٹا بچہ اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آ کھڑا ہوا۔

چھوٹی بادامی صورت آنکھیں اور گہری مسکان۔ بال بکھرے تھے اور آدھی آستین والی ٹی شرٹ میں تیار اس کی پتلی صورت ماتھے کے گرد ہتھیلیوں سے چھجا بنائے آسمان کو تک رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑا تھا اور اس کا سایہ زمین پر نمایاں تھا۔ ہیزل انکھوں کی سیدھ میں دور ہزاروں فٹ اوپر ایک جہاز کا پنکھ بادلوں کے درمیان چھپا دکھائی دیا۔ وہ جب بھی کسی طیارے کی گڑگڑاہٹ سنتا تھا، سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اوپر بھاگ آتا اور آنکھوں میں لاکھ حسرت اور چاہت لیے اسے تکتا رہتا، جب تک وہ پوری طرح مٹ نہ جاتا۔

جہاز اب بادلوں کو تیر کرتا اس کے سر کے ٹھیک اوپر سے گزر رہا تھا۔ اس کے لب تعجب اور بے قراری میں مکمل فراخ ہوئے۔ دھوپ چھپ گئی اور طیارے کے دو سو سے زائد فٹ نے اسے چھاؤں بخشی۔ بارہ سالہ رانج آدم نہیں بھول سکتا، کس شتابی سے خون اس کی نسوں سے گذرا تھا۔ وہ انفعال جو جنون کی حد تک صعود تھا۔

اسے اپنے جینے کا مقصد مل گیا تھا۔

جہاز دور ہوا اور سورج کی روشنی سیدھا اس کی آنکھوں میں گری۔ اس نے درد سے آنکھیں منچ لیں۔

آؤٹ فلو والوز کا مٹھیا گھماتے اس نے طیارے کی ابتری طرف موجود دریچے آہستگی سے کھولے، ساتھ ہی جہاز کے اندر موجود ہوا ان دروازوں سے خارج ہونے لگی تھی، اور اس کا صرف ایک ہی مطلب تھا۔ ایم ایچ تھری سیون زیرو میں آکسیجن کم ہونے والی تھی۔

ہوابازی نے اسے اپنی زندگی کی منزل مقصود دکھائی تھی، اور آج وہی اسے دو سو انتالیس اموات کا ذمہ داری بنا رہی تھی۔

★★★

دس منٹ قبل

"میں نے کبھی تمھارے گھر والوں کو نہیں دیکھا۔"

ظبیہ چہرہ اس کی جانب کیے نہایت کرن بندی سے اسے تک رہی تھی۔ اکائر نے سر اٹھایا، لیپ ٹاپ پر ٹائپ کرتی انگلیوں میں سستی آئی۔

"کیا کرو گی میرے جیسے بیس اور لوگوں کو دیکھ کر؟" کروم کا ٹیب بند کرتے سوال کیا۔ ظبیہ ہولے سے ہنس دی۔

"تمھارے جیسا تو خیر کوئی نہیں۔"

کچھ اور کہنے کو الفاظ تمام تھے۔ اکائر مسکرا کر تصاویر کے فولڈرز پر کرسر چلانے لگا۔ "ٹھہرو، ڈھونڈتا ہوں۔ میں ان سے اتنا ملتا نہیں۔ نئے سال یا کرسمس یا ایسٹر وغیرہ پر ہی اکھٹے ہوتے ہیں سب۔ میرا ایک بڑا بھائی نیویارک میں ہوتا ہے، باقی دو اسپین میں۔ میڈریڈ اور ویلنسیا۔"

"تمھارے امی ابو کس کے ساتھ رہتے ہیں؟" ظبیہ کو دلچسپی ہوئی۔

"ویلنسیا والا بھائی۔ ایڈرین۔ مجھ سے چھوٹا ہے وہ۔ باقی دو، روبن اور نکولاس بڑے ہیں۔ روبن اور ایڈرین کی شادی ہوئی ہے۔ نکولاس نہیں کرتا۔ پاگل آدمی۔"

ظبیہ اس کے چڑچڑاپن پر ہنس دی۔

وہ بولتا رہا۔ "تمھیں پتا ہے میں زندگی کے مختلف دور میں ان سب سے کلوز رہا ہوں۔ ایڈرین اور میں بچپن میں ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ عمر تقریباً ساتھ کی ہے نا۔ لیکن مڈل اسکول میں آ گیا تو روبن سے چیزیں شئیر

کرنا زیادہ آسان تھا۔ نکولاس سب سے بڑا ہے، لیکن اس کی موجودگی ہی میرے لیے سکون ہے۔ خاموش سا ہے۔۔ ایسا سمجھ لو اس کی آواز میں تھا اور میرا دماغ وہ۔"

ظبیہ ٹھوڑی ہتھیلی پر سجائے خاموش سے اسے سنتی گئی۔ وہ پہلی بار اسے اپنے خاندان کے بارے میں کچھ کہتا دکھا تھا۔ یہ منظر اس کے دل کو بھاتا تھا۔

اکائر اسے جوش سے بتا رہا تھا۔ "روبن کے دو بچے ہیں۔ ایک بڑی بیٹی ایلا اور دوسرا بیٹا ہے تین سال کا۔ تمھیں پتا ہے اس نے اس کا نام اکائر رکھا ہے۔" وہ پورے دل سے ہنسا۔ "اکائرز موراجونیر۔ بہت کیوٹ ہے وہ، لیکن خاموش سا ہے۔ مجھ سے زیادہ نکولاس سے ملتا ہے۔"

اب وہ اسکرول کر کے ایک البم کھول رہا تھا پھر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ "یہ دیکھو، یہ ہے ایڈرین اور یہ اس کی بیوی منی۔" ظبیہ اس کے برابر سیٹ میں جھکی۔

"مجھ سے نہیں ملتا۔ آئی نو۔ بلانڈ بال ہیں اس کے۔ ماما کے بلانڈ بال اور سبز آنکھیں ہیں اور بابا کے ڈارک بلیک۔ میں اور روبن بابا سے ملتے ہیں۔ نکولاس کی آنکھیں سبز ہیں اور بال براؤن۔ وہ الگ ہی ہے۔" اس نے کلک کر کے ایک اور پکچر ڈھونڈی۔ اب کہ اسکرین پر ایک لمبا چوڑا خاندان تھا اور عقب میں رنگ برنگی بتیوں والا کرسمس کا درخت۔ کیمرے کے سامنے قالین پر سرخ اور سفید پجامے پہنا اکائر اور اس کے ساتھ، اس ہی کے جیسا ایک اور خوش شکل مرد اکڑو بیٹھا تھا۔ پیچھے دو بزرگ آدمی عورت تھے۔ عورت کے نرم سنہری لٹیں کھلی تھیں اور گال مسکراتے ہوئے گول اور گلابی تھے۔ مرد کی عمر لگ بھگ پچاس کے قریب تھی جو بھوری پفر جیکٹ پہنے شان سے مسکرا رہے تھے۔ ان کے پیچھے دو اور لڑکے کھڑے تھے، ایک سنہرے بالوں والا ایڈرین اور ساتھ لمبے کوٹ میں سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے، قریب العقل طور پر نکولاس۔

"کیسا کیوٹ لگ رہا ہوں میں۔" اکائر نے اپنے چہرے پر زوم کرتے تبصرہ دیا۔ ظبیہ نے ابرو چڑھائی۔

"پانچ اور لوگ ہیں۔"

"تم انھیں دیکھ رہی ہو؟ کم اون، ظبیہ، تمھاری عمر کا نہیں ہے کوئی۔ ٹیسٹ بھی نہیں ملے گا۔ روبن اور ایڈرین تو ٹیکن ہیں۔ نکولاس سے بات چلاؤں؟ لیکن میں بتاتا چلوں، یا تو یہ بالکل خاموش رہتا ہے یا گیانی بابا بن جاتا ہے۔ شادی کے تحفے میں روئی گفٹ کروں گا تمھیں، کانوں میں ٹھونس لینا۔"

ظبیہ نے پلکیں جھپکیں، آنکھیں حیرت سے کھل بند ہوئیں، پھر اکائر کو گھورا۔ "بہت بد تمیز ہو تم۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

اس نے دانت دکھائے۔ "ہم سب کو لگتا تھا سب سے پہلے شادی نکولاس کی ہو گی، بڑا ہے ناسب سے۔ لیکن ماما کی فرینڈ کو روبن پسند تھا اپنی بیٹی کے لیے۔ اور پھر ایڈرین کو منی اسکول کے دنوں سے پسند تھی۔"

"تو اگلا نمبر تمھارا ہے؟" ظبیہ نے چڑھایا۔

"نہ بھئی، پتا نہیں۔" اپنی باری میں وہ زیادہ نہیں بولتا تھا، ظبیہ نے غور کیا۔

"تمھیں بھی شادی کر لینی چاہیے۔ اسپین چلے جاؤ۔ بہتر جاب مل جائے گی۔ اور پھر تمھاری ساری فیملی بھی تو ادھر ہی ہے۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر نے شیشے کے باہر دیکھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ پہلے ہی کوالالمپور میں سارا کام سمیٹ چکا تھا؟ اس کی وہاں رکنے کی وجہ، اپنے پانچ سال ایک معمولی جاب کو دینے کا کارن، گھر والوں سے علحیدہ رہنے کی ضرورت، کوئی اور نہیں بلکہ وہ تھی۔

وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ غزار جیسے مرد کے ساتھ تو بالکل نہیں۔ اکائر بہت قبل ہی جان چکا تھا کہ وہ مکمل طور پر بے آسرا تھی، نہ اس کے آگے کوئی تھا نہ پیچھے، اور نہ ہی وہ ان لڑکیوں جیسی تھی جن سے اکائر اپنی زندگی میں ملتا رہا تھا۔ نڈر، مستحکم اور فیصلہ کُن۔ ایک کاغذ سے سارے رشتے ختم کر دینے والی ہمت اور حالات اس کے پاس نہیں تھے۔

وہ رفو نہیں ہو سکتی تھی، سو وہ اس کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

"ویسے واقعی عمر کیا ہے تمھاری؟ تیس۔"

"انتیس۔"

"-اور تیس سال کی عمر میں سنگل ہو۔ تمھاری امی پریشان رہتی ہوں گی تمھارے لیے۔ تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔"

اکائر نے ایک سانس لیتے اسے دیکھا، آنکھوں میں تمسخر تھا۔ "تم بہت شادی شادی کر رہی ہو۔ کس کو پھنسایا ہے بیجنگ میں؟"

اس کے گال سرخ ہوئے۔ "توبہ! میں تو تمھارے لیے کہہ رہی تھی۔"

اس کے متفکر تاثرات دیکھ کر وہ اپنی مسکراہٹ روک نہ پایا۔ "میری ماں کو جب ہوش آئے گا تب کر دیں گی میری شادی۔ فی الحال تو وہ دینداری سے نکولاس کو ہر صبح تین لڑکیوں کی تصاویر بھیجتی ہیں، جنھیں وہ تھمبس اپ کر کے اپنی بات شروع کر دیتا ہے۔"

ظبیہ ہنس دی۔ "ایسے تو تمھارا نمبر نہیں آئے گا۔ کسی کو پٹالو۔ گرل فرینڈ وغیرہ نہیں تمھاری؟"

اکائر نے اسے ایسے دیکھا جیسے ظبیہ نے سر پر سینگ اگا لیے ہوں۔ وہ اچانک بھنبھوڑ گئی۔

"تمھیں میں گرل فرینڈ والا لگتا ہوں؟ رحم کھاؤ، بی بی۔ گرل فرینڈ دوسرے دن میرے منہ پر تھپڑ رسید کر کے چلی جائے گی۔ اکائرز مورا کے ساتھ ٹر گر وارننگ آنی چاہیے۔ **کم ہمت لوگ دور رہیں۔** مجھے ایک دستخط شدہ اجازت نامہ چاہیے ہو گا کہ میرے خطرناک لطیفے طلاق کے حق دار نہیں ہیں، کہ میں اچھا، برا اور بہت برا بھی قابلِ قبول ہوں۔"

"اسے عام لوگ شادی کہتے ہیں۔"

"ہاں، شادی۔" وہ مسکرا دیا اور یونہی سیٹ سے ٹیک لگا کر سامنے دیکھنے لگا۔ جہاز کی رفتار دھیمی تھی، لیکن ہوا میں رتی برابر ردوبدل کو اس نے محسوس کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنے سینے میں ایک عجیب سی تنگی کا احساس ہوا جو اس نے دو تین بار پلکیں جھپکا کر مٹانا چاہا۔ حواس بحال ہوئے تو اس نے شیشے کے پار دیکھا۔

ایم ایچ تھری سیون زیرو اس کے لیے اور کیا قید کیے تھا؟

★★★

گیلری ایریا

کچن، MH370

02:13 AM (MYT)

پسنجر کیبن کے اختتام پر دائیں جانب کو گیلری کا دروازہ مکمل کھلا تھا جہاں سے فلائٹ اٹینڈنٹوں کے مکالمات کی ہلکی سرگوشیاں اور ساتھ ہی اوپر نیچے ہوتے برتنوں کی کھڑپڑ سنی جا سکتی تھی۔

کاؤنٹر کی ایک جانب کھڑی لورا نیلے یونیفارم میں سجی ہوئی کینو کے جوس کا ڈبا ایک کے بعد ایک تین گلاسوں میں الٹا رہی تھی۔ اس کی پشت پر کام کرتی ایک اور فلائٹ اٹینڈنٹ عائشہ عبدالکریم سیاہ حجاب کو چہرے پر لپیٹے سلیب کو ٹشو پیپر سے گھس کر صاف کر رہی تھی، شفاف انگلیوں میں بڑے موتی والی ایک کالی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

"مین کورس میں چکن ہے یا بیف؟" عائشہ نے مینو کارڈ آگے پیچھے کرتے ہیڈ فلائٹ اٹینڈنٹ کو مخاطب کیا۔ لورا نے جوس گھول کر چمچ بیسن میں رکھا۔

"چکن ٹھیک ہے۔ ویجی ٹیرین ڈش تم سوچو، میرا دماغ بند ہو رہا ہے۔" کانچ کے گلاسوں کے جما کر لکڑی کی ٹرے میں کھڑا کیا۔

عائشہ نے ٹرے کو دیکھتے ابرو سکیڑے۔ "آپ نے جنجر ایل نہیں بنائی۔ C16 والی نے اسپیشل کہا تھا۔ ان کا گلا بیٹھا ہے۔"

لورا نے کاؤنٹر سے پشت ٹکائی اور ایک پر سکون نگاہ اپنی جونیر پر ڈالی۔ "کچھ نہیں ہوتا اسے۔ اسے پتا بھی نہیں ہوگا جنجر ایل کیا ہے۔ مینو کارڈ دیکھ کے رینڈم بول دیا۔ فری جو مل رہی ہے۔"

عائشہ ہلکے سے مسکرا دی اور اوپری کیبنٹ سے کھانے کی اشیاء نکالنے لگی۔ لورا نے توجہ واپس ٹرے کی جانب کی۔

"آپ نے کاکپٹ میں کھانا پانی پہنچایا تھا؟"

عائشہ نے سینڈوچ کا سامان نکال کر سیدھی ہوتے سوال کیا۔ بریڈ کے رول سے تھیلی اتارتے اس نے اسٹینڈ سے چھری اٹھائی۔

"نہیں۔" پانی کے نیچے دو گلاس دھوتے لورا نے جواب دیا۔ "رانج نے کہا۔۔۔" ایک پل کا وقفہ جس میں مذکورہ بالا کی آواز کی نقل کرنی چاہی۔ "آئی ایم گڈ۔ سائلنس۔"

"یہ ایسے کیوں بات کرتے ہیں؟" عائشہ اپنی مسکراہٹ نہیں روک پائی۔ چکور ڈبل روٹی کو تکون میں کاٹتے ہاتھ پھرتی سے چلے۔

"پتا نہیں۔" لورا بھی دھیمے سے مسکرائی۔ "پہلے بہت جولی ہوا کرتا تھا، سب کا فیوریٹ تھا۔ خیر اب بھی ہے، لیکن پہلے کیوٹ سا تھا۔ اب ڈراؤنا لگتا ہے۔"

عائشہ نے بریڈ کے ٹکروں کے درمیان چکن سجائی اور آدھوں میں ہری سبزیاں۔ "مجھے تو اب بھی ٹھیک لگتے ہیں۔"

لورا نے کندھے کے اوپر سے اپنی جونیئر کو دیکھا۔ "ایک منٹ، یہاں دیکھنا ذرا۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

عائشہ حیرت سے پیچھے گھومی۔ تنگ کچن میں ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا، اور لورا کی آنکھوں میں تیرتی شیطانی تو اسے مکمل تاریکی میں بھی نظر آجاتی۔ عائشہ کے رخسار گلابی ہوئے اور وہ واپس سامنے گھومی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔" کمزور دلیل۔ ضرور لڑکی دل ہارے ہوئے تھی۔

لورا ہنس دی۔ چلو، شکر تھا۔ چھ گھنٹے کی فلائٹ میں اسے بوریت کم کرنے کو ایک ٹاپک تو ملا!

"تمھیں پتا ہے اسامہ مجھے بورڈنگ کے وقت بتا رہا تھا۔" اس نے فرج سے آئس کیوب کی ٹرے نکالتے ایک ستاتی نگاہ جھکی پلکوں والی لڑکی پر ڈالی جو خاموشی سے سلاد کے پتے درست کر رہی تھی۔

"کہ۔۔۔" ایڑیوں پر اچک کر شکل دیکھنی چاہی۔ عائشہ مسکراہٹ دباتے مکمل پلٹ گئی۔ لورا نے بھی ہنسی روکی۔

"کہ کیپٹن صاحب شادی کر رہے ہیں۔"

عائشہ نے پلکیں یک ٹک کھل بند کر کے اسے دیکھا۔ "اسامہ؟ ان کو کس نے کہا؟"

"رانج نے کہا ہو گا۔ بڑے کلوز ہیں دونوں۔" لورا کو تو بہت مزہ آ رہا تھا۔ یا اللہ، روز روز ور کرز کو آپس میں کرش کیوں نہیں ہوتے؟ وہ ایسے میں چھ کیا چھتیس گھنٹے کی فلائٹ بھی لے لے گی۔

عائشہ کے چہرے پر سایہ گزرا، سینڈوچ کاٹتے ہاتھ ایک پل کے لیے تھم گئے، پھر اس نے منڈی یہاں وہاں جھٹک کر کام کرنا شروع کر دیا۔ لورا کا حلق کڑوا ہوا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"اچھی بات ہے۔ انھیں کر لینی چاہیے۔ میں مبارکباد دے دوں گی فلائٹ کے بعد۔"

لورا کا دل کیا ایک گلاس اس کے سر پر پھوڑ دے۔ وہ ہیلز کے ساتھ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ "رانج شادی کر رہا ہے! تم اسے مبارکباد دو گی؟!" سرگوشی میں سوال اٹھایا۔ عائشہ نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"سلامی بھی دے دوں گی۔"

"افو!" لورا کا منہ الٹ گیا۔ پاگل لڑکی۔ پھر اس نے اسٹریٹجی تبدیل کرنے کا سوچا۔ عائشہ کے برابر کاؤنٹر سے ٹکتے اس نے ایک دکھ بھری آہ باہر نکالی۔

"پانچ سال پہلے بیچارہ محبت ہار گیا تھا۔"

عائشہ نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اب آپ مجھ سے ری ایکشن نکلوانے کے لیے کچھ بھی بولیں گی۔"

"سچی! تمھاری قسم۔ دھواں دھار محبت ہوئی تھی شہزادے کو۔ بیچارے کی شادی نہیں ہو پائی۔ کریش اینڈ ایوری تھنگ، یو نو۔" اس نے ناخن سہلاتے عائشہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی۔

"لڑکی کون تھی؟" آخر کار سوال آیا۔ لورا نے فخر سے خود کو پیٹھ پر تھپکی دی۔

"وہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔ کافی پروٹیکٹیو تھا، رائج۔ نام پتا تھا صرف۔ ایک سیکنڈ کیا نام تھا؟" اس نے ٹھوڑی پر انگلی پھیرتے یاد کرنا چاہا۔ عائشہ نے دو پل انتظار کیا پھر قدموں پر پلٹ کر سینڈوچ پلیٹ میں رکھنے لگی۔

"رہنے دیں۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اوہو، جل رہی ہو۔"

"میں کیوں جلوں گی؟ ان کو میرا نام تک نہیں پتا۔ پچھلی فلائٹ پر 'لورا۔۔۔ او نہیں، آپ' کہہ کر بلایا تھا۔" عائشہ نے بسوری صورت کے ساتھ بتایا تو اس کی سینئر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"باولا لڑکا۔" وہ سر جھٹک کر دور ہو گئی۔ "خیر، تم نے نوٹ کیا آج اسامہ کتنا خاموش ہے؟ رائج نے کلاس لی ہو گی ضرور۔ مجھے پکا یقین ہے اس کی کوئی رول بُک ہو گی۔ 'تمھیں چھوڑا گیا ہے کہ تم بے تکلف گفتگو میں مشغول نہ ہو۔'" اس نے پھر سے اپنی 'رائج' آواز میں کہتے ہنسی چھوڑی۔

اس بار عائشہ بھی ہنس دی۔ کچھ دیر دونوں اسی طرح سامان تیار کرتی رہیں۔ باتیں، لطیفے، ہنسی اور مسکراہٹیں۔

ایم ایچ تھری سیون زیرو کے آخری لمحات سے قبل یہ سب کچھ تھا۔

★★★

فلائٹ MH370 کا کیبن مدھم سفید بتیوں میں گھرا تھا۔ رات کی سرگوشیاں ڈھائی سو فٹ سے کثیر ہوائی جہاز کے پار بلند تھیں۔ رات کے بائث، کیبن کی وسعت میں بیٹھے مسافرین مختلف سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ کچھ کتاب کے پنے پلٹتے، کچھ سامنے لگی اسکرین پر بنتی اشکال دیکھتے اور کچھ کھڑکی سے باہر بادلوں میں گھرے چمنستان کے نظارے کرتے۔

کاکپٹ میں بیٹھے کیپٹن کے حرکات کے زیر اثر اب طیارہ دھیمی چڑھان پر قابض تھا، جس کی وجہ سے کیبن کی اونچائی بھی خودکارانہ طور پر اٹھنے لگی تھی۔ لیکن یہ عمل اتنا دقیق تھا کہ چند لمحات میں محسوس کر لینا دشوار تر تھا۔

طیارہ چڑھتا رہا اور بے آرامی کی لہر فضا میں گھل گئی۔

کھڑکی کے برابر بیٹھی ایک چینی بزنس وومن کو اپنے کانوں کے پردے بند ہوتے محسوس ہوئے، جیسے ان میں بہت سی روئی ساتھ ٹھونس دی گئی ہو۔ اس نے ایک تنگ سانس چھوڑتے گلے سے تھوک اندر اتارا۔ آئل کی اگیاڑی طرف براجمان چینی مرد دو جوان بیٹیوں کا باپ تھا۔ اس تنگ دل احساس کو محسوس کر کے اس نے اخبار منہ کے سامنے سے ہٹایا، کھردری انگلیاں تیوریوں کو مسلنے لگیں، جیسے آنکھوں کے پیچھے بنتے سر درد کو روک رہیں ہوں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

راہداریوں کے اثناء میں سفر کرتیں فلائٹ اٹینڈنٹ چہرے پر مسکراہٹیں لیے آگے پیچھے نگاہیں دوڑا رہی تھیں۔ ان سب سے ناقابلِ فہم، طیارے کی آؤٹ فلو والوز کھل چکی تھیں، جنھیں پرواز کے اس حصے میں بند ہونا چاہیے تھا۔ اور غیر معمولی واقعات شاذ و نادر ہی مثبت انداز میں کھلتے ہیں۔

آنکھیں موندے لیٹے اکائر نے چہرے پر اپنی سیاہ بیس بال کیپ ڈال رکھی تھی اور باہیں سامنے بندھی تھیں۔ میگزین کا صفحہ ختم کر کے ظبیہ نے اسے بند کیا اور سامنے رکھا اور فلائٹ اٹینڈنٹ سے کھانے پینے کو آخر کار کچھ منگوا ہی لیا۔ اسے اپنا دماغ خالی اور جسم باریک ترین محسوس ہو رہا تھا، ٹانگیں لکڑیاں معلوم ہوتی تھیں اور پیٹ ایک اندھا کنواں۔ اور چونکہ وہ خاموشی سے کھانا نہیں کھا سکتی تھی، تو اکائر کی نیند برباد کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ناسی گورنگ (مالائی فرائڈ رائس) میں پلاسٹک کا چمچہ چلاتے اس نے کینو کا جوس چکھتے اکائر کو دیکھا جو ابھی بھی سویا سویا لگتا تھا۔ منہ بھر چاول کوک سے اندر پھانکتے اس نے ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں کا کنارہ صاف کیا۔ اکائر نے ایک دلچسپ نگاہ اس پر گزاری۔

"تم کیا کرو گی بیجنگ میں؟"

"میں؟" فرائڈ انڈے کو کانٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں کاٹا اور پھر دانتوں کے درمیان رکھا۔ اکائر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی پیاری لگتی تھی۔ اسے مک بانگار (mukbanger) بننے کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

"یہاں اور کون بیجنگ جا رہا ہے؟" سوال پوچھتے ہی اسے اس کی حد درجہ بیوقوفانہ نوعیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً تصحیح کرنا چاہی۔ "میرا مطلب۔"

"ہا! سارے دو سو انتالیس لوگ۔ پاگل!"

اکائر تھک کر ہنس دیا۔ "تم واقعی بدل گئی ہو۔"

"پیاری ہو گئی ہوں ناں۔" چمچے سے چاول صاف کرتے بڑی بڑی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"جوک اچھے ہو گئے ہیں۔"

ظبیہ نے کن اکھیوں سے اسے کانٹا دکھایا۔ "روڈ۔"

اس نے شانے اچکائے۔ "Call it tough love."

"اوکے مذاق کے علاوہ، تمھارے کیا پلینز ہیں، لڑکی؟"

ظبیہ نے دو پل سوچا۔ "تمھیں پتا ہے مجھے کھانا بنانے کا شوق ہے۔ ایک وقت میں پروفیشنل کورس بھی کیا تھا، لیکن ابا نے پورا نہیں کرنے دیا ورنہ آج سرٹیفکیٹ ہاتھ ہوتا۔ خالہ نے کہا تھا ان کے پاس دو تین دکانیں ہیں جہاں وہ مجھے کوئی شاپ کھلوا دیں شاید۔ لیکن اب یہ سب جھوٹ لگتا ہے۔"

اکائر نے بوتل کے پیندے سے آخری گھونٹ منہ میں گرایا۔ "تمھاری خالہ تم سے جھوٹ کہہ رہی ہیں؟"

اس نے سر نفی میں دائیں بائیں کیا۔ "وہ نہیں، حالات۔ اب سب مشکل ہے۔ خالہ بیمار ہیں، مجھے کسی کا سپورٹ نہیں ہو گا۔" وہ بددلی سے مسکرائی۔

"میں انویسٹ کروں؟" اس نے سوچ کر بولا۔

"پیسے؟" وہ چونکی۔ اکائر نے گردن جھکائی تو وہ مسکرا دی اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے جھکا تو اس نے اس کی قمیص کا کنارہ پکڑتے سرگوشی کی۔

"میرے بینک اکاؤنٹ میں اس وقت تیئیس ملین رنگٹ ہیں۔"

اکائر بے اختیار کھانسا، اتنی قوت سے اس کے گال سرخ پھول گئے اور ہڈی پسلی جھنجوڑ گئی۔ ظبیہ نے آنکھیں گھمائیں۔ "اچھا بس ڈرامے مت کرو۔" لیکن وہ رک نہیں پا رہا تھا۔ ہتھیلیوں کا پیالا بنائے وہ اوندھا ہوا کھانسے جا رہا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے اس کا کندھا چھوا، اس بار آنکھوں میں فکر تھی۔ تھوڑے پل میں وہ تھم گیا، لیکن چہرے پر بے آرامی تھی۔ ظبیہ نے اپنا پانی اسے پکڑایا۔

"پتا نہیں کیا ہوا تھا۔۔۔" وہ سستی سے کہہ رہا تھا، انگلیوں نے بوتل تھام رکھی تھی۔

"تمھارا انہیلر کہاں ہے؟" ظبیہ نے اس کا سامان دیکھتے پوچھا تو اس نے بے دھیانی میں اپنے بیک پیک کی طرف اشارہ کیا۔ ظبیہ نے جلد ہی سبز رنگ کا آلہ ڈھونڈ کر اس کی جانب کیا۔

"شکریہ۔"

لمبی سانس کھینچتے اس نے ڈھکن ہٹایا اور آلہ آگے پیچھے ہلایا، پھر اسے منہ کے پاس پکڑ کر سانس اندر اتاری۔ دس سیکنڈ تک وہ سانس روکے رہا پھر ہوا باہر چھوڑی۔ ظبیہ اسے دیکھتی رہی۔

ان سب کو جلد پتا لگ جائے گا کہ کیا ہوا تھا۔

★★★

MH370 کا کپٹ

02:21 AM (MYT)

کھڑکی کے برابر بیٹھی چینی بزنس وومن، لیا، کو کانوں میں اٹھتی چبھن شدت سے محسوس ہوئی۔ اس نے بے دھیانی میں سیٹ کی گدی کو جکڑ لیا۔ دو بیٹیوں کا اخبار پڑھتا باپ اب کہ ہتھیلی سے ماتھا مسلتے سر درد کو کم کرنے کی کوشش میں تھا۔ دس سوئیوں کی تکلیف اس کی سر کے پچھلی طرف جنم لے رہی تھی۔ ایک عورت کا پانچ سالہ بیٹا مووی کے درمیان بیشتائی سے جمائیاں لینے لگا تھا، جیسے اس کا جسم آکسیجن کی کمی کو پورا کرنے کی جست میں ہو۔

اکائر کی سانسیں اب بھی مکمل بحال نہیں ہو پا رہیں تھیں۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے آنکھیں بند کر کے انہیلر سے دوبارہ منہ جوڑا۔ ظبیہ اسے دیکھتی رہی۔ ان کے برابر اور آگے والی قطاروں میں بیٹھے مسافرین نے کمزور دل نگاہیں آپس میں ملائیں۔ سب کو کچھ بدلتا محسوس ہو رہا تھا۔

ہوا پتلی ہو رہی تھی اور اس کی مقدار کم سے کم تر۔ جہاز کی خارجی دریچے پورے کھلے ہوئے تھے جن کے بائث شتابی سے آکسیجن طیارے سے رفو ہو رہی تھی۔

کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی، سوائے اس ایک کے۔

ظبیہ نے بھی آس پاس نظریں دوڑائیں، اس کے ابرو پریشانی اور گھبراہٹ میں جڑے تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

"Ladies and gentlemen, this is Captain Rabeh Adam speaking."

ظبیہ کا دل یکدم ٹھہر گیا۔

کیبن میں مسافرین نے سر اوپر اٹھائے اور دیوار کے ساتھ نصب سیاہ اسپیکر کو دیکھا جہاں سے وہ دھیمی اور پیشہ ورانہ آواز ان سے مخاطب تھی۔

"پرواز میں ایک معمول کی چڑھان جاری ہے۔ آپ کی حفاظت کے مفاد میں ہم آکسیجن ماسک تعینات کر رہے ہیں۔ براہ کرم، اپنے ماسک پہن لیں، اور ہمارے فلائٹ اٹینڈنٹ کی رہنمائی پر عمل کریں۔" اپنے کلمات سنا کر وہ آواز اوجھل ہو گئی۔ ظبیہ چند ثانیے اور اسی سیاہ اسپیکر کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تھا، اتنا کہ وہ جذبات سے لبالب لگتی تھیں۔

اس کا خمار جلد چکنا چور ہوا جب اسے اپنے سر کے بالا کیبنٹ سے آکسیجن ماسک اترتے نظر آئے۔ اس کے ارد گرد بھی مسافرین تنگ تاثرات اور بھاری دل سے ماسک کو اپنے منہ پر چڑھا رہے تھے۔ سب کو اپنی حفاظت خود کرنی تھی۔

جیسے آکسیجن ماسک کے نیست ہوتے ہی علامتی سرخ بتیوں نے اپنا جال بچھایا۔ کرمسن رنگ متفکر چہروں پر واضح ہوا۔ حرکت کرتے ہاتھ، سستی سے چلتے منہ، ماسک کی ڈور کو کھینچتی انگلیاں اور اس کے پیچھے چھپائی گئی ایک ایک سانس۔ دو سو انتالیس جانیں۔۔۔!

اب کہ فلائٹ اٹینڈنٹ قدم قدم سب کو اپنے ماسک پہننے میں مدد کر رہی تھیں۔ ظبیہ نے چہرہ موڑ کر اکائر کو دیکھا۔ اس کے گال رنگ بدل رہے تھے اور سانسیں بے ضابطہ تھیں۔ اس کے دل کو دو کڑیاں لگیں۔

"اکائر، تم ٹھیک ہو؟ تمھاری حالت خراب لگ رہی ہے۔" اس نے آگے جھکتے اس کا جائزہ لیا۔ وہ دمہ کا مریض تھا اور یہ بات ظبیہ بخوبی جانتی تھی۔ سیڑھیاں عبور کر کے یا بھاری سامان اٹھا کر وہ دو سے تین منٹ تک صرف اپنی سانس بحال کرتا تھا۔ اس نے ظبیہ کو بتلایا تھا کہ بہت ساری جائیداد کے سنگ وہ بیماری بھی وراثت میں عنایت کی گئی تھی۔

وہ عسرت سے مسکرایا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ بس۔۔۔ سانس لینے میں تھوڑی دشواری ہو رہی۔ تم ماسک پہنو۔" آخر میں اس کے الفاظ گڈمڈ ہوئے۔

ظبیہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بلند کرتے خانے سے اپنا آکسیجن ماسک آزاد کیا اور منہ کے قریب لائی۔ فلائٹ اٹینڈنٹ ان کے نزدیک پہنچی تو ظبیہ نے ایک لمحہ نہیں لگایا کال کا بٹن دبانے میں۔ یونیفارم کے نیلے ڈریس اور حجاب میں ملبوس پانچ فٹ دو انچ کی عائشہ عبدالکریم تابعداری سے ان تک آئی۔

"اکائر کو آپ کی مدد چاہیے۔" اس نے سرگوشی میں اشارہ کرتے کہا۔ سرخ بتیوں والے کیبنٹ سے اپنا ماسک اتارتے اکائر نے اسے باقاعدہ طور پر گھور کر تنبیہ کی۔

"ظبیہ، میرا انہیلر میرے پاس ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

فلائٹ اٹینڈنٹ نے توجہ اس کی جانب کی۔ "سر، ہمیں مدد کرنے دی جیے۔ ہمارے پاس میڈیکل کٹ اور اضافی آکسیجن موجود ہے۔ آپ کا آرام ہماری ترجیح ہے۔"

اسے بد تہذیب لگ رہا تھا ڈھائی سو لوگوں میں اپنے آپ کو خصوصی اہمیت دینا۔ "کوئی مسلہ نہیں۔ میں آکسیجن ماسک استعمال کر رہا ہوں۔ میرا انہیلر تو ہے ہی۔" اس کی سانس میں تنگی اس کے الفاظ سے عیاں تھی۔ اس نے آکسیجن ماسک سر کے پیچھے کھینچا اور ناک اور ہونٹوں کے گرد پھنسا لیا۔

ظبیہ نے اس کا بازو چھوا۔ "پلیز اکائر۔ انھیں مدد کرنے دو۔" سفید آکسیجن ماسک کے پیچھے اس کی بھوری آنکھیں التماس سے گھری تھیں۔ اکائر کا دل بے ترتیب ہوا۔ اس نے بس آہستہ سے سر اثبات میں جھکا دیا۔

عائشہ جلد ہی ان تک واپس آچکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹیوب جیسا آلہ تھا جسے وہ آکسیجن کے چھوٹے پورٹ ایبل (portable) سلنڈر کے ساتھ تھامی تھی۔ سلنڈر کا اوپری حصہ انوناسک قنولہ سے جڑا تھا، جس سے آکسیجن بہہ کر ٹیوب میں داخل ہوتی ہے۔

"ماسک ہٹایئے گا۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

عائشہ اب کہ ترتیب سے قنولہ اس کی ناک کے گرد لگا رہی تھی، جس کا دوسرا حصہ سلنڈر سے منسلک تھا۔ ٹیوب فکس کر کے وہ پیچھے ہوئی تو اکائر نے آکسیجن ماسک اس کے اوپر چڑھا لیا۔ اب کہ آکسیجن کا بہاؤ کشادہ تھا۔

فلائٹ اٹینڈنٹ چلی گئی تو ظبیہ اس سے مخاطب ہوئی۔ "کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"زہر لگتا ہے مجھے یہ قنولہ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو ظبیہ گڑبڑا گئی۔

"بچپن میں جب دمہ کا اٹیک ہوتا تھا تو اسپتال جانا پڑتا تھا۔ اماں کو لگتا تھا مجھے کچھ ہو گیا ہے، کہ میں مر جاؤں گا۔ وہاں میرے یہ قنولہ لگاتے تھے۔ اس سے صرف دردناک یادیں وابستہ ہیں۔ آئی ریئلی ہیٹ دس، ظبیہ۔"

اس نے ادھ کھلے لبوں سے اسے دیکھا پھر ہمدردی سے اس کی کلائی کا اوپری حصہ سہلایا۔ "آئی ایم سوری۔ مجھے نہیں پتا تھا۔۔" اس کی آواز خاموش تھی۔ اکائر کے دل کو ٹیس پہنچی۔

"ایسے مت کہو۔ میں بچکانہ بات کر رہا ہوں۔ لیکن۔۔۔" مجھے لگتا ہے کہ میں اس قنولہ میں مر جاؤں گا۔ پر کیا وہ ظبیہ کو یہ کہہ سکتا تھا؟ وہ کیا سوچے گی ایک انتیس سالہ مرد اپنے بچپن کی ایک بات کو ٹراما بنائے بیٹھا تھا۔ وہ نہیں بتا سکتا تھا۔

اس نے تھک کر ٹھوڑی جھکائی، انگلیاں ہوا میں تھیں، جیسے وہ اپنی کلائی کے اوپر رکھے ظبیہ کے ہاتھ کو تھامنا چاہتا ہو مگر کچھ اسے روک رکھا ہو۔

"لیکن؟" اس نے اس کی کلائی پر ذرا سی قوت لگائی، اسے بولنے کا اشارہ کیا۔ اکائر نے اسے دیکھا۔ سفید ماسک کے پار بنتی بھاپ اور منتظر نظریں۔ کیا وہ بھی اس کا انتظار کرتی تھی؟ کیا وہ بھی اس کے لیے ٹھہر جایا کرتی تھی؟

"لیکن یہ سب فضول ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بچپن تھا۔"

وہ ماسک کے پیچھے مسکرایا۔ ظبیہ اسے دیکھتی رہی پھر سر ہلا کر ہاتھ دور کر لیا۔ اکائر نے انگلیاں نیچے کیں اور اپنے کلائی کے اس حصے کو چھوا جسے چند ثانیے پہلے وہ پکڑی تھی۔

اس کی پوروں کی تپش اب بھی وہاں تھی۔

ظبیہ اپنا ماسک لگائے چھت پر لگی بتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ سنہری اور سفید، لیکن آکسیجن ماسک کے ساتھ اترے سرخ انگارے اب ان میں گھل سے گئے تھے۔ چھت پر سائے آگے پیچھے ہوتے، کوئی مسافر اٹھتا تو

کوئی بیٹھتا۔ سایا آتا اور چلے جاتا۔ بھوری آنکھوں کی سفیدی میں لال نقتہ واضح ہوتا۔ اس کے ماتھے کی سلوٹیں سمیٹ جاتیں۔

اس نے آنکھیں موندلیں اور خواہش کی کہ جلدی آکسیجن کا بہاؤ بھرپور ہو جائے، کیونکہ خواہشات اور انتظار میں اس بدھو لڑکی کا کوئی متضاد نہ تھا۔

اس کے کان ایم ایچ تھری سیون زیرو سے وقتاً منقطع ہو گئے۔ ظبیہ یمین کو اس کے ماضی نے آن گھیرا تھا۔

★★★

حال سے سات سال قبل

"It all started when an alien device did what it did!"

"ادا، بچے آواز کم کرو۔" رباب کی ڈانٹ۔

"مو آنا! ابی نے تیز کی ہے۔" فوراً احتجاج۔

"ابی، آواز کم کرو۔" فون کے کی پیڈ پر ٹک ٹک کرتی انگلیاں۔ بدلے میں گاڑی کے اسپیکر کی آواز دھیمی کر دی گئی تھی۔ اب کہ بین ٹین کا گانہ مدھم سُر سے رواں تھا۔

"یہاں سے رائٹ تھا یا لیفٹ؟" ڈرائیور سیٹ پر نشست رابح نے استفسار کیا۔ اس کی انگلیاں چمڑے کے اسٹیرنگ ویل کے گرد لپٹی تھیں اور گود میں ساڑھے چار سالہ ادا سرخ و سفید جمپ سوٹ میں ملبوس پُر شوق سی بیٹھی تھی۔ اس کی ننھی گول کلائی کے گرد باربی کی گھڑی تھی اور نرم لٹیں کھلی ہوئی تھیں۔

"مجھے کیا پتا؟ تم دونوں بہن بھائی لائے ہو۔" پسنجر سیٹ پر بیٹھے مرتضیٰ نے فوراً جان چھڑوائی۔ رابح نے ہونٹ چباتے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور نظریں بیک ویو مرر کی جانب کیں۔

"آپا، راستہ یاد آ رہا ہے یہاں سے؟ مجھے یاد ہے اینڈ میں لیفٹ تھا بس یہ جنگل دماغ گھما رہے ہیں۔ دو چار سال پہلے سے مختلف ہو گیا ہے سب۔" وہ رباب کے جواب کا منتظر تھا جو بٹن بٹن دبا کر اب فون کان پر کیے تھے۔

"شش! مجھے نہیں پتا۔ اماں کو کال کرنے دو۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

رانج نے دونوں میاں بیوی کو کھڈے میں ڈالا اور رفتار تیز کی۔ تیتی وانگسا علاقے میں واقع جینٹنگ ہائی لینڈز کی ہوائیں پہاڑیوں کی اونچائی کے شناسی کرتے ہوئے تازہ اور کڑک تھیں۔ گہرے سیاہ رنگ کی ہونڈا اوڈیسی کی کھڑکیوں کے گلاس نیچے تھے، دھند سے چومی پہاڑیاں اور سبز و شاداب ہریالی کا منظر پیش کرتے۔

رانج کے بھورے بالوں کے درمیان ہوا نے گانٹھ لگائی۔ وہ ساری توجہ راستے پر مرکوز کیے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ادا نے مسکراتی نگاہ کے ساتھ ٹھوڑی اوپر کی اور اس کا گال سہلایا۔ باپ برابر میں تھا لیکن افسوس، کبھی جو اس کا ابی کی گود سے اترنے کا من ہو۔

"گڑیا، سامنے دیکھو۔" اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

بیک سیٹ میں دوسری طرف شیشے کی جانب رخ کیے ظبیہ آنکھوں کے آگے کھلتی وادیوں کے لطف اٹھا رہی تھی۔ دیودار کی خوشبو اور سوکھی ہوئی شبنم کی قرص، قرمزی رنگی جھاڑیاں اور اوپر نیچے ہوتی راہیں، وہ اپنے ملک کے اس علاقے میں اس سے قبل کبھی نہیں آئی تھی۔ سیاہ زلفیں ہیئر ٹائی کے بغیر آزاد تھیں اور دھیمی ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ اس نے سفید اور نیلے رنگ کی قمیص پہنی تھی، ساتھ ہی ڈینم کی جینز اور گلے میں سفید اسٹال۔ کانوں میں سفید دل والے چھوٹے اسٹڈ چمک رہے تھے۔

"کیا ہے؟ اماں فون نہیں اٹھا رہیں۔" رباب نے فون کان سے ہٹاتے اعلان کیا پھر برابر بیٹھی ظبیہ کی طرف دیکھا۔ "تم اپنی خالہ کو ٹرائی کرو۔ دونوں ساتھ ہی ہوں گی، کوئی ایک اٹھا لے شاید۔"

ظبیہ نے ہامی بھرتے براؤن والٹ سے فون باہر نکالا اور اسکرین اون کی۔

"آئی وانٹ جوس!" اچانک ادا نے سر ہلاتے رابح کی طرف دیکھا اور معصومیت سے آنکھیں گول کیں۔

"Abby will buy you all the juice in the world."

اس نے نرمی سے سر پر بوسہ دیتے کہا تو رباب نے بیٹی کے ہیلو کٹی والے بیگ کو کھنگالا اور تین قسم کے جوس آگے بڑھائے۔

"یہ سب جوس تمھارے ہی ہیں، انھیں پیو۔ ابی کے پاس بہت پیسہ آرہا ہے۔ بڑی بہن پر لگائے گا۔" ادا نے تو جوس لیے بھی نہیں۔ رابح نے جواب دینے کو منہ کھولا لیکن ظبیہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

"نہیں جا رہی کال۔ یہاں وہاں ہوں گی خالہ۔" اس نے اطلاع کی۔

"تو ٹھیک ہے ناں۔ کر تو چکے ہیں دو بار کال۔ ایک بار کراک ہائے وے پر کی تھی، ایک بار ابھی، جینٹنگ سمپا پر۔" مرتضیٰ نے اطمینان دلایا۔ رباب ناخوش تھی۔

"اماں کو ساتھ آنا چاہیے تھا ہمارے۔"

"آپ میری ماں کو سانس کی کمی سے مارنا چاہتی ہیں۔" رابح نے ترنت سر اپکڑا۔

"تم سے پہلے میری ماں ہیں۔ تم سے پہلے سات سال تک وہ صرف میری ہی ماں تھیں۔" رباب بھی بھوکی شیرنی کی طرح لپکی۔ ظبیہ ان کی بحث دیکھ کر مسکرا دی۔

"ہاں، لیکن سکون انھیں مجھ سے آیا ہے۔"

"تم دونوں ظبیہ کو بور کر رہے ہو۔" مرتضیٰ نے باہر دیکھتے تبصرہ دیا تو گاڑی میں سناٹا چھا گیا۔ اپنے نام پر ظبیہ نے گھبرا کر آگے دیکھا۔

بیک ویو مرر میں ہیزل آنکھیں اس پر تھیں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"تم بور تو نہیں ہو رہی، ظبیہ؟ دیکھو اس میٹھی چھری کی اصلیت۔ کتنی بد تمیزی کرتا ہے بڑی بہن کے ساتھ۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آنا۔" رباب نے اس کے بازو میں بازو ڈال کر سر اس کے کندھے پر رکھا۔ ظبیہ مسکرا دی۔

"ظبیہ نہیں سنتی ایرے غیروں کی۔" ڈرائیور کا اندھا اعتماد اس کی مطمئن مسکراہٹ میں عیاں تھا۔

رباب نے گھور کر آگے دیکھا۔ "وہی کہہ رہی ہوں۔" پھر ظبیہ کی طرف چہرہ کیا اور اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

"مجھے دیکھو ظبیہ۔ ایرے غیروں۔۔۔" ترچھی نگاہ سامنے ڈالی۔ "کی کبھی مت سننا۔"

رابح نے ہونٹ کاٹ کر مسکراہٹ روکی اور ظبیہ کے گال گلابی ڈھلے۔ ادا کو اپنے بھلا دیے جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ اچانک رابح کی ٹانگوں کے درمیان کھڑی ہو کر بال بگاڑنے لگی۔

"کب آئے گا پارککککک؟"

"یہ آپ کے ابی بتائیں گے۔" مرتضیٰ نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرا کمر کے گرد پھنسا کر اسے اپنی سیٹ میں اٹھا لیا۔

"سامنے دیکھو سب۔" رابح نے اسٹیرنگ ویل پر انگلیاں چلاتے غور سے کہا۔ سب کی منڈیاں آگے کو مڑیں۔

"وہ دور بلڈنگ نظر آ رہی ہے؟"

"کلر فل سی؟" ادا نے جوشیلے الفاظ میں پوچھا۔

"بالکل۔ اس کلر فل بلڈنگ میں جا رہے ہیں ہم۔" اس نے فخریہ اعلان کیا۔ ظبیہ کی آنکھیں اب بھی ونڈ شیلڈ کے پار کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ دھند میں جکڑا، ٹوٹی پھوٹی راہوں اور گھنے درختوں کے سائے میں بچھا ریزورٹ۔ تفریحات کا شہر، جینٹنگ ہائی لینڈز!

"اس کا نام کیا ہے، ادا؟ یاد ہے کل ابی نے بتایا تھا۔" رابح نے سوال کرتے ایک اور نظر بیک ویو مرر پر ڈالی۔ ظبیہ نے چہرہ موڑ کر باہر دیکھا، گال دہک رہے تھے۔ اُف!

"آہ! بھول گئی۔ کل کب؟"

"کل جب مونگ پھلی کھاتے وقت ابی کو ظبیہ کی خالہ کا میسج ملا تھا کہ ظبیہ کو اجازت مل گئی ہے اور مونگ پھلی چھلکا سمیت اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔"

رباب اور مرتضیٰ نے ہنستے ہوئے آپس میں تالی پیٹی۔ رابح کا دل کیا چلتی گاڑی سے کود کر جان دے دے۔ ظبیہ نے خاموش نظروں سے آس پاس دیکھا پھر اپنی گود میں۔ بیگ کے اسٹریپ کو آگے پیچھے کرتے ایک نرم مسکراہٹ اس کے گلابی ہونٹوں پر بستار تھی۔

"نہیں یاد۔"

"اب تو ابی بھی بھول گیا ہو گا۔" مرتضیٰ نے آخری کیل ٹھونک کر بات ختم کی۔ "ہم فرسٹ ورلڈ ہوٹیل جا رہے ہیں۔" اس نے بیٹی کے کان پر پیار کرتے بتایا۔

بقیہ پورے سفر رابح کی نگاہیں روڈ سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ابھی کے لیے اتنی شرمندگی کافی تھی۔

ظبیہ نے پیر نیچے کرنے چاہے تو اس نے اس کی سیٹ پر ہلکا سا کھٹکھٹایا۔ وہ پیچھے ہوا۔ "اپنی سیٹ آگے کر لیں۔ میرے پیر پھنس رہے ہیں۔"

سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالتے اس نے سوئچ دبایا اور اسے اوپر کھینچا۔ "آل گڈ؟" کندھے کے اوپر دیکھتے سوال کیا تو ظبیہ مسکرا دی۔

"جی۔" رابح آگے جھکنے لگا تو اس نے ماتھا اس کی سیٹ سے ٹکاتے سرگوشی کی۔ "آپ واقعی اتنے خوش ہیں کہ میں آئی؟"

رانج نے نظر برابر میں دوڑائی۔ رباب اپنے شوہر کو میگزین سے ان کے دبئی والے گھر میں ڈالنے کے لیے فرنیچر کی تصاویر دکھا رہی تھی، اور میاں صاحب حال اور صورت سب چھوڑے صرف قیمت کی جانب متوجہ تھے۔ ادا ہر چیز کو پنک لیپ دینے پر سنگ آسا تھی۔

"ایسے خطرناک سوال ایسی خطرناک جگہ مت پوچھو۔" وہ کہتے آگے جھکا، ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل تھاما اور دوسرا کھلی کھڑکی کے کنارے جمالیا۔ ظبیہ مسکرا کر پیچھے ہو گئی۔ اسے اپنا جواب مل گیا تھا۔

پندرہ منٹ اور لگے تھے انھیں اس رنگوں میں گھرے ہوٹل تک آنے میں۔ فرسٹ ورلڈ ہوٹل، دو ہزار پندرہ تک گینس بک میں مانا گیا دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل، جس کے دو ٹاورز اور ان کے اندر سات ہزار تین سو پندرہ کمرے تعمیر شدہ تھے۔ قوس قزح کے سات رنگ اس کی افق قد بلڈنگ کو گھیرے تھے، روئی جیسے شفاف بادل اور ہوا کی خستہ مٹھاس۔ وہ واقعی روزمرہ کی زندگی سے ایک وقفہ تھا۔ اسکیپ!

ہونڈا اوڈیسی کا دروازہ کھولتے سب سے پہلے رباب نے قدم باہر جمائے، اور چھوٹے بھائی کے لاکھ ٹوکنے کے باوجود اسی شان سے دروازہ ٹھوک کر بند کیا۔ رانج نے ضبط سے آنکھیں میچ لیں۔ میری گاڑی۔

ظبیہ ہنسی روکتے باہر نکلی، کیمرہ اس کے گلے میں تھا اور لال بھورا والٹ ہاتھ میں۔ رباب تک قدم اٹھاتے اس نے اپنے گرد کے ماحول کے بان پڑنا چاہا۔ اتنی شیریں ہوا اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"پاپا، رائڈز!" ادا اپنے باپ کا ہاتھ کھینچتے دور تھیم پارک کی جانب بڑھنے پر اٹل تھی۔

"میری تین فٹ کی ماں، باپ کو نہا تو لینے دے۔ دو گھنٹے سے اس گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ ہڈیاں جواب دے گئیں۔"

"ویسے پبلک سروس میسج ہے کہ آپ دونوں واپس سچ مچ کی گھوڑا گاڑی میں جانے والے ہیں۔ میری گاڑی اتنی ذلت برداشت نہیں کرے گی۔" چابی سے ٹرنک کھولتے رانج نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس نے کریم

کلر شرٹ اور سفید ٹراؤزر پہنے تھے، ساتھ ہی بھورے ٹمبر لینڈ۔ چھوٹے کٹے بال ماتھے پر گول ہوئے تھے، مدھم ہوا کے زیر اثر حرکت کرتے۔

"سب اپنی کال کوٹھڑی سمیٹ لیں۔" وہ ٹرنک کھول کر رباب اور مرتضیٰ کو ان کے بیگ دینے لگا، جو رباب بھی مرتضیٰ کو ہی دیے جا رہی تھی۔

"کیا ہے بھئی؟ کچھ تم بھی اٹھاؤ۔ آج کی زمانے کی عورت مضبوط ہے۔" اس نے منہ بسورے کہا۔

"شوہر کو بیوی کے بیگ اٹھانے چاہیے! ورنہ دو لڑکیاں کیا کریں گی شادی کر کے؟" وہ سیاہ شیڈز چڑھاتے ادا کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی۔ مرتضیٰ کو ایک لمحہ لگا اس کا بیان ادراک کرنے میں پھر اس نے لب کھولتے اسے حیرت سے دیکھا اور پیچھے چل دیا۔

ظبیہ اپنا بیک پیک لینے آگے بڑھی تو رابح اس کے اور ٹرنک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ اچانک رکی، آنکھیں ہلکی سی بڑھی ہوئیں۔

"پوچھو اب۔" اس نے بازو سینے پر باندھے۔

"کیا پوچھوں؟"

"اپنا خطرناک سوال۔" اس نے دعوت دی۔

"ارادہ بدل لیا۔" وہ مسکرا کر کنارے سے بیگ لینے لگی تو اس نے ڈگی کا دروازہ نیچے کیا، مگر مکمل نہیں۔ یہ صرف اسے روکنے کے لیے تھا۔

"تم آج آئی، یہ مجھے اچھا لگا۔ تم مجھ سے ہم کلام ہو، یہ میرے لیے ایک حسین گھڑی ہے۔ لیکن تم جینٹنگ ہائی لینڈز کی وادیوں میں میرے سامنے کھڑی ہو، یہ میرے لیے ناقابلِ یقین ہے، ظبیہ۔"

ہیزل آنکھوں میں تشکر تھا، چاہ بھی۔ بھوری آنکھوں میں رشک تھا، اور وصف بھی۔

اس نے جواب میں صرف ٹھوڑی جھکا دی۔ رائج دروازے سے دور ہوا اور اس کا سرخ بیگ باہر نکال کر کندھے پر ٹانگا۔

"کیا کر رہے ہیں؟" وہ فکر مند ہوئی۔

"تمھارا بوجھ اٹھا رہا ہوں۔" اس نے مسکرا کر بتایا اور گاڑی کے دروازے چیک کیے۔

"یہ آپ کا فرض نہیں ہے۔" وہ پیچھے پیچھے لپکی۔ رائج کے قدم ہوٹل کی انٹرنس کے جانب تھے۔ اس نے راستے میں پل بھر رک کر اس لڑکی کو دیکھا، پھر ہلکا سا ہنس دیا جیسے اس کی بات سے دل تک محظوظ ہوا ہو۔

"ہاں، ابھی نہیں ہے۔ لیکن کبھی تو ہو گا۔" وہ ایک قدم آگے آیا اور سادگی سے مسکرایا۔

"اور بہت جلد ہو گا۔" سرگوشی میں بات جاری رکھی۔ "میں دعائیں کرتا ہوں۔"

ظبیہ جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی۔ بھوری آنکھوں کی کڑیاں ہیزل آنکھوں سے جڑ گئیں۔ زندگی کی تپتی سل پر اس مرد کا سایہ اسے کیسے چھاؤں بخش گیا تھا۔

★★★

جینٹنگ ہائی لینڈز کا انڈور تھیم پارک رش اور شور میں یکساں ڈوبا ہوا تھا۔

تیز روشنیاں ہر سو اجاگر تھیں، متحرک رنگوں میں گھرے فرش پر مختلف خاندان یہاں سے وہاں سفر کر رہے تھے۔ وہ جاندار سرگرمیوں کی الگ ہی دنیا تھی۔ نوخیز بچوں سے لے کر بوڑھے اور نوجوان سب تفریحی شہر کا اس طرح حصّہ بن جاتے کہ عمر صرف ایک افسانہ نمایاں ہوتی۔ ایک کے بعد ایک سواریاں اپنے قد آور ڈھانچوں کے ساتھ استادہ کھڑی تھیں۔ دن کے رات میں بدلتے ہی طلسماتی طور پر نیون لائٹس پارک کو ہر سو روشن کر چکی تھیں، اور سنسنی کے متلاشیوں کی مدھم چیخیں اور ہنسی ٹھٹہ ہوا میں بلند تھے۔

انڈور پارک میں تین اقسام کی رائڈز لی جاسکتی تھیں۔ تھرل رائڈ، جس میں بلند و بالا رولر کوسٹر کشش ثقل کی مخالفت کرتے، مہمانوں کو دم توڑ دینے والی اونچائی کے نظارے کرواتے ہیں۔ دوسری، فیملی فرینڈلی سواریاں جن سے خاندان کا ہر فرد حظ اٹھا سکتا تھا اور تیسری بچوں کے لیے بنائی گئیں بامروت اور دھیمی رفتار سواریاں۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا تمھیں!" ٹاور رائڈ کے پاس کھڑی رباب کسی سے کہہ رہی تھی۔ سیاہ بیس بال کیپ کے نیچے اس کے بھورے بال کھلے تھے اور سفید ٹی شرٹ پر فلینل شرٹ پہنی تھی۔ مٹھی بھر پاپ کارن پھانکتے اس کے لب حرکت میں تھے۔

"میں انتظار کرلوں گی۔ آپ لوگ ہو آئیں۔" ظبیہ غیر مطمئن لگتی تھی۔ اتنی اونچائی۔ اس کا تو سر چکرا رہا تھا اسے دیکھ کر ہی۔ رباب نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"چپ کر کے چلو۔ ابی تمھارا ٹکٹ بھی لا رہا ہے۔ ہم جہاں جائیں گے ساتھ جائیں گے۔ ادا باپ کے ساتھ ہے تو پلیز مجھے میری ڈھلتی جوانی انجوائے کرنے دو۔" اس نے پاپ کارن والے ہاتھ صاف کرتے اس کی کلائی تھامی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"میں نہیں جاسکتی۔" آنکھوں میں اضطراب تھا۔ "آپ اور رابح لے لیں، میں تصویر بنالوں گی آپ کی۔" اس نے کیمرا دکھاتے لالچ دی۔

"کھڈے میں ڈالو اپنا کیمرا۔ مجھے تم چاہیے ہو۔ ایک ہی تو دوست ہو میری۔" رباب نے سر اس کے کندھے سے ٹکاتے التجاء کی۔

"یہ لیں۔" کریم کلر شرٹ پر اس نے اب کہ مرون رنگ کی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے پاس رباب کی جانب بڑھایا تو ظبیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دائیں کان میں چمکتا موتی اور جبڑے کی تیکھی لکیر، پچیس سالہ رابح اتنا ہی پرکشش تھا جتنا کسی اور عمر میں۔

"ان لمیٹڈ ہے یہ۔ ساری رائڈز فری ہیں اس کے بعد۔" اس نے ظبیہ کو اس کا پاس دیتے بتایا۔

"تم پاس چھوڑو، اپنی پڑوسن کو سنبھالو۔ یہ فری ہو رہی ہے، کہہ رہی ہے نہیں جائے گی رائڈ پر۔" رباب نے شکایتوں کی پٹاری کھول ڈالی۔ ظبیہ نے شرمگین ہو کر آنکھیں چرائیں۔

رائج نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ "ایسا کیوں؟"

"ڈر لگ رہا ہے اونچائی سے۔" رباب نے اس کے بدلے جواب دیا۔ ظبیہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

رائج ایک پل کے لیے حیرانی میں خاموش ہو گیا۔ پہلے اپنی بہن کو دیکھا پھر اسے، اور پھر وہ ہنس دیا۔ چند لمحات ہنستا رہنے کے بعد اس نے ظبیہ کو دیکھا، آنکھوں میں نرمی تھی۔

"تم اونچائی سے ڈر رہی ہو؟ ایک پائلٹ کے سامنے؟"

ظبیہ نے اٹل رہنا چاہا۔ "ہاں، تو مجھے کیا پتا؟ آپ پائلٹ ہیں۔ آپ کا دل کرتا ہے اوپر اڑنے کا۔ میں ایک نارمل انسان ہوں۔"

"ویل پہلی بات، میں پائلٹ ہوں، پرندہ نہیں۔ مجھے گریویٹی کی وجہ سے نیچے آنا پڑھتا ہے، پرندوں کا اچھا ہے مست چلتے جاؤ۔" اب بھی چہرے پر مسکراہٹ واضح تھی۔

"ہاں، تو کوئی پرندہ اتنا پاگل نہیں ہوتا میٹل کے راڈ میں خود کو پھنسا کر جھولے لے۔" اس نے بیگ کے اسٹریپ کو چھیڑتے بحث جاری رکھی۔ رباب کے پاپ کارن ختم ہو گئے تو اس نے رائج سے اس کا کارن ڈاگ لیتے اس میں ڈانت گاڑے۔

"یہ آپ کے لیے نہیں تھا۔" اس نے سکون سے ٹوکا۔ رباب نے نوالہ چباتے اسے دیکھا۔

"ہاں، دیکھو میں پھر بھی کھا گئی۔ قسمت بھی کیا چیز ہے ناں۔"

"آپ لوگ جائیں، پلیز۔" وہ اپنی وجہ سے ان کی ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"جائیں، بھئی آپا۔ ظبیہ آپ سے تنگ ہو رہی ہے۔" رائج نے دانت دکھاتے قریبی سیٹ پر تشریف رکھی۔ رباب نے نشانہ لیا اور کارن ڈاگ کی ڈنڈی اس کو ٹکا کر ماری۔

"میں اکیلے کیا کروں؟ چھوڑو! میں تھرڈ ویل کرتی ہوں۔" وہ رائج کے برابر ٹانگیں جما کر بیٹھ گئی۔ چھوٹے بھائی نے ضبط سے آنکھیں کھل بند کیں اور ظبیہ کو دیکھا۔

"ذرا آس پاس نظریں دوڑاؤ۔ ان کے میاں دکھائی دے رہے ہیں؟"

"اوہ، ظبیہ تمھیں پتا ہے! یہ لیدر جیکٹ میرے کہنے پر پہنی ہے اس نے۔ کہہ رہا تھا آپا کچھ دبنگ سا نکال کر دیں، آج اچھا لگنا ہے۔"

"اچھا، بس۔" رائج نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ رباب نے اس کی انگلیاں کاٹ کر بات جاری رکھی۔ پائلٹ نے سسکی لے کر ہاتھ دور کیا۔

"پیار الگ رہا ہے ناں میرا بھائی؟ ایک بار تعریف کر دو ورنہ یہ پوری رات وقفے وقفے سے مجھ سے۔" رائج اسے چیونٹی کاٹ رہا تھا۔

"۔ مجھ سے پوچھے گا: "میں ٹھیک نہیں لگ رہا تھا کیا؟" بڑا انوئنگ ہے میرا بیٹا۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

گلابی گالوں کے ساتھ اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے رائج کو دیکھا جو ٹھنڈی سانسیں لیتے اسے چھوڑ کر ہر جگہ دیکھ رہا تھا۔

"رباب!"

اپنے نام پر وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ دور گیٹ کے پاس کھڑا مرتضیٰ تفتیش میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر کندھے اچکائے تو مرتضیٰ نے ایک انگلی سے ادا کے پیروں کی جانب اشارہ کیا جہاں لائٹوں والے جوتوں میں سے ایک غائب تھا اور گلابی موزے مٹی میں اٹے بھرپور نمائش پر تھے۔

"کہاں پھینک کر آگئی یہ!؟" رباب تیر کی طرح اس جانب لپکی۔

اس کے جاتے ہی باریک سکوت نے ان کے درمیان جگہ گھیر لی۔ پارک کی سنہری روشنیاں ان دو نفوس پر واضح تھیں۔ سر جھکائے بیٹھا پائلٹ چھوٹی انگلی میں پھنسا چاندی کا چھلا آگے پیچھے کر رہا تھا، بھورے بال ہلکے بکھرے تھے۔ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کی سیاہ گھنگریالی لٹیں ٹھنڈی ہوا کے سائے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ ظبیہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ اچھے لگ رہے ہیں۔"

ہیزل آنکھوں والے کی انگلیاں تھم گئیں، گال پر بے اختیار گاڑھی سرخی بکھری۔

"شکریہ۔" اس نے خاموشی سے جواب دیا، ٹھوڑی جھکائے رکھی۔

ظبیہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ گھٹنوں کے بل جھکتے اس نے اس کا قریبی جائزہ لینا چاہا۔

"آپ شرما رہے ہیں؟"

"یار، رحم کھاؤ۔" وہ ہنس کر کھڑا ہوا اور گال چھپاتے آگے بڑھ گیا۔ ظبیہ بھی زوردار ہنس پڑی اور بیگ کے پٹے میں باہیں پھنسائے اس کے ساتھ چل دی۔

ان لمیٹڈ سواریوں کا پاس اس کی ہتھیلی میں قید رہا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

★★★

حال

جگہ: کاکپٹ

02: 25 AM

آکسیجن سینسر کی طرف نظریں موڑتے کیپٹن نے جہاز میں موجود آکسیجن کی مقدار جانچی جو ہولے ہولے گھٹ رہی تھی۔ آؤٹ فلو والوز اب تک مکمل کھلی تھیں، اور طیارے کی چڑھان قائم تھی۔

اس نے تھروٹل کو اڈرنٹ کو تھامے نگاہ اس پر جمائے رکھی، دانت ہونٹوں میں گڑے تھے۔ اب تک اسے پسنجر کیبن کے پار سے کسی نے کوئی شکایت درج نہیں کی تھی، کسی فلائٹ اٹینڈنٹ نے آکسیجن کی کمی پر سوال نہیں اٹھائے تھے، حالانکہ معمول کی چڑھان کے درمیان آکسیجن ماسک کا استعمال غیر متوقع تھا، کسی نے رائج آدم سے سوال نہیں کیا تھا۔

کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے امید کی تھی کہ اب تک سارے مسافرین نے آکسیجن ماسک پہن لیے ہوں گے اس سوچ کے ساتھ کہ اب وہ محفوظ تھے، ہر خطرے سے خالی۔ ان کی سانسیں بحال تھیں اور سفر گامزن۔ چند اور گھنٹوں کی بات تھی اور وہ اپنی منزل بیجنگ کی سرزمین پر قدم رکھ پائیں گے۔

اس نے بھی تو پانچ سال پہلے یہی گمان کیا تھا۔ انڈیا کے آسمانوں میں پرواز ڈالے، اس نے بھی تو کوالالمپور تک کا فاصلہ منٹوں اور میلوں میں ناپا تھا۔ اور کیا غلط کیا تھا۔ وہ فاصلہ اسے منٹوں اور میلوں میں نہیں، اذیت ناک راتوں اور بن بلائے دنوں میں ناپنا چاہیے تھا، تہمتوں اور الزامات میں رنگنا چاہیے تھا، خون تھوکے رشتوں اور چبائی ہوئے محبتوں میں لکھنا چاہیے تھا۔ کیا غلط کیا تھا اس نے۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

آخر کیا غلط کیا تھا اس نے؟

شاید کچھ نہیں۔ زندگی آپ کو ہمیشہ کہیں چوک جانے کے بعد نہیں آزماتی۔ وہ آپ کو آزماتی ہے اور چوک جانا آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ غم اور غرور ایک ہی سکے کے دو منہ تھے، اور انسان کو اپنی تقدیر کا چناؤ ان کے درمیان تلاشنا تھا۔

یہی تھا پرواز کا دستور اور نزول کا معمول۔

طیارچی ماسک اس کے لبوں کے گرد کسا تھا، اس کا مکمل چہرہ چھپائے ہوئے۔ سیاہ بادلوں کو پار ہٹاتے، کاکپٹ میں بیٹھے پائلٹ نے ہیزل آنکھیں جھپکیں اور نیلی، سرخ جگمگاتی بتیوں پر نگاہ روشن کی۔

آکسیجن سینسر طیارے میں تخفیف ہوتی ہوا کی شناخت کر رہا تھا۔ دو سو انتالیس جانوں کی سانسیں ایک ہی ٹینک سے جڑی تھیں۔

کیا مسافرین کو واقعی لگتا تھا آکسیجن ماسک ان کا مسیحا تھے؟ کیونکہ کوئی انھیں بتاتا۔۔۔

ہوائی جہاز میں مسافروں کے لیے فراہم کیے گئے وہ آکسیجن ماسک پندرہ سے بیس منٹ کا اہم دورانیہ پیش کرتے تھے، اور ہم پہلے ہی ان قیمتی گھڑیوں میں سے پانچ منٹوں کی خوش قسمتی جی چکے ہیں۔

★★★

جگہ: پسنجر کیبن

02:27 AM

کھڑکی کے ساتھ بیٹھے اکائر کو اپنی سانس پھنس پھنس کر آتی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف وہی نہیں، بلکہ بیشتر قطاروں کے درمیان بے آرامی اپنی جگہ بنا چکی تھی۔

اس نے آنکھیں کھل بند کرتے بے اختیار انگلیوں کی پوروں سے ماسک چھوا۔ اس کے نیچے لگا قنولہ اب بھی فٹ تھا۔ حالانکہ وہ اوروں کے مقابلے اضافی آکسیجن کا استعمال کر رہا تھا، ایک دمے کا مریض ہونے کے لحاظ سے یہ اب بھی کم ہی تھی۔

اس نے اچھنبے سے چہرہ آگے پیچھے گھمایا۔ راہداریوں کے اثناء میں ٹہلتی فلائٹ اٹینڈنٹس سب مسافرین کا جائزہ لیتے مشغول تھیں۔ ہر عمر، صنف اور جات پاکش کے لوگ لب اور ناک سفید ماسک تلے چھپائے پلین کے نارمل ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کب سب نارمل ہو اور وہ جینا شروع کریں۔

"کچھ مسلہ ہے؟" ظبیہ نے اس کی پریشان نظروں کا تعاقب کیا۔ سرمئی آنکھوں نے پل بھر اسے دیکھا، پھر دانت کڑکڑائے۔

"بس۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

"بتایا ہے نا، پلین چڑھان پر ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا تھوڑی دیر میں۔"

"ظبیہ، پلین اسینڈ کرتے ہیں، مجھے پتا ہے۔ میں اب تک کوئی سو سے زائد فلائٹس لے چکا ہوں مختلف ائیر لائنز کی لیکن کبھی آکسیجن ماسک پہننے کی نوبت نہیں آئی۔"

"ایسے مت کہو۔ مجھے ڈر لگنے لگے گا۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ہی سہی، مگر دل کی بات کہہ دی۔ اکائر نے لب کاٹے اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔

ان سے چند نشستیں چھوڑ کر بیٹھی نیلے کارڈیگن والی خاتون کو فلائٹ اٹینڈنٹ نے پانی کا گلاس آفر کیا تو متذبذب نظروں سے اس نے منا کر دیا۔ اس کا منہ سوکھ رہا تھا۔

اس کے برابر بیٹھے مرد نے جھرجھری لیتی انگلیوں سے ماسک آگے پیچھے کیا۔ اس کے بدن کے پور پور پر کوئی بوجھ سا تھا، بجلی جیسا طاقت ور مگر روشنی سے زیادہ باریک۔

بارہویں قطار میں بیٹھے مسافرین میں سے ایک پینتیس سالہ مرد نے سر کھڑکی کی جانب موڑا۔ کسی وقت کی اس کی مضبوط نگاہ اب گم سی نمایاں ہوتی تھی۔ انگلیوں کی مصروف گردش تھم چکی تھی، اور گود میں رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین ڈھلکی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

جمائی لیتا بچہ اب اپنی ماں کے سہارے ٹکا تھا، جو خود بھی بے آرامی سے دوچار تھی۔ اس کی ممتا اب بھی اپنے بیٹے کی زلفیں سنوارنے میں جھلک رہی تھی۔

مختصر مدت کے استعمال کے لیے بنائے گئے ماسک ہولے ہولے اپنی تاثیر کھونے لگے تھے۔

"یہ تندور ہے یا ہوائی جہاز! مجھے سانس نہیں آ رہی ہے۔" ان کے عقب میں بستی چند سیٹوں میں سے ایک ۔کوئی مرد غصے سے تلملا رہا تھا۔ فلائٹ اٹینڈنٹس کی متذبذب نظریں اس جانب گھومیں۔ بلانڈ بال اور ہلکی بڑھی ہوئی شیو پر سفید ٹی شرٹ پہنا مرد آکسیجن ماسک کے پار سے آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔

"کیسی گھٹیا سروس ہے آپ کی!" وہ کہتا ہوا سیٹ سے اٹھ کھڑا تھا۔ آس پاس مسافرین بے کس تماشائی بنے تھے۔ فلائٹ اٹینڈنٹس پریشان مگر سکون سے اس سے مخاطب ہونا چاہتی تھیں، جو طیش میں ہانپ رہا تھا۔ ایک تو آکسیجن پہلے ہی کم تھی، یہ ہانپ ہانپ کر ساری پی لے گا۔ اکائر نے ناگواری سے سوچا۔

"سر، پلیز اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ آپ کی سلامتی ہماری اول ترین ترجیح ہے۔" عائشہ عبدالکریم ماسک کے نیچے سے الماس بھری نگاہوں سے اس سے درخواست کر رہی تھی۔

"مائی فٹ! آپ یہ فکس کریں ورنہ-" اور جملہ مکمل کرنے سے قبل ہی ایک گہری سانس کے ساتھ وہ مرد اپنی نشست پر ڈھے گیا تھا۔ آئل میں بیٹھے ہر فرد نے منہ سے چیخ یا چیخ کے قریب ترین کوئی آواز نکالی۔ ظبیہ نے ماسک کے اوپر ہتھیلی رکھ کر اپنا شاک چھپایا۔ اکائر سر موڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھتا رہا۔

فلائٹ اٹینڈنٹ اس کے نزدیک بڑھیں۔ انھیں ان کی ٹریننگ نے یہ سب سکھایا تھا۔ اس کے منہ پر لگا آکسیجن ماسک سدھارا اور اس کا گال تھپتھپاتے اس کا نام پکارا۔ جلد مرد نے سرخ متورم آنکھیں جھپک کر کھولیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات اب کہ اڑے ہوئے تھے۔

"سر، کیپٹن نارمل کنڈیشنز اسٹور کر رہے ہیں۔ آپ تھوڑا وقت دی جیے اور سکون سے بیٹھ جائیں۔ اس طرح آپ اپنے آپ کو چوٹ پہنچائیں گے۔"

بلانڈ بال والا سستی سے اپنی سیٹ میں ڈھے گیا، کپکپاتی انگلیاں ماسک تھامے تھیں۔ راہداریوں کے درمیان جلتی سرخ روشنیاں اب بھی پر نور تھیں۔ قریبی نشست پر بیٹھے بزنس مین نے آنکھیں مسل کر اپنی بصارت صاف کرنی چاہی مگر یہ درد اور چبھن اس کی آنکھوں اور سر میں تمام نہیں تھی۔

بلانڈ بال والے کے قریب بیٹھی چند ماہ کے بچے کی ماں نے اسے نرمی سے مشورہ دیا۔ "صبر رکھیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا۔" آکسیجن کے چھوٹنے کی سسکاری اس کے ماسک سے سنی جا سکتی تھی۔ وہ تردیدی تاکید طیارے کے مسلسل گھٹتے آکسیجن لیولز کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

اچانک پائلٹ کی آواز نے دوبارہ جنم لیا۔ انٹر کام زندہ ہوا۔ "میں، رابح آدم، آپ سب سے گزارش کرتا ہوں کہ اپنے آکسیجن ماسک لگائے رکھیں۔ یہ آپ سب کی حفاظت کے لیے اہم ترین ہے۔"

اس کی حکم کو یقینی بناتے فلائٹ اٹینڈنٹ دہرانے لگی۔ "پلیز ایوری ون، اپنے ماسک پہنے رکھیں۔"

مسافرین نے منہ پر چڑھے ماسک اتارنے کا ہر خیال ترک کر دیا۔ ویسے بھی کوئی یہ کیوں کرتا؟ اپنی زندگی تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔

ظبیہ نے گود میں رکھیں اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا۔ آج وہ مرد، اس کے کہے گئے الفاظ سب اتنا قریب ہو کر بھی کوسوں، میلوں، دھائیوں دور لگتے تھے۔ وہ سات سال قبل بھی اس کی زندگی کی ڈور تھامے تھا، سات سال بعد بھی۔ سات برس قبل بھی اسے تتر بتر ہوئے راہوں کے درمیان چلنا سکھا رہا تھا اور سات سال بعد بھی عرش کے سائے تلے محفوظ رکھے تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ، رابح آدم، آخر تھا کون؟

اس کا محافظ، مخالف، ملزم یا ظالم؟

جینٹنگ ہائی لینڈز کی وادیوں میں بیتی وہ شب ظبیہ فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ یاد اسے ستاتی تھی، اسے ڈستی تھی، کلستی تھی۔ کیونکہ اس رات ان کے درمیان بہت کچھ لکھا گیا تھا، بہت کچھ سنوارا گیا تھا۔

اس رات ظبیہ یمین اور رابح آدم کے درمیان بہت کچھ طے پایا تھا۔

★★★

سات سال قبل

ملائیشیا کے سرسبز مناظر کے درمیان واقع، پہانگ کی ریاست قدرتی عجائبات، بھرپور ورثے اور متحرک ثقافت کی ایک دلکش کائنات کے طور پر ابھرتی ہے۔

ہرے بھرے جنگلات، شاندار پہاڑیوں اور قدیم ساحلوں کے ساتھ، پہانگ دنیا بھر کے ایڈونچر کو اپنے اندر سمو لینے پر مدعو کرتا ہے۔ مشہور تمان نیگارا نیشنل پارک کا گھر اور دنیا کے قدیم ترین بارانی جنگلات میں سے ایک، یہ ریاست ایک بے مثال حیاتیاتی تنوع کی حامل ہے۔

پہانگ کے چاروں اور رات کا پہرا تھا۔ جینٹنگ ہائی لینڈز میں بارش کی ٹھنڈی بوندیں قطرہ قطرہ پوری شام برستی رہی تھیں، اور ان ہی کے بائث پہلے سے خنک موسم اور بھی تر و تازہ ہو گیا تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان واقع دنیا کی اعلیٰ ترین آرام گاہ، فرسٹ ورلڈ ہوٹل، کے دونوں ٹاورز سنہری اور سپید بتیوں میں دور سے جگمگاتے نظر آرہے تھے۔ ہوا میں گھلی گیلی مٹی کے سگھند اور جنگلات میں ٹپکتے پانی کی سرسراتی پکار، ہر چیز رات کے سکوت میں بڑھ چڑھ کر نمایاں ہو رہی تھی۔

گیلی مٹی کے درمیان سفید جاگرز قدم قدم اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ چاپ آہستہ تھی، اور مٹتا ہوا سایہ یہاں سے وہاں ہلتے واضح۔ مدھم سرگوشی اور خاموش تنفس کی آواز۔

غور کرو تو جاگزر کے نشانات کے ساتھ، سڑک پر بھورے ٹمبر لینڈ بھی ٹک ٹک کرتے اپنا راستہ بنا رہے تھے۔ مردانہ وزنی جوتے۔ لیکن چال اس کی بھی سست تھی، پرسکون۔ گہری نیلی ڈینم جینز پر سلائی والا سبز رنگا گول گلے کا کارڈیگن پہنے رانج کا ایک ہاتھ جیب میں تھا اور ایک کان کے ساتھ فون جوڑے تھا۔ اس نے سویٹر کے اوپر بھوری پفر جیکٹ تانی تھی۔ اجلی رنگت ٹھنڈ کے بائث گلابی سی دمک رہی تھی۔

"لگی کال؟" برابر چلتی آواز ظبیہ کی تھی۔ اس نے سلک کا اسکارف چہرے کے گرد آہستگی سے لپیٹا تھا، جس سے کان اور سر ڈھکے ہوئے تھے۔ فر والا کوٹ اور نیچے گلابی رنگ کی درمیانی اونچائی کی کرتی۔

"چچ۔ نو سگنل۔" رابح نے کال کاٹ کر واپس ملائی۔ وہ دونوں دھیمے قدموں سے پہاڑیوں کے درمیان بنی سڑک پر مشابہ چل رہے تھے۔ فرسٹ ورلڈ ہوٹل ان سے زیادہ دور نہیں تھا، البتہ یہاں کچھ خاموشی تھی۔ ان کے آس پاس زیادہ تر لوگ ٹوریسٹ تھے جو تصاویر بناتے اور اپنی زبانوں میں پٹر پٹر کرتے آپس میں لگے تھے۔

کنارے لگی اسٹریٹ لائٹس کی بیش بہا طلائی چمک اسفالٹ کی روڈ پر ٹوٹ کر بکھرے ہوئے تھی۔

"ہاں، آپا۔ کیا حال ہے بھائی کا؟" کال لگی تو اس نے فوراً طبعیت دریافت کی۔ ظبیہ نے سکھ کا سانس لیتے دوپٹہ سیٹ کیا۔ موسم اور تکان کی وجہ سے مرتضیٰ کو شام سے ہی بخار چمٹ گیا تھا، جس کے بائث وہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں ہی روڈ ٹرپ منا رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ پانچوں ساتھ تھے (اداسمیت) لیکن پھر مرتضیٰ نے زبردستی ان کو باہر نکالا، کہ وہ اس کی وجہ سے اپنا سفر خراب نہ کریں۔

"ہوں۔" وہ سنتا گیا، قدم لاشعوری طور پر یہاں وہاں بھٹک رہے تھے۔ وہ کال کے دوران اتنا مشغول ہو جاتا کہ اپنے راستے پر دھیان ہی نہ دے پاتا۔ ظبیہ اس کے آگے پیچھے پھرتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ ہاں، ہاں اوکے۔" اللہ حافظ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی اور فون جیب میں ڈالا۔ ساتھ ہی پھونک مارتے ہتھیلیوں کو گرم کرنا چاہا۔ ظبیہ نے اسے دیکھتے خیریت پوچھی۔

"ٹھیک ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ آپا نے کہا ہے واپسی پر تھرمامیٹر خرید لوں۔ ادا تو سو گئی بیچاری بچی میری۔"

ظبیہ نے سر جھکا کر اس کی اطلاع سنی۔ "واقعی بہت سردی ہے یہاں۔ یقین نہیں ہو رہا یہ بھی ملائیشیا ہے۔" وہ سادگی سے مسکرا کر بولی۔ رابح نے چہرہ جھکا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی بھول گیا تھا کہ یہ جگہ وجود رکھتی ہے۔ پہانگ ابا کو بہت پسند تھا۔ یہ فرسٹ ورلڈ ہوٹل تو پانچ چھ سال پہلے بنا ہے۔ ابا کے دوست رہتے تھے دوسرے علاقے میں۔ ہم وہاں آتے تھے۔"

وہ مسکرادی۔ "فیملی پکنک ٹائپ؟"

"ہاں، ہر سال۔ میری گرمیوں کی چھٹیاں ادھر ہی گزرتی تھیں۔ پھر ابا چلے گئے تو کبھی پروگرام نہیں بنا۔"

سنہری روشنیاں چاروں اور تھیں۔ دور مین سڑک پر لائٹوں والا ایک ٹھیلا گڑیا کے بال بیچ رہا تھا۔ رانج نے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ "کھاؤ گی؟"

وہ جھینپ کر مسکرادی۔ "میں پرس نہیں لائی۔ رہنے دیں۔"

"کردی ناں چھوٹی بات۔" اس نے برا سا منہ بنایا اور قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ "چلو، آ بھی جاؤ۔ میں تو کھاؤں گا ناں۔"

ظبیہ ہنس دی اور اس کے ساتھ چلتے فٹ پاتھ پار کی۔ ٹھیلے کے نزدیک پہنچ کر رانج نے اپنی پچھلی جیب تھپتھپائی اور بٹوا باہر نکالا۔

"یار، دو دے دو۔ زیادہ میٹھے تو نہیں ہیں؟" اس نے لکڑی کی ڈنڈی گھماتے چالیس سالہ انکل کو دیکھتے مشتبہ سی نگاہ ڈالی۔ روئی کے بادل اڑ کر ڈنڈی کے گرد لپیٹتے گئے، ریشم جیسے نرم اور گلاب جیسے دل بہار۔

"بالکل بھی نہیں۔ کھٹے ہیں۔"

انکل نے پہلی کاٹن کینڈی پیچھے کھڑی ظبیہ کو دی۔ رانج ان کے جواب پر حیران سا دیکھے گیا اور وہ محظوظ ہو کر دھیمے سے ہنس دی۔ نرم روئی کو دانتوں سے کترتے اس نے اس کی مٹھاس زبان پر رقص کرتی محسوس کی۔ سبز کارڈیگن میں ملبوس مرد گردن موڑے اسے دیکھنے لگا۔

"گڈ؟" اس کی رائے جاننی چاہی۔ وہ مسکرادی۔ "پرفیکٹ!"

رانج کی کاٹن کینڈی خرید کر وہ دونوں ہوٹل کی سڑک پر واپس آ گئے۔ ہلکے، سست قدم اٹھاتے، وہ آسمان کے سیاہ قالین پر بچھے تاروں سے بے نیاز رہے۔ رانج نے کنارے سے ایک بڑا نوالہ توڑا تو تازہ اور ملائم ریشے اس کے منہ میں گھل سے گئے۔

"مجھے یاد دلا دی جیے گا۔ ہوٹل جا کر پیسے دینے ہیں۔" ظبیہ نے نرم آواز میں اسے متنبہ کیا اور آخری نوالوں میں سے ایک چبایا۔

"تم ہی یاد رکھو ایسی فضول باتیں۔"

"کیا فضول بات؟" اس نے ضدی بچے کی طرح ٹھوڑی اٹھائی۔ "پیسے نہیں لوٹاؤں کیا آپ کو؟"

"نہیں، فوراً لوٹاؤ ورنہ میں سڑک پر آجاؤں گا۔ جتنی جائداد تھی سب بیچ کر تمھیں گڑیا کے بال کھلائے ہیں۔"

وہ پلک جھپکتے اسے تکتی گئی۔ رائج نے منہ جھٹکتے اسے دیکھا۔ "عجیب عورت ہو۔" اس نے ستے ہوئے چہرے سے کہا۔

ظبیہ خفیف سا مسکرا دی۔ "اچھا! ناراض نہ ہوں۔ آپ کو پتا ہے سن ڈے میگزین میں غصہ کنٹرول کرنے کی بڑی اچھی اچھی ٹپس آتی ہیں۔"

رائج لطف اندوز ہوتے ایک ابرو اونچی کی۔ "تمھیں میں غصے والا لگتا ہوں؟"

"میں نے یہ کب کہا؟" اس نے دانت دکھائے۔ "ٹپس آتی ہیں۔ اور بھی کئی چیزیں آتی ہیں۔ بہت کام کا ہوتا ہے۔ آپ نہیں پڑھتے؟"

"تم پڑھ کر سنا دو۔" اس نے ڈنڈی ہونٹوں کے قریب کرتے بڑا سارا حصہ منہ سے کاٹا۔ ظبیہ نے مسکراتے ہوئے باہیں سامنے باندھیں۔ اب رائج آدم اس کی ایکس پرٹیس جاننے لگا تھا!

"کھانوں کی ریسیپی، پزل گیمز، کہانیاں، سوالات، نئے فیشن کی تصاویر، دنیا بھر کی خبریں۔ سن ڈے میگزین بیسٹ ہوتا ہے۔ میں کبھی مس نہیں کرتی۔" اس نے فخریہ انداز میں کمر اکڑائی۔ رائج تھوڑا سا مسکرا دیا۔

وہ بولتی گئی اور رائج کے کان سنتے گئے۔ وہ تو بنے ہی اسے سننے کے لیے تھے۔

"آپ کو پتا ہے، دو ہفتے پہلے ایک ماہر سائیکولوجسٹ نے اپنے آرٹیکل میں لکھا تھا کہ چند پیشوں سے وابستہ مرد اوروں سے زیادہ بے وفا ہوتے ہیں۔"

اپنی کاٹن کینڈی ختم کر کے اس نے ظبیہ سے اس کی خالی ڈنڈی تھامی، ساتھ ہی اس کے کہے پر ابرو اٹھائی۔

"او پلیز تم یہ—"

"جی، ہاں! انھوں نے کہا تھا کہ پائلٹس بے وفائی میں سر فہرست ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ڈاکٹرز، وکلاء، ٹیچرز۔۔۔"

"مطلب تمھارے سائیکولوجسٹ کو ہر کامیاب پیشے سے مسلہ ہے۔"

ظبیہ نے ابرو بھینچے اسے دیکھا، سرسری سی ناراضگی دکھانی چاہی۔ "وہ بہت پہنچے ہوئے تھے!"

"ہاں، بالکل۔ اسی لیے تو سائیکولوجسٹ بن گئے۔" وہ مسکراہٹ دبائے اسے چھیڑ رہا تھا۔ ظبیہ نے سانس لیتے آنکھیں پھیر لیں۔

"سن ڈے میگزین کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔"

اس نے ہاتھ جیب میں ڈالتے فون نکالا۔ "یہ کون ہے مواسن ڈے میگزین کا رائٹر؟ مجھے مل گیا کہیں تو جوڑ جوڑ الگ کر دوں اس کا۔" بٹن دبا کر اسکرین اون کی، لیکن ادھر ہی 'نو سگنل' آنکھوں کے سامنے چمچا رہا تھا۔ ظبیہ سن ڈے میگزین کی تعریف کے پل باندھتے مرمری سفید گاجا گرز سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے تھک کر سانس خارج کی اور فون کے کنارے بنا بٹن بند کیا۔

"بچ گیا سالا ہوم ریکر (homewrecker)۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

تھوڑے وقت کے وقفے کے بعد، وہ دو نفوس جینٹنگ ڈیک کی اونچائی پر کھڑے تھے۔ وہاں سے فرسٹ ورلڈ ہوٹل ان کے عقب میں تھا، جس کے ساتوں رنگ کوسوں تک پھیلی زریں چمک میں لت پت تھے۔

اونچے جھاڑ اور پتے سیاہ و سبز رنگ کا غلاف تانے بارش کی نمی میں دھلے دھلے لگتے تھے، جن کے درمیان اگے پھولوں کی خوشبوئیں سما میں ہر جگہ محسوس کی جاسکتی تھیں۔

ڈیک کے کنارے کھڑے رابح نے ہیزل آنکھیں جھکا کر آس پاس کے منظر کا بغور ملاحظہ کیا۔ مڑی ہوئی پلکیں اور گالوں کی ٹھنڈی سرخی، اس کے لب خشک تھے جنھیں وہ وقتاً فوقتاً دانت سے نوچتا رہتا۔

"آپ کی اگلی فلائٹ کب ہے؟" ظبیہ نے سینے پر ہاتھ باندھے سوال کیا۔

"پتا نہیں، ابھی شیڈیول نہیں دیا۔ لیکن میں دو ہفتے میں تین فلائٹس لے چکا ہوں، تو میں نے ریسٹ کی پلی کی تھی۔ درخواست۔" اس نے فوراً انگریزی لفظ کا ترجمہ کی۔ ظبیہ نے سمجھ کر ٹھوڑی جھکائی۔ آس پاس ہوا نے بے اختیار تیزی پکڑی۔ آئیوری رنگ کا سلک اسکارف اس کے سر سے پیچھے سرکا۔

اس ہی پل بادلوں کے درمیان سے چیرتی گڑگڑاہٹ کی آواز سُنائی دی۔ ان دونوں نے گردنیں پیچھے جھکائیں تو تاریک آسمان میں جگمگاتی بتیاں دیکھی جاسکتی تھیں۔ بادلوں کے گولے یہاں وہاں ہوئے تو ایک جہاز کی شکل نمودار ہوئی۔

"چلیں۔ یہ کون سا ماڈل ہے؟ بتا دیا تو جو کہیں گے میں کروں گی۔" ظبیہ نے مسکراتے ہوئے اسے دعوت دی۔ رابح اس کے اعتماد پر محظوظ ہوتے ہولے سے ہنس دیا۔

"ایسی آفر سے تم خود کو مشکل میں ڈال رہی ہو، لڑکی۔"

"اوں ہوں، باتیں چھوڑیں۔ جلدی بتائیں۔"

رابح نے ایک ڈرامائی سانس کے ساتھ اوپر دیکھا۔ اب کہ جہاز ان سے دور ہو رہا تھا۔ اس کے انجنوں کی گنگناہٹ بھی دھیمی پڑ گئی تھی۔ "اس کے فیوسلیج کا سائز اور ٹوئن ونگز ہمیں بتاتے ہیں، ڈیئر گرل، کہ یہ ایک کمرشل ائیر لائنز ہے۔ ائیر بس A330۔ اور یہ پہانگ کے اوپر سے اڑ رہا ہے، سو چانسز یہ ہیں کہ یہ کوالا مپور سے ٹیک آف کر کے آیا ہے یا لینڈ ہونے والا ہے۔ ائیر لائنز ہے، ظاہراً، ملائیشیا ائیر لائنز۔"

ظبیہ منہ کھولے اسے دیکھے گئی، آنکھوں میں ستائش تھی۔

"بلکہ رکو۔ ابھی میں نے غور کیا ہے اور یہ سو فیصد لینڈ ہونے والا ہے۔ اس کی ڈھلان پر غور کرو، رفتار آہستہ ہے۔" اس نے ایک مطمئن سی سانس خارج کی۔ "یہ ایک سفر کا اختتام ہے۔ او، لکی پائلٹ۔"

پھٹی پھٹی آنکھوں والی لڑکی کی جانب چہرہ موڑتے وہ کمینی سی مسکان کے ساتھ ترچھا ہوا۔ "ہمم، تو ہماری کچھ ڈیل ہوئی تھی؟ مجھے یاد پڑھتا ہے۔"

ظبیہ نے گلا صاف کرتے یہاں وہاں دیکھا۔ "ہاں۔ آپ پہلے پروف کریں کہ آپ نے سب ٹھیک ٹھیک بتایا ہے۔"

رانج کے تاثرات بگڑے، رنگ پھیکا پڑا۔ "میں؟ میں کیسے پروف کروں؟"

"نہیں کر سکتے؟ اوہ، چچ چچ۔ کوئی بات نہیں۔ وہ کیا ہے نا، آپ اپنی طرف کی ڈیل پروف نہیں کر سکتے تو میں کیسے اپنی طرف کی پوری کر دوں۔" اس نے بھی پلکیں جھپکتے مسکراہٹ پیش کی۔

رانج اس کی چالاکی پر دل کھول کر ہنس دیا۔ "شاطر لڑکی۔ اچھا ایک مزے کی چیز بتاتا ہوں تمھیں۔ ہاتھ دو اپنا۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

ظبیہ نے دو پل ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "آپ کو اپنے گھر والوں کے ساتھ مانگنے آنا چاہیے۔"

دایاں ہاتھ ادھ ہوا میں بلند کیے اس کی حرکات کو دو پل قفل لگے، اور پھر وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ گال نیم گلابی پڑے، لیکن اس بار وجہ ٹھنڈ نہیں تھی۔

"ظبیہ، تم۔۔۔" وہ مسکراتا جا رہا تھا۔

"یہ لیں۔ کیا یاد کریں گے۔ میرا ہاتھ۔" اس نے پانچ انگلیاں ہوا میں ہلائیں، خود وہ بھی مسرور سی نظر آتی تھی۔

"اوکے، یہ دیکھو۔" جیب میں رکھے رکھے اس کا ہاتھ گرم ہو چکا تھا، البتہ ظبیہ کی ہتھیلی ٹھنڈی برف جیسی تھی۔ نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے اس نے اس کی شہادت کی انگلی اپنے انگوٹھے کے نچلی طرف سجائی، ایک آڑے نشان کی صورت۔

"اس طرح پائلٹس اونچائی کی پیمائش کرتے ہیں۔ ہم اپنے انگوٹھے کو ریفرنس کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور ہر انگلی کی چوڑائی ہزار فٹ کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہذا اگر میں دس ہزار فٹ پر اڑان بھر رہا ہوں، تو میں اس کی پیمائش ایسے کروں گا۔"

اپنے خالی ہاتھ کی انگلی کی نوک اس کی انگلی کی کنارے سے ٹکرائی اور اس کے ہاتھ پر ایک فرضی لکیر کھینچی۔ ظبیہ کا جسم یکدم شل پڑ گیا، پھر پھر چلتی زبان جھٹ پٹ قید ہوئی۔ ہیزل آنکھیں جھکائے وہ مشغول سا کچھ کہہ رہا تھا، نرم گالوں میں سے ایک پر مخصوص مسکراتا آدھا چاند واضح تھا۔ مگر ظبیہ کہاں سن رہی تھی۔ وہ یک ٹک، سحر میں جکڑی نگاہیں اٹھائے اس کا چہرہ دیکھتی گئی۔ وہاں کی پور پور ناپتی گئی۔ اس کی ناک کی ہڈی، گلابی گالوں کا پھولا پن، چمچپاتی جلد، دائیں کان میں پرویا قیمتی موتی۔ کوئی اسے روکتا، کیونکہ وہ ایک بار پھر اس مرد کے لیے چیخ رہی تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ کوئی بات ختم کر کے رکا تو نظر گھما کر اسے دیکھا۔

"ہزار فٹ؟ ضروری ہے ہزار فٹ ہی ہو؟" ظبیہ نے ہڑبڑاہٹ میں آکر بمشکل گلے سے تھوک اتارتے سوال کیا۔

"ہمم، ضروری ہے۔ دیکھو، ایک اسکیل ذہن میں لاؤ۔ اس میں پانچ پانچ نقتے چھوڑ کر ہندسے موجود ہوتے ہیں، اور ہم حساب بھی اسی طرح لگاتے ہیں۔ ویسے ہی میرے ہاتھ کی ہر انگلی بھی ایک مخصوص چوڑان ناپ رہی ہے۔ سو اگر ہم دس ہزار فٹ پر اڑ رہے ہیں، تو میں نقتہ آغاز سے اوپر کی طرف دس انگلیوں کی چوڑائی کو گنوں گا۔" اس نے دوبارہ اسی لکیر پر انگلی پھیری، آنکھوں میں نرمی تھی۔

"سمپل سی چیز ہے، لیکن ہزاروں فٹ اوپر بہت کام آتی ہے۔" اس بار اس نے نگاہیں اٹھائیں تو رائج اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"چھوٹا سا لینڈ مارک، ہمیں یاد دلانے کے لیے کہ ہمارا مقام کیا ہے اور قیام کیا ہے۔"

وہ سانس روکے اسے دیکھتی رہی۔ چند اضافی لمحات ان کے درمیان ایسے ہی طویل ہوئے، اور پھر رائج نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اس کے پہلو میں چھوڑ دیا۔

"واپس چلتے ہیں۔ ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔" جیکٹ کو سختی سے کھینچتے اس نے کہا تو ظبیہ نے بھی ہامی بھر لی۔ واپسی کا سفر ساکت مگر خوش آنند تھا، لیکن جینٹنگ ہائی لینڈز کی ہوا میں ایک عجیب سی دلگیری جنم لے چکی تھی۔

شاید ان پاک وادیوں کو علم تھا کہ جوانی کے ان انمول وعدوں میں سے کتنے اصل ہو پائیں گے، اور کتنے وقت کی مار مر جائیں گے۔ ان کے بس میں ہوتا تو جینٹنگ ہائی لینڈز انھیں روک لیتے، لیکن پھر ذہن کے پردے پر ایک خیال نمودار ہوتا۔

انسان روکنے پر آخر کب رکے ہیں؟

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

★★★

حال

جگہ: پسنجر کیبن MH370

AM02:27

اکائرز مورا کی بس ہو گئی تھی۔

اس نے اچھنبے سے سیٹ میں آگے پیچھے ہوتے اپنے اندر دوڑتی بے آرامی اور تنگی کی لہر کو مٹانا چاہا۔ آکسیجن ماسک اور قنولہ کے باوجود اسے سانس اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔ راہداریوں کے بیچ چلتی فلائٹ اٹینڈنٹس

بھی گردن اور پیشانی سے ٹھنڈے پسینے صاف کرتیں متذبذب سی دکھائی دے رہی تھیں۔ بارہ منٹ قبل کچھ بہت غلط انجام پا چکا تھا۔ بہت نحس، بہت عیب دار۔

"بس، بہت ہوا۔ میں اور ایسے نہیں بیٹھ سکتا۔" اپنی سیٹ کی بیلٹ کھولتے اکائر نے ہڑبڑاہٹ میں کہا۔ ظبیہ نے بند آنکھیں مچک کر اسے دیکھا، ابرو آپس میں تنگ ہوئیں۔

"کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" وہ تیزی سے آگے جھکی۔

"میں نہیں، تم بھی ساتھ چلو۔" اس کے تنفس پھول رہے تھے، آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ ضبط سے، چبھن سے۔ کپکپاتی انگلیوں نے لاک کھولا۔

"کہاں جائیں گے؟ دماغ ٹھیک ہے۔ ہم پلین میں ہیں۔ ہوا میں۔" اس نے ساتھ بیٹھے مرد کی آنکھوں سے خمار کا چشمہ ہٹانا چاہا، البتہ اسے خود بھی دور کہیں اپنا حلق کڑوا ہوتا محسوس ہو رہا تھا، گلے کی نالی سوکھی تھی۔

"آئی ڈونٹ کیئر ہم پلین میں ہیں یا کروز شپ میں۔ مجھے سانس نہیں آ رہی، ظبیہ! یہ نارمل نہیں ہے۔ کچھ غلط ہو رہا ہے اس پلین میں۔" وہ پہلی بار طیش میں غرایا۔ آس پاس سب اپنے حواسوں میں اتنے کمزور اور مبہم سے بیٹھے تھے کہ کسی نے زیادہ توجہ نہ دی، البتہ سیاہ عبائے والی ضرور باز گشت ہوئی تھی۔

"اور لوگ بھی تو صبر کر رہے ہیں ناں۔" اس نے پرسکون مگر سادہ لہجے کا انتخاب کیا۔ اکائر نے آنکھیں گھمائیں۔

"اور ویسے بھی کیپٹن نے—"

"اوہ، تمھارا ایکس منگیتر؟ کیا کہا تھا اس نے؟ طیارہ چڑھان پر ہے، صبر رکھیں، واٹ ایور۔ مجھے کوئی یہ بتا دے کہ دس منٹ سے طیارہ چڑھان پر ہی ہے؟ اور اب تک آکسیجن بحال کیوں نہیں ہوئی؟ ماہر پائلٹ سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا جا کر۔"

ظبیہ نے ناپسندیدگی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "تم اسے پلین اڑانا نہیں سکھا سکتے، اکائر۔" آکسیجن ماسک کے پار اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اکائر نے دبے دبے غصے میں زبان لبوں پر پھیری، پھر ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "تمھیں اس پر اتنا یقین ہے۔ آخر کیوں؟ کیونکہ وہ تمھارا منگیتر رہا ہے؟ پڑوسی رہا ہے؟ تمھارا اس کا محبت اور عقیدت اور بھروسے اور دلاسے کا رشتہ تھا؟ تم بھول گئی وہ جھوٹا ہے، بدتمیز ہے؟ اس نے تمھیں ایئرپورٹ پر ذلیل کیا۔ وہ تمھیں ذلیل کرنے کے لیے ہر حد تک جا سکتا ہے۔ تم اس پر کیوں بھروسہ کر رہی ہو، ظبیہ؟" سرمئی آنکھوں میں سوائے تکلیف اور کرب کے کچھ نہ تھا۔

ظبیہ نے دو پل کے لیے نگاہیں اس پر جمائی رکھیں، پھر گردن جھکالی اور سر آہستگی سے نفی میں جھٹکا۔

"میں اس پر بھروسہ کرتی ہوں کیونکہ وہ اس پلین کا پائلٹ ہے۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔ "صرف اور صرف اس لیے۔"

اور وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر اس کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھا اور پھر اپنی بیلٹ پرے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ ظبیہ نے اسے نہیں روکا، صرف راہ بناتے اپنے پیر پیچھے کر لیے۔ جانے والوں کو کون روک سکتا ہے؟

عائشہ عبدالکریم اکائر کو راہداری تک آتے دیکھی یکبارگی اس کے قریب پہنچی، البتہ راستے میں تھوڑا سا ڈگمگائی تھی۔ آکسیجن کی کمی مضبوط تر کو بھی نہیں بخشتی۔ "جی، سر؟"

"اپنے کیپٹن سے میری بات کروائیں۔" اس نے سپاٹ نظروں سے اس کی شکل پڑھی۔ عائشہ نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ یقیناً وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ اکائر نے پرسکون انداز میں بات کاٹی۔

"منع کرنے کا سوچیے گا بھی مت۔ میرے پیچھے موجود دو سو لوگ اس وقت گواہی دے سکتے ہیں کہ ہم سب سانس کی کمی سے مر رہے ہیں۔ آپ کے پائلٹ اس مبہم سے اعلان کے بعد ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔"

رک کر سانس لی، جو کہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ ”میں جاننا چاہتا ہوں یہ چل کیا رہا ہے۔ کیا پلین مشکل میں ہے؟ اور ہے تو ہمیں جاننے کا پورا رائٹ ہے۔ اس لیے میری بات کروائیں۔“

”سر، ہم ایسے کیپٹن کو نہیں بول سکتے...“ عائشہ پریشان سی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، جب دور کھڑی لورا بھی ماجرے کی باریک بینی ناپ کر آگے بڑھی۔ عائشہ کا بازو چھوتے، اس نے سوالیہ ابرو اوپر کی۔ عائشہ نے اضطراب میں سر نفی میں ہلایا۔

”مجھ سے شیئر کیجیے۔ کیا معاملہ ہے؟“ ماسک کے پار سیاہ آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔

”معاملہ کچھ یوں ہے کہ میں ایک دمے کا مریض ہوں اور آپ کی ایئر لائنز اس وقت مجھے بالکل بہتر محسوس نہیں کروا رہی ہے۔ پچھلے دس منٹ سے دو لوگ نیم بیہوش سے بیٹھے ہیں، اور باقی سب مستقل جمائیاں لیتے دکھائی دے رہے ہیں۔“ اس نے ایک نگاہ عائشہ پر ڈالی۔ ”مجھے پتا ہے آپ کی طبعیت بھی عجیب ہے۔ مجھ تک آتے آپ کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔“

عائشہ نے شرمندگی سے یہاں وہاں دیکھا۔

”تو ایک ایسے مسافر کی حیثیت سے فی الوقت میری ایک یہی خواہش ہے کہ۔۔۔“ گہری سانس اندر لی، پھر باہر چھوڑی۔

“Let me talk to your captain”.

”آپ کیا بات کریں گے کیپٹن سے؟“ لورا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ قریب بیٹھی ظبیہ بے چین مگر خاموش سی اکائر کی پشت کو دیکھتی رہی۔

”میں ان سے پوچھوں گا کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا بتاؤں گا کہ یہاں لوگ مرنے والے ہیں۔“ پھر بددلی سے مسکرایا۔ ”شاید ان پر کوئی اثر پڑے۔“

عائشہ نے لب کاٹتے لورا کو دیکھا جو گہری سوچ میں گم نظر آ رہی تھی۔ چند ثانیے بعد اس نے ٹھوڑی اٹھائی اور ایک مضبوط نگاہ سے اکائر کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آئیں۔"

اس نے کندھے کے اوپر سے ایک آخری نظر ظبیہ پر ڈالی جو ساکت تاثرات سے اسے دیکھے گئی، پھر اس نے رخ موڑ لیا اور لورا کے پیچھے چل دیا۔

★★★

گیلری ایریا تک جاتے مسافرین کی سرگوشیاں ماند سی پڑ گئی تھیں۔ وہ سر جھکائے سیاہ لیدر جیکٹ میں ملبوس سست قدموں سے چلتا رہا۔ اسے لگا اس کے نیچے زمین اوپر نیچے ہو رہی تھی، لیکن وہ صرف وہم تھا۔ وہم ہی تھا ناں؟

اس مقام پر وہ دونوں مسافرین کی سماعت اور بصارت سے دور تھے۔ ایک ویران کونے کے قریب رک کر لورا نے اطمینان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "مجھے ایک سیکنڈ دیں۔" اس نے کہتے اپنے کان سے جڑے ہیڈ سیٹ میں لاگ ان کیا۔ رابطہ کاکپٹ سے کنکٹ ہوا۔

"ایک پسنجر آپ سے بلا توقف بات کرنا چاہتے ہیں، کیپٹن۔ ان کے کچھ شبہات ہیں۔" اس نے اطلاع دی اور دوسری طرف کا جواب سننے خاموش ہوئی۔ اکائر ہونٹوں کا کنارا کترتے اسے دیکھتا رہا۔

لورا نے کچھ سن کر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ "مسٹر اکائرز مورا۔" شاید رائج نے نام پوچھا تھا۔ لیدر جیکٹ والا مرد جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اسے تکتا گیا۔

وہ ہیڈ سیٹ میں ہامی بھرتے سیدھی ہوئی اور اپنے یونیفارم کی جیب سے ایک کالی چھوٹی ڈیوائس برآمد کی۔ اکائر کے سامنے اپنے کھلی ہتھیلی پیش کرتے اس نے بتایا۔ "کیپٹن تیار ہیں۔ اسے استعمال کریں۔"

اکائر نے لمبی انگلیوں سے ڈیوائس تھامی اور اٹینڈنٹ کو دیکھا۔ لورا نے اس پر واقع بٹن کی جانب اشارہ کیا۔

"جب آپ تیار ہوں تو اسے دبا دیجیے گا۔"

"تھینک یو۔" اس نے کہتے بٹن دبایا اور ڈیوائس منہ کے قریب کی۔

"اکائر اسپیکنگ۔"

رائج کا جواب سننے اس نے چھوٹا ڈبا کان سے لگایا۔ لورا اسے دیکھتی گئی۔

"اپنے سامنے کھڑی ہوسٹس کو فارغ کرو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" سنجیدہ، بے اثر الفاظ۔ اکائر نے ایک پل گڑبڑا کر لورا کو دیکھا تو کیپٹن کی آواز دوبارہ گونجی۔

"ایکٹ نیچرل۔"

اس کے دل نے دھڑکنیں بلند کیں، مگر اس نے توجہ نہ دی۔ آلے کو کان سے ہٹاتے اس نے نرمی سے سامنے کھڑی اٹینڈنٹ کو دیکھا اور خفیف سا مسکرایا۔

"تھینک یو۔ میں بات کر کے آپ کو بلا لوں گا۔" اور وہ سر کو خم دیتے وہاں سے چل دی۔ راہداری خالی پا کر اس نے چھوٹا سیاہ ڈبے جیسا فون واپس کان سے جوڑا، اس بار چہرے پر واضح ناگواری تھی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو، کیپٹن؟" وہ دبی دبی جھنجھلاہٹ میں غرایا۔

"پہلے بتاؤ، لورا گئی؟"

اکائر نے ناک سے سانس اندر کھینچی۔ پھیپھڑے چھلنی چھلنی ہوئے۔ "ہاں۔"

"گڈ۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو، رائج؟ تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟ لوگوں کو سانس نہیں آ رہی ہے!" اس نے سرگوشی میں ہی اسے جھاڑا۔

"میں نے کیا کیا؟" سامنے والا الٹا حیران ہوا، لیکن اس کے انداز کا تمسخر عیاں تھا۔

"رائج آدم۔" اکائر نے ضبط سے پکارا۔

"اکائر زمورا۔" رک کر ایک محظوظ سی سانس لی۔ "میں صرف وہی کر رہا ہوں جو ہماری ڈیل ہوئی تھی۔ تم سے وفا کر رہا ہوں، تمھاری مدد کر رہا ہوں۔"

"بکواس مت کرو میرے ساتھ۔ ہماری ایسی کوئی ڈیل نہیں ہوئی تھی۔" وہ دانت پیستے بولا۔ "تم نے کیا کیا ہے آکسیجن کے ساتھ؟"

دوسری طرف رائج مردہ سا مسکرایا۔ "یار، تمھاری کال کا انتظار کرتے کرتے کاکپٹ میں اتنا بور ہو گیا تھا کہ دو چار سوئچز چھیڑ دیے۔ اب ٹھیک نہیں ہو رہے۔"

اس کے چہرے سے سارا رنگ پانی کی مانند نچوڑ گیا، جسم سے جیسے روح آزاد ہوئی۔ خشک لب زبان سے نم کیے۔ "رائج، فوراً اسی وقت سب ٹھیک کرو۔ دو لوگ بے ہوش ہو چکے ہیں، باقی اس قدر بدحواس ہیں کہ اپنے اٹھنے بیٹھنے کا اندازہ نہیں۔"

"اچھا، اور تم؟ تمھیں بھی تو asthma ہے۔"

"میری اتنی فکر ہوتی تو یہ گھٹیا، پنچ حرکت انجام نہ دیتے تم۔ اسی وقت سب ٹھیک کرو، رائج۔ ہمارا پلان پورا ہو چکا ہے۔ مجھے اپنا انتقام مل گیا، تمھیں تمھارا۔" اس نے گھبرائی ہوئی نگاہ آس پاس دوڑائی۔ مسافرین اور لورا اب بھی دور تھے۔

لائن کی دوسری جانب سناٹا تھا، اور پھر آہستگی سے ایک خاموش ہنسی گونج اٹھی۔ اکائر کے ابرو عتاب میں بھینچے۔

"اور یہیں پر تم مار کھا گئے، مسٹر کنسلٹنٹ۔" دوسری طرف دھیمی کھڑ پڑ ہوئی۔ رائج کی آواز ساخت تھی، ٹھوس۔

"میرا انتقام تو اب شروع ہوا ہے۔"

اکائر کا دل بے قابو تھا۔ اس نے پسینے میں بھیگی ہتھیلیوں سے ڈیوائس دوسرے ہاتھ میں منتقل کی، زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "اسٹاپ اٹ، رائج۔ ہمارا پلان-"

"کیا ہمارا پلان، ہمارا پلان لگا رکھا ہے؟" وہ یکدم جیسے چڑ گیا۔ "ایک تو اتنی دیر بعد کال کر رہے ہو اور ایک منٹ، تم میں یہ فلاحی کیڑا کب جاگا؟"

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ تم کیا کرنے والے ہو، رائج؟" اس نے پیشانی مسلتے خوف سے پوچھا۔

"تم نے کتنی دیر پہلے ماسک پہنا تھا، اکائر؟"

اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ "تم کیا کرنے والے ہو، کیپٹن؟" دوبارہ زور دیا۔

اس بار رائج مسکرا دیا۔

"تم نے سنا ہو گا، رائج آدم کو زندگیاں تباہ کرنے میں مہارت حاصل ہے۔" ٹوٹتی جڑتی خاموش آواز۔ اکائر کی جلد کا بال بال رینگ گیا۔ اس نے بے اختیار ساتھ بنی دیوار کو جکڑا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا، صرف وقت کاٹوں گا۔ میرا انعام میری رہائی ہو گی۔"

"رائج..." اس کو اپنی آواز بھرائی ہوئی سنائی دی۔ "تم کچھ بھی مجھے بتائے بغیر نہیں کر سکتے۔ میں تمھارا پارٹنر ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ایک پل کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اکائر کو امید ابھرتی نظر آئی۔

"تم مجھ پر کیس کر دینا، لڑکے۔ دغا میں دغا دینے والا کمبخت پائلٹ رائج آدم۔"

"میں تمھیں جان سے مار دوں گا، رائج۔" وہ بمشکل دانت مسلتے خود کو چیخنے سے روک رہا تھا۔

"برائے کرم، خیالی تعبیرات کو فیکٹ بنا کر نہ پیش کریں۔ سامعین گمراہ ہوں گے۔" وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ اکائر نے لرزتی سانس اندر اتاری، آنکھیں سرخ پڑ چکی تھیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"اور ویسے بھی۔۔۔" وہ سیٹ میں آگے جھکا۔ بادلوں کے سائے چھپی سیاہی ہیزل آنکھوں سے ہوتی اس کی روح میں قید ہو چکی تھی۔

"کیا تم ہمارا نقطہِ آغاز بھول چکے ہو؟"

اور یہیں پر اکائرز مورا کی بچی کچی سانسیں بھی اٹک سی گئیں۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا؟

★★★

حال سے سات ماہ قبل

۱۵ اگست، ۲۰۱۳

ملائیشیا ائیر لائنز کے کانفرنس روم میں شاہانہ کوٹ سوٹ میں ملبوس مرد حضرات گول میز کے چاروں اطراف نشست تھے۔

چھت پر نصب زرد و سپید بتیاں صبح سویر کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ چکنے ٹائلز اور سرسراتے چمڑے کے کشن والی کرسیاں۔ ہاتھوں میں کاغذات کے پلندے اور لیپ ٹاپ اٹھائے ایوی ایشن کے پیشے سے وابستہ عہدے دار یک بعد دیگرے چوکھٹ پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہاں بیٹھنے والا پر فرد اپنی زندگی سے کچھ نہ کچھ جیت کر آیا تھا، اور کوئی تھا جو بہت کچھ ہار کر وہاں بیٹھا تھا۔

بھوری سپید، ریتیلی رنگ کے ٹو پیس سوٹ میں تیار رائج آدم نے اپنی نشست سنبھالی۔ شکل اور رویے دونوں ہی سے حد تک پیشہ ور، بتیس سالہ پائلٹ ائیر لائنز کی بہتری کے لیے رکھی گئی کانفرنس اٹینڈ کرنے وہاں موجود تھا۔ بھورے بال مخصوص انداز میں پیچھے جمے تھے۔ اطراف میں ہلکے اور درمیان سے چھوٹے۔

سب کے براجمان ہوتے ہی سربراہی مرد اپنی سیٹ سے بلند ہوئے۔ ساری گردنیں سانجھی طور پر ان کی جانب راغب ہوئیں۔

"سلام، جنٹلمین۔" ریشمی سرخ رنگی ٹائی کی گانٹھ پچاس سالہ سی ای او کی گردن کس رہی تھی۔ ان کے بال سیاہ سفید تھے اور ڈھال دبلی پتلی۔ منیب احکام کے بعد پانچ سال سے ملائیشیا ائرلائنز کی لگام انھوں نے ہی سنبھالے تھے۔ منسوخ ہوئی کسی بھی ادارے یا تنظیم کو اس کی رد کردہ عزت و اعتماد واپس دلانا ہمیشہ ہی ایک دشوار تر عمل ہوتا ہے، لیکن عزیز الدین نے کافی حد تک اپنی پوزیشن سے انصاف کیا تھا۔ بس اگر وہ اپنی زبان کی سستی کم کر دیتے تو رائج کو بار بار کان کھجانے کی نوبت نہیں پڑے گی۔

یہ ان دنوں کی بعد تھی جب ایم ایچ تھری سیون زیرو کا منصوبہ اس کے ذہن میں کافی حد تک پختہ ہو چکا تھا۔

MH370 – The flight that disappears.

چار سال لگے تھے اسے اس مقام تک پہنچنے کے لیے جب اسے اپنا منصوبہ قابلِ قبول لگنے لگا تھا۔ اس نے اس پلان کی پیچیدگیاں کھوج لی تھیں، ساتھ ہی ناقابلِ تردید جھول بھی۔ آہ، وہ جھول۔ آج کل وہی اس کی نیندیں اڑائے ہوئے تھے۔ وہ کیا کرے گا اگر سب گڑبڑ ہو گیا؟ اگر اس کے جہاز کو تکمیل تک پہنچانے سے قبل کسی نے اس کا منصوبہ بھانپ لیا، کیا کرے گا اگر اتار ٹیز نے اسے پکڑ کر دھر لیا؟ اسے تو سیدھا عمر قید ہو گی۔ سابقہ جرائم کا انبار بھی کمپنی اس پر تھوپ دے گی۔ اپنے ملک، پیشے اور لوگوں سے غداری کی سزا کیا ہو گی؟

لیکن کوئی نیزہ تھا جو اس کی رواں سوچ کو ہر بار ادھر ہی روک دیتا۔

وہی سزا جو پانچ سال پہلے تھی۔ وہ سزا جو اس نے معصوم ہو کر بھی ہونٹ سیے کاٹی تھی۔ اس کے اپنی لہو کی سرخی پر قاتل کی مہر لگ گئی تھی، اپنے خسارے کے آنسوؤں پر بھیس بدلنے کے نعرے اٹھے تھے، اس کے اپنوں کی جدائی اذیت ناک تھی، لیکن بقیہ دنیا سے محروم ہونے کا غم اسے توڑ گیا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج نے اس گھڑی کے بعد اپنے دل کے گرد کثیف سلاخیں استادہ کر دی تھیں، لیکن ان ناروشن دیواروں کے پار تھا تو اس کا قلب اب بھی مجروح۔ کسی نے یہ کیوں نہیں سوچا؟ دیواریں کھڑی ہو جائیں تو زخم پُر نہیں ہوتا، صرف زخم پُر ہونے کی امید ماند پڑ جاتی ہے۔

"کیپٹن، آپ بہت بورڈ نظر آ رہے ہیں۔" کوئی اسے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اونچا کیا۔ کمرے میں موجود بیس آنکھوں کی جوڑیاں اس پر تھیں۔ ایک جزبات سے عاری سانس اس نے باہر چھوڑی۔

"آپ کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟" سیفٹی آفیسر سوال کر رہا تھا، آنکھوں میں چبھن تھی۔ یہاں اس کے ہاتھ گھس گئے تھے میٹنگ کے منٹس لکھ کر اور یہ بھائی صاحب بیس منٹ سے خلا میں تک رہے تھے۔

"ہمارے طریقے کار یا پروٹوکول کے حوالے سے؟ بطور پائلٹ؟"

"کیوں نہیں؟" اس نے ٹانگیں زمین پر رکھیں اور سیٹ میں سیدھا ہوا۔ کمرہ اسے سننے کے لیے بے تاب تھا۔ سامعین نے غیر مطمئنہ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

"ہمارے محافظت ناکافی ہیں، تربیتی پروگراموں میں گہرائی کی کمی ہے، اور مواصلاتی پروٹوکول کو بہتری کی اشد ضرورت ہے۔" وہ ایک سانس میں بول گیا۔ "اگر ہم ایک سرکردہ ایئرلائن کے طور پر اپنی ساکھ برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں 'کام' کرنا ہو گا۔"

اچانک کمرے میں ہوا تنگ سی ہو گئی تھی۔ چنگاری لگا کر وہ پرسکون بیٹھا تھا۔ کسی نے اپنا گلا کنکارا اور پھر جواب دینے کی ہمت جوڑی۔

"آپ کا فیڈ بیک ہمارے لیے مفید ہے، مگر ہمارے روائیدا انڈسٹری کے معیار کے مطابق ہیں۔"

رانج تھوڑا سا مسکرایا۔ "معذرت کرتا ہوں سر، مگر مجھ سے میری رائے پوچھی گئی تھی، نہ کہ انڈسٹری اسٹینڈرڈ کاری کیپ (recap)۔"

بے آرامی بڑھ گئی تھی۔ عزیز الدین نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ ہمیں سیفٹی پروٹوکول میں کوئی ایک جھول بتائیں، مسٹر آدم۔''

اس نے ابرو اٹھائی۔ ''ایک؟ ارے، ایسے تو باقی بر امان جائیں گے۔''

واقعی، یہ آدمی کیا کھا کر آیا تھا؟ وہ لوگ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگے، لیکن میز کی دوسری طرف بیٹھا ایک شناسا چہرہ ٹھوڑی جھکا کر ہلکا سا مسکرا دیا۔ اس کی آسمانی رنگ کی ڈھیلی ڈریس شرٹ کی آستینیں نفاست سے اوپر لپٹی تھیں، ساتھ ہی سفید پینٹس۔ گہرے سیاہ بال تھوڑے بکھرے ہوئے اور چہرے کی شیو سیاہ۔ سرمئی آنکھوں والا مرد ملائیشیا ایئر لائنز کے متبادل بزنس کنسلٹنٹ کی طور پر اپنا دوسرا ہفتہ مکمل کر رہا تھا۔

لیپ ٹاپ پر انگلیاں روکے اب اکائرز مورا صرف دور بیٹھے کیپٹن کو سن رہا تھا۔

''ہمارے محافظت بری طرح ناکافی ہیں۔ ہم وقت اور پیسہ بچانے کے لیے طیارے کی سالمیت سے سمجھوتہ کرتے ہیں اور ہزاروں جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔'' رابح کو کسی پرچے یا لقمے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے حرف حرف پر یقین تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

''دوسری بات، ہمارے ٹریننگ پروگرامز میں سخت گیری کی کمی ہے۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟ پائلٹس کو ڈنڈے لگائیں ہم اب؟'' میز کی دوسری طرف سے چڑچڑاہٹ بھری پکار بلند ہوئی۔ اکائر نے اپنے ساتھ بیٹھے مرد کو دیکھا، پھر رابح کو جو اسے جانب گردن موڑے تھا۔

''ڈنڈے لگانا ذرا زیادہ نہیں ہو جائے گا؟'' وہ مسکراتے ہوئے چہکا۔ اکائر نے چہرہ لیپ ٹاپ اسکرین کے پیچھے چھپایا۔ تین انگلیوں سے ناک مسلتے اپنی ہنسی ضبط کی۔

کچھ افسردہ سوچو، جلدی۔ اس نے خود کو ڈانٹا۔

آہ میری تنخواہ۔ وہ تنخواہ جو ایک کمپنی کا خبیث ایکزیکیٹیو اب تک روکے تھا۔ اس کے حق کی کمائی۔ جلد ہی اس کی مسکراہٹ بے کس سے تاثر میں تبدیل ہو گئی۔

"مسٹر رانج، یہاں محفل نہیں لگی۔" عزیز الدین نے اسے کرختگی سے ڈانٹا۔

"سوری، سر۔ میں تو بس آپ کے لیول پر آ رہا تھا تاکہ اپنا پوائنٹ سمجھا سکوں۔" معصومیت سے آنکھیں گول کیں۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پائلٹس غیر مستعد ہیں؟"

اس بار اس نے سنجیدگی سے سر نفی میں ہلایا۔ "میں صرف ہمارے ٹریننگ پروگرامز کی مناسبت پر سوال اٹھا رہا ہوں۔"

"آپ کو کیوں لگتا ہے ٹریننگ پروگرامز کافی نہیں؟ کیا آپ نے پائلٹس کو مشکل میں دیکھا ہے؟" اس بار وہ خاموش نہیں رہ سکا۔ ویسے بھی اکائرز مورا کو خاموشی کب بھاتی تھی؟

ہیزل آنکھوں نے دائیں طرف سے اس کی آواز پر رخ پھیرا۔ ان کی نگاہیں ملیں، اور رانج کے ماتھے پر دو شکنیں ابھریں۔ انجان شکلیں اسے اضطراب میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ کچھ سوچ کر اس نے تعرف نہیں مانگا، نہ ہی اکائر نے دیا۔ اسے تو کمینی سے خوشی مل رہی تھی اس کی پریشانی پر۔

"میری رائے صرف ٹریننگ کے بارے میں نہیں ہے۔" اس کے الفاظ اپنے وزن تلے ٹھوس تھے۔

"پلین اڑانے کا مطلب ہے اسپلٹ سیکنڈ میں فیصلے کرنا۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر کمرے کو تکا پھر واپس اکائر کو۔

"ایک لمحہ، صرف ایک لمحہ کہانی بدل دیتا ہے، جناب۔ ایک لمحہ آپ کی تقدیر پھیر دیتا ہے۔"

تقدیر تو پھرے گی، کہانی بھی بدلے گی۔ لیکن اس لمحے کنسلٹنٹ نہیں جان سکا۔ فی الحال اگلے سال کی آٹھ مارچ اور اس کے درمیان وقت کا قفس حائل تھا، اور اسے توڑنا ناممکن تھا۔

"میں نے کئی واقعات دیکھے ہیں جہاں پائلٹس نے فیصلے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا یا کوئی مائینر غلطی کی، اس لیے نہیں کیونکہ ان میں مہارت کی کمی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ حقیقی پرواز کے لیے تیار نہیں کیے گئے تھے۔"

"بالکل ویسے ہی جیسے آپ تیار نہیں تھے ایک ماہ قبل، کوالالمپور انٹرنیشنل سے جان ایف کنیڈی انٹرنیشنل تک کی فلائٹ میں؟ میں نے سنا کافی دقت ہوئی تھی آپ کو۔" اکائر نے مسکراہٹ دباتے محظوظ انداز میں دریافت کیا۔ رانج ایک لمحے مکمل سن پڑ گیا، سارا خون ایک دم پتلا ہوا۔

وہ آدمی اس کے سامنے اپنی ریسرچ کر کے بیٹھا تھا اور رانج اس کا نام تک نہیں پتا تھا۔ پچھلی ماہ کی فلائٹ جو نیویارک کے لیے طے شدہ تھی، رانج ریڈار سے چھپ کر فلائٹ کے انحرافی راستے کھوج رہا تھا۔ وہ تین سالوں میں وہ عمل اتنی مرتبہ دہرا چکا تھا، کہ اس کے لیے معمول بن گیا تھا۔ البتہ مسلہ تب اٹھا تھا جب وہ واپس روٹ پر آیا اور ایئر اسپیس ضرورت سے زیادہ تنگ تھا۔ اس دن اسے لینڈنگ میں مشکل ہوئی تھی، اور اپنی بے وقوفی پر ناز بھی۔

کس نے کہا تھا ملک کے مصروف ترین ایئر اسپیس میں تیس مار خان بننے کو؟

"میرے ساتھ جو ہوا وہ میرا ذاتی امتحان تھا۔ نیویارک کا ایئر اسپیس دنیا کے مصروف ترین فضاؤں میں سے ہے، خاص کر کہ شام اور رات کے اوقات میں۔ اس دن ٹربیولنس کے امکانات بھی تھے۔" پھر ٹھہر کر کمرے کو دیکھا۔ "اور مجھ واحد کے کسی تجربہ کی بنا پر میں اپنے پوائنٹ سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

اکائر تھوڑا سا مسکرا دیا۔ "برائے کرم، برا نہ مانیں، کیپٹن صاحب۔ میں تو صرف یہاں devil's advocate بننے بیٹھا ہوں۔" اس نے میز پر رکھا اپنا ہاتھ دفاعی انداز میں اٹھایا۔

"No hard intentions".

رانج ایک پل کے لیے رکا، اور پھر سر کو ہلکا سا جھکا کر اس کی وضاحت قبول کی۔

میٹنگ کے بعد، وہ اپنا لیپ ٹاپ بیگ اٹھائے آگے چلنے لگا تو جوتوں کے نیچے اپنا تسمہ کھلتے محسوس ہوا۔ وہ گھٹنے کے بل جھک کر گانٹھ لگانے لگا۔

"آپ تو توصیف میں نیچے تک جھک گئے۔ ہاتھ ملا لیتے تو بھی ہم برا نہیں مانتے۔" اکائر ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رانج نے ایک نگاہ اوپر اٹھا کر اسے دیکھا اور گانٹھ باندھنے میں مشغول رہا۔

"توصیف اور تحسین گھٹنوں پر بٹھا کر ہی لی جاتی ہے کیا؟" گراں کس کر وہ سیدھا ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "شانہ بشانہ آگے بڑھنا کسی کو پسند نہیں؟"

"مجھے تو بہت پسند ہے مگر آپ میرے شانوں سے ذرا نیچے ہیں۔" اپنے کندھے سے اس کے کندھے تک کا فاصلہ ناپا۔ رانج واضح طور پر اس سے قد میں تھوڑا چھوٹا تھا۔ وہ اس بار پوری طرح ہنس دیا۔ حیرانگی کی بات تھی، کیونکہ تین سالوں میں پہلی بار اس حرکت پر اس کا جبڑا نہیں دکھا تھا، نہ ہی ہونٹ سوکھے تھے۔

"پھڈے کے لیے ہاتھ میں نے بڑھایا تھا، جان پہچان کا ہاتھ تم بڑھاؤ۔" اکائر مطمئن سا مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ جیبوں میں تھے۔

رانج نے آس پاس دیکھا۔ بریفنگ روم اب کہ کافی حد تک خالی تھا۔ اس کا چہرہ پہلے جیسا خوش باش نہیں تھا، مگر ایک نرمی تھی جو لمبے عرصے سے کسی نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔

"رانج آدم۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔" چاندی کا چھلا پہنا مضبوط ہاتھ۔

"اکائر زمورا۔ لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔"

لمبی، شفاف انگلیوں والا پر اعتماد ہاتھ۔ مصافحہ ہوا اور پھر وہ دونوں ساتھ چلنے لگے۔

"مجھے مسٹریس (mysteries) حل کرنے کا شوق نہیں ہے، مسٹر زمورا۔" ٹمبر لینڈ کی ٹک ٹک چکنے فرش پر مسلسل تھی۔ اکائر کے جوتے اس کے برعکس خاموش تھے۔

"ہو سکتا ہے میرے بعد ہو جائے۔" وہ دانت دکھاتے بولا۔ "ویسے، تم اتنا ہی فارمل رہتے ہو سب سے یا مجھ سے ڈر گئے ہو؟"

سیڑھیاں اترتے رانج ایک بار پھر مسکرا دیا۔ "مجھے دوستیاں کرنے کا بھی شوق نہیں۔ بچپن کے شوق تھے سارے۔"

"دوستیاں بچپن کا شوق ہوتی ہیں؟" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا با آسانی اس کے ساتھ چلتا رہا، آنکھوں میں سوچ تھی۔

رانج نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ "دوستیاں، محبت، کامیابیاں، سب زندگی میں ایک دفعہ ملتی ہیں۔ اور جب ملتی ہیں تو آپ کو پتا چل جاتا ہے۔"

"دوستی اور کامیابی کی جمع لیکن محبت صرف واحد؟ اس گرامر کے پیچھے کوئی وجہ؟" اکائر چھیڑنے والے انداز میں پوچھ پڑا۔

سینڈرنگ سوٹ میں ملبوس پائلٹ سیڑھیوں کے اختتام پر ٹھہر گیا۔ گردن اٹھا کر اپنے پیچھے دیکھا۔ اکائر اس سے تین زینے بالاتر تھا، وہیں جم گیا۔

"کہانیاں ایک بار ہوتی ہے، اور جب ہوتی ہے تو روح سے گوشت اور گوشت سے حواس سب گواہی دیتے ہیں۔"

اکائر کو لگا اس کا دل تک کانپا ہے۔ سستی سے ایک اور سیڑھی عبور کی۔ اب فاصلہ صرف دو قدم کا تھا، لیکن ان کے استھان میں تفاوت تھا۔ اونچائی اور پستی کا۔

"اور اگر کسی کو دوسری بار ہوئی ہو تو؟"

رانج نے اندر تک چیر دینے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ حیرت کی بات تھی اسے یہ سوالات برے نہیں لگ رہے تھے۔

"تمھیں ہو رہی ہے کیا؟" ابرو اٹھائی۔

اکائر دبا دبا سا ہنسا، دل بے قابو تھا۔ "پہلی تو ہونے دو ٹھیک سے۔" ایک چہرہ اس کے دماغ کے پچھلے حصے میں گاڑ دیا گیا تھا، اور اکائر کو وہ بوجھ چبھتا بھی نہیں تھا۔

رائج آگے بڑھا اور آہستگی سے اس کا کندھا تھاما۔ "پہلی سنبھل کر کرنا، لڑکے، کیونکہ دوسری نہیں ہوتی۔ وہ ملے نہ ملے، تم اس سے لوٹ نہیں سکو گے۔"

دو بار بازو تھپتھپایا اور اپنی سمت موڑ لی۔ اکائر کا دل کسی آس میں ان کھلے دروازوں کو دیکھتا رہا جہاں سے اس کا سایہ چند ثانیے قبل غائب ہو چکا تھا۔

وہ رائج کو نہیں بتا سکا کہ کس طرح محبت کا اوزار اسے پوری طرح سے شگاف کر چکا تھا، اور اس کی ادھوری چوٹوں کا مرحم صرف انتظار تھا۔ لا انت، بے پناہ انتظار۔

★★★

دوسری بار وہ بانگسار کے ایک جم میں ملے تھے۔

یہ اگست دو ہزار تیرہ کے اختتامی دن تھے۔ گرمی کی شدت ایک لمحے کو دھیمی نہیں پڑتی تھی۔ صبح سے سہ پہر اور سہ پہر سے صبح، سورج کی تپش کوالالمپور کے شہر پر یکساں برستی تھی۔ ہیٹ اسٹروک سے خوف زدہ عوام مشکل ہی سے گھروں سے نکلتے تھے، گیلے تولیے اپنے سروں پر لپیٹے، مدھم رنگ کپڑوں میں ملبوس۔ سکون یا تو قبر میں تھا یا پھر کسی ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں۔

ارش کے سائے نارنجی میں گھل کر نیلے بکھرے ہوئے تھے۔ عصر بیت چکی تھی اور مغرب در پر تھی۔ چاند کی گولائی بادلوں کے چند پھیکے مرغولوں کے پس پشت جھلک رہی تھی، سپید اور چمکدار۔ بانگسار کا علاقہ روزمرہ کے شور سے اجاگر تھا۔ گاڑیوں کی دھیمی گنگناہٹ، اسٹریٹ لائٹس سے جلتی بجھتی روشنیاں اور

سڑک کنارے بنے کیفے جن کی سرخ میزوں پر نشست گاہک گھونٹ گھونٹ اپنی مشروبات کے حظ اٹھا رہے تھے۔ دوستوں اور عزیزوں کے خفیف مجموعے اپنی الگ ہی دنیا آباد کیے ہوئے تھے۔

پتھریلی روڈ پر گرم، مرطوب ہوا دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف اپارٹمنٹ کامپلیکس کے نیچے جلتے بورڈ پر کسی مردانہ جم کا نام درج تھا۔ داخلی گلاس ڈور کو سیاہ میٹ کی پینٹ سے فریم کیا گیا تھا اور قدم اندر اتارتے ہی ایک خوشگوار سی ٹھنڈک تنگ دماغ پر تاری ہو جاتی۔

جم زیادہ کشادہ نہیں تھا، مگر کافی وقت اور خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ریسیپشن سے گزر کر دائیں طرف ٹریڈمل کی لمبی قطاریں لگی تھیں اور ان کے ساتھ ہی پیروں کی کسرت کے لیے استعمال ہونے والی اسٹیشنری بائیکس۔ مرکزی ورک آؤٹ ایریا میں ایک جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ ڈمب بیل کا انبار لگا تھا۔ دوسری جانب اینٹوں کے بنے فرش پر ننھے پودے کھلے ہوئے تھے۔

اکائر ان میں سے ہی ایک بینچ پر لیٹا تھا۔ سبز رنگ کی اسپورٹس ٹی شرٹ اور سیاہ پینٹس میں ملبوس، پسینہ اس کی گردن سے بہہ کر گلے کی سلائی میں جذب ہو رہا تھا۔ شفاف سیاہ بال ماتھے سے پیچھے پڑے تھے اور سانس بے ضابطہ تھی۔ اس کے بے داغ بازو اپنے اوپر باربل کو سختی سے تھامے تھے، جس کا وزن معمول سے تھوڑا زیادہ تھا۔ گہری سانس باہر چھوڑتے، اس نے پہلا ریپ rep شروع کیا۔ بوجھ بڑا مگر وہ مستحکم رہا۔ قریب ہی مشینوں کی آواز گونجتی رہی، کہیں ہلکی گفتگو کی بھنبھناہٹ بھی سنی جا سکتی تھی۔

جب اس نے باربل کو تیسری دفعہ خود سے دور دھکیلا تو اس کے بازوؤں میں لرزش سے تاری ہوئی، ایک ایک عصب اپنے وجود میں تن گیا۔ سینے میں آگ مچلی اور پسینہ اس کی کہنیوں سے ٹپکنے کو لپکا۔ یکبارگی وزن جیسے دگنا ہو گیا تھا۔ اس کے حواس پھولتے چلے گئے، دماغ میں خوف کی سنسناہٹ بلند ہوئی جب اسے اندازہ ہوا کہ اس کے بازو جلد ہی جواب دینے والے تھے۔

"Need a hand?"

اس نے گلابی پڑتے تنفس سے سر کے بائیں جانب دیکھا تو دھندلا سا چہرہ بصارت میں واضح ہوا۔ ایک لمحہ درکار ہوا تھا اسے نووارد کو پہنچاننے میں اور پھر وہ، باربل کو سنبھالتے بمشکل کپکپاتی آواز سے بول اٹھا۔

"پلیز!"

رائج بینچ کی پچھلی طرف جھکا اور لوہے کے باربل کے نیچے اپنی باہیں پھنسائی۔ سیاہ لمبی آستینوں والی شرٹ کے پار اس کے پٹھے دو پل کے لیے اکڑے تھے۔ "میں تین تک گنوں گا، پھر اوپر۔ ریلکس۔" اس نے تحکم سے انداز میں کہا۔ اکائر نے بغیر مزاحمت جلدی جلدی سر اوپر نیچے کیا۔

"ون، ٹو، تھری!" رائج کے گنتے ہی ان دونوں کے چار ہاتھوں نے باربل ریک کی جانب دھکیلا۔ تیز ٹھن کی آواز پورے فلور پر گونجتی سنائی دی۔ اکائر ایک لمحہ یونہی لیٹا رہا۔ اس کا چہرہ اب بھی سرخ دہک رہا تھا۔ پھر وہ کروٹ لیتے اٹھ کر بیٹھا اور سر اٹھا کر رائج کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا وہ پورے وقت اسی ایرا میں دوسری جانب ویٹس اٹھا رہا تھا، اور اس کی مٹتی صورت دیکھ کر مدد کو چلا آیا تھا۔

"یہ کون سا نیا طریقہ ہے جان دینے کا؟" برابر بنے ریک سے ٹیک لگاتے رائج پڑا۔ اس کی بھورے بال پیشانی پر پھیلے پسینے میں چپک رہے تھے۔ باہوں سے آستینیں اوپر کی طرف کھینچتے اس نے کہنیاں کھلی چھوڑ دیں۔

"مجھے یہ مشین راس نہیں آئی۔ اب صرف بھاگوں گا۔ میری تقدیر میں باڈی بنانا ہے ہی نہیں۔" چہرے پر تولیہ رگڑتا اکائر بڑبڑایا۔

رائج ہلکے سے مسکرایا۔ "تم فٹ ہو اچھے خاصے۔ آسمان کو دیکھو لیکن چلو زمین پر۔ تمھارا پہلا ہفتہ ہے بینچ پر؟"

اکائر نے دل کی شکست چھپاتے ہامی بھری۔ رائج نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "پہلے ہفتے میں ہی تم نے پانچ کلو اوپر ایڈ کر دیا بار بل پر؟ مینٹل ہو کیا؟" اسے خود نہیں خبر تھی کیسے، مگر وہ کافی اپنایت سے اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"تم تو پرسنل ہو رہے ہو۔" اکائر نے پانی کی بوتل جھپٹتے منہ بنایا، مگر اصل میں اسے برا نہیں لگا تھا۔ رائج نے چہرہ جھکا کر سر دائیں بائیں کیا۔

"پہلے ہفتے صرف بار بل اٹھاؤ۔ پھر ایک ایک ہفتہ چھوڑ کر پانچ پانچ کلو ایڈ کرتے جاؤ۔ اپنے جسم کا رسپانس چیک کرو، اسے اڈجسٹ کرنے دو۔ ایک ساتھ مت تھوپ دو سب۔" وہ کسی ماہر جم انسٹرکٹر کی طرح اس کی رہبری کر رہا تھا۔

"نوٹڈ۔" اکائر مسکرا دیا اور اجلی سپید بتیوں میں اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "یہ ہماری دوسری ملاقات ہے غالباً۔"

"غالباً۔" رائج اب کہ تھوڑا سا سنبھل چکا تھا، لہجے کی بے فکری ان ھی لوٹ آئی تھی۔ ایسے ہی وہ اپنی جگہ واپس لوٹ گیا۔ اکائر تھوڑا مطمئن سا اسے دیکھتے رہا پھر مسکرا کر رننگ مشین کی جانب بڑھ گیا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

★★★

۱۱ ستمبر، ۲۰۱۳

کوالالمپور میں تیرتی اندھیری ہوا حبس زدہ تھی۔

خزاں میں کمزور پڑتے پتے اپنی شاخوں سے ٹوٹ کر زمین پوش ہو رہے تھے۔ روڈ کے قریب استادہ قائم بلند و بالا عمارت فیری لائٹس کی ڈوریوں سے آرستہ تھی، مدھم، سنہری روشنیوں میں نہائی ہوئی۔ پس منظر میں آسمان گہرا سیاہ تھا۔ مختصر فاصلے پر واقع پیٹرو ناس ٹاور اپنی کامل شان و شوکت میں دمک رہے تھے۔

آہنی ریلنگ کی قریب، رائج کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ انگلیوں کے درمیان تھامے گلاس میں ادھ پیا خوبانی کا شربت چھلک رہا تھا۔ اس کے عقب میں، ٹیرس پر ہر سو گہما گہمی تھی۔ گفتگو کی دبی دبائی سرگوشیاں، پیالیوں کی جھنکار، اور موقعی ہنسی ٹھٹہ۔ روسٹ ہوئے گوشت اور مصالحوں کی سگھند بُو فے کی میزوں سے گزرتی ہوا میں تیر تھیں۔ پاس رکھے کسی گملے میں یاسمین کے پھول کھل رہے تھے، کلی بہ کلی۔

اس نے وزن ایک پیر سے دوسرے پر منتقل کیا، ٹیلر شدہ تاریک سوٹ بھی ساتھ ہی سکوڑ گیا۔ مہنگا کپڑا بہ وسعت کندھوں پر کھنچ کر اس کے کسرتی جسم کی جھلک نمایاں کر رہا تھا۔ اس نے شربت کا ایک اور گھونٹ بھرا اور کندھے سے اوپر ایک اچٹتی نظر پیچھے ڈالی۔

"یار، تم تو صدا کے لونر بندے ہو۔"

اپنے عقب سے آتی آواز پر وہ چونک کر مڑا۔ اکائرز مورا ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا گلاس پکڑے اس کے برابر آرکا تھا اور اس کی تصویر اپنی گہری، تفتیشی آنکھوں میں اتار رہا تھا۔ اس نے سرتاپا سفید رنگ کا تھری پیس سوٹ پہنا تھا اور ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا۔ گہرے سیاہ بال تھوڑے بکھرے ہوئے تھے۔

"آدھے گھنٹے سے تمھیں دیکھ رہا ہوں، مجال ہو جو تنکا برابر ہل جاؤ۔ میں نے دو گلاس کوک پی لی، اسٹیک کی پوری پلیٹ چٹ کر گیا، ایک بار واش روم سے ہو آیا، تین نئے دوست بھی بنا لیے، اور تم اب تک چاند تاروں کو گھور رہے ہو۔" ہاتھ میں موجود گلاس سے ایک سپ بھرا۔ "ماجرہ کیا ہے؟"

"یہ ہم دونوں کچھ زیادہ ہی نہیں مل رہے؟" رائج نے نظریں واپس آسمان کی جانب کیں۔ اکائر اب کہ اس کے ساتھ تھا۔ سیاہ اور سفید، روبرو۔

وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ "کبھی تم مجھے ڈھونڈ لیتے ہو، کبھی میں تمھیں۔ لگتا ہے ہم دونوں کو مشترکہ طور پر عشق ہو رہا ہے۔" آخر میں منہ اپنے کوٹ میں چھپایا۔ رائج نا چاہتے ہوئے بھی زور سے ہنس پڑا اور اسے کندھے سے دھکا دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"اتنی لمبی زبان خدا گائے کو بھی نہ دے۔" رائج نے اپنے شربت کا گھونٹ بھرا۔ اکائر اتنے میں میز سے لکڑی کی ڈنڈیوں میں پروئی چکن کی بوٹیاں لے آیا تھا۔ "ہمم، یہ کھاؤ۔ جاپانی ڈش ہے یہ۔ یاکی ٹوری۔ Too yum."

رائج مسکرایا اور ایک تھام لی۔ باقی تین وہ ویسے بھی اپنے لیے لایا تھا۔ ایک پیس دانتوں سے کترتے اسے اس کا مزہ منہ میں گھلتا محسوس ہوا۔ کمپنی ڈنر پر کھانا اچھا ہوا کرتا تھا۔ اکائر آگے جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "ویل؟"

"ایسے پوچھ رہے ہو تم نے بنایا ہو۔" رائج نے مصنوعی روکھے پن سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ناٹ بیڈ۔"

"اسی لیے سنگل ہو تم۔" اکائر سر جھٹکتا رہ گیا۔ "تعریفوں میں کنجوسی کرو گے تو کوئی لڑکی اپنی بے عزتی کروانے آئے گی تمھارے پاس؟"

رائج اس بات پر محظوظ ہوا تھا۔ "اچھا جی؟ اور تم کیوں سنگل ہو؟"

"کس نے کہا میں سنگل ہوں؟" اکائر نے ترنت ابرو اٹھائی، پھر اپنی فون اسکرین کھولی۔ لاک اسکرین پر گیم آف تھرون کی کردار ڈائنریس ترگریں کی تصویر چمچما رہی تھی۔ "آہ، مائی وائف۔ ہم ڈیٹ کر رہے ہیں، اسے بس پتا نہیں ہے۔" اسکرین چوم کر بند کی اور واپس جیب میں ڈالی۔

رائج ہنس پڑا۔ "تمھیں پتا ہے تم تھوڑے سے پاگل ہو۔" اس بار آنکھوں میں نرمی تھی۔

وہ بھی مسکرا دیا۔ "اچھا ایک راز کی بات بتاؤ۔" آگے جھکتے سرگوشی کی۔ رائج نے ایک ابرو اٹھائی۔

"یہ ملائیشیا ایئر لائنز والے تمھیں کیسے لگتے ہیں؟"

"کسی ملازم سے پوچھو گے اسے اس کا باس کیسا لگتا ہے تو گالیاں ہی نکلیں گی۔ زہر لگتی ہے یہ کمپنی مجھے۔"

اس نے منہ بسورے شربت کا گھونٹ لیا۔ گلاس کے پیندے میں جما بیج بھی زبان پر گر گئے۔ اکائر کی سرمئی آنکھیں روشنیوں سے کھل اٹھیں۔

"واقعی؟ کیوں؟" ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ اسے کچھ بتانا چاہتا ہو، لیکن اس سے پہلے اسے اعتماد میں لے رہا ہو۔ رانج نے گہری سانس لی۔

"دو ہزار نو میں تم کہاں تھے؟"

غیر متوقع سوال پر اکائر چونکا۔ "آہ۔۔۔ یہیں؟"

"2009 انڈمان کریش کا نام سنا ہے؟" وہ لہجہ میں نیم بے زاری لیے پوچھ رہا تھا۔ "نہیں۔ یہ کیا ہے؟"

رانج نے اسے ایسے دیکھا، جیسے واقعی اس کا یہ اعتراف اسے برا لگا تھا۔ "نہیں پتا؟ ٹی وی نہیں تھا گھر پر؟ میرا پرائم فینس ٹائم تو تم نے مس کر دیا۔"

اکائر ہلکے سے مسکرایا۔ "کیا ہوا تھا؟"

رانج نے مڑ کر گلاس ٹیبل پر رکھا اور ہتھیلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ ایک گہری سانس اندر کھینچتے واپس تاروں کو دیکھنے لگا۔ "میری فلائٹ تھی اٹھارہ نومبر دو ہزار نو کو۔ کوالالمپور سے دبئی اور واپس۔ سیم روٹ۔ اس فلائٹ کے بعد اٹھائیس سالہ رانج کیپٹن بننے والا تھا۔ میری بہن دبئی میں رہتی تھی۔ ان کی پوری فیملی۔ شادی کے لیے گھر آ رہے تھے وہ لوگ۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ویٹ واٹ! شادی؟ کس کی؟" اکائر کے تو چودہ طبق پل بھر میں روشن ہو گئے تھے۔ رانج تھوڑا اور مسکرایا۔ "میری۔ ازلی سنگل آدمی کی۔"

اکائر تو خوشی سے چہک رہا تھا۔ "یار، یہ کیا؟ تم کہانی بیچ میں سے کیوں شروع کر رہے ہو؟ سب سے مزے کا پارٹ کھا گئے۔"

رانج ہنس کر اسے دیکھنے لگا۔ "سب سے مزے کا پارٹ سنا رہا ہوں، چپ تو رہو۔" اکائر چمکتی آنکھیں اٹھائے اسے دیکھتا رہا۔

"میری بہن میری ہی فلائٹ میں گھر واپس آرہی تھی۔ وہ اور اس کی بیٹی۔ اس کے شوہر کو کام تھا، انھوں نے بعد میں آنا تھا۔ ہم DXB ائیر پورٹ پر ملے تھے۔ وہ اتنی خوش تھیں۔ ادا تو میری گود سے ہی نہیں اتر رہی تھی۔ ہم سال میں ایک بار ملتے تھے، اسی لیے وہ کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔"

اکائر نے اندازہ کر لیا 'ادا' اس کی بھانجی ہو گی۔

"میں بہت خوش تھا، اکائر۔ اپنی زندگی میں اتنی خوشی اس لمحے سے پہلے اور بعد آج تک محسوس نہیں کی۔"

اکائر نے ہمت کی کہ سوال کرے۔ "شادی تمھاری پسند کی تھی یا۔۔۔ ارینج میرج؟"

"پسند کی ارینج میرج۔" وہ مسکرا دیا۔ "میری پڑوسی تھی۔"

اکائر نے ابرو اٹھائیں۔ "اوہو! پورے رومانس ناول میں تھے تم۔"

"دو گھنٹے سکون سے فلائٹ چلتی رہی۔ بیچ میں انڈیا آیا۔ تمھیں پتا ہے انڈیا کتنا خوبصورت لگتا ہے کاکپٹ سے؟ اتنا بڑا اور اتنا روشن۔ اگر اتنا مصروف نہ ہو، تو وہ میرے پسندیدہ ترین ائیر سپیس میں سے تھا۔"

اکائر نے بھی کئی بار جہاز کا سفر کیا تھا، مگر پسنجر کیبن اور کاکپٹ سے نظارے میں تفاوت بہت بڑا تھا۔ وہ اسے سنتا رہا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"پھر لال بتی جلنے لگی۔"

اکائر کے ابرو نا سمجھی میں تنگ ہوئے۔ رابح کی نگاہ خلا میں تھی، بہت دور، بہت گم۔

"اس نے کہا، "رابح!" میں نے کہا، "کیا ہوا؟" اس نے انگلی پینل کی جانب کی۔ لال۔ لال۔ لال. فیول ختم ہو رہا تھا۔"

اکائر یکایک سیدھا ہوا۔ اب کہ چہرے سے مسکان اتر چکی تھی۔ رابح اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیزل، سنہری آنکھیں دور تھیں۔ بہت دور۔ ماضی کی ترجمان۔

"میں نے کہا، "ATC کو بتائیں۔" اس نے کہا، "تم جونیئر ہو، تمھیں عقل نہیں۔" مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ دل کیا بھول جاؤں سامنے عورت ہے۔" اکائر کا دل بری طرح بھاگ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ سوال کرنا چاہتا تھا، کہ رائج ہر جملہ ماضی کے حوالے سے کیوں بول رہا تھا، لیکن اب نہیں۔ اب وہ نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔ جو بھی ہوا تھ دردناک تھا۔

"اکائر، تمھیں سوئمنگ آتی ہے؟" اس نے اچانک بات بدلی۔ برابر کھڑا مرد بوکھلایا ہوا سا اسے دیکھتے رہا۔

"ہاں، لیکن مجھے asthma ہے۔ زیادہ دیر کچھ بھی سانس کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

"کوئی فاعدہ بھی نہیں۔" وہ احساس سے عاری آواز میں گویا ہوا۔ "مجھے بھی آتی تھی۔ کوئی فاعدہ نہیں ہوا۔ موت منہ پر ہو تو کچھ نہیں ہوتا۔ سب ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو کتنا اعلیٰ اور باری سمجھتا ہے، لیکن موت کا ایک جھٹکا اسے پنڈلی پنڈلی توڑ دیتا ہے۔"

اکائر نے نرمی سے اس کا کندھا دبایا۔ "کس کی موت ہوئی تھی؟" سوال کرنا دشوار تر تھا۔ رائج نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میری، اکائر۔" پلکوں کا جھالر بچھا رہا۔ "میری۔"

سارا معاملہ اسے بتا کر وہ آسمان کو دیکھتے خاموشی سے بولا۔ "میں چاند تاروں کو نہیں گھورتا۔ میں ان بلندیوں کو دیکھتا ہوں۔ یہ آسمان جس کی میں نے اتنی آرزو، اتنی طلب کی۔ اور بدلے میں مجھے یہ ملا۔ میں اپنا آپ دیکھ رہا ہوں، اکائر۔ یہ آسمان نہیں، آئینہ ہے۔ مجھے مت روکنا۔ مجھے دیکھنے دو۔"

وہ ریلنگ سے دور ہٹ گیا۔ اکائر ساکت و جامد اسے دیکھتا رہا۔ اس کے پیروں میں جنبش نہیں تھی۔ رائج دو تین لوگوں کے کان میں کسی بہانے کے ساتھ الوداعی کلمات کہہ کر وہاں سے جا چکا تھا۔ اور وہ، ادھر ہی کھڑا رہا۔

ہوا نے اس کی سیاہ بالوں میں گانٹھ لگائی اور اس نے چہرہ آسمان کی جانب کر لیا۔

★★★

۲۰ ستمبر، ۲۰۱۳

اکائر کی ساہ ٹویوٹا آویز ابنگلوں کی قطاروں کو پار کرتے داخلی سمت مڑی۔

ڈھلتے آفتاب کی شعائیں نرم، سنہرے چراغ ہر سو جلائے تھیں۔ گاڑی کے چمکتے، پالشڈ شیشوں سے گلابی و نارنجی روشنیاں ٹکرا کر اجاگر ہو رہی تھیں۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے سرمئی آنکھیں آئینے کی جانب کی اور پہیوں کی رفتار ہلکی ہوئی۔

گئیر شفٹ تک مضبوط ہاتھ بڑھاتے گاڑی ریورس کی تو انجن نے دھیمے سے احتجاج کیا۔ نگاہ کے اوپر سے پیچھے دوڑائی، ایک ہاتھ اسٹیرنگ ویل پر سجایا، دوسرا پسنجر سیٹ کی پشت سے ٹکا تھا۔ مدھم ہوا میں اس کے آستین کے کنارے ہولے ہولے پھڑ پھڑائے اور نفیس بازوؤں کی جھلک نمایاں ہوئی۔ بہترین زاویہ تلاش کر اس نے ویل آہستگی سے گھمایا اور تنگ سی جگہ میں نہایت جمکت عملی سے گاڑی پارک کی۔

سنگ ریزہ پر پہیوں کی چرچرانے کی آواز گونجی اور اس نے انجن کی چابی بند کی۔ پسنجر سیٹ پر رکھا اپنا بریف کیس اٹھایا، چمڑے کے پٹے کو کندھے سے گزارا اور گاڑی کا دروازہ کھولتے باہر قدم رکھا۔ ارغوانی سے ماحول میں جلد نیند کے قفس میں قید ہونے والے چرند پرند چہچہا رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کرتے آسمان میں چمکتے پہلے پہل ستاروں کا محاصرہ کیا۔

ملائیشیا ائیر لائن کے کمپنی ڈنر کو ایک ہفتہ ہونے کو تھا۔ ٹیرس پر ہوئی اس ملاقات کے بعد سے رانج اور اس کے درمیان جیسے کوئی دیوار استادہ ہو گئی تھی، اور کہیں نہ کہیں اکائر کو لگتا کہ ایسا رانج نے دانستہ طور پر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنا ٹراما بانٹنے کے بعد پچھتانے لگا ہو، اسی لیے دوستی سے مکمل ہاتھ کھینچ لیا۔ اکائر کو یہ بات چبھی تھی، لیکن وہ اس رات، چھت پر کھڑے رانج کے الفاظ تھے جو اس کی روح کے کسی حصے کو مجروح چھوڑ گئے تھے۔

اکائر نے کبھی گمان نہیں کیا تھا اس قدر مستحکم اور ثابت قدم انسان کی بنیادیں اتنی مضروب تھیں۔ رائج سے اسے ہمدردی محسوس ہوئی تھی، رفاقت بھی اور ترس بھی آیا تھا۔ لیکن اس کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے کان بند کر لیے تھے۔

اسے فرق نہیں پڑنا چاہیے تھا، مگر رائج سے بات کر کے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک کامل دوستی کی پرچھائیاں نظر آئی تھیں، جو کہ وہ اس سے چھین کر چل دیا تھا۔

اپنی جیب سے موٹر سائیکل والی کی چین میں لپٹی چابیاں برآمد کیں اور ایک کی ہول میں گھمائی۔ کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا، تو اس نے بریف کیس تھامے ایک ہاتھ سے پورا دھکیلا اور اندر داخل ہوا۔ سامنے لاؤنج کے منظر میں روشنیاں روزمرہ کی برعکس مقابلتاً دھیمی تھیں، ہلکے سنہرے لیمپ سے اونچی چھت منور تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ ہوا کرتی تھی کہ غزار نائٹ شفٹ کر رہا ہے، یا کسی بھی وجہ سے گھر سے غائب تھا۔

ظبیہ کو دھیمی روشنیاں اچھی لگتی تھیں، لیکن غزار ہر وقت، ہر سو بتیاں روشن رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے، جب وہ تنہا ہوتی تو گھر کی اکثر روشنیاں دھیمی کر دیتی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور جوتوں کے ریک میں اپنے لوفر جمائے۔ قد آور شیشے میں اس کی سفید ڈریس شرٹ اور نیوی بلیو ٹراؤزر کا عکس نمودار ہوا۔ اس نے بکھرے بالوں کو سست ہاتھ سے سدھارا۔ وہ اتنا تھک گیا تھا کہ لگا اسی پل گر جائے گا، اوپر سے اتنا لمبا ٹریفک۔

"آ گئے تم؟" ڈائننگ ٹیبل پر تنہا بیٹھی ظبیہ اس سے مخاطب تھی۔ اس نے لیمن پیلے قمیص شلوار پہنے تھے اور دوپٹہ گلے میں ڈال رکھا تھا۔ چہرے کے آگے میز پر مختلف طرح کے موتیوں، ربن اور آرائشی انگوٹھیوں کی گنگا بہہ رہی تھی، جس میں سے یک بعد دوجے ربن اٹھا کر وہ گانٹھیں لگاتی، اور انھیں ننھی، نفیس سی ڈیڑھ گراہ میں لپیٹ دیتی۔

"یہ کہاں ڈاکہ ڈالا؟" وہ خود کو باز نہ رکھ سکا۔ بریف کیس صوفے پر رکھتے وہ اس سے گویاں ہوا۔

"ہوم ڈیکور کا سامان ہے۔ سیڑھیوں والا ایریا بہت سونا سونا لگتا ہے، یہ موتی باندھ کر ادھر ٹانگ دوں گی۔ کیسا؟"

اکائر کو اس کی جستجو دیکھ کر مسکرانے کا قائل ہونا پڑا۔ "وہ صرف راستہ ہے۔ وہاں کیوں اتنی بیوٹی ضائع کر رہی ہو؟ اپنے کمرے میں ٹانگو۔ ہو سکتا ہے غزار کا دل بہل جائے۔" وہ چھیڑ کر بولا۔ ظبیہ نے آنکھیں گھمائیں، اپنے کام سے نگاہ ایک پل کے لیے بھی نہیں اٹھائی۔ اکائر آستینیں چڑھاتے قریب آیا اور اس کی متضاد کرسی کے پیچھے کھڑا ہوا۔

"ویسے ہیں کہاں تمھارے میاں جی؟"

"کسی کان میں۔ فون سگنل بند ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب رات بھر کا کام ہو۔ اب صبح ہی آئیں گے۔" اس نے رنگ برنگے موتی ایک پیالے میں جما کیے۔ اکائر چند لمحات مکمل شوق و ذوق سے اسے تکتا رہا پھر کرسی کھینچ کر اس کی مخالف سمت بیٹھ گیا۔ "لاؤ، میں مدد کروں۔"

"ارے کھانا وانا کھاؤ تم۔ فالتو سا کام ہے یہ تو، بور ہو رہی تھی تو بس ایسے ہی۔۔۔"

"آپ کر رہی ہیں تو فالتو کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ دانت دکھا کر بولا، پھر آگے بڑھ کر ربن چھوئے۔ "لاؤ ناں، تھوڑی چمک دمک میرے لیے بھی چھوڑ دو۔"

وہ مسکرا دی اور برابر برابر موتی اور ربن اس کے اور اپنے درمیان تقسیم کر لیے۔ اکائر کاریگر انگلیوں سے چھوٹی، باؤ کی صورت، گرہ لگاتا اور باری باری اس کو دکھا کر ایک جگہ جما کر تار ہتا۔ گھڑی کی ٹک ٹک، کچن کے سوکھے نل سے زیر ہوتی پانی کی ہر ہر بوند، لیمپ کی مدھم سنہری روشنیاں اور موتیوں کے پھسلنے کی جھنکار، ہر سو خاموشی کا بے تاج راج تھا۔

مین روڈ پر کسی گاڑی کا ہارن گونجا تو لاؤنج روم میں قائم مہر سکوت ماند پڑ گئی۔ اکائر نے چہرہ بلند کرتے نظریں اس پر جمائیں، انگلیاں اب بھی بیلوں سے موتی الگ کر رہی تھیں۔ اسے اپنا جسم تکان کے پہاڑ سر کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ پورے دن کی خواری اور مشقت اس کی ہڈی ہڈی میں بس کر دماغ کو ستا رہی تھی۔ وہ سر جھٹکتے گراہ لگاتا رہا، البتہ اب کہ انگلیاں کاہلی سے حرکت میں تھیں۔

"تم تھکے ہوئے ہو۔ جاؤ، اکائر۔" ظبیہ نے اس کی دشواری دیکھتے نرمی سے کہا۔ وہ سرکشی سے گردن دائیں بائیں موڑتے رہ گیا۔ "یہ ختم کر کے جاؤں گا۔"

"اتنے ضدی کیوں ہو تم؟" اس نے کچھ تندی سے گھڑکی بھری، مگر لہجے کا ملائم پن صرف بڑھ گیا تھا۔

اکائر مسکرانے لگا، موتیوں کے دانے پیالے میں لڑکائے۔

"تمھیں تو ایسے ہی پسند ہوں۔"

ظبیہ ہنس کر رہ گئی۔ "بہت برے ہو تم۔ کبھی نہیں سنتے۔" وہ بھی مسکراتا رہا۔

ان دو نفوس کے شیرینی ماکلمے سے شغل کرتے، گھڑی کی سوئی چند منٹ اور آگے بڑھ گئی۔ کیسمنٹ کھڑکیوں کے باہر اندھیرا مکمل پھیل چکا تھا اور چاندنی دھول جیسے بادلوں کی اوٹ سے جھانکتی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

ظبیہ وقت کا اندازہ نہیں کر سکی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ ہر سو سکون تھا، اور وہ محفوظ تھی۔

رنگ برنگی لڑیوں کو ساتھ باندھتے اس نے اکائر سے قینچی مانگنے کے لیے ہاتھ آگے کیا، مگر نظریں اس جانب پھیرتے اسے دکھائی دیا کہ وہ میز پر چہرہ ٹکائے سو چکا ہے۔ سیدھا گال لکڑی کے کاؤنٹر پر ٹکا تھا اور گلابی ہونٹ نیند سے وا ہوئے تھے۔ ظبیہ اس کی ہٹ دھرمی سے محظوظ ہوئی۔ یہ بندا اس کے سامنے خراٹے مار کر سو سکتا تھا، مگر معذرت کر کے اپنے کمرے کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔

انا ہو تو اکائرز مورا جیسی، ورنہ نہ ہی ہو۔

وہ خاموشی سے ربن کاٹنے لگی اور ایک کے بعد ایک آپس میں لپیٹتی گئی۔ آخر میں گلوگم سے ننھے سفید موتی ان پر چسپاں کیے، گلوکم پڑی تو تھوڑی اور لگائی۔ اس پورے عرصے میں اکائر بن حرکت، بن سخن سوتا رہا۔ ظبیہ کو اندازہ ہوا وہ واقعی ہی تھک گیا تھا، اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی۔

چند اور منٹوں کی مہلت کے بعد، وہ سارا سامان ڈبوں میں بند کر کے ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ گلو اور اسٹیپلر ساتھ اٹھائے، ربن سلیقے سے باکس میں رکھے اور بقیہ موتی ڈھکن لگا کر اسی میں قید کر دیے۔

سامان اپنے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ واپس آئی تو اس کی بھوری آنکھوں میں لاؤنج کی سنہری روشنی جل کر نمایاں ہوئی۔ لیمن پیلے رنگ کے سوٹ میں اس کی گہری گندمی رنگت مزید حسین و دلکش نمودار ہو رہی تھی۔ لچھے دار، سیاہ لٹیں اور ناک میں چمکتی سونے کی باریک بالی۔ ظبیہ یمین ہر سانس رکھتے مرد کا پہلا خواب بن سکتی تھی۔

گرمی کے دنوں میں گھر سینٹرلی ائیر کنڈیشنڈ ہوتا تھا، سو اس وقت رات کی اپنی ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ گھر کی وسعت میں ہلکی ہلکی خنکی گھل چکی تھی۔ اس نے آگے بڑھتے صوفے سے ایک پتلا کمبل اٹھایا۔ اگر اکائر جاگا ہوتا تو وہ اس سے کھانے کے بارے میں پوچھ لیتی، لیکن وہ تو گہری نیند سو چکا تھا۔ اس نے بن آواز قدموں سے راستہ ناپا اور مزید دو لیمپ بجھائے۔ کمرے میں روشنی اور دھندلا گئی، سوائے ایک باریک نارنجی پٹی کے۔ اکائر کے برابر پہنچتے اس نے آہستگی سے کمبل کی تہ کھولی، پھر آگے جھکتے اس کی کندھوں کے گرد پھیلایا۔ وہ ذرا برابر چوکنا ہوا، لیکن نہ آنکھیں کھلیں نہ ہی کوئی آواز باہر آئی۔ ظبیہ نے کمبل پیچھے سے لا کر اس کے بازوؤں پر ڈالا، اور تھوڑا اوپر کرتے اس کا منہ بھی ڈھانپ دیا۔ اکائر نیند میں تڑتڑایا، تو ظبیہ نے ہنسی روکی، پھر اس کا چہرہ کھول دیا۔

وہ نہایت اطمینان سے ایک سلیم الطبع نیند سوتا رہا۔ ظبیہ کے چہرے پر ایک اندیکھا احساس اجاگر ہوا، ہرنی جیسی مدور آنکھوں کا بھوراپن سوکھ کر سیاہ ہو گیا۔ وہ ہاتھ ہوا میں اٹھائے، وہ چند خوبصورت ثانیے بن

مدافعت جیتی رہی۔ اس کے دل کی گرد استادہ دائرے باز عام ہو گئے تھے، پیروں تلے کانٹے نہیں کلیاں کھل جاگی تھیں۔

پھر اس نے چہرہ جھکا دیا۔ دائرے سکڑ گئے، کانٹے ابھر آئے۔ اس کے تلووں سے ہی نہیں، خون دل سے بھی رسا تھا۔ ایک آخری مرتبہ نگاہ خوابیدہ مرد پر ڈالی پھر چلنے کو راہ موڑ لی۔ وہ رفو ہو جانے کو پلٹی ہی تھی، کہ ایک ہاتھ اس کی کلائی کے گرد غایت نزاکت سے قابض ہوا۔ اس کی سانس کہیں دور رک گئی، پیروں کے اطراف سے زمین ہی کھسک گئی۔ وہ دم سادھے، گردن موڑے کھڑی رہی۔ مردانہ ہاتھ کی تپش اب بھی اس کی جلد پر تھی، لیکن وہ دعویٰ بہت کمزور تھا، بہت نامضبوط۔ ظبیہ محض ذرا سی قوت سے اس سے آزاد ہو سکتی تھی، لیکن کیا وہ یہ آزادی چاہتی تھی؟

اس نے دل کے گرد رسیاں باندھتے ٹھوڑی پیچھے کی اور منظر جانچا۔ اکائر اب بھی نیند میں گھلا ہوا تھا، لیکن اب کہ اس کے بازو کے اوپر ظبیہ کا ہاتھ تھا۔ وہ چہرہ جھکائے اس کا ہاتھ کھینچ کر اس کی ہتھیلی پر سر رکھے تھا۔ ظبیہ کے دل میں کئی کنکر چبھے، آنکھوں میں بہت کچھ ٹوٹ کر بکھرا۔ وہ بغیر حرکت کیے اسے دیکھتے رہی۔ اس کے بال گانٹھوں میں جکڑے تھے اور چہرہ کامل نیند کی تصویر تھا۔ اکائر زمورا کو اندازہ بھی نہیں تھا، کہ وہ اپنی بے خبری اور ناواقفیت کے عالم میں ظبیہ یمین کے دل کے کون سے تار چھیڑ چکا تھا۔

اس کی آنکھوں میں جلن سی اتر آئی۔ اس نے پلکے مچکا کر اسے صاف کرنا چاہا، مگر نمناک آنسو فقط اس کی ناک کی ہڈی پر سرشار ہو گیا۔ وہ طنز کر رہا تھا، طعنہ مار رہا تھا، یا اسے احساس دلا رہا تھا، کہ دیکھو ظبیہ یمین، تعرض کی مشق میں تم بس اتنی ہی لاغر ہو، اتنی ضعیف العقل، کہ ذرا سا لمس تمھیں کھول دیتا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ آزاد کرنا چاہا، مگر اس کا جسم سدا کا تردیدی تھی۔

آنسو زار زار اس کے سلونی گالوں سے اوندھے پڑتے رہے۔ وہ بن آواز کھڑی بلک رہی تھی، اس کا ہاتھ اب بھی اکائر کے قلاب میں تھا۔ اسی نے تو دے رکھا تھا۔

وہ دھیمے سے اپنے گھٹنوں پر پھسل گئی، اکائر کی کرسی کے ٹھیک برابر۔ اس کی آنکھیں اسے دیکھتے نہیں رک رہی تھیں، نہیں تھک رہی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی، اکائر کو جگا کر اسے دو تھپڑ لگانا چاہتی تھی اور پھر بغیر مزاحمت اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ اس مرد نے اسے بہت جوڑا تھا، بہت سیا تھا، اور اب وہ ایک لمحے میں اس کے سارے ٹانکے ادھیڑ چکا تھا۔

ظبیہ نے ایک ہاتھ کی کانپتی انگلیاں ہوا میں بلند کیں۔ سرخ پڑتی آنکھیں اس کے اپنی حرکات پر حیران تھیں۔ اس نے ہاتھ اس کے چہرے کے قریب روک دیا۔ گلابی گالوں کی شیو اور ماتھے پر پھیلی لکیریں، گھنی ابرو اور خمدار پلکیں جو سرمئی رنگ اپنے آنچل میں سموئے تھیں۔ وہ سرمئی آنکھیں ظبیہ سے اجنبیت برت سکتی تھیں، لیکن وہ اس کی حفاظت کرنا چاہتی تھیں۔

اس کا ہاتھ پہلو میں گر پڑا، سانس پھیپھڑے چیر کر آزاد ہوئی، دل نے ایک کراہ نکالی، اور ظبیہ یمین نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو اس لمحے سے پیش کبھی اعتراف میسر نہیں کرے گی۔ وہ اور آنے والی ہر گھڑی اس کے لیے اعذاب ہو گی۔ اکائرز مورا اس کے لیے لاحاصل تھا، اور ہمیشہ رہے گا۔

اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اکائر نے مزاحمت نہیں کی۔ شاید وہ بے ہوشی میں بھی ہوش رکھتا تھا، اور ایک وہ تھی جو مکمل شعور و ادراک رکھنے کے باوجود اپنی آزاردگی لمحہ لمحہ طویل کرنا چاہ رہی تھی۔ ظبیہ کو خود سے گھن آئی، بے پناہ گھن۔ آنسو اس کی پلکوں سے موتی بن کر بہہ گئے۔ اس نے اس کے کندھوں کے گرد کمبل مضبوطی سے لپیٹا، اور پھر اسے بغیر دیکھے چل پڑی۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے شتابی سے دروازہ لاک کر دیا، انگلیاں کڑیاں آپس میں ملاتے پھسل رہیں۔ اس نے دوپٹے کا ایک سرا لبوں کے اوپر رکھتے اپنے سسکیوں کی آواز دبائی، کمر پیچھے لکڑی سے ٹک گئی۔ وہ دروازے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئی، ایک ہاتھ اب بھی کلائی کہ اس حصے پر تھا جسے وہ اکائر سے آزاد کروا آئی تھی۔

★★★

شیشے کے پٹ کو کنارہ کرتے، سیاہ لوفر کی چمکتی ہوئی جوڑی شفاف ٹائلز کے فرش پر دھر دی گئی۔ اکائر نے آنکھوں سے سیاہ شیڈز دور کیے اور سفیدی مائل سرمئی بٹن شرٹ کے کالر میں اٹکائے۔ کاونٹر کے جانب بڑھاتے اس نے ایک بازو داخلی میز پر ٹکایا، اور دل بھر کر مسکرا دیا۔ بتیس دانت کھل اٹھے۔

"سلام، اہلی فاطمہ۔" یہاں کے روزمرہ کے چکروں میں ہی اسے کرسی پر جمی بیٹھی بیس سے بائیس سالہ لڑکی کا نام حفظ ہو گیا تھا، اور وہ ہر بار اپنی طبیعت کے برخلاف کافی جوش سے اس سے مخاطب ہوتا۔

فاطمہ نامی حجابی لڑکی سر جھٹک کر رہ گئی، گویا سر پر اڑتے بن بلائے مچھر کو دھتکار رہی ہو۔ اکائر نے سر اٹھاتی عزت نفس کا گلا گھونٹ کر شیرینی مسکراہٹ قائم رکھی، اور ایک بار پھر منہ کھولا۔

"آپ کے صاحب کے ساتھ آج میری میٹنگ ہے۔" وہ مدعے پر آیا، لیکن فاطمہ نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی اسے چہرہ اٹھا کر نظر میں نہیں لائے گی۔

"مسٹر سعید فی الحال دبئی والی پارٹی کے ساتھ ہیں، فارم ہاؤس پر۔"

اکائر کی مسکراہٹ میں کوئی بدل نہیں آیا۔ "یہ ضرور مسٹر سعید نے آپ کو رٹوایا ہو گا۔ آپ کی سیلری پیکج میں جھوٹ بولنا اور چھپانا بھی شامل ہے کیا؟"

"دیکھیے، مسٹر زمورا۔" جھنجھلاہٹ کی شدت سے جسم بھر کا خون اس کے چہرے پر امڈ آیا تھا۔ "میں کہہ رہی ہوں ناں، مسٹر سعید فارم ہاؤس۔۔۔"

ان کے مکالمے کے بندھن کو توڑتی چند آوازیں راہداری میں نمودار ہوئیں۔ اکائر نے اس کی بات نصف چھوڑ کر گردن پیچھے گھمائی۔ عمر سعید مکمل شان و اقتدار کے ساتھ ٹیلر شدہ سوٹ میں بقیہ بزنس مین کے ہمراہ بریفنگ روم سے نکل رہے تھے۔ چالیس کے ہندسے کو چھوتا چہرہ، ہلکی شیو اور مسکراتی آنکھیں۔

اکائر نے چہرے پر بیان ہوتی جھلاہٹ چھپاتے قدم اس جانب موڑے۔ فاطمہ اپنی کرسی سے اتر کر اسے روکنے لپکی، مگر ناکام ٹھہری۔

"کمال بات ہے، سر۔ آپ نے تو کمروں میں فارم ہاؤس کھول رکھے ہیں۔" کہتے ہوئے عمر سعید کے عین مقابل پہنچا۔ سامنے کھڑے مرد کے چہرے سے پلوں کی اثنا میں سارا رنگ نچوڑ گیا۔ دانت پیستے اس نے اکائر کو گھورا، جو مسکراتے ہوئے سب سے مصافحہ کر رہا تھا، ساتھ ہی عمر سعید کے ساتھ اپنی پرانی رقابت کی قصے بھی سنانے لگا تھا۔ سب ہی اس انجان چہرے سے محظوظ تھے۔

"ارے اپنا تعارف تو میں بھول ہی گیا، حضرات۔" ایک جتاتی ہوئی نگاہ عمر سعید پر روشن کرتے سرگوشی کی۔ "دوں؟"

"یہ مسٹر زمورا ہیں۔ انھوں نے کچھ عرصے ہمارا بزنس سیٹ اپ سنبھالا تھا۔ یہ پرائیوٹ کنسلٹنٹ ہیں۔" عمر سعید کی گھٹن زدہ مسکراہٹ دیکھتے اکائر نے بمشکل اپنی ہنسی قابو کی، البتہ بٹوے سے اپنا بزنس کارڈ ان سب کو دینا وہ نہیں بھولا تھا۔

سب رخصت ہوئے تو راہداری میں دو وجود بقیہ رہے۔ دونوں کے چہرے سے تبسم فوارے کی طرح اڑ گیا تھا۔ عمر سعید نے ارد گرد اچاٹ سی نظر دوڑاتے اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

★★★

"کیوں آئے ہو تم؟ کیوں آتے ہو تم ہر بار یہاں؟" کمپنی کے باس نے کوٹ کے بٹن ایک دوسرے سے چھڑاتے اسے گھور کر اپنا سوال پیش کیا۔

اکائر کو جتنی سعادت مندی دکھانی تھی، وہ دکھا چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی صرف اور صرف ناگواری تھی۔ تیز، طویل۔

"یہاں آنے کا میرا ہر دفعہ صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، جو کہ تمھارا چہرہ دیکھنا تو قطعاً نہیں۔ بچی میری پے منٹ تو ہاں، میں اپنے پیسے لینے آیا ہوں۔"

"تم بہت نادان اور کم سمجھ ہو، اکائر۔ چھوٹی سی عمر میں امیر ہونے کا یہی نقصان ہے۔ تمھیں بزنس کے اصول نہیں معلوم۔ ترقی کے پہیے آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں۔ اور تمھیں ہوا ہی کتنا عرصہ ہے؟" وہ اپنے گلاس میں پانی نکالتے سرشاری سے بولنے لگے۔ اکائر کے دماغ کا ایک حصہ بھک سے اڑا، مگر اس نے جذبات کی بجائے ضبط کو ترجیح دی۔

"ڈیڑھ سال، عمر صاحب۔ ڈیڑھ سال ہو چکا ہے مجھے آپ کے در پر اپنے پیسوں کی بھیک مانگتے۔ کانٹریکٹ کے مطابق، میری پے منٹ آٹھ ماہ پہلے due تھی۔ آخری مرتبہ آپ نے یہی ٹائم لائن دی تھی۔"

"کانٹریکٹ، کانٹریکٹ، کانٹریکٹ۔۔۔ یہ بڑے ذو معنی ہوتے ہیں، مسٹر زمورا۔ clauses, sub clauses, interpretations. ہو سکتا ہے تم نے کسی فقرے کے غلط معنی لے لیے ہوں۔"

سرمئی آنکھیں سامنے والے کی دلیری پر تیر ہوئیں۔ اس نے بلا توقف اپنے بریف کیس سے ایک فائل مطلوب کی اور چند صفحات پلٹ کر الفاظ ڈھونڈے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

کاغذ پر انگلی رکھتے اس نے بات جاری رکھی۔ "یہاں یہ شق واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ خدمات کی تکمیل پر ادائیگی واجب ہے، جسے آپ جان بوجھ کر دینے سے گریز کر رہے ہیں۔ کوئی ابہام نہیں، سعید صاحب۔"

شہانت کا لبادہ اوڑھے عمر سعید کی مسکان پل بھر کو ماند پڑی اور ایک پتھریلا تاثر اس کے تبادل نمودار ہوا۔

"جان بوجھ کر؟ یہ بڑا کڑا الزام ہے، بچے۔" وہ معصومیت سے مسکرائے۔ "اصل میں، تمھارا in voice مسئلے کر رہا ہے۔ فائننس ڈیپارٹمنٹ بار بار اسے مسترد کر دیتا ہے۔ کبھی فارمیٹنگ کے مسائل، کبھی ڈیٹیلز غائب۔ تمھیں تو پتا ہو گا۔"

اکائر کو اپنی مایوسی پنپتی محسوس ہوئی۔ ”میں تین بار in voice جما کر واچکا ہوں، اور ہر بار میں نے آپ کی ٹیم کی وضاحتوں پر عمل کیا ہے۔“

”اگلی دفعہ اور توجہ سے بھر دینا۔ ویسے بھی بیوروکریسی تو سب کو بندر کا ناچ نچواتی ہے۔ ابھی تو تم نے صرف تال سے تال ملائی ہے۔“ انھوں نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ ”اور تمھارے اخراجات بھی مسلہ کن ہیں۔ کچھ بہت غیر ضروری ہیں، ہمیں انھیں آڈٹ کرنا ہو گا۔“

اکائر نے بمشکل خود کو ہم دماغ رکھا۔ ”ہر خرچ دستاویزی اور جائز ہے۔“ پھر اس نے زبان کی نوک سے اندرونی گال کھجایا۔ ”اصل میں آپ کی نیت میں ہی کھوٹ ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹک گئے۔ ”الزامات تمھاری مدد نہیں کریں گے۔ الفا گروپ قانونی حدود کے اندر کام کرتا ہے۔ اگر تم ہمارے طریقے کار کی تعمیل نہیں کر سکتے، تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ دل تک محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے گہری سانس بھری، مگر آواز ٹھوس رہی۔ ”مسٹر سعید میں ہر چیز کی تعمیل کر چکا ہوں، لیکن اگر مجھے اس معاملے میں کوئی حرکت نہیں ملی، تو میرے پاس اسے بڑھانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں۔“

عمر سعید نے ہتھیلیاں آپس میں ملائیں اور سیٹ میں آگے جھکا۔ ”کہاں بڑھاو گے؟ کس تک پہنچاو گے؟ میری قانونی ٹیم؟ عدالتوں کو؟“

”میں صرف وہی چاہتا ہوں جو میرا ہے۔“ دھڑکتے دل کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ تلملا اٹھا تھا۔ ”میں نے سخت محنت کی ہے، میں اپنے پیسوں کا مستحق ہوں۔“

اس نے چہرہ دائیں بائیں ہلایا۔ ”اور اگر میں نہ دوں تو؟“ وہ کمینگی ہی پر تواتر آیا تھا۔ اکائر کے ماتھے کی رگ پھڑ پھڑائی۔ ”کیا کرو گے؟ کورٹ لے کر جاؤ گے؟ کیس کرو گے؟“ وہ کڑواہٹ سے ہنس دیا۔ ”میرے وکیل تمھیں ناشتے میں بھگوس لیں گے۔“

اکائر کی سرمئی آنکھوں میں شاید ایسا تاثر پہلی مرتبہ در آیا تھا۔ گھمبیر، سفاک۔ ڈریس شرٹ کے کھلے کف سے جھانکتے بازووں کی نسیں ابھر کر نمایاں ہوئیں۔ اس نے بنا پلک جھپکے اسے دیکھا، پھر ایک ڈگ بھرتے نزدیک بڑھا۔

"آپ کو شاید اپنی بالاتری پر یقین ہو، لیکن آج میرے الفاظ نشان زد کر لیں۔" اس نے نگاہداری میں خلل نہیں پیش آنے دیا۔ "میں اپنے پیسے لے کر رہوں گا۔One way or another."

سامنے بیٹھے کی مرد کی مسکراہٹ میں مکاری گھل کر واضح ہوئی۔ "دیکھیں گے۔ اب اگر آپ یہاں سے برخاست ہوں تو میرے پاس مزید اہم معاملات ہیں۔"

اس نے اپنے پیچھے دفتر کا دروازہ بند ہوتے سنا۔ کھلی ہوا کے سائے میں کھڑے اس نے اعتاب سے لرزتی انگلیاں مٹھی میں قید کیں اور ایک بھاری سانس اپنے پھیپڑوں میں قبض کی۔

آگے کا پلان اسے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا تھا۔

★★★

کوالالمپور انٹرنیشنل ائیرپورٹ

لاؤنج ایریا

۲۰۱۳ اکتوبر ۷

آسمان پر سیاہی کمبل اوڑھے تھی۔ ارش میں قمر کی چمکدار، سپید شعاعیں بادل کے مرغولے چیرتے ہوئے زمین بوس ہو رہی تھیں۔ ائیرپورٹ لاؤنج کی کھڑکیوں میں نصب قیمتی کانچ سے ٹرمینل کی روشنیاں ٹکرا کر نرم و ملائم کارپٹ پر نقشے دراز کر رہی تھیں۔ فضا میں معمول کی ہلچل اٹھی ہوئی تھی۔ کہیں مدھم سرگوشیاں سنائی دیتیں، تو کہیں پورسیلین کے برتن پر چمچے کانٹوں کی بوچھاڑ ہوتی۔

ٹرمینل میں وقفے وقفے سے کئی اعلانات گونج اٹھتے، جن کے زیرِ اثر مسافرین اٹھ کر ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ سفر کرتے۔

لمبی مسافتوں سے چور چور بدن لیے پسنجر چمڑے کی کرسیوں میں آرام فرما رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر تھرتھرا رہے تھے، کچھ چینی کے نازک کپ سے گھونٹ باگھونٹ اسپریسو حلق میں اتار رہے تھے۔ قریب کسی اسٹال سے تازہ بیک ہوئی پیسٹری کی خوشبو ہوا میں تیر کر نتھنوں کو تلملا رہی تھی۔ کچھ راہ گیر خیالات کے سمندروں میں مغلوب، تارکول کے رن وے کی جانب نگاہیں موڑے تھے، جہاں ہوائی جہاز آہستگی سے ٹیکسی کرتے اپنی پرواز کا اختتام پہنچ رہے تھے۔

اکائر نے دائیں ٹانگ اٹھا کر بائیں گھٹنے پر رکھی۔ اس وقت وہ فلائٹ کریو ایریا میں مقیم چھوٹی، گول میز کی ایک کرسی گھیرے تھا۔ ہاتھ میں ٹیبلیٹ تھا اور کرسی کے پائے کے ساتھ اس کا بریف کیس ٹکا تھا۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا کوٹ اور ہلکے گندمی رنگ کی لینن پینٹس زیب تن کی تھیں۔ اس نے اسکرین سے نگاہ ہٹائے بغیر کیرامل ماکیاٹو کا گھونٹ بھرا۔ تیوری چڑھاتے اس نے کریم کا مزہ زبان سے نیچے اتارا اور ہاتھ میں بندھی گھڑی کو دیکھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رابح آدم کی لیٹ لطیفی اسے صدا کھلتی تھی، لیکن کیونکہ وہ رابح آدم تھا، تو اکائر درگذر فرما لیتا تھا۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔

"پیپرمنٹ؟"

نیلے کاغذ میں لپٹی کینڈی اس کی جانب اچھالتا رابح کرسی کھینچ کر براجمان ہو گیا۔ اکائر نے چونک کر اسے کیچ کیا پھر اس کی صورت دیکھتے ہولے سے مسکرایا۔

"فلائٹ کیسی رہی؟" اس نے کاغذ کھول کر ٹوفی منہ میں ڈالی۔ "ممم، چاکلیٹ والی نہیں تھی؟"

"تم نے رکھوائی تھی؟" سفید یونیفارم کی آستینیں کہنیوں سے اوپر چڑھاتے، رائج نے ایک مصروف نگاہ اس پر دوڑائی اور آرام بخش انداز میں پھیل کر بیٹھ گیا۔ ہیزل آنکھیں نیلے شیڈز کے پیچھے چھپی تھیں اور بھورے بال ہلکے سے بکھرے ہوئے تھے، پھر بھی اس کی کشش میں کمی نہیں آئی تھی۔ کوٹ اس نے کرسی کے ہتھے پر پھیلایا تھا۔ "پانی نکال دو۔"

"یہ بیویوں والی خدمت مجھ سے کیوں کروا رہے ہو؟" اکائر نے منہ بسورتے گلاس میں پانی انڈیلا۔ رائج نے 'تھینک یو' کہتے گلاس تھاما اور تین سانسوں میں سارا پانی اتار گیا۔

"ٹائم سے لینڈنگ ہوئی تھی، لیکن اللہ کی شان، Heathrow والے ایسے ہیں کہ بیس منٹ مجھے پارکنگ اسپاٹ تلاش کرنے میں گزارنے پڑے۔ گراؤنڈ ہینڈلنگ بہت بکواس ہے ان کی۔" اس نے مزید تھوڑا پانی نکالتے لندن والوں کو چند اور القابات سے نوازا۔

اکائر مسکراتا رہا۔ "موسم کیسا تھا؟"

"دس ڈگری۔" گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا۔ "کچھ کھانا کھلاؤ، یار۔"

پچھلے دنوں میں ان کے درمیان قائم سرد مہری ساتھ کام کرنے کے درمیان ہی کہیں دم توڑ گئی تھی۔ اکائر نے نوٹ کیا تھا کہ وہ عادتاً نہایت خاموش طبع اور سلیم انسان تھا۔ اس کے خول کے باہر بسنے والے لوگوں کو سرد، خشک اور اکھڑ معلوم ہوتا تھا، لیکن اپنی دفاعی دیواروں کے پار وہ بہت سیدھا سادھا مرد تھا۔

اس کے برعکس اکائر زمور اخود کو ایکسٹرووورٹ مانتا تھا۔ تقریباً ہر سوشل سرکل میں اس کے چار 'احباب' تو طے تھے ہی۔ لیکن وہ احباب بھی ایسے تھے جو اکائر کے نہیں، بلکہ اس کی اُس تصویر کے دوست تھے جو وہ باہر والوں کو دکھاتا تھا۔ معلوم نہیں کہ قصداً ایسا تھا یا کوئی فطری عمل تھا، مگر اشتراکیت کی گھنی پوشاک کے نیچے، وہ بھی رائج جتنا ہی خاموش اور تنہا تھا۔ وہ دوست نہیں بنا پاتا تھا، کیونکہ انتیس کی عمر میں بھی اسے اپنے مسائل کسی سے بانٹنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اندر اندر پی کر ہر پریشانی خود ختم کر دیتا۔ سوائے کائی

کے، جو ہائی اسکول کے جونیر ائیر سے اس کے ساتھ چسپاں ہو کر رہ گیا تھا، اس لیے کبھی کسی پر اتنا بھروسہ نہیں کیا تھا کہ اپنا دل کھولے۔

اس لیے، یہ حیران کن سے بڑھ کر، غضب ناک تھا کہ رائج آدم کے ساتھ اس کی کچھ حد تک کامیاب اور مخلصانہ دوستی قیام پا گئی تھی۔

چند لمحات بعد رائج گرم کافی کے ساتھ کراسنٹ چگ رہا تھا۔ اکائر نے اپنا ٹیبلٹ اس کے آگے کیا۔ "یہ پچھلی فلائٹ کی رپورٹ ہے۔ مین ٹیننس ٹیم کام شروع کر چکی ہے۔ ائیر کرافٹ میں کوئی مسلئہ تھا؟"

رائج نے ہونٹ پونچھے اور سر نفی میں ہلایا۔ "نہیں، صرف کاسمیٹک ڈیمج۔" پھر ٹیبلٹ پر جھکا اور تیسری انگلی اسکرین پر چلاتے پڑھتا گیا۔ اکائر نے بازو سینے پر لپیٹتے اپنی ماکیاٹو ختم کی۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد دونوں ساتھ ٹرمینل سے باہر نکل رہے تھے۔ رائج اپنے قدموں کے ساتھ سیاہ سوٹ کیس کھینچ رہا تھا، آنکھوں پر اب بھی چشموں کا پہرا تھا۔ اکائر نے ہاتھ میں پکڑی چابی کا بٹن دبایا تو سڑک کے دوسری طرف کھڑی ٹویوٹا آویزا کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس نے رائج کا سامان اندر ڈالا اور ڈگی بند کی۔ وہ اسے گھر ڈراپ کر رہا تھا۔ رات کو ویسے بھی ان دونوں کو کوئی خاص مصروفیات نہیں ہوتی تھیں، تو وہ اکثر وقت ساتھ گزار لیا کرتے تھے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

سیپانگ کی سڑکوں پر گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اکائر ڈرائیور سیٹ میں بیٹھا روڈ میں مکمل جذب ہو چکا تھا، جب کہ رائج کا رخ شیشے سے باہر تھا۔ سر کی پشت کرسی کے سر سے ٹکی تھی اور ہیزل آنکھیں امبر اسٹریٹ لائٹس تلے دمک رہی تھیں۔ اس نے کالر کر بٹن چھڑا لیا تھا اور گردن کی ہلکی ہلکی جھلک نمایاں تھی۔ کچھ سوچے بغیر اس نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر دیا۔ اکائر نے اس کی کارروائی پر کچھ نہیں کہا۔

ہوا کی ٹھنڈی لہریں اس کے گالوں سے ٹکرا کر زلفوں میں روپوش ہو گئیں۔ رائج نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ لمحات ایسے ہی گزرے تھے کہ اسے اپنے چہرے پر ننھے قطرے ٹپکتے محسوس ہوئے۔ اس نے پلکیں

جھپکیں تو شیشے پر بارش کی بوندیں ابھرتی دیکھیں۔ ونڈ شیلڈ وائپرز یہاں سے وہاں حرکت کر رہے تھے اور اکائر سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔

"ایک تو KL کی بارش۔۔۔"

رانج مسکرا دیا۔ "تمھیں نہیں پسند؟" اس نے شیشہ واپس بند کر دیا کیونکہ پانی اندر اڑ رہا تھا۔ اکائر نے اسے حیرانی سے دیکھا اور پھر بے یقینی سے مسکرایا۔

"Don't tell me you're a romantic."

(اب یہ نہ کہنا تم عاشق مزاج آدمی ہو۔)

رانج ہولے سے ہنس دیا۔ اسے اپنے اندر بستی سرنگ میں لمبے عرصے بعد کوئی آہنگ سننے کو ملی۔ احساس غیر معمولی اور انتہائی عجیب تھا۔ اس نے وقت چیک کرنے کے لیے فون کی اسکرین کھولی تو آنکھیں لاک اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔ اچانک ساری روشنیاں، ساری آوازیں دم توڑ گئیں۔ وقتی اطمینان کے تلاب میں پھینکا گیا کنکر اس کا پورا وجود دہلا گیا۔ دھڑکنیں دل میں فنا ہو گئیں اور لہریں کانوں تک بلند ہوئیں۔

رانج آدم یک لمحے میں چار سال پہلے جا پہنچا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"رانج، آل گڈ؟" اکائر متفکر تھا۔ بارش تیزی اختیار کر رہی تھی۔

اس نے کسی ٹرانس کے عالم میں ساتھ بیٹھے مرد کو دیکھا، پھر اپنی فون اسکرین کو۔ انگلیاں پھسل کر چکنی ہو گئی تھیں۔ "آج ادا کا برتھ ڈے ہے۔"

ایک لمحے کے لیے اسے کے چہرے پر سوال تاری ہوا، لیکن پھر جلد شناسائی۔ "ادا۔ او، یور نیس۔"

"مائی ڈیڈ نیس۔" وہ الفاظ نہ جانے کیسے اس برہمی سے اس کے لبوں سے اپنا راستہ بنا گیا۔ بند فون کو دیکھتے جبڑا تنگ ہوا۔ اکائر نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"قبر پر چلیں؟" بہت سوچ کر اس نے کافی دیر بعد کہا۔ رانج کے لیے وہ پیشکش بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ ابرو نا سمجھی میں جوڑے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے سنا ہے شاید تمھیں بہتر محسوس ہو۔ اس کے پاس رہ کر، اس سے بات کر کے۔ مجھے لگتا ہے تمھیں ضرورت ہے، رانج۔"

وہ اسے دیکھتا رہا، پھر گردن موڑتے ایک بھاری سانس خارج کی۔ اکائر اس کے مثبت یا منفی جواب کا منتظر تھا۔ پھر اس نے اس کی ٹھوڑی جھکتے دیکھی۔

اس نے اگلا موڑ ہی مسلم سیمٹری کا کاٹا۔

★★★

بارش اپنے مکمل جاہ و جلال سے برس رہی تھی۔

رات کی سیاہی دائم تھی۔ گدلا پانی جگہ جگہ گڑھوں کی صورت سڑک کے کنارے بھر چکا تھا اور کیاریاں ترنم مٹی سے مہک اٹھی تھیں۔ اکائر نے ڈرائیور سیٹ کا دروازہ کھولا اور ایک ہاتھ میں چھتری تھامے باہر نکلا۔ رانج دوسری جانب سے آزاد ہوا۔ سڑک پر قدم رکھتے ہی اس کے لوفر کیچڑ کے طلاب میں دھنس گئے۔ اس نے برا نہ مناتے پیر باہر کھینچا پھر آہستگی سے چل کر اکائر کے قریب آیا۔

"تم آرام دہ نہیں ہو تو میں گاڑی میں انتظار کر لوں گا۔ لو، یہ لے جاؤ۔" اس نے چھتری رانج کی جانب بڑھائی۔ رانج نے میکانکی انداز میں اس کا ہاتھ پرے کیا۔ چھتری کا سایہ اس سے دور ہو گیا۔ "میرے ساتھ چلو۔۔۔" وہ گھائل آواز میں کہتا اندر جانے مڑ گیا۔ بھیگتا ہوا، روندھا ہوا، ہارا ہوا۔

اکائر اس کے پیچھے لپکا۔

قبرستان میں تاریکی ہر سو تھی، سوائے لمبے پول پر لگی سپید لائٹس کے۔ اکائر متذبذب، کچھ پریشان سا اس کا کندھا چھونے بڑھا۔ "رانج، تم بھیگ رہے ہو۔"

دوسرے مرد نے تو جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی مطلوبہ قبر کی طرف کسی بھی تاثر کے بغیر چلا جا رہا تھا۔ اکائر اس کے ساتھ آ گیا اور چھتری اس کے سر پر کی۔

اب کہ وہ ایک قبر کے آگے گھٹنوں بیٹھا تھا، جس کے پتھر پر سیاہ پینٹ سے درج تھا۔

ADA MURTAZA ABBAS

Daughter of Murtaza Abbas

Born: October 7, 2003

Died: November 18, 2009

(Involved in a plane crash)

وہ بھیگا ہوا تھا، مکمل تر۔ بھوری لٹیں اس کے سپید ماتھے پر سائے ڈال رہی تھیں۔ آنکھیں اس قدر ویران نمایاں ہو رہی تھیں کہ قبرستان کی روشنیاں وہ خود ہضم کر گیا ہو۔

اس نے نم مٹی اپنی انگلیوں سے جکڑی اور ٹھوڑی جھکا لی۔ ایک روہانسی آواز اس کے گلے سے آزاد ہوئی اور اکائر نے چہرہ پھیر لیا۔ لاکھ سخت جان سہی، وہ رانج کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میری بچی، میری جان۔" وہ تڑپ کر گویا ہوا تھا۔ مٹی کو اپنی ہتھیلی میں اور مضبوطی سے جکڑا۔

"سالگرہ مبارک، ادا۔ ابی کا تحفہ قبول کرو۔" اس نے بھیگی پاکٹ سے کچھ باہر نکالا۔ اکائر میں صرف اتنی ہمت تھی کی ذرا سی گردن ترچھی کر سکا۔

کٹ کیٹ۔ وہ کٹ کیٹ کے تین چار لمبے لمبے بار اس کے آگے رکھ رہا تھا۔

اکائر اس چاکلیٹ کی اہمیت سے واقف تھا۔ اسے اپنا گلا سوکھتا محسوس ہوا، لیکن وہ سائے کی طرح پیچھے کھڑا رہا۔ اسے لگا رانج کچھ اور کہے گا، تھوڑا اور روئے گا، مگر اگلے ہی لمحے وہ سرخ گال پونچھ کر اس کے روبرو تھا۔

"چلو۔" اس نے کھردری آواز میں کہا اور کنارے سے نکل گیا۔

"تم خاموش کیوں رہے تھے، رابح؟" سوال اس کا ضمیر پھاڑتے ہوئے باہر نکلا۔ اکائر کو اندازہ نہیں ہوا, کب اس کی سوچ حقیقت بن گئی۔

قبرستان کی دہلیز پر کھڑے رابح کے قدموں کو قفل لگے۔ وقت کی زنجیر دونوں کو تھام چکی تھی۔ ھبوط کا پیا یکایک تیز ہوا۔

"چار سال پہلے۔۔۔" اکائر نے چھتری بند کر دی۔ بارش تھرتھراتی ہوئی اس کے وجود سے ہم آغوش ہوئی۔ "کیوں خاموش رہے تھے؟ تم بے گناہ تھے, تم مظلوم تھے۔"

رابح آہستگی سے ترچھا ہوا۔ پانی کے قطرے اس کی ناک کی ہڈی سے ٹپکتے ہونٹوں پر واضح ہوئے۔ اکائر نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

"خاموشی آخری قدم تھا، اکائر۔" آواز میں جذبات کی ذرا رمق نہیں تھی۔ "خاموشی آخری ذریعہ تھا۔"

"کس چیز کا ذریعہ؟" وہ بے باکی سے پاس آیا۔ آسمان میں بجلی دراڑیں ڈال گئی۔ "تم نے سب وقت کے سہارے کیوں چھوڑا، رابح؟ اپنا نام کیسے اتنا گندا ہونے دیا؟"

"کس کے لیے صاف کرتا نام؟ ماں کے لیے، بہن کے لیے، یا اس عورت کے لیے جو کسی اور کی ہو گئی تھی؟" آواز مقابلتاً تیز ہوئی، اور بارش کی رفتار بھی۔ پانی آج سب بہالے جانے والا تھا۔

اکائر کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کی ایک بے نام منگیتر تھی، جو اسے ان کی تیسری ملاقات میں پتا چلا تھا۔ اس سے زیادہ نہ اس نے کبھی پوچھا تھا، نہ رابح نے بتانے کا شرف عطا کیا تھا۔

"خود کے لیے، رابح۔ کیا تمھاری ذات تمھارے لیے اتنی غیر ضروری ہے؟" وہ افسوس کر رہا تھا یا گھن کھا رہا تھا، رابح نہیں بوجھ پایا، لیکن اس کے الفاظ سامنے کھڑے مرد کو ضرور جھنجھوڑ گئے تھے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اس کی ذات۔ اس کی وہ ذات جسے ختم کرنے کی تدابیر وہ کتنے ہی وقت سے تخلیق کر رہا تھا۔ اس کا تنفس بگڑ سا گیا۔ پھر بھی اس نے شک نہ ابھرے اس لیے بات جاری رکھی۔ "میں نے کوشش کی تھی، اکائر۔ کیا نہیں کیا تھا میں نے؟ پریس کانفرنس، میڈیا کو انٹرویو، وکلاء کے ساتھ ملاقاتیں۔ میں بھی وکٹم تھا! میں نے دنیا سے چیخ چیخ کر کہا، مگر کسی نے نہیں سنا۔"

چار سال بعد وہ یہ سب زبان تک لایا تھا، اور اسے اندازہ ہوا تھا، اس کے زخم اتنے ہی گہرے اور اتنے ہی تر تھے۔

اکائر کی نگاہ داری میں کوئی خلل نہیں آیا۔ "یہ کافی نہیں ہے، رانج۔ یہ کافی نہیں تھا۔ تم اب تک خود ترسی کی سائیکل میں پھنسے ہو۔ تم پہلے انسان نہیں ہو جس کے ساتھ غلط ہوا۔"

رانج کی آنکھوں میں رنج اور غصہ ساتھ ابھرا۔ "تمھیں نہیں پتا، اکائر۔ تمھیں نہیں پتا! جب پوری دنیا آپ سے نفرت کرے، پوری دنیا آپ کو الزام دے۔ تمھیں نہیں پتا۔"

"ہاں، مجھے نہیں پتا۔ ٹھیک کہتے ہو۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ "لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ اپنی ہی زندگی میں بیک سیٹ لے لینا اور اپنی صفائی وقت کے سپرد کر دینا کوئی عقلمندی نہیں۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج نے نظریں ترچھی کر لیں، جبڑے میں ایک عصب پھڑ پھڑایا۔ "میں لڑا تھا، میں بہت لڑا تھا۔ لیکن میری ساری کوششیں، سارے جتن فنا ہو رہے تھے۔ میری چیخیں کسی کی سماعت پر اثر کرنے سے پہلے ہی غائب ہو رہی تھیں۔"

"تم اور اونچا چیختے۔"

اس نے بے اختیار گردن اٹھائی۔

"اپنے پاس موجود ہر ٹول استعمال کرتے۔ پریس کانفرنسیں کافی نہیں تھی۔ تمھیں قانونی کارروائی، پبلک ریلیشنز، شاید سوشل میڈیا مہم کی بھی ضرورت تھی۔ تمھیں اپنا بیانیہ دوبارہ کلیم کرنا تھا۔"

اس کے کندھوں سے کچھ ڈھلک کر گرا۔ شاید، وہ کبھی نہ سنے جانے کا بوجھ تھا۔ اکائر اس کے حقیقی ارادوں سے ناواقف تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ماہر پائلٹ 'فکس' ہونے کے درجے سے بہت آگے نکل گیا تھا۔

رانج آدم ایک سوسائیڈل مرد تھا، اور تینتیس سال کی عمر میں خود کو قتل کر دینے کے علاوہ، اسے کوئی چیز سکون نہیں دیتی تھی۔

"اور اگر کوئی پھر بھی نہ سنتا؟"

"تو تم انھیں سناتے۔" اکائر ڈٹا ہوا تھا۔ "تم جان مارتے، تم چور ہو جاتے، لیکن تم تب تک نہ رکتے جب تک تمھاری کہانی سنی نہ جائے۔"

رانج نے بھنوؤں سے پانی صاف کیا۔ "چار سال گزر گئے ہیں، اکائر۔ اب تو سب جانتے ہیں میں بے قصور تھا۔"

"کیا وہ واقعی جانتے ہیں؟ یا بھول گئے ہیں؟ بے قصور ثابت ہونے میں اور بری ہو جانے میں فرق ہے۔"

اکائر اب اس کے عین مقابل تھا۔ "تمھیں قسمت موقعہ دے رہی ہے۔ بس کرو گھٹ گھٹ کر جینا۔ اپنی اندر کی آگ باہر نکالو۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج اسے پلکیں اُٹھائے دیکھتے گیا۔

"تمھیں انتقام کی ضرورت ہے۔"

یہ آخری فقرہ تھا جو اس نے گمان کیا تھا اکائر زمورا اس سے کہے گا۔ اپنے مورلز پر پختہ مرد ایسے کیسے سوچ سکتا تھا؟

"کس سے انتقام؟" رانج نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

اکائر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے یونی فارم کو۔ "جس نے تمھارا نقصان کیا۔ ملائیشیا ائیر لائنز۔"

رانج کو لگا اس پر پوری چٹان کے پتھر لڑھکا دیے گئے ہوں۔

"میں انتقام میں یقین نہیں رکھتا۔ لیکن جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو یہی ایک آپشن بچتا ہے۔

کارپوریٹ ورلڈ برباد ہے، رانج۔ یہاں ہر روز ایک ملازم اپنی کمپنی، اپنے باس، اپنی سروسز کے تحت پستا ہے۔ کسی کا حق مار لیتے ہیں، کسی کا پیسہ، اور کسی کا نام۔ ان بگ باسس سے کون سوال کرتا ہے؟ یہ کس کو جوابدہ ہیں؟ ان کو کیوں کھلی چھوٹ ملے؟ کیونکہ یہ امیر ہیں، کیونکہ یہ 'باس' ہیں؟" وہ سانس لینے کو رکا۔ کیا نہیں تھا اس کے چہرے پر؟ ملال، عتاب، کوفت۔

"کیوں رانج کیوں؟ کیوں ہم چپ کر جائیں؟ کیوں مرد اپنا حق نہ مانگے، کیوں مرد صفائی نہ دے؟ کیوں ہم مردانگی کی آڑ میں ظلم برداشت کریں؟"

رانج کی آنکھیں اسے تکتی گئیں۔ رات بیت رہی تھی، لیکن اس کی زندگی کی رات تو اب گہری ہوئی تھی۔

"تمھیں کیا ملے گا اس سے؟ تمھاری کیا کہانی ہے؟" اس نے بہت دیر بعد سوال کیا۔

اس نے نم زلفیں انگلیوں سے سہلا کر پیچھے کیں، پھر ایک بے جان سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر امڈ آئی۔ بارش اب کہ تھم چکی تھی۔

"میری جنگ مختلف ہے۔ میں نے ڈیڑھ سال تک الفا گروپ کے سی ای او کو اپنی کنسلٹنگ سروسز فراہم کیں۔ اس پر میرے کئی ملین قرض ہیں، لیکن وہ مجھے ڈوج کر رہا ہے۔ ہر قانونی لوپ ہول اپنے مفاد میں استعمال کر رہا ہے۔"

رانج کی ابرو تنگ ہوئے۔ "تو ہم دونوں سسٹم کے ستائے ہوئے ہیں۔"

قد میں لمبے مرد نے گردن جھکا دی۔ "ہم دونوں کو معلوم ہے کہ بھوکے شیروں کے آگے کنارہ کر دیا جانا کیسا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کچھ تو ہو گا جو ہم ساتھ کر سکتے ہیں، رانج۔ ہم دونوں نااہل نہیں ہیں۔ ایک لمحے کے لیے سوچو: ایوی ایشن انڈسٹری میں تمھاری معلومات اور قانونی اور مالی حربیات میں میری expertise. سچ کو چھوڑو، ہم اپنا حق تو واپس لے سکتے ہیں۔"

رانج نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ اکائر یہ کیا کہہ رہا تھا؟ اگر رانج آدم کی زندگی میں کوئی فرد تھا جس سے اسے نفرت تھی تو وہ اس کا اپنا آپ، اس کا اپنا وجود تھا۔ اور اگر اسے انتقام کا موقع ملتا، تب بھی وہ اپنے آپ کو ہی سولی پر چڑھاتا۔ لیکن اس نے فوراً اس کی آفر رد نہیں کی۔

ایم ایچ تھری سیون زیرو کی پلاننگ میں ایسے کئی موڑ آنے تھے جہاں اسے اس انفارمیشن کی ضرورت ہو گی، جو بطورِ پائلٹ اس کے لیے حاصل کرنا دشوار ہو۔ لیکن، اکائر لیگل معاملات سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ ملائیشیا ائیر لائن کا بزنس کنسلٹنٹ تھا، اور کافی اچھا تھا۔ اندر کے جھول کے بارے میں وہ اسے خبر کر سکتا تھا۔

اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے رانج آدم کو اس بیک بون کی سخت ضرورت تھی جس کا نام اکائر زمورا تھا۔

لیکن اسے عقلمندی دکھانی تھی، کیونکہ اکائر کے ساتھ ہاتھ ملا کر وہ دنیا کو ہی نہیں، بلکہ اکائر کو بھی دھوکہ دے رہا ہو گا۔ اسے گمان میں رکھنا ہو گا کہ وہ اس منصوبے میں برابر کا شریک تھا اور پلان ویسے ہی جائے گا جیسے ان کے درمیان طے پایا ہے، لیکن درحقیقت، سچ سے صرف رانج واقف ہو گا۔ کیونکہ رانج آدم اپنے راز کسی کو بھی نہیں بتاتا۔

"تو تم مجھے استعمال کرنا چاہتے ہو اپنے سی ای او سے بدلا لینے کے لیے؟" اس نے سرسری سا پوچھا۔

"بدلہ نہیں رانج، حق۔ تم اپنی آبرو کے حقدار ہو اور میں اپنی پیمنٹ کے۔ اور ہم دونوں حاصل کر سکتے ہیں، اگر ساتھ مل جائیں۔"

رانج نے نم مٹی کے اوپر ایک قدم آگے لیا۔

"یہ کیسے ہو گا؟"

★★★

"اوکے، آئی نو تم مجھے دماغی مریض سمجھو گے۔"

"ڈیفی نیٹلی۔"

"لیکن میری بات جب تک ختم نہ ہو تب تک کوئی رائے نہ دینا، پلیز۔ ورنہ میں دانت توڑ دوں گا تمھارے۔" اکائر شرمایا شرمایا سا اس کے گھر کے لاونج میں کھڑا تھا۔ آج سن ڈے کا دن تھا اور صبح کے دس بج رہے تھے، اسی وجہ سے وہ رانج کے گھر اپنے پلان سمیت ٹپک پڑا تھا۔ سیاہی مائل گہری بھوری بائیکر جیکٹ اس پر جچ رہی تھی۔

رانج نے انڈا توڑا اور فرائے پین میں گرایا۔ اس نے سفید ڈھیلی ٹی شرٹ اور پجامے پہنے تھے، بال نیند سے بکھرے بکھرے تھے۔ "چلو، سناؤ اپنا ماسٹر پلان جس کے لیے مجھے نیند سے جاگنا پڑا۔" وہ اکائر کو دیکھتے گویا ہوا۔

"اوکے، آرام سے سنو اور پلیز، پولیس کو مت بلا لینا۔" اس کی بات پر رانج محظوظ ہوا۔ جتنا غیر قانونی وہ ایم ایچ تھری سیون زیرو کے حوالے سے سوچ چکا تھا، اس کا متضاد کوئی نہیں تھا۔

"اس پلان کے لیے ہمیں پلین کی ضرورت ہے۔ ایک نارمل فلائٹ کی۔ تم، رانج آدم، اپنی کمپنی سے بدلا لینے کے لیے ایک جعلی سسٹمیٹک خرابی کا ڈھونگ رچاؤ گے۔ کچھ خطرناک نہیں، بس اتنا کہ ذرا سی ہلچل مچ جائے۔ اس کے بعد، اس پلین کی جو بھی منزل ہو گی، اس کو چھوڑ کر، تم یہ پلین کسی اور ملک، کسی deserted ایریا میں غایت 'مشکل' سے لینڈ کرو گے۔ لیکن اس خرابی، اتنی ساری جانوں کو خطرے میں ڈال کر ایک خراب ائیر کرافٹ کو زیرِ حرکت رکھنے کے جرم میں، ملائیشیا ائیر لائن کو قانونی ذمہ داری لینی پڑے گی۔ یہی ہوا تھا ناں دو ہزار نو میں؟ خراب ائیر کرافٹ انجینیئر کے لاکھ روکنے کے باوجود بھی اڑایا گیا تھا، اور اس کا الزام تمھیں دے دیا تھا۔"

رائج دنگ سا اس کی شکل دیکھے گیا۔ یہ اکائر نے سوچا تھا؟ وہ واقعی یہ سب سوچ سکتا تھا؟ ایک لمحے کے لیے وہ اپنا اصلی پلان، ماس مرڈر سوسائیڈ، کے بارے میں مکمل بھول گیا تھا، اور اس پلان کو پرکھنے لگا تھا، لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل سا گیا۔ انڈے کو پین میں ہلاتے اس نے اس سے نظریں ملائیں، جو ہونٹ کاٹتے کھڑا تھا۔

"تم تو اچھے خاصے کریمنل مائنڈ ہو۔" رائج نے مسکراتے ہوئے کہا تو اکائر کے گال سرخ ہوئے۔ "اس میں تم اور تمھارے سی ای او کی انٹری کب ہو گی؟"

وہ پورے جوش سے اچھل کر بیٹھا۔ "اس ہی دوران۔ بس ہمیں ایک چیز کرنی ہو گی اس پلان کے لیے۔"

"وہ کیا؟" رائج نے انڈا پلیٹ میں اتارا۔

"الفا گروپ کے سی ای او کو کسی طرح اس فلائٹ میں چڑھانا ہو گا۔ اگر یہ ممکن ہو گیا تو سب صحیح جائے گا۔ بیچ آسمان میں وہ نہ اپنے وکیلوں کی مدد لے سکتا ہے، نہ ہی سکیورٹی کی دھمکی دے سکتا ہے۔ ہم ساتھ مل کر اس سے دوچار ہوں گے۔ وہ اتنا بے بس ہو گا کہ پیسے دینے سے کترا نہیں پائے گا۔"

"اور اگر اس نے فلائٹ کے لینڈ ہوتے ہی تم پر کیس کر دیا؟ بلیک میل اور ریمی فیکیشن وغیرہ۔"

"پیسے میرے ہاتھ آ جائیں، اس جیسے چار خرید لوں گا میں۔ اور کس بات کا کیس؟ وہ خود بھی جانتا ہے جو بھی قبضہ اس نے کیا ہے غیر قانونی ہے۔ پیسے میرے ہیں۔" اکائر سنجیدہ تھا۔

"ہمم۔" رائج کے پلان میں فلائٹ نے لینڈ نہیں ہونا تھا، لیکن اسے اکائر کے پلان کی پیروی کرتے اسے یقین دلانا تھا کہ ہاں، فلائٹ نے لینڈ ہونا تھا اور ماحصل پر غور کرنا بہت ضروری تھا۔

"اکائر، تمھیں پتا ہے ناں تمھارا پلان بارڈر لائن اللیگل ہے؟"

اس نے ضبط سے نظریں جھکا لیں، سرخ و سفید ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھل بند کیں۔ "مجھے پتا ہے۔"

رائج سینے پر ہاتھ لپیٹے اسے دیکھے گیا۔ "پھر بھی کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے میرے پیسے چاہیے ہیں۔"

"کوئی اور راستہ کیوں نہیں ڈھونڈتے؟" اچانک اس کے لہجے میں نرمی جھلک آئی۔ وہ اکائر کی معلومات سے کتنا ہی مطمئن کیوں نہ ہو، MH370 میں اس کی شرکت نہیں چاہتا تھا۔

"ڈیڑھ سال سے میں یہی کر رہا ہوں، رانج۔ میں تھک گیا ہوں چیخ چیخ کر۔"

رانج نے چائے کا کپ اس کی طرف کیا۔ "اور اونچا چیخو۔" اس نے اس کا جملا اسے واپس لوٹایا۔

سرمئی آنکھیں اس پر محفوظ ہوئیں۔ "یہ، یہ پلان میرے اونچا چیخنے کا نتیجہ ہے۔ میں کچھ غلط نہیں کر رہا، اپنا پیسہ واپس لے رہا ہوں۔ بس۔"

"اور جو جعلی سسٹمیٹک فیلئیر ہو گا؟"

"وہ جعلی ہو گا، رانج۔ اس سے مسافرین کو، کسی کو، کسی بھی موڑ پر کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ نہیں ہونی چاہیے۔ میں اپنے پیسوں کی لالچ میں انسانی زندگیاں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اسی لیے یہ پلان جب ہی فائنل ہو گا جب تم کہو کہ ہاں، تم کسی کی جان خطرے میں ڈالے بغیر یہ انجام دے سکتے ہو۔"

جیسا کہ اس نے سوچا تھا، اکائر کے مورلز اب بھی پختہ تھے۔ اور ایک وہ تھا، جسے ٹراما کے پیچھے چھپ کر کئی سو زندگیوں سے سانسیں کھینچنے کا خیال ڈراتا تک نہیں۔ رانج کو اس پل اندازہ ہوا وہ سچ میں بے حس ہو گیا تھا۔

"اور اگر میں یہ پلان نہ قبول کروں، تو؟ کیسے واپس لو گے اپنے پیسے؟"

اکائر خاموش ہو گیا، نظریں خمیدہ ہوئیں۔ ایک ہاتھ سے اس نے اسٹول کا کنارہ تھاما۔ "میں نے نہیں سوچا ہے فی الحال۔"

رانج کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ایک جگہ وہ اکائر سے ہاتھ ملا کر اس کی مدد یقینی بنا سکتا تھا، لیکن دوسری جگہ اکائر کی موجودگی اس کے اصل پلان، ایم ایچ تھری سیون زیرو، کے لیے کئی دشواریاں پیدا کر سکتی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر سے پورا معاملہ چھپانا مشکل ہی نہیں، بلکہ عنقریب ناممکن ہو گا۔ اور اگر اسے ایک پل کے لیے بھی رانج کے حقیقی ارادوں کی بھنک کی پڑ گئی، تو اس کا ردِ عمل فوری اور انتہائی ہو گا۔ معاملہ کٹھن تھا۔

"یہ۔۔۔ عمر سعید کو فلائٹ میں چڑھانے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" اس نے پانی کی سطح ناپتے سوال کا کنکر اچھالا۔ اکائر خاموشی سے سوچنے لگا۔ "میں وہی سوچ رہا تھا۔"

"ایسا کر سکتے ہیں..." رانج نے بریڈ کا ٹکڑا کاٹ کر منہ میں رکھا۔ "اس کے کسی بندے کو پیسے کھلا دیتے ہیں، جو ہمیں اس پر اپڈیٹڈ رکھے۔ مجھے یہ بتاؤ، اس کا کون سے ممالک سب سے زیادہ آنا جانا ہے؟ فار اینی ریزن۔"

"چین۔" اکائر بلا توقف بول اٹھا۔ "اس کے گھر والے اور آدھا بزنس ادھر سیٹ اپ ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ کئی بار گیا ہوں۔"

"چائنہ۔۔۔" رانج بڑبڑایا۔ "چھ مہینوں میں کتنی بار جاتا ہے؟"

اکائر ہنس دیا۔ "چھ؟ وہ ہر مہینے ایک دفعہ جاتا ہے۔"

"ملائیشیا ائیر لائن؟" اس نے کانفرمیشن چاہی۔

"ہمیشہ۔ سی ای او اس کا دوست ہے۔ فلائٹ فری اور سیٹ VIP ملتی ہے۔"

رانج زیرِ لب مسکرانے لگا۔ "پھر معاملہ سیٹ ہو گیا۔ اس کے کسی چیلے کو نوٹ ٹھونستے ہیں، وہ اس کی فلائٹ شیڈول ہمیں بھیج دے گا۔ اگر اس کی پرانی عادت ہے تو ہر ماہ کی ایک تاریخ فکس ہو گی چائنہ جانے کی۔ پہلا ہفتہ یا آخری ہفتہ۔ ہم اسی حساب سے پلان کریں گے۔"

"مجھے سسٹمیٹک فیلئیر کا ڈر تھا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا ہم نے ناٹک کیا ہے؟" اکائر گھبرایا ہوا سا بولا۔

"تو ہم جھوٹ نہیں بولیں گے ناں۔" رانج نہایت اطمینان سے گویا ہوا تو اکائر کی تیوری چڑھی۔

"کیا مطلب؟"

"ہم جھوٹ نہیں بولیں گے، ہم جھوٹ بنائیں گے۔" اس نے کانٹے سے انڈا الگ کرتے زبان پر رکھا۔

"پرانے پچھلے مین ٹیننس ریکارڈ، لیگل ڈاکیومنٹیشن، میڈیا کا کھیل۔ جب پلین میں موجود ہر بندہ گواہی دے گا کہ ہاں، ہمیں خطرہ تھا۔ ہاں، پلین خراب ہوا تھا۔ جب ایک کے بعد ایک ان پر قانونی مقدمے چڑھیں گے تو نکل کر سانس تک نہیں لے پائیں گے۔"

"اور اگر ائیر کرافٹ چیک ہوا اور اس میں جھول نہ نکلا؟"

رانج اس کی معصومیت پر مسکرایا۔ "تم بہت پیارے اور بہت شریف انسان ہو، اکائر۔ جرم کا دامن تھام کر بھی صالح مرد رہنا چاہتے ہو۔ جب اتنے چھوٹ گڑھیں گے تو سب سے اہم کیسے چھوڑ دیں؟ Expert testimony. بس، پیسہ کھلانے کے لیے تیار رہو۔ بڑا مہنگا کام ہے یہ۔"

اکائر نے کنپٹی سے پسینہ صاف کیا۔ "پیسہ مسئلہ نہیں۔"

"بس، پھر کیا مسئلہ ہے؟" رانج چائے کا گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ باہر جتنا مطمئن نظر آ رہا تھا، اس کا دل اندر سے اتنا ہی دیوانہ بنا ہوا تھا۔ وہ یہ کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ واقعی اکائر کے ساتھ اپنا سیاہ انت جوڑ رہا تھا؟ کیا وہ اسے دھوکہ دے رہا تھا؟ یہ مرد جو اس کے پاس اتنی امید لیے حق اور سچ کی بات کرنے آیا تھا، اتنی چاہ سے اسے اپنا دوست مانتا تھا، کیا رانج اسے MH370 میں قتل کر دے گا؟ اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

اس نے کپ پرچ میں رکھا۔ "ایک شرط پر میں یہ پلان ماننے کو راضی ہوں۔"

اکائر جو اپنے سارے مسائل سلجھ جانے کے باعث وقتاً چہک رہا تھا، فوراً اس کی بات سننے آگے بڑھا۔

"تم مجھے ہر وہ معلومات دو گے جس کی مجھے ضرورت ہوئی۔ ہر چیز، بغیر سوال جواب۔"

"ڈن۔"

"اور تم کبھی میرے ایتھکل کوڈ (اخلاقی کردار) پر انگلی نہیں اٹھاؤ گے۔ مجھے جو ٹھیک لگے گا میں ویسے ہی کروں گا۔"

"بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔" اکائر نے فوراً بات جوڑی۔

"یہ پلان فول پروف نہیں ہے، اکائر۔ لیکن ہم کوشش کریں گے ہو جائے، چاہے جتنی دیر لگے۔ لیکن اس کے بارڈر لائن اللیگل پلانز میں نقصان کا خدشہ حقیقی ہوتا ہے۔ تمھیں اتنا رسک لینا پڑے گا۔"

"کتنا نقصان ہو سکتا ہے؟" اکائر کافی دیر بعد بولا۔

"مار پیٹ، بلیک میل، انٹیمیڈیشن، بقیہ سیفٹی اشوز۔"

"کسی کی جان تو نہیں جائے گی ناں؟" اکائر نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔

"جا بھی سکتی ہے۔"

"نہیں، نہیں! اگر 0.2٪ چانس بھی ہے کسی کی جان کا تو میں یہ پلان نہیں کر سکتا۔ میں اپنی زندگی بھر کی کمائی لٹا سکتا ہوں لیکن معصوم خون بہتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"اچھا، آرام سے۔ میں کوشش کروں گا معاملہ کبھی وہاں تک نہ پہنچے۔"

"نہیں، رابح کوشش نہیں۔ مجھے یقین چاہیے، وعدہ چاہیے۔"

"کوشش بھی یقین رکھنے والے ہی کرتے ہیں۔ اگر تم مجھ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو بہتر ہے ہم ابھی نہ کہہ دیں۔"

اکائر کافی دیر خاموش رہا پھر اس کی آواز ہولے سے بلند ہوئی۔

"مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

رابح کا دل یکدم ٹھہر گیا۔ اس نے بے اختیار نگاہیں اوپر کیں۔ اکائر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ "ڈیل؟" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

رابح نے اس کے کھلے ہوئے ہاتھ اور چمچماتے چہرے کو دیکھا، پھر اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھایا۔ مصافحہ مضبوط تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"ڈیل۔"

رانج آدم نے زندگی میں شاید ہزارویں بار محسوس کیا تھا، کہ وہ ازل سے ہی بدبخت تھا۔

★★★

۱۰ دسمبر، ۲۰۱۳

"یہ عمر سعید کا اسٹاف تو بہت ہی وفادار نکلا۔"

"چھوڑو ناں، ہمارا کام تو ہو گیا۔ بس اب اس کا پی اے تمیز سے رپورٹ دے اور زیادہ بک بک نہ کرے۔"

دو ماہ بعد رانج آدم اور اکائرز مورا سیاہ ٹویوٹا آوینز امیں براجمان اپنے منصوبے کے مضافاتی اقدامات کو کرید رہے تھے۔ اب تک ان کے پلان میں کوئی سنگین عیب یا رکاوٹ پیش نہیں آئی تھی، اسی لیے دونوں قدم قدم اپنا کام کر رہے تھے۔ انھوں نے کام بانٹے ہوئے تھے۔ عمر سعید اور اس کے پلان سے جڑتی ساری انفارمیشن اور قانونی معاملات اکائر کے ذمے تھی، جب کہ فلائٹ اور ایوی ایشن کے حوالے سے سارے انفارمیشن رانج سنبھال رہا تھا۔

"کیچ اپ پکڑاؤ۔" کاغذ میں لپٹے برگر کی تہیں کھولتے اکائر نے انگوٹھے سے بقیہ ساس صاف کی۔ رانج نے خاکی تھیلے میں سے کیچ اپ کا ساشا اسے تھمایا، ساتھ ہی اس کا سوڈا کین۔

"ویسے تمھیں یہ پیسے چاہیے کیوں ہیں؟ کوئی خاص کام کروانا ہے ان سے؟" رانج نے عرصے سے دماغ میں اڈتے سوال کا اظہار کیا۔

"یہ میرے اپنے ہوتے تو شاید میں چپ کر جاتا۔ مگر یہ میرے بھائیوں کے ہیں اور بہت ہیں۔ میں نے انھیں زبان دی ہوئی ہے کہ جب میرے پاس پیسہ آیا ان کے معاملات میں انویسٹ کروں گا۔ روبن اپنے بچوں کو اسکالرشپ پر آسٹریلیا بھیجنا چاہتا ہے۔ نکولاس کو اپنی فوٹ بال اکیڈمی میں کام کروانا ہے۔ اڈرین

نے ون یارڈ کا وعدہ لیا تھا مجھ سے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری ذمہ داری کوئی اور پوری کرے۔" اس نے خمار آلود نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

ڈرائیو تھرو کے پار افق پر شام کا پہر اڈلا تھا۔ بھینی بھینی طوفانی ہواؤں کی سرسراہٹ ہر سو تھی۔ سیاہ بادل، غضیل اور سوجے ہوئے سے، آسمان پر کروٹیں بدلتے لہروں کی صورت مشرق سے مغرب جا پہنچے تھے۔ ان کے کنارے ہر کچھ دیر کے وقفے کے بعد، دور دست چمکتی بجلی سے روشن ہو جاتے۔ فضا میں مساوی مقدار میں امن اور بے امنی موجود تھے۔

رابح نے اسے دیکھتے ہوا میں منڈلاتی بارش کی مہک اپنے آپ میں اتاری۔

"میری فیملی میرے لیے سب کچھ ہے، رابح۔ میں ہر خسارہ، ہر غم بھلا سکتا ہوں، مگر اپنی فیملی سے غافل نہیں رہ سکتا۔" سرمئی آنکھیں رخ موڑ کر اس کی جانب مائل ہوئیں۔ ہیزل آنکھیں ٹکٹکی باندھے اس سے جڑی رہیں، مگر ان کے پیچھے کئی تصاویر یک بعد دیگرے ابھرتی مٹتی گئیں۔

کبھی چھ سالہ رابح، کبھی پندرہ سالہ، کبھی اکیس سالہ۔ کہیں ماں کے سرہانے، کبھی رباب سے بے تکلف، کبھی ادا سے ہم آغوش۔ مرتضٰی اور رباب کے نکاح پر ان دونوں کو چھیڑتے ہوئے، کہیں رات گئے تک گٹار بجاتے ہوئے، فیملی آؤٹنگز، خاندان کی کوئی شادی، دبئی سے آتی رباب کی بے وقت کالز کیونکہ وہ بس اسٹاپ تک جاتے بور ہوا کرتی تھی۔

اس کی ماں، اس کی بہن، اس کی بھانجی، اس کا بھائی جیسا بہنوئی۔ کئی لمحات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ سب ختم ہوا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں تمھیں تمھارا پیسہ ضرور واپس ملے گا۔" وہ یکایک اس مصمم ارادے سے بولا کہ دو پل اکائر بھی بوکھلا گیا، پھر چکن کا پیس چگتے مسکرایا۔

"اور میں وعدہ کرتا ہوں، تمھیں تمھارا انتقام ضرور ملے گا۔ ملائیشیا ایئر لائن کبھی سر نہیں اٹھائے گی دوبارہ، اور اٹ لیسٹ، اگر غیرت ہو گی تو نہیں اٹھائے گی۔"

اس کا انتقام، رابح کا دل کیا ہنس دے۔ وہ جو اسے استعمال کر کے اپنی منصوبے کو کامیاب بنانے کی جست میں تھا، ایسے انسان کا انتقام کیا ہی ہو سکتا تھا؟ پوری دنیا میں کسی نے اس کے ساتھ اتنا غلط نہیں کیا، جتنا اس کی اپنی ذات نے کیا۔ اسی لیے اس پوری دنیا میں اسے کسی سے اتنی نفرت نہیں تھی، جتنی خود سے تھی۔ اس کا انتقام اپنی ذات سے تھا۔

"چلو، میرے گھر چلتے ہیں۔ وہاں جا کر فلائٹس چیک کرنی ہے۔ تم نے کہا تھا تم نے عمر سعید کے خلاف کچھ ڈھونڈا ہے؟" اکائر نے نشانہ لیتے کچرے کا تھیلا سڑک کنارے لگے بن میں پھینکا اور گاڑی کے گئیر تبدیل کیے۔

"ہاں، کافی دلچسپ معلومات ہے۔" رابح مسکرایا، سر موڑ کر باہر دیکھا تو سائے لمبے اور سیاہی میں نم تھے۔

"تمھارا گھر؟ تمھارے ساتھ تو۔"

"ہاں، کرائے دار رہتے ہیں، لیکن ان کا پورشن نیچے ہے۔ میرا کمرہ اوپر ہے۔ صرف مین ڈور ایک ہے، اور کچن اور۔۔۔"

"سمجھ گیا۔ تو تم ان کے پورشن میں رہتے ہو سارا دن۔ What a third wheel you are." رابح نے مسکراتے ہوئے تمسخر اڑایا، تو اکائر بھی ہنس دیا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ سارا دن میں جاب پر ہوتا ہوں۔ صرف صبح اور رات فری ہوتی ہے۔ ہم نے وقت سیٹ کیے ہوئے ہیں کچن کے۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کے وقت میں نہیں آتا۔"

"بڑی فیملی ہے کیا؟" آسمان کے پردوں پر بتدریج مداخلت کرتی شب میں بوندیں زوال پذیر ہوئیں۔ مٹی میں پانی کے سیاہ نشانات اپنا داغ چھوڑ گئے۔

اکائر نے سر نفی میں ہلایا۔ "صرف میاں بیوی۔ دراصل، جو ہسبنڈ ہیں ناں، وہ میرے ابا کے جاننے والے ہیں۔ انھوں نے آؤ بھگت میں پورا گھر اٹھا کر اتنے کم کرائے میں انھیں دے دیا۔ خیر مجھے اس سے مسئلہ

نہیں تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پھر میرے پیچھے کیوں پڑ رہے ہو بھئی؟ مجھے الگ گھر ہی نہیں لینے دیا۔ کہہ رہے تھے، 'اپنا گھر چھوڑ کر کون گدھا کرائے کا گھر لے گا؟' میں ہوں گدھا، بننے دو مجھے گدھا۔ لیکن نہیں۔" اکائر نے بھی الف تا یے ساری کہانی کھول کر رکھ دی۔ رانج اس کی تقریر پر محظوظ ہوا۔

"ویل دیٹس او کورڈ۔" وہ ہمدردی میں مسکرایا۔

اکائر نے منہ بنایا، لیکن اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسٹیرنگ ویل سے موڑ کاٹا تو دور سے ہی بھورے دروازے والا بنگلہ چمکتا دکھائی دیا۔ اس نے گئیر نیچے کیا اور گاڑی ذرا فاصلے پر روکی۔ ونڈ شیلڈ وائپرز یہاں سے وہاں پانی صاف کر رہے تھے۔

"رکو، میں احتیاطاً پوچھ لیتا ہوں۔ کہیں مائنڈ نہ کر جائیں۔"

"میرے گھر ہی چل لیتے ہیں مسلہ ہے تو۔" رانج نے تجویز کی۔ ویسے بھی اب تک تمام پلاننگ اسی کے گھر میں ہوئی تھی۔

"او نہوں، بہت سمجھدار ہے۔ آئیم شیور اسے برا نہیں لگے گا۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔ ٹیکسٹ کروں گا تو آجانا اندر۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ بارش کی ننھی بوندیں شیشے کے پار اس کا قد دھندلا گئیں۔ سیاہ سفید سوٹ میں ملبوس مرد دور جاتا رہا۔ رانج نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا۔ ہیزل آنکھیں بیک ویو مرر میں اپنی پیشانی پر جم گئیں۔ کیونکہ آج اس کی فلائٹ نہیں تھی، تو وہ یونی فارم نہیں پہنے تھا۔ ہلکے سرمئی رنگ کی فلینل سوٹ جیکٹ اور سفید پولو ٹی شرٹ اس پر کافی اچھی لگ رہی تھی۔

اس نے بھورے دروازے کے کھلنے کا عکس دیکھا، لیکن فاصلے اور درمیان میں ٹپکتی بارش میں کچھ اور اخذ نہیں کر سکا۔ چند سیکنڈز بعد ہی اکائر کا ٹیکسٹ آچکا تھا۔ وہ اسے اندر بلا رہا تھا۔

★★★

اس نے روش کے قریب جوتے اتارے۔ اکائر سیڑھیوں پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رابح کی نگاہیں بے اختیار گھر کی انٹیریئر پر پڑیں اور دل ہی دل میں، وہ عش عش کر اٹھا۔ سپید و سنہری بتیاں سیلنگ میں نصب تھیں، ماربل کا سیاہ و سفید کچن، باون انچ کا ایک بڑا ٹی وی، اور کمرے کی وسعت میں رکھا سبز و سفید صوفہ سیٹ۔ گھر عالیشان تو نہیں، مگر قابلِ قبول سے کئی درجات بڑھ کر تھا۔

لاؤنج کی دائیں جانب بنے روم کا دروازہ بند تھا، لیکن سنہری روشنی کی پٹی اس کے نیچے بنتی خلا سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ رابح نے اندازہ کیا کرائے دار ادھر ہی ہوں گے۔

"آ جاؤ۔" اکائر زینے چڑھتا گیا۔ رابح بھی گردن جھکا کر پیچھے ہو لیا۔

مالک مکان کا کمرہ نیچے کے برعکس بے حد سادہ اور مختصر ترین چیزوں سے آرستہ تھا۔ اکائر نے اپنا بریف کیس بیڈ پر ڈالا اور کوٹ دیوار میں لگے ہینگر میں لٹکایا۔ ایک سنگل بیڈ، ایک لمبی الماری، ایک کمپیوٹر ٹیبل اور ایک بیڈ سائیڈ دراز کے علاوہ کمرے میں صرف دو سنگل سیٹر صوفے پڑے تھے، جس میں سے ایک پر رابح دراز ہو گیا۔

"تمھارا گھر کافی خوبصورت ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو اکائر دو پل ٹھہر کر مسکرا دیا۔

"ہاں، نیچے جو کپل رہتا ہے ان کی وائف یہ سب سجاوٹ کرتی رہتی ہیں۔ ورنہ مجھ سے تو اپنے آپ کو نہیں سجایا جاتا، گھر کیا سجاؤں گا۔" رابح ہولے سے ہنس دیا، مگر اس کی بات سے اسے ضرور کوئی یاد آیا تھا۔ کتنی تراکیب، کتنے منصوبے بنائے تھے اس نے کسی کے ساتھ۔ کتنا شوق تھا کسی کو اس کی زندگی سنوارنے کا، ہر خالی جگہ میں رنگ بھرنے کا۔

اس کی مسکان اتنی ہی جلدی معدوم ہو گئی جتنا جلدی ابھری تھی۔

اکائر اس کے سامنے بیڈ پر براجمان ہوا اور ہاتھ بڑھا کر اپنا ٹیبلٹ اون کیا۔ "یہ لو، چیک کرو۔ میں نے فلائٹس ڈھونڈیں ہے اگلے دو سے چھ ماہ میں چین جانے والی۔ تم بتاؤ یہ پلان کتنا جلدی کرنا ہے؟"

رانج بھی اب کہ سنجیدہ تھا۔ "جلدی مسئلہ نہیں، ہمیں یہ ٹھیک کرنا ہے۔" ٹیبلیٹ پر انگلیاں چلاتے اس نے اسکرول کیا۔ "کیا کہہ رہا تھا اس کا پی اے؟ کب جاتا ہے وہ چین؟"

"ہر منتھ کے پہلے ہفتے۔"

رانج نے گردن ہلائی، پھر ٹیبلیٹ پرے رکھا۔ "اس کو دھمکانے کا اچھا خاصا سامان ملا ہے۔ عمر سعید ملٹری پیپٹ ہے۔" اس نے ایک چپ نکال کر اکائر کو دکھائی جس کی آنکھیں حیرت سے گول ہوئیں۔ اس نے جھٹ پٹ اپنا سی پی او اسٹارٹ کیا۔

کافی دیر میں، اچھی خاصی پلاننگ کے بعد، رانج نے ایک نقشہ اس کی کھڑکی پر چسپاں کیا۔ اکائر پیچھے بیڈ پر ہتھیلیوں کے بل وزن ڈالے پھیلا تھا۔ فلینل جیکٹ میں ملبوس مرد نے ہاتھ میں ریڈ مارکر پکڑے جگہ جگہ سرخ دائرے لگائے۔

"یہاں سے ٹیک آف۔ کوالالمپور۔" پہلا دائرہ۔

"یہاں ابتدائی ہیڈنگ۔ اوور مالائی پینن سولہ۔" دوسرا دائرہ، مقابلتاً بڑا۔

"اس کے بعد، یہ۔" اس نے مارکر کی نپ تھائی لینڈ پر گھونپ دی۔ "اوور بینکاک۔" ایسا گمان ہوتا جیسے اپنے پیشے سے وفاداری اس کے خون میں سرایت کرتی ہو۔

"پھر لاؤس۔" اس نے لاؤس کے پہاڑی سلسلوں پر لکیر کھینچی۔ اگلے لمحے میں اس کے جبڑے میں تنگی واضح ہوئی۔ چند ثانیے مارکر ہوا میں تحلیل رہا، پھر اس نے آہستگی سے اس کا کنارہ فلائٹ پاتھ پر رکھا۔ پیچھے سرخی نمایاں ہوئی۔

"پھر ویتنام۔ ہوچی من۔" وہ دائرہ لگا کر اکائر کی طرف گھوما۔ "لیکن یہاں ایک ٹوئیسٹ آئے گا۔" اس نے مارکر کا ڈھکن لگایا۔

بیڈ پر گرا مرد گفتگو کی سنگینی بھانپ کر سیدھا ہوا۔

"مجھے ATC سے کمیونیکیشن ختم کرنی ہو گی۔ ٹرانسپونڈر بند کرنا ہو گا۔"

اکائر جانتا تھا اس کے کیا معنیٰ ہیں، پھر بھی رابح نے سمجھایا۔ "تاکہ پلان کے اگلے حصے سے ہم سسٹمیٹک فیلئیر کا کام شروع کریں۔ رابطہ ختم کرنے سے قبل، مالائی ایئر کنٹرول ہمیں ہوچی من کے پاس فارورڈ کر دے گا۔ اصولاً طیارے کی فریکوئنسی نوٹ کر کے ATC والے خود ہی رابطہ جوڑ لیتے ہیں، لیکن جب میں ٹرانسپونڈر بند کر دوں گا، تو پلین کے سارے الیکٹرانک سگنلز بھی غائب ہو جائیں گے۔" رابح نے نقشے پر ایک سحر انگیز نظر ڈالی۔ "ایسے ہو گا جیسے۔۔۔۔"

"The plane doesn't exist."

اکائر نے جملا مکمل کیا، پھر بے یقینی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "واؤ۔" بے اختیار اس کے منہ سے چھوٹا۔

"تم ہارڈ ڈرائیو پر جو بھی ڈیٹا لیتے ہو اسے ڈسکارڈ کرتے ہو ناں؟" رابح ایک دو فائلز پلٹتے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں، میں نے برنر فون بھی لیے ہوئے ہیں۔"

"فلائٹ سے پہلے اپنا سارا ڈیٹا، بلکہ پورا سی پی یو ہی خالی کر دینا۔ فزیکل فارم میں جو چیزیں ہوں انھیں بھی جلا دینا۔" وہ حتمی انداز میں سمجھا رہا تھا۔ یہ والی ساری باتیں ان کے مشترکہ، اور رابح کے ذاتی منصوبے میں یکساں تھیں۔ اسی لیے وہ اکائر کے دم پر اپنے پلان میں کوئی گڑبڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک ان کے درمیان اکائر کے فون کی رنگ سنائی دی۔ نوٹی فکیشن کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور اسکرین اون کی۔ ایک مسکراہٹ بے اختیار اس کے لبوں پر کھل اٹھی۔ رابح کے لیے یہ منظر کچھ غیر مانوس تھا۔

"میری کرائے دار نے کچھ ڈرنکس بنائی ہیں۔ میں لے کر آتا ہوں، تم بیٹھو۔" وہ بتاتے ہوئے کھڑا ہوا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ فائل کے کنارے رکھیں اس کی انگلیاں ادھر ہی تھم گئیں، اور اس نے گردن دروازے کی جانب کی جہاں سے اکائر ابھی نکلا تھا۔ کچھ اسے کھٹکا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

جتنی دیر میں وہ واپس آیا تھا، رانج اس کا کمرہ کافی حد تک سمیٹ کر ستھرا کر چکا تھا۔ اکیلے رہنے میں اسے صفائی کی خاصہ عادت ہو گئی تھی، اور بے ترتیب چیزوں سے تو اسے الجھن تھی۔ بد نظمی اسے زندگی کے اس بھیانک ترین دور کی یاد دلاتی تھی، جب وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں قید ہر حس کھوتے ہوئے ضائع ہو رہا تھا۔

ٹرے میں رکھے دو گلاسوں کو سنبھالتے اکائر نے پیر سے دروازہ بند کیا۔ رانج اس کی جانب مڑا جس کا چہرہ چمک کر گلابی گلابی سا نظر آ رہا تھا، مگر بولا کچھ نہیں۔

"کیا ہے یہ؟" وہ صوفے پر جا بیٹھا۔

"تے تاریک (teh tarik)۔ میری کرائے دار نے بنائی ہے۔ تمھاری آنے کی خوشی میں۔" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا اور ٹرے کافی ٹیبل پر رکھی۔ رانج جو بغور اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا، چائے کا نام سن کر بے جا ٹھٹک گیا۔ آہ، چار سالوں میں پہلی بار اسے کسی نے دوبارہ تے تاریک کی پیشکش کی تھی۔

اسے آج بھی یاد تھا، اس نے اپنی زندگی کی بہترین تے تاریک ظبیہ یمین کے ہاتھوں پی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سواد کا جادو تھا اور کھانے کی ہر شے پر اس کا ماہرانہ قلاب تھا۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے تھی، جنھیں born chef کہا جاتا ہے۔

جب بھی وہ اپنی اماں کے ہمراہ اس کے گھر چکر لگاتا، وہ ہمیشہ مُسکراتے ہوئے اسے سرو کرتی، اور اس کی خدمت کرنے میں خود سے کافی مطمئن ہوتی۔ ظبیہ کا انداز ہی ایسا تھا۔ وہ ایسی محبت کرتی تھی جو اس کا اپنا آپ روند جائے۔

رانج جبراً مسکرایا۔ "میری طرف سے شکریہ کہنا۔" اس نے ٹرے اپنی طرف کھینچی اور ایک کپ اٹھانے ہاتھ بڑھایا ہی تھا، کہ اس کا ہاتھ ٹھٹک کر رکا۔ سانس پسلیوں کی درمیان کہیں قید ہو گئی۔ انگلیوں نے حرکت ترک کی۔

دونوں گلاسوں میں قید کریمی، بھورے رنگ کی چائے کے اوپر ٹوتھ پک کی نوک سے ایک ڈیزائن تراشا گیا تھا۔ ایسے نشانات اکثر کیفے اور ریستوران اپنی کافی اور چائے کو سنوارنے کے لیے ڈالتے ہیں، لیکن وہ وہ نشان جانتا تھا، اور یہ وہ نہیں تھا۔

یہ انفینٹی کا نشان تھا۔

"کیا مطلب ہیں اس کے؟ تم ہمیشہ یہ بناتی ہو۔"

رائج سینے پر بازو لپیٹے کاؤنٹر کے برابر جھکا تھا۔ برابر کھڑی ظبیہ گہرے نیلے رنگ کے ڈریس میں کھڑی تھی۔ بھوری رنگت کچن کے بلبز تلے چمک رہی تھی اور سیاہ گھنگریالی لٹیں آج بے حد سلجھی ہوئی سی اس کے کندھوں پر ریشم کی طرح پھسلی تھیں۔ زرین نے اسے زبردستی اپنے اسٹریٹنر کے آگے بٹھالیا تھا، اور پھر اس کی بالوں کی جھول سدھار دیے تھے۔

رائج ان پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

ظبیہ کاؤنٹر پر رکھے سب ٹی کپس میں ایک بعد ایک ٹوتھ پک سے نشان بنا رہی تھی۔ ایک زیرو، دوسرا زیرو۔ انفینٹی!

اس کے سوال پر وہ ٹھٹک کر رکی، اس کا ہاتھ کپ کے کنارے تحلیل رہ گیا۔ اس کے تازہ چہرے پر ایک نازک سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے نگاہ اوپر کی، تو وہ ساتھ کھڑا متجسس نظروں اس کا منتظر تھا۔

"بس، مجھے اچھا لگتا ہے۔" اس نے خاموشی سے کہا، نظریں جھکائے رکھیں۔

رائج ذرا سا قریب ہوا، کہنیاں ماربل کے کاؤنٹر پر ٹکائیں۔ "بس اچھا لگتا ہے؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"

وہ مسکراتے ہوئے زور دینے لگا۔ ظبیہ گھبراہٹ میں تھوڑا دور ہوئی۔ رائج کی توجہ اسے ہمیشہ سے 'عجیب کر دیتی تھی۔ چائے کی دھیمی خوشبو ان کے درمیان کسی تیسرے فریق کی طرح موجود تھی۔

اس نے ایک گہری سانس اندر لی۔ "یہ انفینٹی کا نشان ہے۔" الفاظ کی جھجک عیاں تھی، بھوری آنکھیں کپ میں بنتے ڈیزائن کو آہستگی سے سہلا رہی تھیں۔ "اس کے معنی ہوتے ہیں کچھ جو چلتا رہے۔ کبھی ختم نہ ہو۔ لا انت۔"

رانج نے ایک ابرو اٹھائی۔ "کبھی ختم ہو؟ لائیک، چائے کی پیالیاں جو کبھی ختم نہ ہوں؟" اس پر الگ مسخرہ پن چھایا تھا۔

ظبیہ کی مسکراہٹ بھی گہری ہوئی، اور وہ دھیمی سے ہنس دی۔ "شاید، یا شاید یہ کچھ لمحات کے بارے میں ہے۔ وہ لمحے جو کبھی ختم نہ ہوں۔" اس نے آخر میں نگاہیں رانج سے ملائیں۔

وہ اس کی بات کے زیر اثر تھوڑا پیچھے ہوا اور ایک سانس باہر چھوڑی۔ ایک نظر کپ کو دیکھا، پھر اسے۔

"انفینٹی ہی کیوں؟" اس نے سر کو ترچھا کرتے نرمی سے پوچھا۔

ظبیہ کے دل میں لہر سی بن کر دوڑی۔ اس کی نظروں کا وزن اتنا تھا کہ اس کی انگلیاں کپکپا اٹھیں۔ اس نے ٹوتھ پک کنارے رکھی۔ "ایک یاددہانی کے طور پر؟ کہ کچھ چیزیں، کچھ لمحات، کچھ رشتے وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رانج آدم کو لگا اس کا دل پھٹ پڑے گا۔

اس کے ہاتھ میں لغزش تاری ہوئی، تن بدن میں جیسے سو سوئیاں گڑنے کی سنسناہٹ ہوئی۔ اس نے اکائر کو دیکھا۔ وہ منہ پھیرے فون چارجنگ پر لگا تا کچھ کہہ رہا تھا، مگر اس کا دماغ کہاں سن رہا تھا؟ اس نے بے حد دشواری سے ایک کپ تھاما۔ اس کی انگلیوں میں ذرا توازن نہیں تھا۔ سیرامک کپ چرچرا رہا تھا۔ اب جواب پانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔

اس نے کنارہ منہ سے لگایا اور ایک گھونٹ بھرا۔ چار سال ایک لمحے میں طے ہو گئے۔ یہ وہی تھی۔

یہ نیلے لباس میں حسن بکھیرتی وہی تھی، یہ تمان تُن ڈاکٹر اسماعیل کی بنگلو کی چھت پر اس کے روبرو وہی تھی، یہ رباب کے نکاح پر اس کی سانسیں روک دینے والی وہی تھی، یہ اس کے زخموں کی پاسداری کرتی وہی تھی، یہ اس کی تاک میں انگنت راتیں جاگتی وہی تھی، یہ سرخ عروسی لباس میں تیار کسی اور کی ملکیت وہی تھی۔

یہ وہی تھی، اور یہی وحی تھی۔

اور اس مکمل انکشاف کا مجموعی تصفیہ ایک ہی تھا: ظبیہ یمین اکائرز مورا کی کرائے دار تھی۔

رائج اگلا آدھا گھونٹ بھی نہ پی سکا۔ وہ بے خودی میں صوفہ چھوڑ کر کھڑا ہوا۔

گلاس میں اسٹرا چلاتے اکائر نے ایک ابرو اونچی کی۔ "کیا ہوا؟"

"میں۔۔۔ مجھے گھر جانا ہے۔ ایک کام ہے۔"

"ادھر کر لو کام۔ ہال وے کے لیفٹ میں واش روم ہے۔"

"نہیں، مجھے۔۔۔" اس نے پیچھے سے اپنی جیکٹ اور والٹ سمیٹا۔ انگلیاں مسلسل تگ و دو میں تھیں، گویا کہ اس کے جسم میں خون کی حاجت ہو گئی ہو۔ "بعد میں بات ہوتی ہے۔"

اکائر ہڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ "کیا ہوا ہے، یار؟ کوئی پرابلم ہے؟"

"ہٹو سامنے سے۔" وہ نہ نظریں ملا رہا تھا، نہ بات کر رہا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اگلے پل باہر نہ نکلا تو ادھر ہی گھٹ کر مر جائے گا۔

"لیکن۔"

"ہٹو!" وہ تنگ جبڑے کے ساتھ غرایا۔ اکائر ہکا بکا سا دو قدم پیچھے ہوا۔ رائج اسے بغیر دیکھے زینے اترتا چلا گیا۔ دماغ کے لاکھ ٹوکنے کے باوجود اس کے دل نے ظلم کرتے اسے ایک بہ آرزو نگاہ آس پاس دوڑانے پر

عاجز کر دیا۔ لاؤنج اب بھی خاموش پڑا تھا۔ روح کے کسی حصے میں آسودگی تاری ہوئی، تو کوئی اس دیدار کی ضرر سے شکست خوردہ لوٹا۔

ایک عرصے بعد ظبیہ یمین اس کے اعصاب پر چھائی تھی، اثر مابعد تو یقینی تھے۔

وہ مین گیٹ تک پہنچا، ٹھنڈی بے جان انگلیوں سے لاک کھولنے کے عمل میں پھنسا ہی تھا کہ اسے اپنے ہمراہ کمرے میں وجودیت کا احساس ہوا چلا۔ اس کے گردن کے پٹھے اکڑ گئے۔ نامعلوم، سرخ سی تپش اس کی جلد کی پور پور چھو گزری۔ سانس لینا کٹھن تر امر بن گیا۔

قدموں کی چاپ آہستہ، مگر گھمبیر تھی۔ رائج کو اس ہی شتابی سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی اور تھا۔ اس کے حواس سلجھنے چاہیے تھے، لیکن وہ اکڑے رہے۔ وہ دھیمے سے ترچھا ہوا۔

سامنے پچاس کے ہندسے کو چھوتا مرد سفید ڈھیلی شرٹ کے ساتھ پجامے پہنے تھا۔ پیشانی پر اس کی سیاہ، اور کچھ حد تک، سفید بال بکھرے تھے جو ان کے پیچھے نمایاں ہوتی ناگواری کی شکنوں کو بمشکل چھپا رہے تھے۔ سیاہی میں لپٹی بھوری نگاہیں رائج کا آنکھ گاڑ کر معائنہ کر رہی تھیں۔

"ابا نے میرا رشتہ دیکھا ہے ایک پچاس سالہ امیر جیولوجسٹ کا۔"

"میرے ابا مجھے دھمکا رہے ہیں۔ وہ مرد بار بار میرے گھر چکر لگا رہا ہے۔ وہ امید کھو رہے ہیں۔"

"وہ انتظار میں ہیں کہ تم سے ایک بھول ہو، اور وہ مجھے کہیں دور کھینچ لے جائیں۔"

اچانک، اس کا دماغ سفر کرتا کوئی اور حالات سے جا ملا، تو اس کی مٹھیاں بے اختیاری میں بھینچ گئیں۔

بازو سینے پر لپیٹتے سامنے کھڑا مرد ایک اور قدم آگے آیا۔ ایک ماضی سے داغا سانچہ اور دوسرا حال کی تلافی کا صلہ، دونوں مرد نگاہ داری میں خلل ڈالے بغیر روبرو تھے۔ غزار نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ کچھ تھا اس کی نظر میں، کچھ تپتا ہوا جو اس کے کھلے زخموں پر سیسا انڈیل رہا تھا۔ رائج نے پیچھے بنا لاک تھاما۔ نگاہیں پہلے اس ہی نے ہٹائیں۔

"سیلامت تنگال۔(خدا حافظ)" ہولے سے کہتے، اس نے کڑی کھولی اور برستی بارش میں ظبیہ یمین کو ایک بار پھر اپنے پیچھے چھوڑ آیا۔ فرق اتنا تھا، کہ چار سال قبل، یہ اس کا جواب تھی، اور چار سال بعد یہی اس کا انتخاب تھا۔

★★★

کوالالمپور انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے ٹرمینل سے گزرتے رانج نے ناک پر چڑھے ایویایٹر سنگلاسز پیچھے کیے۔ سنہرے فریم میں دمکتے بھورے شیشے شہد رنگ بتیوں تلے اجاگر تھے۔ صبح سویر کے آغازی گھنٹوں میں بھی چمکتے ٹائلز پر ہر سو مسافرین کا رش واضح تھا۔ نفاست سے جمے بھورے بالوں تلے کان میں لگا بلیوٹوتھ پیس دوسری جانب موجود آواز سے اسے جوڑے رکھی تھی۔ کال کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی، اور پھر آخر کار اسے اٹھالیا گیا۔

"اتنی دیر؟" اس نے ناراضگی سے استفسار کیا، لہجے کا ٹھہراؤ قائم رہا۔ اس کے قدم اسے پھرتی کے ساتھ مسافرین کے ہجوم سے دور کھینچ کر لے کر جا رہے تھے۔ باوسعت کندھے، جاندار ٹانگیں اور گہرے نیلے یونی فارم میں دمکتا اس کا سراپا۔ یونیفارم کے کنارے لگی سنہری پٹیوں والا بیج اس کے درجے اور ملائیشیا ایئرلائنز میں اس کے مقام اور مرتبہ کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔ فلورسنٹ لائٹس رانج آدم پر الگ ہی کھلتی تھیں۔

"ہاں، بھئی۔ نہیں ہوں تمھاری طرح کا 'مارننگ پرسن۔'" اکائر کی چڑچڑی، نیند میں ڈوبی آواز کی رسائی اس تک ہوئی۔ پھر اس نے رک کر ایک جمائی لی۔ "صبر کرو۔ لیپ ٹاپ سیٹ کر رہا ہوں۔" رانج نے اندورنی طور پر اس کی باتوں پر سر جھٹکا اور فلائٹ ڈسپلے پڑھنے کے لیے نگاہیں اسکرین پر مرکوز کیں۔ اس کی پرادا میں مہارت جھلکتی تھی، جیسے پر راستہ، ہر عمل اسے حفظ ہی نہیں، اس کی روح و گوشت کا حصہ ہو۔

رائج کو دوسری جانب سے ایک دھیمے سُر کی اواز سنائی دی تو اس نے آنکھیں گھماتے سر جھٹکا۔ "صبح صبح گانے کون سنتا ہے؟" وہ حیران تھا، اور اس کی عادات سے دلچسپ بھی۔

"میں۔ میرا دماغ چلتا ہے ایسے۔ کام کی بات کرو۔ کیوں کال کی ہے؟" دوسری طرف وہ کسی پتیلی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ کیفے کے پاس سے گزرتے گرما گرم کافی اور سینڈوچز کی خوشبوئیں اس کی نتھنوں سے ٹکرائیں تو رائج ایک تمنائی آہ بھر تا رہ گیا۔ اس نے دماغی طور پر نوٹ بنایا کہ فلائٹ سے پہلے کچھ کھا لے گا۔ ویسے بھی وہ اکثر ناشتہ گول کر دیا کرتا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا، تم ایک بار ری تھنک کر لو، اکائر۔ ہمارا پلان۔" اس نے کافی مطمئن لہجے میں، بغیر کسی دباؤ یا تنقید کے بات کا آغاز کیا، ساتھ ہی TSA آفیسرز کے استقبال کو سر کو خم دیتے قبول فرمایا۔

اکائر کے تو جیسے سر سے لگی تلوؤں میں بجھی۔ "اب اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ ایک تو نیند، اوپر سے ناشتے کا سامان نہیں، اوپر سے پلے لسٹ میں ڈھنگ کا گانا نہیں، اور اس کے اوپر رائج صاحب اخلاقیات سکھا رہے تھے۔ یہ سب صبح دس بجے ہی ہونا تھا؟

"ون سیکنڈ، میں چیکنگ کروالوں۔" اس نے کہا تو اکائر سمجھ گیا تھا اس کی پھر کوئی صبح سویر کی پرواز تھی اور وہ ائیر پورٹ کے انتظامات سے گزر رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکتے اپنا فرج چھاننا شروع کیا۔

رائج نے اپنا ہینڈ کیری conveyor belt پر رکھا، پھر مصالحت آمیز طریقے سے گھڑی اور بیلٹ اتار کر میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرا۔ اس کی قامت مستحکم اور چال نڈر تھی۔ دوسری جانب سے اپنا سامان اکھٹا کرتے اس نے اکائر کو مخاطب کیا۔

"دیکھو، ہمیں چھ ماہ گزر گئے ہیں، اکائر۔ اب تک سب سکون سے گزرا ہے۔ کچھ جگہ مشکلات آئی ہیں، کچھ جگہ خدشات بھی رہیں گے جیسے کہ میں نے پہلے کہا تھا، لیکن میں پھر بھی چاہوں گا، تم آخری فیصلہ سوچ

سمجھ کر کرو۔ اگر پیسے حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ ہے تو اسے اپناؤ۔ تمھاری زندگی کا سوال ہے۔ فلائٹ کے بعد کیا ہو گا، کوئی نہیں جانتا۔" اس نے اپنی ٹائی سدھاری اور یونی فارم سے شکنیں مٹائیں۔

یہ ساری بات وہ خاصا شعور رکھتے کر رہا تھا۔ اس کے دل کے کسی کونے سے ہر کچھ دن بعد آواز اٹھتی کہ رانج آدم، تم تو موت کے لائق ہو، لیکن اپنے ساتھ کیوں کسی اور کو غرق کرنا چاہتے ہو؟ وہ جس نے تم پر بھروسہ کیا۔ اکائر کو اس پلان میں شامل کرنا اس کی بچی کچی انسانیت کو گھائل کر رہا تھا۔ لیکن وہ بھی بلا کا ضدی مرد تھا۔ پتا نہیں کیوں مرنے کے لیے مرے جا رہا تھا۔ رانج کا دل کیا اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔

"ہم اگر کسی مشکل میں پھنس گئے، کچھ غلط ہو گیا تو مجھے نہیں پتا ہم کیسے مقابلہ کریں گے۔ میں کیسے مقابلہ کروں گا۔ میں نے تم سے کہا تھا میں اس فلائٹ کے بعد فلائنگ چھوڑ دوں گا۔ مجھے اب اڑان سے خوف سا آتا ہے، اکائر۔ بادلوں میں خون دکھتا ہے، آسمان تاریک لگتا ہے۔ اب میں قیام چاہتا ہوں۔ اب میں رک جانا چاہتا ہوں۔ بس بہت اڑ لیے۔" سکیورٹی گیٹ پار کرتے، اس کے قدموں میں ہلکی سے لرزش اتر آئی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ وہ زیادہ بول گیا تھا, لیکن شکر خدا کا اکائر خاموش رہا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

"بتاؤ، اکائر۔ عمر سعید سے پیسے لینے کا کوئی اور طریقہ ہے؟ ہم وہ کر لیں گے۔ تمھیں اس فلائٹ میں نہیں آنا پڑے گا۔ تم نے میری مدد کی، اس کا اجر تمھیں کسی اور طرح مل جائے گا۔"

وہ اب بھی خاموش تھا، لیکن گانے کی ہلکی دھن اس کے پیچھے سنی جا سکتی تھی۔ گیٹ ایجنٹ کو رانج نے ایک مسکراہٹ سے نوازتے، اپنی آمد کی آگاہی دی۔

لیکن بات کرنے کے لیے ادھر ہی ٹھہر گیا۔ "مجھے پتا ہے الفا گروپ والے بہت خبیث، بہت مکار لوگ ہیں، لیکن کچھ تو ہو گا اس کے علاوہ۔۔۔؟" اکائر کی خاموشی اسے چبھنے لگی تو اس نے تیوری مسلتے اسے بلایا۔

"تم میری بات سن بھی رہے ہو؟"

"ہاں، سن لیا ہے۔ عمر سعید بڑا چڑیل آدمی ہے۔"

اس کے الفاظ پر رابح سانس بھرتے رہ گیا، پھر کچھ دیر بعد اس نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔ "تمھارے کتنے پیسے ہیں اس کے پاس؟" اسے یہ پتا تھا کہ رقم بڑی تھی، لیکن باقاعدہ پیسے اس نے آج تک پوچھے نہیں تھے۔ اس کے عقب میں PA سسٹم سے ہوتے اعلانات جاری تھے، مدھم گُفتگو اور دور دراز گنگناتے جیٹ انجن۔

"بہت زیادہ ہیں، تم گالیاں بکو گے۔" اکائر بے آرامی چھپاتے ہنسا تھا۔ اس نے آنکھیں گھمائیں۔

"وہ تو میں ویسے بھی بک دوں، اماؤنٹ بتاؤ۔" اب کہ اس کا راستہ جیٹ برج کی جانب تھا۔ لائن کی دوسری جانب مرد نے اس کی بات سنی تھی، مگر سرے سے درگذر کر گیا تھا۔

"اکائر، تم مجھے اگنور کر رہے ہو۔"

"ویل، ایسا نہیں ہے میں نے کورٹ میں اپیل نہیں کی۔" وہ بلاوجہ اپنے دفاع میں لگا تھا۔ رابح کو جھلاہٹ ہوئی۔ اور پھر وہ منہ بھر بھر کر بددعائیں قابل سی ای او کی جھولی میں اتارنے لگا۔ رابح نے اسے آرام سے سنا، پھر اسے عمر سعید سے ایک آخری دفعہ ملنے کا مشورہ دیا، اور اسے پتا تھا اکائر کو یہ مشورہ کتنا ناگوار گزرے گا۔ پھر بھی وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ اسے ایم ایچ تھری سیون زیرو سے کہیں ڈور بھیجنا چاہتا تھا۔ اور توقع کے مطابق، اکائر برس پڑا تھا کہ وہ کس طرح اس مطلبی اور مجرم آدمی کے آگے مزید اپنے ہی پیسوں کی بھیک نہیں مانگنا چاہتا تھا۔ کاش، رابح اسے بتا سکتا کہ اگر اس کی ذرا سی بھیک سے کام ہو جائے، تو وہ اپنی زندگی کا سودا کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اکائر زمور امنہ بگاڑ چکا تھا۔

رابح نے جیٹ برج پار کرتے آسمانی نیلاہٹ کو آنکھوں میں اتارا۔ خوبصورت۔ پُل کے اختتام پر ائیر بس A330 کا سفید رنگ طیارہ اس کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مدھم سا مسکرا دیا۔

"میں لائن پر ہوں۔" رائج کے آواز کے سنگ بادلوں کی گرج دوسری جانب اپنے باورچی خانے میں کھڑے اکائر کو بھی سنائی دی تھی۔ وہ منہ پھلائے دودھ کی بوتل کھولنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ رائج اسے اس مرد کے واپس بھیج رہا ہے جو پہلے ہی اسے اتنا دھتکار چکا تھا۔ اف، ایک تو یہ کون Hulk تھا اس کے گھر میں جو دودھ کی بوتلیں قارون کے خزانے کی طرح بند کرتا تھا؟ حد ہو گئی، مطلب۔

"میں اب بھی لائن پر ہوں۔" رائج بھی اسے چین سے روٹھنے نہیں دینے والا تھا۔ ٹایلر سوئفٹ کی آواز بانگسار کے کچن سے ہوتی ہوتی رائج آدم کے KLIA تک کا سفر طے کر چکی تھی۔

Enchanted.

گلاس وال سے چھن کر آتی سورج کی پیلی شعاعوں تلے رائج آدم کے قدم اپنی منزل کی جانب رواں تھے۔ راستے میں کئی کریو ممبرز نے اسے سلام پیش کیا۔ وہ ان کا جواب منہ اور سر کے اشاروں سے دیتا آگے بڑھتا رہا۔ بلیوٹوتھ اس کے کان میں اب بھی اٹکا تھا۔

بانگسار میں قائم اس دو منزلہ بنگلے کے باورچی خانے میں کھڑے اکائر کی پشت پر صبح سویر کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ دنیا و حال سے مکمل بے نیاز مرد ہاتھ میں تھامی دودھ کی بوتل پر جھکا اپنی مکمل طاقت اس پر لگائے تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ھبوط کا پیہ بھاگا تھا یا تھم گیا تھا، لیکن دونوں کی تقدیر کا سرخ دھاگہ ایک ہی جال سے ٹوٹا تھا۔

ہلکی چاپ کب راہداری پار کر آئی اسے معلوم نہیں ہوا، لیکن اگلے لمحے اس تلائی روشنی میں پر نور کچن میں صرف ایک نفس نہیں تھا۔ گہری نیلی شرٹ اور کالے ٹراؤزرز پہنی ظبیہ کے کمر تک آتے سیاہ، گھنگریالے بال آدھے بندھے تھے اور چہرے پر صبح سویر کی تازگی نمایاں تھی۔ ہلکی نمی بھی اس کی تیوریوں پر چمک رہی تھی اور بھوری آنکھیں اپنی گھنی پلکوں سمیت سحر انگیز لگ رہی تھیں۔ البتہ نازک انگلیوں سے اس نے دائیں آنکھ کے گرد ایک کپڑا پکڑ رکھا تھا، جو اندر رکھی برف کی وجہ سے گیلا ہو چکا تھا۔

رائج کے سیاہ ٹمبر لینڈ تنگ سے جیٹ برج کو قدم بہ قدم سر کر رہے تھے۔ ائیر کنڈیشنر سے بہتی خنک ہوائیں اس کے آس پاس فضا میں گنگنا رہی تھی۔ دور کہیں سامان لوڈ کیا جا رہا تھا، اس سے بھی دور ٹرمینل کے اعلانات گونج رہے تھے۔ فیول اور پلین کے انٹیریئر کی شفاف خوشبو اس کی قوتِ شامہ پر ایک حسین احسان تھی۔

"میرا ٹائم ہے۔"

اکائر کی آواز اسے بلیوٹوتھ پیس میں گونجتی سنائی دی۔ اسکائے برج کے درمیان سو کے لشکر میں شامل رائج آدم کے قدم یکایک قفس میں جکڑے۔

اکائر کسی سے ہم کلام تھا، اور رائج دو ماہ سے بخوبی واقف تھا کہ اس کے گھر میں اور 'کون کون' رہتا تھا۔ اس نے بارش والے دن کے بعد سے اس کے گھر جانے سے احتراز برت لیا تھا۔ وہ نہ کبھی اکائر سے 'اس' بارے میں کچھ پوچھتا، نہ ہی بات کو اس طرف جانے دیتا۔ محض یہ علم ہی اس کے فہم و ادراک پر ایسے بوجھ بن کر برسا تھا، کہ وہ اور جانکاری برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

مسافرین کا ریلا اس کے گرد کسی سیلاب کی مانند تیر رہا تھا، اور وہ ائیر کرافٹ کے دروازے کے باہر رک چکا تھا۔ انگنت فاصلوں کے درمیان، صرف کسی کی موجودگی، رائج آدم پر آج بھی وہی اثر رکھتی تھی۔

جواب بھرا گیا تھا، مگر لب و لہجہ مکمل نسوانی تھا۔ اس کے دل نے کئی دھڑکنیں مس کیں۔ چار سال گزر گئے تھے، ایسی شدت وقوف سے باہر تھی، لیکن جو تھا وہ تھا، اور وہ رائج کو اپنے دل سے اٹھتا اور کانوں میں گونجتا سنائی دے رہا تھا۔

وہ کئی منٹ ادھر ہی رکا رہا۔ اکائر مائیک سے ہٹ کر کچھ کہہ رہا تھا، اس کی آواز دور ہو گئی تھی۔ رائج کا پورا وجود کان بنا ہوا تھا۔ اسے صحیح سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ان کی گفتگو دھیمی تھی، کچھ اس کے اپنے اندر کا شور ہی بہت اونچا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" تین الفاظ تھے، یا تین سو جذبات، اس کی پلکیں خود کارانہ طور پر بچھ گئیں۔ ہاتھ میں پکڑا بریف کیس سرخ و سفید انگلیوں کے جال میں مزید سختی سے قید ہوا۔ ظبیہ بول رہی تھی، اور رابح سن رہا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا اس کے آس پاس لوگ اسے کس طریقے کا وحشی تصور کریں گے، لیکن وہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ کیوں کہہ رہی تھی؟ اس کا لہجہ کڑک تھا، ٹھوس۔ کیا یہ وہی ظبیہ تھی؟ اس کی ظبیہ؟

"ظبیہ، کب؟" اکائر پوچھ رہا تھا۔ اس کے الفاظ میں اختیار تھا، ضبط تھا، گویا وہ کسی اپنے سے استفسار کر رہا ہو۔ حق سے۔

"آج صبح، کل رات، کل صبح، پرسوں، ایک ماہ پہلے! پچھلے پانچ سال سے۔" ظبیہ ٹوٹ چکی تھی، اور اسے لگا تھا کسی نے اس کا سینا گولی سے چھان دیا ہو۔ اس کا آپ ذرہ ذرہ ہوا پڑا تھا، اور لائن کی دوسری طرف وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی، کراہ رہی تھی۔

اولین ظلم تو یہ تھا، کہ وہ آنسو نہ اس کے لیے تھے، نہ اس کی وجہ سے۔ رابح آدم اس کی زندگی میں اب کسی باب میں جگہ نہیں رکھتا تھا، حالاں کہ ظبیہ یمین وہ مخطوطہ تھی جس سے اس کی پوری ذات کا موضُوع تَسلسَل مَربُوط تھا۔

اس کی سانس اٹک گئی، بدن میں بجلی نے ایک غوطہ لگایا۔ کون سی چوٹ؟ کون سا ظلم؟ وہ اپنے ہی گھر میں رو رہی تھی، وہ بھی اپنے شوہر کے آگے نہیں، بلکہ ایک دوسرے مرد کے سامنے۔ چاہے وہ ہمدرد تھا، یا غم گداز، اس بات کا صرف ایک ہی مطلب نکلتا تھا۔

کیا ظبیہ یمین کی شادی ناکام تھی؟

وہ جسے وہ سالوں پہلے چھوڑ آیا تھا، وہ جس کی جدائی کا کرب اس نے سالوں سال سینے میں دبایا تھا، وہ جس کا نام اس نے اپنے علاوہ کسی کے ساتھ کبھی سوچا تک نہیں تھا، خوش نہیں تھی؟

رانج کو اپنا آپ وہ لکڑی لگا جو جل جل کر راکھ نہ ہو، وہ کانچ لگا تھا جو پک پک کر سیاہ نہ ہو، وہ سورج لگا تھا جو پھٹ پھٹ کر فنا نہ ہو۔ آگ سی چبھن، آگ سی خار، ساڑھے چار سالوں کے ہر دن، ہر گھنٹے اسے محسوس ہوتی رہی۔ اس نے خود کو مار دیا، بار بار، کئی بار۔ ظبیہ خوش ہو گی، وہ بہت خوش ہو گی، یہی تسلی دی تھی اس نے خود کو۔

اس کا دماغ تصویریں بُنتا رہا، وہ ان میں ڈوبتا رہا۔ ہنستی، مسکراتی آنکھیں جو اب نمناک تھیں۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن اس ضرر کا اعلان تھی جو ظبیہ یمین اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے برسوں پہلے خیر کے لیے بڑا قدم اٹھالیا تھا، خود سے دور بھیج کر اس کا مستقبل سنوار دیا تھا، لیکن آج اسے معلوم ہو رہا تھا، کہ وہ کس قدر غلط تھا۔ مردوں میں جان ڈھونڈتے، اس نے کسی جاندار کی سانسوں پر ڈاکہ ڈال دیا تھا۔

اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکا، بند انگشت خون کی حاجت سے سفید پڑ رہے تھے۔

وہ رو رہی تھی، اکائر کچھ پوچھ رہا تھا، مگر اس کا دماغ کہاں کچھ سن رہا تھا؟ ارد گرد ائیر پورٹ دھواں بن گیا، اس سماعت میں صرف دل مروڑ دینے والی سسکیاں تھیں۔

"رانج، میرا ظالم! رانج، میرا قاتل!" اس کا ایک ایک آنسو یہ کہتا ہو گا، ایک ایک بد دعا میں اس کا نام ہو گا۔ چلو، وہ اسے یاد تو رکھتی تھی، بد دعاؤں میں ہی سہی۔ اس کے دل کو جو تسکین پہنچی تھی وہ قابلِ شرم تھی۔

رانج کا وجود ڈور فریم پر دھیرے سے ڈھے گیا، بصارت دھندلی ہوئی، آنسو آنکھوں کی تجلی پر امڈتے اسے نیش کر گئے۔ وہ رو رہی تھی، اور وہ سن رہا تھا۔ وہ اسے سنانا نہیں چاہتی تھی، وہ پھر بھی سن رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے اس جہنم میں تھی، وہ پھر بھی اس کے خاطر ٹھہرا تھا۔

وہ عورت جو شاید اس سے نفرت کے علاوہ آئندہ کچھ نہ کر پائے، اس کے لیے رائج آدم کے دل کی پہلی خواہش آج بھی اسے اپنے آغوش میں بھر کر اس کے آنسو صاف کرنے کی تھی۔

اس کا دماغ بھاگ رہا تھا، کوئی راستہ، کوئی حل، کوئی جواب، لیکن ایک بار پھر وہ اسے نااُمید بھیج رہا تھا۔

حقیقت کٹھور تھی، سنگ، خنک۔

وہ آج بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بلندیوں کی جانب جا رہا تھا، اور وہ پستیوں میں جکڑی تھی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی، اور رائج تو کبھی جڑا ہی نہیں تھا۔

اس نے بلیوٹوتھ کا ٹکڑا ایک جھٹکے سے کان سے آزاد کیا۔ اس چھوٹی سی ڈوائیس کا وزن کئی اینٹوں جتنا تھا۔

کیبن کی ٹھنڈی ہوا بھی اس کے اندر جلتی آگ بجھا نہیں سکتی تھی۔ ایک بھاری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

اسے سنجیدہ رہنا تھا، مگر اذیت شدید ہی نہیں عذاب تھی۔ اس نے پیشانی دروازے کے ٹھنڈے میٹل پر ٹکائی، آنسوؤں کو بمشکل اندر اتارا۔

"کیپٹن، آپ ٹھیک ہیں؟" فلائٹ اٹینڈنٹ کی پر فکر آواز بہت بعد میں اس کے دماغ میں درج ہوئی۔

وہ جواب نہیں دے سکا۔ اسے الفاظ ہی نہیں ملے۔ اس کے دماغ کے پردے پر چھائی واحد تصویر اس کی تھی، جسے وہ پس پشت چھوڑ آیا تھا۔ اس کا پورا وجود رنج کی نذر ہونے کو تھا۔

ہاتھ کپکپا رہے تھے اور دماغ حصہ حصہ تھا۔ اس نے جیب میں فون ٹٹولا اور اکائر کا نمبر ڈسکنکٹ کیا۔ وہ اور نہیں سن سکتا تھا، لیکن اس کی پیروی کرتا سکوت مزید جان لیوا تھا۔

ائیر کرافٹ کی دیواریں اس پر تنگ ہو چکی تھیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"آئی ایم سوری۔" سرگوشی کی، آواز بیچ سے چیخ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود سے کہہ گزرا تھا، اس سے، یا خالی ہوا سے۔ اسے خود کو ترتیب دینی تھی، کام کرنا تھا، ٹوٹنے کا وقت فی الحال نہیں آیا تھا۔ اس کی محبوب عورت تڑپ رہی تھی، اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دماغ کا ایک گوشہ پھر بھی چیخ رہا تھا۔

"جاؤ! حاصل کرو اسے۔"

"دوڑو! چھڑا لاؤ اسے۔"

"رانج آدم، کبھی تو عہد نبھاؤ!"

فلائٹ اٹینڈنٹ کی آواز نے ایک اور بار اس کا خمار توڑا۔ "کیپٹن، ہمیں بورڈنگ شروع کرنی ہے۔"

اس کا سر میکانکی انداز میں اوپر نیچے ہوا، جسم کا ایک ایک پٹھا اکڑا تھا۔ کاکپٹ کی جانب قدم بڑھاتے، اسے ان کے درمیان چڑھتا فاصلہ زندگی میں دوسری دفعہ اپنی محبت پر غالب آتے نظر آیا تھا۔

★★★

کوالالمپور انٹرنیشنل ائیرپورٹ نے ہمیں وہیں ڈھونڈ لیا ہے جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

یہ جگہ آخر اتنی اہم کیوں ہے؟

رات گیارہ بجے سات مارچ کی رات جگمگاتی بتیاں ہر سو ٹرمینل ون کو اجاگر کیے تھیں۔ اس کی حدت میں موجود لوہے کے لمبے ستون اور چکنے ٹائلوں والا فرش مسافرین کو آرام اور حفاظت بخشنے کے لیے ہی تو بنے تھے۔ بورڈنگ لسٹ پر سرخ اور زرد الفاظ میں فلائٹ کے نام، منزل اور وقت درج تھا۔ مسافرین ان سطور کو پڑھتے، دہراتے اور حفظ کرتے ادھر ہی کہیں بیٹھ جاتے یا گردونواح میں ٹہل لگاتے رہتے۔

ائیرپورٹ مقام ہی ایسا تھا۔ وہاں جا کر سب کے قدم بے چین ہوتے تھے، دل بے تاب اور دماغ بے سکون۔

اس پل اکائرز مورابر گرکنگ کے اسٹال کے ساتھ کھڑا تھا۔ اونچی ڈھال، سیاہ لیدر جیکٹ، گھنی شیو اور پی کیپ۔ کندھوں پر اس کا بیک پیک تھا اور ساتھ رکھا اکلوتا سرمئی رنگ کا سوٹ کیس۔ وہ لائٹ ٹریول کرتا تھا۔ ظاہراً وہ مینو کارڈ اٹھائے تھا، لیکن گاہے بگاہے نظریں موڑتے وہ آنے جانے والے افراد کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کیا وہ کسی کا منتظر تھا؟

ایم ایچ تھری سیون زیرو کی فلائٹ کو پونے بارہ بجے ڈیپارٹ (رواں) ہونا تھا، اور اس سب سے قبل ہی بورڈنگ کے سارے پراسیس انجام دے دیے جانے تھے۔ وہ مستعد تھا، چھ ماہ سے۔ اچانک اس کی نظر کی پٹی پر ایک وجود چلتا آیا۔ قد آور، بھاری بھر کم جسامت، سیاہ سوٹ میں ملبوس۔ ہاتھ میں پکڑے آئی پیڈ پر انگلیاں چلاتے، وہ چالیس سے زائد برس کا مرد مطمئن سا چل رہا تھا۔ الفا گروپ کا چیئرمین اور سی ای او، عمر سعید۔ اکائر کے اندر تک ناگواری کا رس گھل گیا۔ اس آدمی کی شکل دیکھ اسے اپنے رنگٹ کی یاد ستاتی تھی۔ خبیث!

اس نے ایک پل سانس لے کر خود کو استوار کیا۔ چھ ماہ کی پلاننگ کو وہ جذبات کی ہار نہیں ہرا سکتا تھا۔ اسے مضبوط رہنا تھا، خود کے لیے، رابح کے لیے۔

ساتھ اس کے سامان والی ٹرالی چلاتا اس کا کوئی ملازم تھا۔ اشر عبد الرزاق۔ اکائر اسے جانتا تھا۔ وہ پچیس سالہ لڑکا، تین بہنوں کا بھائی، باپ کی موت کے بعد کام کی تلاش میں اس موٹی اسامی کے تلوے چاٹنے پر مجبور تھا۔ چھ ماہ کی ریسرچ نے اکائر کو اس کے بارے میں اور بھی بہت بتایا تھا، لیکن اس کا سہما برتاؤ اسے اتنا یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ خطرہ نہیں تھا۔

اکائر نے چہرے پر ماسک اوپر کی جانب کھینچا اور نظریں پھیر لیں۔ وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ عمر سعید اسے دیکھ بھی لیتا تو غرور کی دھند میں کچھ خاص کرتا نہیں، مگر اسے چوکنا رہنا تھا، محتاط۔ اپنے لیے نہ سہی، رابح کے لیے۔

اس نے کان سے جڑے ائیر پیس کو دبایا۔ "He is here."

دو پل کی خاموشی کھنچ کر لمبی ہوئی اور پھر گلا صاف کرنے کی کنکار۔ رانج کو اس کا پیغام موصول ہو گیا تھا۔ کوک کا ایک کین آرڈر کر کے وہ ادھر ہی ٹک گیا۔ رات کی دوسری آزمائش بھی آنے ہی والی تھی۔ ظبیہ یمین!

رانج کی دین کردہ پسنجر لسٹ کے پنے پلٹ کر اس نے پہلی بار ظبیہ کا نام اس میں ایک ہفتہ قبل دیکھا تھا۔ اس کی بکنگ لاسٹ مومنٹ تھی، اور اکائر نے اندازہ لگا لیا تھا غزار والے سارے ماجرے کے بعد وہ جلد از جلد ملک چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے لاش کو کیسے بھی چھپایا ہو، اگر پولیس کو اطلاع ہو گئی تو اس کا کیس بہت بری طرح کھل سکتا تھا۔

اس نے باتوں باتوں میں ظبیہ کو فلائٹ لینے سے روکنے کی کوششیں کی تھیں۔ وجہ ان کا پلان تھا۔ خراب موسمی صورتحال، ڈسکاؤنٹ آفرز جو اسے ایک دو ہفتہ انتظار کرنے پر ٹکٹنگ میں اسے مل سکتی تھیں، لیکن وہ اٹل رہتی تھی۔ پچھلا ایک ہفتہ اکائرز مورا کے لیے عذاب تھا، لیکن وہ جانتا تھا شاید اس کا ملائیشیا سے نکلنا ملائیشیا میں رہنے سے بہتر تھا۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہاں پولیس کا خدشہ تو تھا ہی، مگر بیجنگ میں موجود اس کی خالہ بھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھیں، اور ظبیہ کے وہاں پہنچنے سے قبل کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا ظبیہ ان سے مل لے، جتنا جلد ہو سکے۔

ویسے بھی پلان نقصان سے عاری تھا۔ انھوں نے عمر سعید کو دھمکانا تھا کہ وہ اکائر کے پیسے واپس کرے، بغیر کسی جسمانی دباؤ کے۔ (بات تو یہی ہوئی تھی، اب خدا رانج کو نیک نیت بخشے۔)

ساتھ ہی رانج نے ملائیشیا ائیر لائنز سے اپنا وعدہ کردہ انتقام لینا تھا۔ وہ ٹرانسپونڈر بند کرے گا، پلین میں نیچرل طور پر ہوتے فیلئیر کا ڈھونگ رچائے گا، پلین کے میکانیکی نظام کی حالت بدل دے گا اور چھ گھنٹے کی اثناء میں کسی ویران ائیر پورٹ پر لینڈنگ کر کے ان کے پلین کی خراب ہونے کی اطلاع ٹریفک کنٹرول کو

دے گا۔ ہر مسافر اس کی گواہی دے گا اور میڈیا اسے اچھالے گا۔ ایک بار پھر ملائیشیا ائیر لائنز اپنی صداقت کھو دے گی، اور وہیں سے شروع ہو گا ملائیشیا ائیر لائنز کی نااہلی کا تماشہ، جسے رانج اس کے انجام تک پہنچائے گا۔

ظبیہ کوالالمپور سے بیجنگ نہیں پہنچ پائے گی، لیکن وہ جنوب مشرقی ایشیاء کے کسی بھی ائیر پورٹ سے کنیکٹنگ فلائٹ لے کر با آسانی اپنا سفر مکمل کر سکتی تھی۔ کم از کم وہ کوالامپور سے تو باہر ہو گی ناں!

رانج نے اکائر سے کہا تھا، وہ کارپوریٹ دنیا میں ملائیشیا ائیر لائنز کا سر دوبارہ اٹھتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کُل پلاننگ کے بعد جب بزنس کنسلٹنٹ مسٹر زمورا نے اس سے سوال کیا تھا، کہ اس کے مستقبل کا کیا ہو گا، تو وہ خفیف سا مسکرا دیا تھا۔

"میں فلائنگ چھوڑ دوں گا۔"

رانج نے بھی اس سے پوچھا تھا، کہ وہ اتنے ہائی رسک پلان میں حصّہ کیوں لے رہا تھا۔ کیوں صرف پیسے کے خاطر اس کے ساتھ یہ خطرہ مول لے رہا تھا؟ اگر بات عمر سعید سے پیسہ نکلوانے کی ہی تھی، تو وہ کرائے کے گنڈے خرید کر اس کے گھر اور آفیس کا نقشہ بگاڑ سکتا تھا۔ بیک گراؤنڈ چیک سے رانج اس کے خاندان کے ہر فرد کی تصاویر بھی نکال چکا تھا۔ ایک بیوی، ایک بیٹی، ایک بہن، اس کے پاس سارہ کمزوریاں تھیں۔ عورت کمزوری ہی تو ہوتی ہے۔ ہے ناں؟ سو وہ کیوں تھک رہا تھا؟

اکائر نے سر جھٹک دیا تھا۔ پوری طرح۔ اسکرین پر نسوانی شکلیں دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے جا کر رانج کے بین بیگ میں بیٹھ گیا تھا۔

"میری بہن یا بیٹی نہیں ہے، رانج۔ اور اگر ہوتی تو میں نہیں چاہتا کہ صبح اٹھ کر مجھے میرے کسی گناہ کے عوض میں ان کے بندھے ہاتھ یا بکھری صورت دیکھنے ملے۔ مل جاتی تو میں توبہ بھول جاتا، اپنا گناہ فراموش کر دیتا۔ مجھے غیرت کی آگ دہکا دیتی، مردانگی کی چبھن جھلسا دیتی۔ میں انتقام لینے نکل پڑتا اور اسی طرح

یہ سائیکل کبھی ختم نہیں ہوتی۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور دو تین انگلیاں چٹخائیں۔ "میں انتقام نہیں چاہتا، صرف اپنا پیسہ چاہتا ہوں۔ میرے بھائیوں کو اس کی ضرورت ہے۔ نہیں بھی ہوتی، تو وہ پیسہ میرا حق ہے۔ عمر سعید ہاتھ سے دے، منہ پر مارے یا میرے گھر کے باہر چھوڑ جائے۔"

"پھر بھی، اس پلان سے تمھیں جتنا فائدہ ہے، اس کے خراب ہونے سے کئی زیادہ نقصان بھی ہو سکتا۔" رائج نے اسے دیکھتے بہت سنبھل کر کہا تھا۔ اکائر نے چہرہ موڑا تو چاند کی روشنی ان دو نفوس کے چہرے بھگو گئی۔ وہ اس وقت رائج کے گھر میں تھے، اس کی بالکونی میں۔

"میں نے کانٹریکٹ کے مطابق اپنا حق لینا چاہا، میں نے عدل و انصاف کے دائرے میں رہ کر اپنا حق لینا چاہا، میں نے منت سماجت کر کے اپنا حق لینا چاہا، قانون سے دھمکا کر بھی اپنا حق لینا چاہا، مگر افسوس۔" سرمئی آنکھیں بے وجود تھیں۔ "کارپوریٹ ورلڈ بہت ظالم ہے، رائج۔ مزدور کا منہ بند کروانا سب جانتے ہیں۔ صنفِ متضاد یہ سمجھتی ہیں کہ مردوں کا راج ہے، انہی کی تو ذات آباد ہے، نوکریاں بھی انہی کی ہیں، گھر بھی، بار بھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مرد عورت اپنی جگہ دونوں پستے ہیں۔ اور جب مرد پستا ہے تو زمانے بھر کی تنگی اور روگ اسے جکڑ لیتا ہے۔ خود میں بے کار اور ناکافی ہونے کا احساس اسے ہڑپ کر لیتا ہے۔ مرد پھر صرف پیسے کی کمی سے نہیں تڑپتا۔ وہ رشتوں کے چھن جانے، گھر کی ضروریات میں کوتاہی، اپنی ہستی کے بوجھ ہونے سے تڑپتا ہے۔"

اس نے ایک سانس لی اور اپنا فون دیکھا۔ رات کے گیارہ بجے۔ تاریخ تھی تین نومبر دو ہزار تیرہ۔ رائج اسے تکتا رہا۔ اس وقت اس کی اماں اسے کال کیا کرتی تھیں۔ وہ شاید اسی کال کے انتظار میں تھا۔

"غیرت مند مرد کی مار پیسہ نہیں ہے۔" اس نے فون آف کرتے بے ریائی سے کہا۔ "پیسے کی کمی سے ہوتا انتشار ہے۔"

کوک کا سپ لیتے وہ سیدھا ہوا ہی تھا کہ اسے لال سوٹ کیس کی جھلک دکھائی دی۔ جلدی سے کین دور رکھا اور فیس ماسک ناک پر کھینچا۔ ظبیہ آگئی تھی۔ اسے فی الحال اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دور سے کھڑے رہ کر اس کی حفاظت کرے گا، اسی ڈر کی رکھوالی کرتے کہ کہیں کوئی اتھارٹی اسے نہ پکڑ لے۔ وہ اپنی بورڈنگ کرے گی، اور وہ اپنی۔

وہ آس پاس نظریں دوڑاتا ٹرمینل کے دوسرے حصّے سے اسے تکتا رہتا۔ وہاں سے وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آہ، سکون! کیونکہ فلائٹ میں جا کر وہ اسے اپنے یہاں ہونے کی دلیل دے سکتا تھا، ابھی نہیں۔ ابھی وہ ضرورت سے زیادہ درہم برہم محسوس کر رہا تھا۔ چھ مہینے اس کی آنکھوں کے سامنے کھلنے والے تھے۔

اگر عمر سعید نے پیسے نہ دیے تو۔۔۔؟

نہیں! رانج کچھ کر لے گا۔ اس کی جگہ پیسے لینے اس نے جانا تھا، کیونکہ اکائر کی شکل دیکھ معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اسی اثناء میں اکائر اس کے کو پائلٹ کو بیہوش کرنے کی دوا تیار کرے گا۔

اپنے خیالات میں اتنا مگن وہ کب ہو گیا کہ اسے معلوم نہیں ہوا پچھلے دس سیکنڈ سے ظبیہ یمین اس گھوری بھر رہی تھی۔ یا خدایا! اس نے کب دیکھا مجھے؟ اعلان کندہ کے الفاظ کا انتظار کیا اور جیسے ہی اس کی نگاہ یہاں وہاں ہوئی، وہ تیر کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسرے ستون سے ٹکتے اس نے اپنا بورڈنگ پاس وغیرہ ہاتھ میں لیے۔ تھوڑی دیر گزری تھی جب اسے ٹرمینل کی دائیں جانب سے دو نفوس چل کر آتے نظر آئے۔ فرسٹ آفیسر اسامہ عامر اور ساتھ ہی اس کا کیپٹن، ایم ایچ تھری سیون زیرو کا پائلٹ، رانج آدم!

اکائر نے سینا پھلا کر گہری سانس باہر چھوڑی۔ وہ ہنس مکھ سا، اسامہ سے کچھ کہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ انگلیاں کان کی لو مسلتے ہوئے تھیں، چہرے پر چمک اور آنکھوں میں بیش بہا رنگ۔ کیا وہ پریشان نہیں تھا؟ اس نے زبان سے دانت کھجائے۔ اس کی کوک بھی آدھی بچ گئی تھی۔ آہ، درد!

اکائر اس پر نظریں مرکوز کیے نگاہ کی روش پر چل کر آیا، تو رانج نے گھنی پلکیں مچکا کر اسے دیکھا۔ چہرے کا تاثر لمحے بھر کے لیے تنگ سے تنگی سے لب ریز ہوا۔ اکائر کے ابرو بھنچے۔ کیا ہوا تھا؟ رانج اس سے نظریں پھیر کر جانے لگا۔ اسے لگا وہ کریو کے بورڈنگ گیٹ جا رہا ہے، کیونکہ وہی طے پایا تھا، مگر اسے مسافرین کی قطار تک آتا دیکھ، اکائر کے حواس الجھتے چلے گئے۔

یہ آدمی سٹھیا گیا تھا؟ وہ غصے اور فکر مندی سے اسے دیکھتا رہا۔ خود بھی وہ دستاویزات تھامے قطار کے آخر پر کھڑا ہو گیا۔ دو تین مسافرین چھٹے تو ظبیہ آگے بڑھی۔ رانج نے اس کے ڈاکیومنٹس مانگے۔ اکائر چار لوگوں کے پیچھے سے اس کی ساری کارروائی کا ملاحظہ کرتا رہا۔ اسی پل کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے انھیں دو مختلف قطاریں بنانے کا کہا۔

اکائر اب کہ ظبیہ کے برابر والی قطار میں تھا۔ وہ رانج سے جھگڑ رہی تھی، بلکہ رانج اس سے جھگڑ رہا تھا، وہ بھی کسی وجہ کے بغیر۔ اس کا دل کیا رانج آدم کا سر پھوڑ دے۔ وہ آدمی سارے پلان کا ملیامیٹ کر رہا تھا۔ اگر ظبیہ پولیس بلا لیتی تو؟ اس کا انتقام مونٹی کرسٹو نے لینا تھا کیا؟

رانج کی کلاس وہ بعد میں لے گا، فی الحال اسے ہی کچھ سوچنا تھا۔ اس نے جینز کے جیب تھپتھپائی تو وہاں صرف بینک نوٹس تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے اپنا سامان اسی مقام پر چھوڑا اور ایک اسنیک شاپ تک بھاگا۔ نوٹ میز پر رکھ کر اس نے اوریو کا بڑا ڈبہ خرید لیا۔ جب دکاندار اس کے بقیہ پیسے اسے لوٹانے لگا تو وہ فوراً بول پڑا۔

"چینج پلیز۔" کمبخت، پورے پچاس سین (sen) بچتے ہیں میرے، واپس کر! (سین مالائی رنگٹ کے سکوں کو کہا جاتا ہے۔)

اور یو کا ڈبہ اپنے بیک پیک میں ڈالتے زپ بند کی اور چلر سکے سارے اپنی جیبوں میں بھرے۔ وہ جیکٹ جو وہ سکیورٹی اقدامات کے لیے اتار چکا تھا، واپس کندھوں پر چڑھائی۔ رائج اب ظبیہ کا سامان کھلوا رہا تھا۔ یا خدا، اس کو ایک رات میں بڑھاپا کیسے چڑھ گیا؟ یہ مرد تو وحشی ہے۔

اپنی باری آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا دیے، اور پھر وہی ہوا جس کی اس نے امید کی تھی۔ میٹل ڈیٹیکٹر 'بیپ بیپ' کر کے اس کے جسم پر لگی کسی غیر مطلوب دھاتی شے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ گارڈ نے اسے بازو لمبا کر کے روکا۔ اس نے نگاہیں پھیریں۔ ظبیہ کی آنکھیں بند تھیں اور رائج کی اس پر۔ گہری، نرم، ہیزل۔ ساتھ بیٹھا گارڈ اس کا سامان الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

اسے اچانک غصہ آیا رائج پر۔ وجہ صرف پلان نہیں تھا۔ وہ گارڈ کو دھکیل کر اندر جانے کی کوشش کرنے لگا، تو پھولے نتھنوں والا مرد طیش میں غرایا۔

"محترم، پیچھے ہٹیے! آپ آگے نہیں جا سکتے!"

ہاں، تو روک ناں سالے۔ اکائر نے آنکھوں میں دعوت لیے اسے کمینگی سے دیکھا۔ ترچھی نگاہ ساتھ کھڑے نفوس پر ڈالی۔ اب کہ رائج اسے دیکھ رہا تھا اور ظبیہ اپنے ہاتھوں کو جیسے ان پر نیا رنگ چڑھا ہو۔ تھینک یو، گاڈ۔ بچ گئے۔

تھوڑے اور تماشے کے بعد رائج اس کے سامنے حاضر ہوا۔ اسے لگا تھا ان آنکھوں میں شرمساری ہو گی، مگر وہ تو کھا جانے والی نظروں سے اکائر کو دیکھ رہا تھا۔

واہ، ایک تو چوری اوپر سے سینا زوری۔ سارے ماجرے کے بعد ظبیہ وہاں سے رفو ہو گئی تھی۔ اچھا ہی ہوا، ورنہ رائج ان کا پلان کھول دیتا اور اسے پتا بھی نہ چلتا۔

اب رائج بے ساختگی سے اس کا بیگ چیک کروا رہا تھا۔ اکائر کو سمجھ نہیں آیا وہ صرف ڈراما تھا یا واقعی وہ اس سے چڑا ہوا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے وہ اسے دیکھتا گیا۔

"تم نے جو اس لڑکی کے ساتھ کیا اس کے لیے تم پر کیس ہو سکتا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اسے دیکھ رہا تھا۔ بالکل! کیونکہ اگر تم بھانڈا پھوڑ دو گے تو طیارے کو دیدہ دانستہ طور پر راستے سے بھٹکانے کے لیے ہم جیل ہی جائیں گے۔

رائج مسکرایا۔ ایک چبھن تھی اس مسکراہٹ میں۔ اکائر کو وہ ذرا نہیں بھائی۔ اور اس کے اگلے الفاظ تو اس کے تن بدن میں آگ لگا گئے۔ خبیث!

اس کا بیگ بند کروا کر وہ جا چکا تھا، لیکن اس کا جانا اکائرز مورا کے دل میں سوالات کا پینڈورا باکس کھول گیا تھا۔

رائج آدم ظبیہ یمین کا تھا کون؟

★★★

یہ ایم ایچ تھری سیون زیور کے ٹیک آف کے آٹھ منٹ بعد کا وقت تھا۔ طیارہ آسمانوں میں اپنی جگہ بناتا اوپر کی جانب سفر کر رہا تھا، اس کی ناک فضائی راستوں کو چیرتے ہوئے گامزن تھی۔

رائج کا ہیڈ سیٹ اس کے کانوں پر تھا، انگلیاں کنٹرول یوک کے گرد طواف کر رہی تھیں، اور دوسرا ہاتھ تھروٹل کو اڈرنٹ پر تھا جسے وہ ہلکے سے پیچھے دھکیلے ہوئے تھا۔ اسامہ چیک لسٹ پڑھنے کے بعد اس میں کچھ باتوں کا اضافہ کر رہا تھا۔ اس نے رولیکس کے چمکتے ڈائل میں وقت دیکھا۔ اوور ہیڈ بنی بتیوں میں اس کے تنگ ابرو واضح ہوئے۔

چند اور منٹ کی دیر میں، ان سے نیچے قائم دنیا چھوٹی سی شبیہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہوا کی بناوٹ میں تبدیلی آئی، اور وہ نشاندھی کافی تھی کہ طیارہ زمین سے آسمان میں تغیر کر چکا ہے۔ مسافرین نے بیلٹ کے بٹن کھول دیے۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اب وہ پر سکون تھے، مگر رابح کی تو ساری بے سکونی ہی اس لمحے کے لیے تھی۔ اسے جلدی کا کپٹ سے باہر نکلنا تھا۔ عمر سعید سے پیسے نکلوا کر اکائر کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروانے تھے اور اکائر سے اسامہ کی بیہوشی کا مادہ ہتھیانا تھا۔ اس سب کے لیے اس کا منصوبہ تیار تھا، لیکن دبہ دبہ سا خوف پھر بھی اسے جکڑے ہوئے تھا۔

اس نے اسامہ کی جانب دیکھا۔ "ریسٹ روم بریک۔" وہ سمجھ کر مسکرا دیا۔ رابح ہیڈ سیٹ اتارتے کھڑا ہوا اور کا کپٹ کا دروازہ سلائڈ کر کے باہر آیا۔ پسنجر کیبن میں خفیف روشنیاں تھیں۔ مدھم نیلی اور پھیکی سنہری۔ اس نے رخ لیوٹری جاتی راہداری کی اور کیا، چال پھرتیلی تھی۔ راستے میں اسے لورا نے دور سے دیکھ کر مسکراہٹ پیش کی، جو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں قبول کر لی تھی۔

لیوٹری کی پٹی گہری نیلی روشنی میں قید تھی۔ وہاں کی چھت پر نصب ٹیوب بلبوں کی روشنی بقیہ کیبن کے برعکس دھیمی تھی۔ انجن کی گنگناہٹ بھی ادھر ہی بلند تھی۔ قطار میں بنے واش بیسن کے پاس پہنچ کر اس نے نظریں آس پاس دوڑائیں۔ مسافرین غیر حاضر تھے۔ اس نے لبوں پر زبان پھیری اور سب سے کنارے لگی ٹوٹی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا، ساتھ ہی کیبنٹ کھولا۔ دو تین خالی ڈبے ٹٹول کر اس نے سلور رنگ کی ایک میک بک بر آمد کی۔ شاید، یہ اسی نے وہاں چھپائی تھی۔ میک بک آن کر کے دیکھی تو ہوم اسکرین جل اٹھی۔ وہ ٹھیک تھی۔ اس نے سکھ کا سانس بھرا۔

ابھی وہ میک بک ہاتھ میں دبائے لیوٹری سے گزرنے ہی لگا تھا، کہ چند قدم بعد اپنے سب سے خوبصورت خواب اور خوفناک ترین حقیقت کے ملے جلے امتزاج سے روبرو ٹکرایا۔ سیاہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائے، سیاہ عبائے والی دلکش لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ غصہ، رنج، ملال اور حیرت سب تھا ادھر۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

پانچ سالوں بعد ان بھوری آنکھوں کے سامنے حاضر ہو کر رائج آدم کے دل کو قرار پہنچا تھا، کہ اشتیاق اور تعرض کی اس جنگ میں وہ تنہا نہیں تھا۔ وہ بھی اتنی ہی گھائل تھی۔ نظریں اس کی داغدار کلائیوں تک گئیں۔ شاید، اس سے بھی زیادہ۔

اس نے میک بک والا ہاتھ آہستگی سے کمر کے پیچھے چھپالیا، اور اسے کوٹ سے اندر پینٹ کی اٹکاؤ کے ساتھ لگایا۔

"مسلہ کیا ہے تمھارے ساتھ، ہوں؟ کیوں آرہے ہو میرے سامنے بار بار؟ کیوں آگئے ہو تم پانچ سال بعد؟ چین نہیں آیا تھا تمھیں میرے ساتھ وہ سب کر کے کہ واپس آگئے ہو؟ شرم نہیں ہے تم میں؟ پہلے میرا ائیر پورٹ پر اتنا مذاق بنایا، مجھے ذلیل کیا، میرا سامان کھول کر رکھ دیا، اور اب دوبارہ میرے سر پر نازل ہو گئے ہو! تم اتنے کم ظرف، اتنے خود پرست ہو گے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا مجھے۔ شیم آن یو، رائج آدم!"

وہ چپ کیوں ہو گئی تھی؟ کیا وہ کچھ اضافی دیر نہیں بول سکتی تھی؟ کیا اس کے شکوے تھم چکے تھے؟ کیا وہ یہاں، ایم ایچ تھری سیون زیرو کی راہداری میں کھڑے، جنم و جنم تک اسے شرمسار نہیں سکتی تھی؟ پتھر کی سی گلٹی اپنے گلے سے نیچے دھکیلتے، اس نے بتدریج آنکھیں کھولیں۔

سرور ٹوٹ گیا، التباس ختم ہوا۔

لیکن اس کے نتھنے کی حدت سے رستا گاڑھا خون رائج کی ہڈیوں تک کو جھنجھوڑ گیا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھنے لگا ہی تھا، کہ وقت نے اپنی حیثیت کا احساس دلایا، فاصلوں نے اسے شانوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ وہ سارے اختیارات پانچ سال قبل کھو چکا تھا۔

اس نے سرسری سی آواز میں اسے اطلاع کی، تو وہ چونک گئی۔ اس کے محافظات دھیمے پڑے، اور اس پل بھر میں رابح نے وہ دیکھا جو وہ دہائیوں اور صدیوں کے لیے اپنے سینے میں مدفن کر چکا تھا۔ پرانی ظبیہ۔ پانچ سال قبل والی ظبیہ۔ اس کی ظبیہ۔

ٹشو اس کی جلد پر تھپتھپاتے، وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ آنکھیں۔ کیا وہ کبھی اسے بتا پائے گا، کہ پانچ سال میں کتنی بار اس نے ان میں جھانک کر ایک آخری بار اپنا عکس دیکھنا چاہا تھا، کتنی بار ان آنکھوں میں اترتی مسکراہٹ کو یاد کرنا چاہا تھا، کتنی بار ان کی روشنیوں میں گھل کر ایک ہونے کی دعا مانگی تھی۔

حقیقتاً، ایسا نہیں ہو گا، لیکن رابح آدم تمناؤں کا گڑھ تھا۔

بھوری آنکھوں میں بھی احساس تھا، ایسا احساس جو غصے اور غم سے کئی زیادہ قوی تھا۔ شاید، ظبیہ کو اس کے ہونے کا اندازہ خود نہ ہو، لیکن رابح پڑھ چکا تھا۔ وہ بے شک نظریں چرا لیتی، لیکن وہ دل تک اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"کیا میں تم سے کچھ پوچھوں؟"

"کیا میں تم سے مغفرت طلب کروں، اور کروں بھی تو زمانے کے کون سے پہر کی؟ کیا تمھیں ماضی میں جھٹک دینے پر اپنی ناک رگڑوں، یا حال کی دوریوں میں گم رہنے سے توبہ کروں؟ یا کیا یہ دونوں چھوڑ میں تم سے تمھارا مستقبل معاف کروالوں؟ بتاؤ، ظبیہ، کر دو گی کیا؟"

لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔

"وہ تمھیں مارتا ہے۔" اس نے خود کی آواز کو الزام کی صورت اختیار کرتے سنا۔ ظبیہ دو پل بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ کیا وہ تردید کرے گی؟

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اکائر کے ساتھ ہوئی گئی ایک ماہ پہلے کی فون کال اس کے کانوں کے پردے سن کرنے لگی۔ ظبیہ کی سسکیاں، اس کی پکار، اس کا دکھ اور اس کے زخم، وہ سب اس نے اکائر کے ساتھ ہوئی کال پر ایک ماہ پہلے براہ راست سنے تھے۔ اب بھلے وہ اس کے مرے منہ پر انکار کرے۔

وہ کہتا چلا گیا۔ سوالات، الزامات، فرضیات اور انکشافات، سب اس چھبیس سالہ لڑکی پر اس نے ساتھ گرا دیے۔ جب اس کی زبان بچوں کے ذکر سے ٹکرائی تو ظبیہ کانپ کر رہ گئی۔

"رانج!" اس نے پکارا۔ اسے پکارا۔ رانج نے اپنے دل کو دو حصوں میں تقسیم ہوتے سنا۔ اس کا نام ایسا ہی تھا، یا ظبیہ کہ ادا کرنے سے خوبصورت بن گیا تھا؟ کیا اس کی آنکھوں کا تاثر اسے خوبصورت بناتا تھا، یا ان میں تیرتے غمگین آنسو؟

وہ اسے تھامنے آگے بڑھا تھا، اور ظبیہ نے اسے خود سے دور کر دیا۔ وہ چلائی تو اس کی آنکھیں رانج کے اندر تک نفرت بھن چکی تھیں۔ نفرت۔ کیا وہ اس سے نفرت کر سکتی تھی؟

"میرے اندر گرم سلاخیں نصب ہوں یا میرے کانوں سے سیسا بہے، اللہ مجھے تمھارا محتاج کبھی نہ بنائے۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ الفاظ اس کی روح کو چھلنی کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چار سال پہلے کی وہ تپتی دوپہر اسے یاد آئی۔ ظبیہ کی پرخلوص آنکھیں، اس کا کانپتا لہجہ اور چہرے کا تذبذب۔

"تمھیں اپنی ویلیو ہی نہیں پتا!" غصے کے دھندلے بادلوں سے چھٹ کر اسے اپنے ادا کردہ الفاظ گونجتے ملے۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ غم انسان کو نفس پرور بنا دیتا ہے۔

"میں دخل دوں؟" کان میں موجود آلے میں اکائر کی آواز گونجی۔ آہ، وہ منصوبے کا حصہ تھا۔ اس نے ان کی گفتگو سنی نہیں تھی، مگر ظبیہ کو لیوٹری جاتا دیکھ کسی انہونی کا ہونا بھانپ لیا تھا، سو وہ پیچھے آ گیا تھا۔ رانج اسے دیکھ کر بار بار مرکز بھٹک رہا تھا۔ اسے اچانک طیش آیا خود پر۔

اسے ظبیہ کو وہاں سے بھیجنے کی اشد ضرورت تھی۔ طے شدہ مورس کوڈ کے ذریعے اس نے آنکھیں جھپکیں۔ ایک چھوٹی جھپک، پھر لمبی، لمبی اور آخری بھی لمبی۔

یہ اس کا جواب تھا۔

YES.

"اوکے، وہاں سے ہٹو۔ میں کوور لیتا ہوں۔" اکائر نے کہا۔

"میری بھی یہی دعا ہے۔" وہ سادگی سے کہتے پیچھے ہوا۔ ظبیہ سے دوسری سمت اٹھتا ہر قدم مانع تھا۔ اس کی جانب پیٹھ کرتے اس نے اپنی کانپتی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑا اور نیلی روشنیوں کا تعاقب کرتے لیوٹری سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اسے کیا پتا تھا، وہ ظبیہ یمین کے دل کا ایک اور گوشہ اپنے سنگ چرا لے گیا تھا۔ بن اجازت، بن رکاوٹ۔

اکائر نے غیر مترقب طور پر حاضر ہو کر ظبیہ کے حواس بگاڑ دیے تھے۔ رانج وہ منظر دیکھ حیرت زدہ تھا۔ لیوٹری سے باہر کی جانب وہ ایک سرے کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا، اور وہاں سے اکائر اور اسے ساتھ کھڑا دیکھ سکتا تھا۔ اکائر نے ہتھیلی اس کے منہ کے گرد کسی تھی۔ رانج کے تن بدن میں مانو سوئیاں چبھو دی ہوں۔ کھولتا لاوا اس کی رگوں میں انڈیل دیا گیا تھا۔

اس نے ناک سے سانس اندر کھینچی۔ اکائر اسے بچا رہا تھا۔ تاہم انگلیوں میں پھڑ پھڑاہٹ ہوئی۔ اسے ہاتھ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے سر زور سے جھٹکا۔ وہ واقعی سٹھیا چکا تھا۔

★★★

ان دونوں کو ادھر چھوڑ وہ پیچھے سے لیوٹری کی جانب واپس بڑھا۔ نیلی روشنیاں مدھم تھیں۔ اندر پہنچ کر اس نے سارے ریسٹ روم باری باری چیک کیے، سب خالی تھے۔ مین دروازے تک واپس آتے اس نے چٹخنی لگائی۔ سیاہ آسمان ایک بار پھر گڑگڑا رہے تھے۔

نیلا کوٹ اس کے جسم پر چت تھا، تھکے تھکے سے کندھے اور ہلکے بھورے بال بکھرے ہوئے۔ اس نے ایک ہاتھ ان میں سے گزارا اور حالت سدھاری۔ ساتھ پسینہ بھی پونچھ گیا۔ چند لمحات انتظار کرتے اس نے کمر میں کسے ٹیبلٹ کو واپس باہر نکالا اور اون کیا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ چمکا۔ وہاں فکر مندی تھی۔ پھولے ہوئے ہونٹ چپے چپے سے تھے۔

اچانک لیوٹری کے دروازے پر کھٹر پٹر ہوئی۔ دروازہ نہیں کھلا تو نووارد دھیرے سے کھٹکھٹانے لگا۔ رانج کا دل بھاری ہوا۔ اگر یہ عمر سعید کے علاوہ کوئی اور ہوا تو؟ وہ بہانہ بنادے گا کہ یہ قلابے کمزور تھے اور خود کارانہ طور پر جڑ گئے تھے۔ اسی لیے اس کے کھولنے سے بھی نہیں کھل رہے تھے۔

لیکن وہ عمر سعید ہی ہو گا۔ اس کی چھ ماہ کی پلاننگ یہی کہتی تھی۔

دروازہ دھیمے سے کھولتے اس نے ساری دعائیں پڑھ ڈالیں۔ مضبوط، اونچی صورت اور گھنی مونچھیں۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ الفا گروپ کا ایکزیکٹیو ہی تھا۔ عمر سعید!

ابرو تنے تھے۔ "دروازہ کیوں لاکڈ تھا؟" اس نے ناگواری سے سوال کیا اور اندر داخل ہوا۔ رانج کو ابھی سے ہی اس سے نفرت ہو رہی تھی۔ یہ آج کل اسے کچھ زیادہ ہی نفرت نہیں ہو رہی تھی؟

"دروازے میں اشو ہے، سر۔" اس نے نل کھولا اور آہستگی سے ہاتھ دھونے لگا۔ عمر سعید پیچھے سے گزر کر باتھ روم کی جانب بڑھ رہا تھا جب رانج نے ہاتھ لمبا کر کے ٹشو کا رول نیچے گرایا۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ رانج پیچھے جھکا اور اوندھا ہو کر ٹشو اٹھایا۔ راہداری مکمل سیاہ تھی، سوائے ان دو نفوس کے۔

"سامنے سے ہٹو۔" عمر کی آواز میں رعب تھا، حقارت تھی۔ رانج کو سمجھ آنے لگا تھا اس آدمی سے اکائر اس قدر کیوں چڑا تھا۔ اس نے قد آور مرد کے جوتوں کے پاس سے ٹشو کا رول تھاما اور دھیرے سے سیدھا ہوا۔

"ایسے تو آپ چلے جائیں گے۔"

ایکزیکٹیو کا اضطراب گہرا تھا۔ "کیا مطلب؟"

رائج اب ٹشو ماربل کے کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا، نظریں یہاں وہاں تھیں۔ ایک مکار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔

"مطلب کہ، ایسے تو ہمیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔" ہیزل آنکھوں والا قدم قدم چلتا باتھ روم کے دروازے تک آیا اور باہیں سینے پر پھیلائیں۔ اب وہ مکمل اس کا راستہ روکے تھا۔

عمر سعید نے اسے غور سے گھورا۔ "کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟"

رائج مسکراتا رہا۔ "آپ میرے پلین میں کھڑے ہیں۔"

اس پر مرد واضح طور پر ٹھٹکا اور ایک قدم پیچھے ہوا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن جسم نے کوئی اور ہی درخواست کی۔ "اچھا، مجھے ریسٹ روم استعمال کرنے دو۔" اس نے رائج کے برابر سے گزرنا چاہا۔ رائج نے اس بار ہلنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"جب BPD کا مسلہ ہے تو کافی تھوڑی کم پینی تھی ناں، عمر صاحب۔" وہ براہ راست خیر گیری سے بولا۔

"یہ میرا وقت ہے، آپ غسل خانے کو دیں گے تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"تم۔۔۔ تمھیں کیسے پتا مجھے بی پی ڈی۔" ان مغرور آنکھوں میں خوف کا تاثر دیکھ کر رائج نے بمشکل خود کو ہنسنے سے روکا۔

"مجھے بہت کچھ پتا ہے، عمر صاحب۔ یہ بھی کہ آپ الفا گروپ کے سی ای او ہیں، یہ بھی کہ اس وقت آپ کے گھر میں آپ کی بیٹی اور ماں اکیلی ہیں کیونکہ بیوی بیجنگ کے ٹیمپل ہوٹل میں آپ کی فلائٹ لینڈ ہونے کا انتظار کر رہی ہیں، یہ بھی کہ آپ کا بیٹا جافر عمر سعید سوئٹزرلینڈ کی یونیورسٹی آف جنیوا کے میڈیسن کورس میں انرولڈ ہے، اور یہ بھی کی اس کی ایک عدد گرل فرینڈ ہے۔"

عمر سعید کو مانو سانپ سونگھ گیا ہو۔

"او، شاید آخری بات آپ کو خود نہیں پتا تھی۔" وہ کمینگی سے مسکرایا۔

"تم کون ہو..." بولتے ان کے ہونٹ کانپے، ایک نظر دروازوں کو دیکھا۔ وہ واپس کب بند ہوئے؟ "کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ مجھے۔۔۔ میری فیملی کو کیسے۔"

رانج دروازے سے دور ہٹا اور چل کر دوسری طرف آیا۔ عمر سعید دنگ سا کھڑا رہا، بے حرکت۔ اس کے ہاتھ ناب تک جاتے جاتے رک چکے تھا۔

"ایک لیوٹری میں میٹنگ کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے، لیکن آپ نے کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا۔ Desperate times, you know." وہ سنک سے ٹک گیا، پیروں کی قینچی بنائی۔

"کس کے لیے کام کرتے ہو تم؟" دہشت سے فراخ ڈلے اسے گھور رہے تھے۔

"میں صرف اپنے لیے کام کرتا ہوں۔" وہ پر سکون تھا۔ "البتہ آپ کی انویسٹمنٹس دیکھ کر بالکل ایسا نہیں لگتا۔ الفا گروپ ٹو بینک کرپسی کے در پر ہے۔ بیٹے کی ٹیوشن فیس کس کمیٹی سے بھر رہے ہیں آپ؟"

اس کے تاثرات تنے۔ "کیا مطلب؟" شاید یہ استفسار غیر متوقع گزرا تھا۔

رانج نے ایک سانس باہر چھوڑی۔ "مجھے لگا تھا دنیا میں کمینے انسان مجھ پر تمام ہیں، مگر اللہ ہائی، آپ نے تو نئے ریکارڈ قائم کر دیے۔ اپنے ورکرز کی حق کی تنخواہوں سے جیبیں بھرتے شرم تو بالکل نہیں آتی ہو گی ناں تمھیں۔ بس اسی لیے تمھارا اعمال نامہ تم سے ملنے آیا ہے۔"

"کیا چاہتے ہو؟ تم، تم وکیل ہو؟ کس نے ہائر کیا ہے تمھیں۔"

عمر سعید کے الفاظ زبان پر پگھل گئے جب رانج نے اسے گریبان سے پکڑتے پیچھے بنے دروازے پر دے مارا۔ ہیزل آنکھیں سرخ چمک اٹھیں۔ "ایک اور بار تم نے پوچھا کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں، اور تم جان جاؤ گے پینتیس ہزار فٹ کی اونچائی کتنی اونچی ہوتی ہے۔"

پھر گلا آزاد کیا اور پیچھے ہٹا، شکل پر واضح چڑچڑا پن تھا۔ وہ اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا۔

"میں تم سے ایک ڈیل کرنے آیا ہوں، عمر۔"

"کہو۔" آواز سہمی ہوئی تھی۔

"الفا گروپ کے جن جن ورکرز کے پیسے تم نے پچھلے پانچ سالوں میں بھگوسے ہیں، انھیں واپس لوٹا دو۔ تمھاری کمپنی، تمھارا خاندان، سب سیف رہے گا۔ مائی ورڈ۔" اس نے "تم" جانتے بوجھتے نہیں کہا تھا۔ عمر سعید نے ابرو اٹھائے اور ماحول کی تنگی کے باوجود مسکرا دیا۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" مسکراہٹ میں جھول تھا، خوف تھا۔ "تمھیں مجھ سے مسلہ ہے، مجھے کورٹ میں چیلنج کرو۔"

"میں ضرور یہ بیوقوفی کرتا اگر نہ جانتا ہوتا تم کس قسم کے انسان ہو۔ قانون تمھارے گھر کی لونڈی ہے۔" رانج نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا پلاسٹک بیگ نکالا۔ عمر کی نگاہیں اس تک اٹھیں۔ اس میں انگلی کی پور کے ناپ کی ایک چپ تھی۔

رانج نے اسے ہلایا۔ "یہ۔۔۔ یہ تمھارا اعمال نامہ ہے۔ مختلف قانون سازوں کے ساتھ ہوتی میٹنگز کی چھ ماہ کی ریکارڈنگ، کچھ ملٹری لیڈرز بھی ہیں۔ غیر قانونی سلش فنڈز، شیل کمپنیز، آف شور اکاؤنٹس ان سب کا ٹریک ریکارڈ ہے میرے پاس۔ مجھے تمھارے گناہوں سے کوئی غرض نہیں، تم مرو یا جیو۔ لیکن ان لوگوں کے پیسے واپس کر دو۔ اس کے بعد یہ چپ کبھی دن نہیں دیکھے گی۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"تم مجھے دھمکا رہے ہو؟ ایک دو نمبر پائلٹ، ایک سڑک چھاپ لڑکا عمر سعید کے منہ پر کھڑا ہے۔"

رانج نے کان کی لو کھجائی۔ "تمھیں بتاؤں اس کا کیا ہوا تھا جس نے تم سے پہلے یہ الفاظ کہے تھے؟" آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ اچانک اس کا منہ خشک ہوا۔ رانج مسکرا دیا اور دھیمی سرگوشی کی۔

"He's no more."

(وہ مر چکا ہے۔)

اور ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ دو سال پہلے اسے ان تخالص سے نوازنے والا ایچ آر منیجر وفات پا چکا تھا۔

عمر سعید کے چہرے کا رنگ بگڑا۔ "میری ایک کال پر تم ضائع ہو سکتے ہو، لڑکے۔"

رانج نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر دھیرے سے پیچھے ہوا۔ "ملاؤ۔"

عمر کے کوٹ تک جاتے ہاتھ نے جیب ٹٹولی۔ اس کا فون تو یہیں ہونا تھا۔

"ملا؟ نہیں؟ اوہ، کہیں یہ تو نہیں؟" اس نے ہاتھ میں ایک فلپ فون گھمایا۔ عمر اس سے لینے قریب بڑھا ہی تھا کہ اس نے آدھے راستے ہی فون ڈھیلا چھوڑا اور وہ اس کے ہاتھ سے پھسلتا ٹوائلٹ میں جا گرا۔

"اوپس۔ اب تم اپنی میجک کال نہیں کر سکتے۔"

"یو اڈیٹ!" وہ غرایا اور جب ہی رانج نے پینٹ کی جیب سے سوئیس آرمی نائف برآمد کی۔ وہ پانچ انچ کی ماپ، مٹھی برابر پاکٹ نائف تھی جس کا بلیڈ اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ اس نے بلیڈ کی تیز دھار عمر کے شہہ رگ پر جمائی اور دوسرے سے آئی پیڈ آگے بڑھایا۔ عمر سعید کا جسم شل تھا۔ "یہ پکڑو اور کام شروع کرو۔ تم ہر ورکر کو اس کا پیسہ لوٹاؤ گے، بھلے وہ زیادہ سے زیادہ ہو یا کم سے کم۔ لسٹ اسی میں ہے۔ شروع کرو اکائرز مورا کے اکاؤنٹ سے۔"

وہ رانج کو بے بس نگاہوں سے دیکھنے لگا جب اس نے بلیڈ کا کنارہ درشتی سے اس کی کھال میں گھسایا۔ گھنیری پلکوں میں چھپی عمر کی آنکھوں میں بہت سا خوف اترا اور اس نے ٹیپ تھاما۔

"تمھارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔"

"ایک گھنٹہ؟ ایسے کیسے میں پانچ سال کا حساب۔"

"پچاس منٹ۔" رانج نے سنگ دلی سے گھورا۔ "اور کچھ؟"

عمر کے ہاتھ کانپے مگر گردن نفی میں ہلی۔ رانج نے اس کے پیچھے دروازہ کھولا اور ٹوائلٹ تک جانے کا اشارہ کیا۔ "پچاس منٹ میں تم سے ایک آدمی حال پوچھنے آئے گا۔ یہاں سے نکلنے کا تصور بھی مت کرنا۔ میری بہت ساری آنکھیں اور بہت سارے کان ہیں۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ٹوائلٹ سیٹ پر بیٹھا مرد اسے دیکھتا رہا۔ ساری شہنشاہی راکھ ہو چکی تھی۔ رابح نے اس کے منہ پر دروازہ بند کیا۔ دو منٹ وہ باہر کھڑا رہا اور پھر اس کے جیب میں رکھے برنر فون میں بیپ ہوئی۔ مسلسل کئی بیپ۔

"نہیں ہو گا، کوئی رابطہ نہیں ہو گا۔ اور اون لائین ٹرانسفر کے علاوہ کوئی ایپ بھی نہیں کھلے گا۔ اس کے اوپر تم جتنی بار کوشش کرو گے، مجھے خبر مل جائے گی۔ جیسا کہ میں نے کہا میں ہزار دیدہ ہوں۔" اس نے مسکرا کر دروازے کے پار مرد کو مخاطب کیا۔

جواب خاموشی تھا۔ ہاری ہوئی، سہمی ہوئی خاموشی۔ اعمال نامہ سامنے تھا، کیا کوئی اسے رد کر سکتا تھا؟

★★★

اکائر ظبیہ کے ساتھ چل کر پیسنجروں کے آئل تک آیا تو ذہن میں صرف رابح تھا اور دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔

کیا عمر سعید لیوٹری جا چکا ہو گا؟ پچھلے چھ ماہ سے وہ اس کے قدم قدم کا ریکارڈ رکھے ہوئے تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھر بار، صحت اور مصروفیات۔ گو کہ اس کے اور رابح کے پلان کا زیادہ تر حصّہ بخت پر انحصار کرتا تھا، انھوں نے ریسرچ پوری کی تھی۔ رابح نے اس سے کہا تھا کہ وہ عمر سے پیسے اون لائین ٹرانسفر کروائے گا اور اکائر کو میسج پہنچ جائے گا۔ وہ انتظار میں تھا، لیکن بے صبر نہیں۔

وہ سیٹ تک واپس پہنچے تو اس کے ابرو نا سمجھی میں جڑے۔ پاس آتے معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا بچہ اس کے سیٹ پر جوس گرا چکا تھا۔ اس کا کالا بیک پیک بھی گیلا ہوا تھا۔ وہ جھک کر آگے بڑھا اور پریشان خواتین کو تسلی بخشی۔ ظبیہ بھی برابر ہی کھڑی تھی۔ غزار کے بارے میں جان کر وہ پہلے سے تھوڑا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ کم از کم وہ اس پر اتنا بھروسہ تو کرتی تھی کہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز یوں کھول دیا۔ اور وہ؟ وہ تو اسے بھی دھوکے میں رکھے تھا۔ ظبیہ کیا کہے گی، اگر وہ اسے بتا دے کہ وہ رابح کے ساتھ مل کر اس پلین میں انتشار پھیلانے والا تھا؟ وہ نفرت کرے گی۔ وہ اسے کوسے گی۔

رائج۔ رائج سے اسے یاد آیا اس نے اب تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس کا لگتا کون تھا۔ اسے ایک معمولی لہجہ اختیار کرنا ہو گا، ورنہ وہ مشکوک ہو گئی تو گئے چھ ماہ تیل لینے۔

وہ رائج سے بھی پوچھ سکتا تھا، کیونکہ جو بھی تھا دو طرفہ تھا۔ لیوٹری میں آمنے سامنے کھڑے، ان دو آنکھوں کی جوڑیوں میں وہ اتنے رنگ و جذبات دیکھ چکا تھا کہ سمجھنے میں بھول نہ کرتا۔ مرکز اس کا یہ جاننا تھا کہ کیا وہ تعلق اچھی نسبت کا تھا یا بری۔

اور جو بھی تھا تو رائج نے اسے پچھلے چھ ماہ میں بتایا کیوں نہیں؟ حالانکہ وہ ظبیہ کو اپنے سامنے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنا بیک پیک اٹھاتے بے تکلفی سے ہاتھ جھاڑے۔ "ارے کوئی مسلہ نہیں ہے۔ میں یہ صاف کر کے آتا ہوں۔" لیپ ٹاپ اور کچھ مہنگی چیزیں ظبیہ کو تھمائیں۔ یہ موقعہ اچھا تھا۔ چند ماہ کا بچہ اسے لیوٹری میں رائج کا جائزہ دینے کا موقع دے چکا تھا۔

★★★

لیوٹری کا دروازہ بجانے سے قبل اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ فلائٹ اٹینڈنٹ اور دیگر پسینجر وہاں سے دور تھے۔ کوئی اس راستے آ گیا تو مسلہ ہو گا، لیکن وہ دونوں دس طرح کے جھوٹ پہلے ہی سوچ چکے تھے۔

ہلکی کھٹکھٹاہٹ کے بعد ہی دروازہ چرچرایا۔ اکائر نے چہرہ اوپر اٹھایا تو سرمئی آنکھوں میں تفتیش تھی۔

سامنے کھڑے مرد نے اسے دیکھ کر ایک سانس اندر لی اور پرے ہو کر راستہ دیا۔ اکائر برابر سے اندر آ گیا تو رائج نے دروازہ واپس بند کیا۔

"کہاں ہے وہ؟" اکائر نے بیک پیک کو ایک طرف ڈالا اور آواز میں ڈھیروں بے کلی لیے سوال کیا۔

پلان کے مطابق وہ ادھر ہی ملنے والے تھے۔ رائج نے اوپر سے نیچے اس کا جائزہ لیا پھر ٹھوڑی بند دروازے والے ٹوائلٹ کی طرف اٹھائی۔ اکائر نے نوٹ کیا اس کے ہاتھ میں پاکٹ نائف تھی جسے وہ صاف کر کے اندر رکھ رہا تھا اور شکل پر ناراضی۔ پائلٹ کے مخصوص یونیفارم میں وہ اچھا لگتا تھا۔

اکائر کا دل مارے خوف ذرا بے ترتیب ہوا۔ اس نے تیز دھار چھری کو دیکھتے الفاظ نکالے ہی تھے کہ رانج نے اسے ٹوک دیا۔ "کچھ بھی نہیں کیا، اس سے پہلے کہ تم اخلاقیات پڑھاؤ مجھے۔"

"کچھ کہا اس نے؟ پیسوں کا کیا بنا؟" وہ سرگوشی میں پوچھ رہا تھا۔

"بھیج رہا ہے۔ دھمکی دے رہا تھا یہاں وہاں کی۔ عقل ٹھکانے آگئی اب۔" رانج نے ابرو سکیڑ کر اطلاع کی پھر اسے دیکھا۔ "تم پر شک تو نہیں ہوا کسی کو؟"

اکائر نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، آل از ویل۔" پھر اس کے ذہن میں ایک بتی جلی۔ اس نے رانج کو دیکھا جو وال مرر کا حال درست کر رہا تھا۔ "تم ظبیہ یمین کو کیسے جانتے ہو؟"

استفسار نے رانج کے کوٹ سدھارتے ہاتھ روک دیے۔ چہرے پر ایک سایہ سا گزرا۔ اکائر طلبگار نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پائلٹ نے چہرہ دجھکا کر نل کھولا اور ہتھیلیوں کے درمیان بہت سا پانی جما کیا۔

"کون ظبیہ؟" چہرے پر چھینٹا پھینکا۔ پانی کی لکیریں اس کی ٹھوڑی سے گر کر فنا ہوئیں۔ اس نے دوبارہ ہاتھوں میں پانی اکھٹا کیا۔

اکائر جیسے اس کی مغلوب ہوئی اداکاری سے محظوظ ہوا۔ لبوں کے کنارے اوپر اٹھے، البتہ وہ خوش نہیں تھا۔ اسے ظبیہ کا ان دونوں کے درمیان آنا ناگوار گزرا تھا۔

"وہی جس کے ساتھ بورڈنگ گیٹ پر روم کوم شوٹ کیا تھا۔" اس نے باہیں سامنے باندھتے کہا۔ "تم جانتے ہو ظبیہ کو، رانج۔ میری کرائے دار۔"

رانج نے ایک اور چھینٹا چہرے پر اچھالا۔ گھنیری پلکوں سے آبشار ٹوٹ ٹوٹ سنک میں گرا تو کئی لہریں اس کی گردن سے نیچے تیر گئیں۔ اس کا کالر اب گیلا تھا۔

"ہاں، تمھاری کرائے دار۔ اسے جانتا ہوں میں۔" اس نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ ظبیہ سے اپنی رقابت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس سے صرف مسائل ہونے تھے۔

"تم کیا باتیں کر رہے تھے اس سے تھوڑی دیر پہلے یہاں؟ تم نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں تم اس سے شناسا ہو؟" اکائر کو بات کی تہہ تک پہنچنا تھا۔ رابح نے نل بند کیا پھر تولیے سے چہرہ سکھایا۔

"راستہ بھول گئی تھی وہ، میں صرف راستہ بتا رہا تھا۔"

"اتنا پاس آ کر؟" رابح نے اسے اکتاہٹ سے گھورا۔ اب کہ ان کے درمیان فاصلہ گھٹ چکا تھا۔ اکائر اسے نظریں جھکا کر دیکھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کسی کو اتنی بری لگ جائے گی یہ نزدیکی۔" وہ تنگ آ کر بولا۔ اکائر کا دل جیسے جھلس گیا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ وہ بن مقصد رابح پر چڑھ رہا تھا۔ آخر اس شخص نے کب صرف پوچھنے پر اپنے راز بتائے ہیں؟ اگر وہ ظبیہ کو جانتا بھی تھا، جو کہ اکائر کو سو فیصد یقین تھا کہ یہی ماجرہ ہے، وہ کبھی نہیں ماننے والا تھا۔

"تم دوا لائے؟" اس نے پوچھا تو اکائر نے سر ہاں میں ہلایا اور بیگ تھام کر زپ کھولی۔ اندر سے ایک شیشی نکال کر اس نے رابح کو تھمائی۔ فینوبار بیٹل۔

"بیس سے تیس ملی گرام اس کے نارمل ڈوز ہے۔ تم ایک سو بیس تک دے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ نہیں ورنہ اوور ڈوز (overdose) ہو جائے گی۔"

رابح نے شیشی پلٹ کر آگے پیچھے کی۔ "یہ تمھیں ملی کہاں سے؟ یہ تو بین نہیں ہے؟"

وہ اسے دیکھ کر فخریہ مسکرایا۔ "کیا میں اکائرز مورا نہیں ہوں؟"

رابح نے تھک کر سر ہلایا، پھر اسے عمر سعید کا خیال آیا تو اکائر کو دیکھا۔ "مجھے واپس جانا ہے۔ پچاس منٹ میں سامان جما کرنے کی ذمہ داری تمھاری۔ ٹیبلیٹ اس سے لے لینا اور اسے دیکھ کر بھیجنا کہ منہ نہ کھولے۔ شکل بھی چھپا لینا اپنی۔"

اکائر نے دھیمے سے گردن ہلائی، تو اس نے سوال کیا۔ "تم نے اپنا فون چیک کیا؟ پیسے موصول ہوئے؟"

اس نے فوراً سیدھا ہو کر جیب سے فون بر آمد کیا اور اسکرین پر چمچماتا مسیج دیکھ کر اسے لگا اس کی آنکھیں بھیگ جائیں گی۔ اس کی ڈیڑھ سال بھر کی تنخواہ اس کے اکائونٹ میں ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ اس نے فون سینے سے لگایا اور آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کیا۔

رابح اسے تکتا رہا۔ ان خالی خالی نگاہوں میں ہزار روک کر بھی ہلکی سے نرمی امڈ آئی تھی۔

"تم انھیں اپنے بھائی یا والدین کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دو۔" اس نے سرسری سا کہا۔ اکائر اب فون ان لاک کر کے اسکرول کر رہا تھا۔

"میں اس سب کے بعد اسپین جاؤں گا تو ساتھ خبر دوں گا۔ اڈرین خوش ہو گا کہ میں اس کے وائن یارڈ میں انویسٹ کر سکتا ہوں اب۔" وہ واقعی خوش لگ رہا تھا۔ "اب بابا کو بھی اپنی سیونگز کی فکر نہیں کھائے جائے گی۔" اس نے چہرہ اٹھا کر رابح کو دیکھا۔ سرمئی آنکھیں گہری تھیں، پہاڑیوں اور آسمانوں سے زیادہ پرکشش۔

"تھینک یو، رابح۔" وہ مسکرایا۔ "تھینک یو سو مچ۔ تمھاری دوستی میرے لیے اعزاز ہے۔"

رابح کو لگا جیسے اس کا حلق اچانک کڑوا ہو گیا ہے۔ کچھ پتھریلا اور نوکدار اس کے گلے میں چبھ رہا تھا۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ احسان کا جذبہ اسے ہمیشہ بھاری پڑتا تھا۔

"میں اب بھی کہوں گا کہ انھیں ٹرانسفر کر دو۔ یہ فلائٹ کب لینڈ ہو، کہاں لینڈ ہو۔ اس کا ابھی پتا نہیں۔ اس کے بعد اچانک اتنی بھگ دڑ مچ جائے گی میڈیا اور آفیس میں کہ تمھیں وقت نہیں ملے گا یہاں سے جانے کا۔"

"تم نے اب تک سوچا نہیں تم کہاں لے کر جاؤ گے پلین؟" اس نے خفیہ انداز میں چہرہ آگے کرتے پوچھا۔

رانج نے زمین کو دیکھا۔ "آس پاس ہی کسی مشرقی ایشیائی ملک میں۔ مے بی ہانگ کانگ یا جاپان۔ شمالی کوریا بھی پاس ہے۔"

پھر سیدھا ہوتے اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا، ایک آخری بار۔ پچاس منٹ بعد اکائر نے عمر سعید کا کام دیکھ کر اسے وہاں سے واپس بھیج دینا تھا۔ ظاہراً وہ اسے اپنی شکل نہیں دکھا سکتا تو ماسک کے پیچھے سے ساری کارروائی کرنی تھی۔ رانج کی دھمکیوں نے اس ایکزیکٹیو کو اتنا تو ڈرا ہی دیا تھا کہ وہ منہ نہ کھولتا، اور اگر کھولنے کا دل چاہتا بھی تو اپنا فون وہ پہلے ہی کھو چکا تھا۔

"سب ٹھیک تو ہو گا ناں، رانج؟" اکائر نے اچانک ایک آس لیے اس سے پوچھا۔ سامنے کھڑے مرد کے دل میں چبھن اٹھی، دروازے کی جانب بڑھتے قدم تھم گئے۔

"اتنا کچھ غلط کر کے بھی۔۔۔ اگر کچھ ٹھیک نہ ہوا تو؟" اکائر کی آواز کانپی تھی۔ "کسی کی جان کو خطرہ تو نہیں پہنچے گا ناں؟ ہمارا پلان فول پروف ہے ناں؟ پیچھے ننھے ننھے بچے ہیں اور ضعیف ماں باپ بھی۔ ہم انھیں خطرے میں تو نہیں ڈال رہے ناں؟"

اس نے ٹھوڑی اکڑا کر اسے دیکھا۔ "پچھلے چھ ماہ اگر میں تمھیں یقین نہیں دلا سکا تو اب کیا کہوں؟"

اکائر نے سر نفی میں دائیں بائیں کیا۔ "مجھے تم پر یقین ہے، رانج۔ تم غم میں ہو لیکن مطلب پرست نہیں ہو۔ تم کسی شخص کو جانتے بوجھتے ہرٹ نہیں کر سکتے۔"

نیزے۔ یک بعد دیگرے، زہر میں ڈوبے نیزے اس کا سینا ٹاپ کر دل میں گھونپ دیے گئے تھے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس نے جواب نہ دیا۔ جواب فریب جو تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔ کچھ بھی ہو تو مجھے اپ ڈیٹ کر دینا۔ ائیر پیس؟" اس نے آہستگی سے پوچھا تو اکائر نے اپنے کان میں اٹکے ائیر پیس کو تھپتھپایا۔ سر ہلا کر وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ قدموں میں لرزش تھی۔

رائج آدم مطلب پرست اور متکبر ہی نہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کا غدار بھی تھا۔

★★★

حال

پسنجر کیبن MH370

02:28 AM

لمحہ وہیں سے جوڑتے ہیں۔ ایم ایچ تھری سیون زیرو۔ نیلی راہداری۔ کنارے کھڑا اکائرز مورا، اور ڈیوائس کی دوسری طرف موجود قابل پائلٹ رائج آدم۔

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" اکائر کی نسوں میں خون ابل رہا تھا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم، رائج؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تم ان چھ ماہ میں سمجھے ہی نہیں میں چاہتا کیا ہوں، اکائر۔ تم میرا دشمن ہی نہیں پہچانے۔"

"کون ہے تمھارا دشمن؟" اکائر کی آواز میں جھجک تھی، خوف تھا۔

ایک لمحے کی توقف کے بعد، رائج بول پڑا تھا۔ "میں، رائج آدم۔"

اکائر کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی، گلے میں سے ایک بے آواز ہوک آزاد ہوتے ہوتے رہ گئی۔ "تم، تم-"

"تمھیں سمجھ ہی نہیں آیا میرا انتقام کس سے تھا۔" رائج ایسے کہہ رہا تھا جیسے مایوس ہوا ہو۔ "میں کس کو ختم کرنے نکلا تھا۔" سیاہ لیدر جیکٹ میں ملبوس مرد کے دماغ کی رگیں پھڑ پھڑا رہیں تھیں۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"نہیں، رائج۔۔۔" اس کی آواز روہانسی تھی۔ اکائر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے، اس شخص کا دل کیسے پھیرے۔ "ایسے کیسے، یار؟ موت کا دامن تھام کر تمھیں زندگی کی اذیت سے رہائی کیسے مل سکتی ہے؟

نہیں مل سکتی! موت زندگی سے بہتر کیسے ہے؟" وہ راز دار نہ ہوتا تو پھیپڑے کھنگال کر چیختا، اپنی جلد نوچ ڈالتا۔

"کیونکہ حیات میں حساسیت ہے۔ دردمندی ہے، روگ ہے، دلاسہ ہے، حوصلہ اور کمبخت امید بھی۔"

رابح نے ٹھہر کر سانس لی، سانس میں لرزش تھی۔ کیا پانچ سال میں وہ پہلی مرتبہ سچ کہہ رہا تھا؟ یہ کسی مجاہد کی نہیں، بلکہ اپنے ضرر تلے روندے سورما کی پکار تھی۔ "اور میں تھک گیا ہوں۔ میں اندر باہر سے کھوکلا ہو گیا ہوں۔ میرے سینے میں ایک چبھن ہے، مسلسل، غیر شناسا جو کسی بھی طبیب یا حاذق کے علم میں نہیں آتی۔ وہ اسے بے سکونی کہتا ہے، اکائر، مگر یہ بے سکونی نہیں ہے۔ یہ ناس ہے اور یہی موت ہے۔"

اکائر کو اپنے آنسو بہتے محسوس ہوئے۔ اس نے چکنے ہاتھوں سے چھوٹا ڈبا آگے پیچھے کیا، پیر جامد تھے اور بے سکون بھی۔

"تم مضبوط مرد ہو، رابح۔ تم موت کا سہارا نہیں لو گے اپنی اذیت سے بھاگنے کے لیے۔ مجھے تم سے ایسے کی امید نہیں ہے۔ کیا واقعی تمھیں اور کوئی آپشن نہیں دکھتا؟" وہ دیوار سے ٹک گیا۔ کاکپٹ میں بیٹھا رابح بھی گنگ اور بے حرکت نشست اسے سن رہا تھا۔

"کم اون رابح، زندگی کی کوئی ایک یاد، کوئی ایک گھڑی جس کے لیے تم جینا چاہتے ہو؟ جس نے تمھیں مقصد دیا؟" کاش وہ کاکپٹ کا دروازہ کھول کر اس کے قدموں میں گر جاتا، لیکن اکائر کو یقین تھا اگر وہ دروازہ کھل گیا تو اس کے دل میں کئی دروازے بند ہو جائیں گے۔

وہ رابح آدم سے اس گھڑی کے بعد سے نفرت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں رکھتا تھا۔

"ہاں، تھی ایسی گھڑی جس نے مجھے مقصد دیا، مجھے شعور بخشا۔"

"کون سی؟ مجھے بتاؤ۔ ہم اس کے لیے جئیں گے۔ میں تمھارا دوست ہوں۔" وہ بے تاب تھا۔ کیا جینے کی تمنا انسان کو اتنا بے بس بنا دیتی ہے؟

"ایم ایچ تھری سیون زیرو کی پلاننگ۔"

وہ سن پڑ گیا، ساری حرکات فنا سی ہو گئیں، اور اسی پل اکائر نے خواہش کی کہ اے رب، کاش تو نے مجھے دو دل دیے ہوتے، کیونکہ اس صدمے کو جھیلنے کے لیے ایک ناکافی تھا۔

"میں پانچ سال سے صرف اس گھڑی کے لیے جی رہا ہوں، اکائر۔ آج کے لیے، ابھی کے لیے۔"

اکائر کے آنسو زار زار ٹوٹتے گئے۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کا آکسیجن ماسک گیلا تھا اور سینے میں قید دل وزنی۔

"میں رانج آدم ہوں۔ پیشے سے پائلٹ۔ ٹی ٹی ڈی آئی کا رہائیشی۔ میری ایک بہن تھی، ایک بہنوئی، ایک بھانجی اور ایک ماں۔ بارہ سال کی عمر میں طیاروں میں اپنا معبود ڈھونڈا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں جہاز کی کاکپٹ پہلی بار دیکھی تھی۔ اکیس سال کی عمر میں اپنی پہلی سولو فلائٹ لی تھی۔ میں حلال تھا اور میں ہی شمس تھا۔ میری چمک لازوال تھی، میری دستان سنہرے پنکھوں سے رقم کی ہوئی۔"

ایم ایچ تھری سیون زیرو کا کونہ کونہ اپنے انجام کار کو سن رہا تھا۔ ہیبت تھی یا اصلی چاہت، اس کا پتا لگانا دشوار تھا۔

"اس ہستی کی زمین سے کئی اوپر، بلندیاں میرا مقام تھیں۔ مجھے سرور ملتا تھا بادلوں میں۔ ہمیشہ اپنا بوجھ آسمانوں پر ڈال دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے سنبھال لیتے تھے۔ لیکن ایک گھڑی آئی جب انھوں نے مجھ سے مراد مانگی۔ آسمان نے طلب کی کہ میں اس کا بوجھ اٹھاؤں۔ میں انکاری تھا۔ میں سفاک تھا، میں کاذب تھا۔ آسمان کذاب کو مہلت نہیں بخشتے۔ اسی لیے اللہ نے پردے لگائے ہیں۔ شیاطین تک اس روک کو پار نہیں کر سکتے، میں تو پھر ایک ادنیٰ شے تھا۔"

ٹھنڈی ساخت ہوائیں سیاہ آسمانوں کو چیر رہی تھیں، لیکن ایم ایچ تھری سیون زیرو اپنے وزن پر قابض تھا۔ آخر کب تک؟

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"انھوں نے مجھے پٹخ دیا۔ میں نے آسمانوں کی رفاقت چھوڑ، ان کا غضب مول لے لیا تھا۔ مجھے زوال دیا گیا، کیونکہ آسمان میرا مقام نہیں تھا۔ میری جگہ نیچے تھی، بہت نیچے۔ پستی اور نابودی کے آخری تخت گاہوں میں۔ وہاں کے لیے ہے انسان۔ میں نے اپنے کیریئر کو اپنی ہر خوشی، ہر خواب پر ترجیح دی۔ ہر لمحے، ہر جواب پر فوقیت دی۔ میں نے خاندان چھوڑے، محبت داؤ پر لگائی اور پینتیس ہزار فٹ کا ایک جھٹکا مجھ سے وہ سب چھین گیا۔" اس نے وقفہ لیا۔ کیا وہ رو رہا تھا؟ اکائر کو لگا تھا وہ رو رہا ہے۔ اس کی آواز گیلی تھی، ناک سے بحال ہوتی سانسیں غیر متوازن۔

اکائر نے پلکیں موندلیں اور دیوار کے ساتھ پھسلتا چلا گیا۔ فون جیسی شے اسی طرح اس کے کان پر تھی۔

"میں لمحات واپس چاہتا ہوں، اکائر۔ بلندی کے نہیں، پستی کے۔ مجھے میری ماں کا ہاتھ چومنا ہے، بہن کا مان رکھنا ہے، اپنی بھانجی کو دنیا کی ہر وہ خوشی دینی ہے جو اس نے مجھ سے مانگی تھی یا مانگنی تھی۔ وہ نہ بھی مانگتی، میں تب بھی دے دیتا۔ لوگ کہتے ہیں پانچ سال پہلے حادثہ ہوا تھا، میں بے قصور ہوں۔ نہیں اکائر۔ میں ہی گناہگار ہوں، میں سیاہ ہوں۔ میں اپنا خاندان ہڑپ کر گیا۔ میں بلندیوں کا پیروکار، اپنے خون کی حفاظت نہیں کر سکا۔ میری بہن میری شہنشاہی میں تھی، اور میں اسے نہیں بچا سکا۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

اب کہ وہ دبی دبی سسکیوں سے رو رہا تھا۔ رابطے کے دونوں طرف بیٹھے مرد بکھرے تھے۔ ایک کو موت کا خوف تھا اور ایک کو زندگی سے وایا۔

"میرے خسارے ان گنت ہیں، ان کا وزن ادھک ہو رہا ہے۔ یہ میرا دم گھونٹ دیں گے۔ یہ مجھے ملال کی موت ماریں گے۔"

"تم پوری طرح سیاہ نہیں ہو۔ تم صرف ضرر نہیں ہو۔" خشک، تردیدی بیان۔ اکائر ڈیوائس میں کہہ رہا تھا۔ رابح خاموش رہا۔ اتنی دیر بولنا اس کا گلا دکھا گیا تھا۔

"تم میں حساسیت ہے، اب بھی۔ تم خیال کرنا جانتے ہو۔"

"میری بات سنو جو میں کہنے لگا ہوں۔" رائج کا لہجہ واپس سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"بورڈنگ گیٹ پر تم نے ظبیہ یمین کی جان بچانی چاہی تھی۔"

اس کے تنفس بگڑے، زبان کی نوک پر بنتے الفاظ وہیں زائل ہو گئے۔ رائج گنگ سا سنتا گیا۔

"تم میں حساسیت ہے۔ تم، تم اس کی زندگی بچانا چاہتے تھے، رائج۔ تم محبت کرتے ہو اس سے۔ آج بھی۔"

اور یہ اعتراف ہی اکائرز مورا کو اندر تک چیر چکا تھا۔ کوئی اس کے سینے سے ہاتھ گزار کر دیکھتا، کیونکہ دھڑکن رکھتی کوئی بھی شے وہاں موجود نہیں تھی۔

رائج خاموش تھا۔ بالکل ساکت۔

"تم نے اس سے محبت کی تھی پانچ سال پہلے۔ تمھاری منگیتر ہے وہ۔ اس کی کہیں اور شادی ہو گئی، اس کے ابا نہیں مانے، تمھارا کریش۔ ایوری تھنگ! اس نے مجھے بتایا ہے۔ رائج، اس کا شوہر مر گیا ہے۔" وہ ایک سانس میں بول رہا تھا، مگر وہ صرف بول نہیں رہا تھا، اپنی روح و بدن کو شعلہ دے کر محبت کا سودا کر رہا تھا۔

"تم نے اسے کیوں بچایا؟ تم اتنے بگ بیڈ وولف (big bad wolf) ہوتے تو تم کبھی نہ بچاتے، رائج۔ تم نے دو سو انتالیس لوگوں میں سے کسی کو نہیں بچایا۔ تم جانتے تھے تم یہ پلین کریش کرنا چاہتے ہو، اسی لیے تم نے اسے روکا تھا۔ میں نہ آتا تو شاید تم کامیاب بھی ہو جاتے۔ تم پچھلے چھ ماہ سے کسی روگ میں مبتلا تھے۔ وہ روگ محبت ہے، رائج۔ تم اسے محبت سے ٹھیک کر لو۔ ظبیہ یمین کا ہاتھ تھام لو۔ وہ اس سفر میں تنہا ہے۔"

آگ، چبھن، شعلہ، مرض اور آزردگی۔ ایک سرخ جذبے کو ہار کر، اکائرز مورا باقی سب کما چکا تھا۔

"تمھاری بکواس ہو گئی تو میں کام کی بات کروں؟" وہ جیسے چڑ سا گیا تھا۔ اپنے ہی الفاظ خود کے سینے میں گھستے محسوس ہوئے۔ تم اتنا کڑوا کیوں بولتے ہو، رائج آدم؟

وہ ہار نہیں ماننے والا تھا۔ اس نے محبت فروخت کر کے یہ لمحہ کمایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اگر وہ بچ بھی گیا تو خود کو آئینے میں کیسے دیکھے گا۔ کیا وہ اتنا گھٹیا مرد تھا؟ اس نے اپنی زندگی کو اپنی محبّت پر فوقیت دی تھی؟ کیا نہیں دینی چاہیے تھی؟

"وہ تمھارے نام پر زخمی ہے، رائج۔ ظبیہ یمین تمھارے غم سے کبھی نہیں بھری۔"

آنکھوں کے آگے چہرے جل بجھ ہوئے۔ ظبیہ اور اکائر کچن اسٹینڈ کے ساتھ کھڑے ہنس رہے تھے۔ اپنے بیسٹ فرینڈ کی سالگرہ پر وہ کیک بنانا چاہتا تھا، سو ظبیہ اسے سکھا رہی تھی۔ فراسٹنگ ہاتھ میں تھامے، گھنگریالے لٹیں کان کے پیچھے چھپائے، لڑکی کیک پر سفید کریم سے کچھ لکھ رہی تھی۔ انگریزی میں کچھ۔ ایک حرف لکھ کر اکائر کو دکھایا اور پھر فراسٹنگ اس کی جانب کی۔ ان کی انگلیوں کی پوریں ٹکرائیں تو ظبیہ نے باریک ترین لمس محسوس کیا۔ اکائر کے لیے وہ قیامت تھی۔

"وہ تم سے وفادار ہے۔ وہ تمھاری مشکور ہے۔"

ظبیہ سیڑھی پر کھڑی لاؤنج کا بلب بدل رہی تھی۔ اکائر گھر میں داخل ہوا تو تیز قدموں سے اس جانب بڑھا اور اسے نیچے آنے کا کہا۔ اسے کچھ ہو جاتا تو؟ بلب اس کے ہاتھ سے لیا، لیپ ٹاپ بیگ صوفے پر ڈالا اور خود اس کی جگہ کھڑا ہونے ہی لگا تھا کہ سیلنگ اس کے سر سے ٹکرائی۔ ظبیہ شرم سے لال ہوئی۔ اس کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ سیڑھی اونچی کرنی پڑی تھی، اکائر کے لیے وہ دو قدموں کی مار تھی۔

وہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہنس دیا۔ "اگلی بار گھر بنواؤں گا تو چھت ذرا نیچی ڈالوں گا۔"

"وہ ریزہ ریزہ ہے۔ اس کی زبان رحم مانگتی ہے، مگر اس کا دل محبت مانگتا ہے۔ تم اسے محبت دے دو، رائج۔"

پھٹا ہونٹ اور خون کے دھبے۔ وہ اسپتال میں تھے اور ظبیہ کے زخمی ہونٹ کو ٹانکا لگنے والا تھا۔ وہ لوہے کے پتلے گدے والے پلنگ پر لیٹی اور اکائر اس کے برابر کھڑا تھا، سینے پر ہاتھ باندھے، لب دانت سے کترتے۔

انجکشن سے ہونٹوں کی جلد کو سن کر کے اب ڈاکٹر اضافی کریم اس کی لال ہوئی جلد پر مل رہی تھی۔ پھر اس نے سوئی اٹھائی اور ظبیہ کی طرف مڑی۔ لڑکی کا دل گھبرا گیا۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پیچھے کر کے اکائر کی آستین کا کنارہ جکڑا۔ وہ سن پڑ گیا، دل کے گرد استادہ دیواریں لمحے کے ہزارویں حصّے میں ڈھے گئیں۔ ایک ایک۔ وہ اس کے لمس اور پکار سے کب ناواقف رہ سکتا تھا؟

آہستگی سے گھٹنوں کے بل اس کے سہارے بیٹھا۔ ظبیہ کی بھوری آنکھوں میں خوف تھا، بے پناہ خوف۔

"پلیز جانا مت۔" وہ منمنائی۔ اکائر نے کانپتی انگلیوں سے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کی۔ "کبھی نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ مضبوط ہے، مگر وہ تھک گئی ہے۔ وہ دنیا کو دکھانا چاہتی ہے کہ وہ مضبوط ہے۔ کیا مضبوطی بے درڑھ ہوتی ہے؟ تم اس کی دراڑوں کی رکھوالی کرو، رابج۔ ہر ہر گوشہ تمھیں سلامت رکھے گا۔ ظبیہ یمین ہم دونوں سے زیادہ اٹل ہے۔"

بارش میں تر دو چہرے۔ سبز جیکٹ پہنا اکائر اور اس سے چند قدم پیچھے، اس کی پشت پر کھڑی گھنگریالی زلفوں والی مجروح لڑکی۔

"آج میں ٹوٹ گئی ہوں۔" اس نے کہا تھا، اور اکائر نے عمر بھر کے لیے وہ الفاظ اپنے سینے میں سمو لیے تھے۔ وہ اسی سے ہی تو کہہ رہی تھی۔ اسی کا تو حق تھا ان الفاظ پر۔ ظبیہ یمین کی طرف سے کیا گیا پہلا اور آخری اعتراف۔

"وہ تمھارے لیے ٹوٹ گئی ہے۔"

مورخ نے قلم روک دیے تھے۔ یہ ظلم تھا، یہ تذلیل تھی۔ اکائر نے اسے ڈپٹ کر لکھنے پر مجبور کیا۔ جہاں اس نے محبت دی، وہاں محبت کا وعدہ بھی دے دیا۔ اکائرز مورا نے رابح آدم کو اپنے جینے کی وجہ سونپ دی تھی۔ شاید، اسے اب موت میں بھی سکون نہ ملتا۔

ان بھوری آنکھوں میں ہر بار دیکھ کر وہ پابندی سے ایک جذبہ تلاشتا تھا۔ شاید وہ اسے حاصل ہو جائے۔ کچھ نہیں، تو کاش وہ اکائر کی اپنی آنکھوں سے چھلک کر ان بھورے چشموں میں عکس ڈال دے۔ لیکن روشنی تک اس کی جھوٹی آس کا غرور نہیں رکھتی تھی۔ وہاں محبت نہیں تھی، کبھی نہیں تھی۔ قرابت تھی، رفاقت تھی، احسان تھا، تشکر تھا۔ محبت نہیں تھی، اور نہ کبھی ہو گی۔

اکائرز مورا نے محبت نہیں ہاری تھی، کیونکہ محبت کبھی اس کی تھی ہی نہیں۔

"تم ایک عورت کے پلو میں چھپ کر زندگی مانگ رہے ہو؟ تم مجھے محبت سے نہیں، محرومی سے پگھلانا چاہتے ہو۔" رابح نے جیسے دو فقروں میں اس کی زندگی کا فیصلہ سنایا۔

اس کے ابرو تنگ ہوئے۔ "میں۔۔۔"

"نو، بالکل خاموش۔ اور اب میری بات ذہن کے آر پار کر لو۔" گہری سانس لی اور دوسری طرف کھڑ پڑ گونجی۔ "تمھیں کتنا بتایا ہے ظبیہ نے میرے اور اس کے بارے میں، یہ میرا مسلۂ نہیں۔ اور اگر تم یہ سب ڈراما کر کے مجھے منیوپلیٹ کرنا چاہتے ہو تو، well done. You've failed miserably."

اکائر کے کان اہانت سے سرخ ہوئے۔

"ظبیہ یمین میری کمزوری نہیں ہے۔ نہ پانچ سال پہلے تھی، نہ اس سے قبل، نہ ہی آج۔ وہ ایک عام لڑکی ہے، ایک عام زندگی کی حق دار ہے۔ سب خراب جب ہوا جب میری زندگی عام نہیں رہی۔ اس نے اپنی زندگی کی سب ڈوریں مجھ سے جوڑ رکھیں تھیں، اسی لیے ذرا سا غیر متوازن اسے بھی جھنجھوڑ گیا۔" اس کی آواز ہمیشہ کی طرح نرم تھی۔

"میں نے اسے بورڈنگ گیٹ پر روکا تھا، ٹھیک کہا تم نے۔ ڈراما بھی کیا تھا، بلاوجہ کے نقص بھی نکالے، الزام بھی عائد کیے۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ ظبیہ کو روکنا میری انسانیت کی آخری درخواست تھی۔ وہ محبت نہیں تھی، رحم نہیں تھا، صرف ایک من چاہی جست تھی۔"

"تمھاری انسانیت اسی کے لیے کیوں چمکی؟ کوئی اور کیوں نہیں؟ ساٹھ ستر سال کے بوڑھے، محتاج ماں باپ کیوں نہیں، گدوں میں لپٹے روئی کے سے ملائم چھوٹے بچے کیوں نہیں؟ ہزاروں خواب آنکھوں کے پردوں پر پروئے جوان کیوں نہیں؟" اکائر کا سر اور دھڑ دونوں دکھ رہے تھے۔ "تم مرڈر کر رہے ہو، رائج! ماس مرڈر! Not a suicide."

"کیونکہ پانچ سال پہلے ان محتاج ماں باپ کی امیدیں مجھ سے وابستہ نہیں تھیں۔ وہ نہیں تھے جن کی روح و بدن چکنا چور ہوئے تھے۔ جن کے منہ پر میرا ہر لفظ طمانچے کی صورت پڑا تھا۔" اس نے کرسی کی گدی جکڑی۔ اکائر اس سے کیا بلوا رہا تھا۔

"اور تم کہتے ہو وہ تمھاری کمزوری نہیں ہے؟" اکائر نم گال لیے مسکرایا۔

"کمزور وہ ہے جو کاکپٹ سے باہر ہے۔" آواز ہیبت تاری کر دیتی تھی۔ "آکسیجن سینسر میرے سامنے ہے اور، میں تمھیں بتاتا چلوں کہ پلین میں زیادہ آکسیجن بچی نہیں ہے رپورٹ کرنے کو۔"

اکائر کا بدن شل ہوا۔ اس نے دو پل قابو پانا چاہا۔ اس کا دماغ اچانک چکرایا۔ وہ ٹھیک نہیں تھا۔

"سب ٹھیک کرو۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"تمھیں بھی تو محبت ہوئی تھی، اکائر؟ کبھی اس کا قصہ نہیں سنایا؟" وہ محظوظ سا بولا۔

"رائج، یو ڈیول۔"

"I have heard that one before."

وہ تھک کر بولا۔ "تمھاری محبت کا عنوان کون ہے؟" وہی شاطرانہ تجسس۔

"میں چیخ چیخ کر سب کو بتادوں گا تم ایک کمینے، خبیث اور قاتل آدمی ہو۔ انسان کے نام پر تہمت!" وہ تلملا رہا تھا۔

"تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟ دیکھو، چیخنا مت۔ ایسی باتیں شرافت سے بھی ہو سکتی ہیں۔"

"میں تمھیں کون سی گالی بکوں، خبیث انسان؟ کیسے مانسٹر ہو تم رائج؟" اکائر بے بس تھا۔ کاش لاعلم بھی ہوتا۔ "لوگ مر جائیں گے تمھاری وجہ سے۔ ان سب کا کیا قصور؟ ان سب نے تو تمھیں ٹراما نہیں دیا ناں۔ جواب دو۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ ان سب کا کوئی قصور نہیں ہے، جیسے میرا نہیں تھا پانچ سال پہلے۔ اپنے گھر والوں کا ذمہ میں لے لوں گا، لیکن ان تین سو اڑتالیس اموات کو میرے گلے ٹکایا گیا تھا۔ وجہ؟ میں قابل تھا، میں موجود تھا، میں زندہ تھا۔ انھوں نے میری حیات کو میرا جرم بنایا تھا۔ میری سانسوں میں الزام پرویا تھا۔ اب وقت پلٹ گیا ہے۔ رائج آدم رحم بھول آیا ہے۔"

اکائر نے فون پر گرفت سخت کی۔ "میں جا رہا ہوں سب کو سچ بتانے۔"

"جاؤ، شوق سے جاؤ۔ شروعات کرنا لوراوو ڈس سے، پھر عائشہ عبدالکریم اور پھر جس کو دل چاہے بتاتے رہنا۔" وہ لاپرواہ تھا۔ "لیکن جانتے ہو کیا ہو گا اس کے بعد؟ تم اور تمھارے دو سو سینتالیس سپاہی دروازہ پیٹیں گے، کیونکہ ظاہر ہے، اور کچھ وہ کر نہیں سکتے۔ لیکن یہ دروازہ بند ملے گا۔ اسے کانکریٹ اسٹیل سے بنایا گیا ہے اور اس کے سکیورٹی میکانزم کو تم اپنے محدود حواسوں سے آج کے آج سمجھنے سے قاصر رہو گے۔"

اکائر نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"پھر بھی تمھارا شوق ہے تو کر لو۔ کیونکہ دوسرا سیناریو بھی ہے میرے پاس۔ دروازہ توڑ دیا، گڈ۔ تم اندر آ گئے۔ مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ ارے چھوڑ دو فکر، ہتھکڑی نہیں ہے، میں دے دوں گا۔ بھائی ہو اپنے۔ ہتھکڑی لگا دی، اسامہ کی لاش بھی دیکھ لی۔"

"تم نے اسامہ کو مار ڈالا؟" اسے اپنی آواز میں بستے خوف سے خوف آیا۔ ٹانگیں لکڑیاں تھیں اور اکائر وہ کٹ پتلی جس کی ساری راس رانج کی پانچ انگلیوں کے گرد لپٹی تھیں۔

"ہاں، بتایا تو تھا۔ اسے بے ہوش کرنا پلان کا حصہ تھا۔" وہ پر سکون تھا۔

"اور تم نے اسے مار دیا؟" اکائر کو لگا تھا اس آخری معلومات سے اس کے اندر بچی کچی رمق بھی پانی بن چکی تھی۔ پانی بھی نہیں، آکسیجن، جو دھواں دھواں غائب ہو رہی تھی۔

"وہ بیچ میں اٹھ جاتا تو سوال کرتا۔ فکر مت کرو۔ ہرٹ نہیں کیا۔ Only overdosed."

"تم یہ کب بن گئے، رانج؟ تم۔۔۔" آنسو اس بار صرف آنسو تھے۔ وہ ادھر مر جائے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔

"تم اندر آ گئے اور تم لوگوں نے مجھے حراست میں لے لیا۔" اب وہ اپنا دوسرا سیناریو اسے سنا رہا تھا۔ "میک شفٹ پائلٹ سے لینڈنگ کروائی اور مجھے کوالالمپور لے کر گئے۔ وہ مجھے اریسٹ کریں گے تو سب سے پہلے نام تمھارا باہر جائے گا، اکائر۔ وہ مجھے ڈیتھ پینلٹی پر ڈال دیں شاید، لیکن تمھیں۔۔۔" وہ سنگ دلی سے ہنسا۔ "تمھیں سول ایوی ایشن اتھارٹی کچا چبا جائیں گی۔ کوئی یقین نہیں کرے گا تمھارا اس پلان میں صرف اتنا سا حصہ تھا کہ تم ایک بندے سے، جس نے تمھارے حق کے پیسے کھائے تھے، ذرا سی بلیک میلنگ سے اپنا پیسا نکلوا رہے تھے۔ وہ تمھیں ماسٹر مائنڈ سمجھیں گے اور مجھے پیپٹ۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"مجھے یہ قبول ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ فون کو دوسرے کان پر شفٹ کیا۔ "مجھے قبول ہے، رائج۔ مجھے ساری عمر تم پر بھروسہ کرنے کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے سڑنا قبول ہے، لیکن انسانی جانوں کا ضائع ہونا نہیں۔ تم باہر آؤ، میں تیار ہوں۔"

"تمھاری عزت اتار دیں گے وہ لوگ۔" رائج نے جیسے تنبیہ کی۔

"میں خود کی نظروں میں نیلام ہو چکا ہوں۔ اکائرز مورا کا گھمنڈ، اس کا رتبہ وہ آپ تھا۔ تم نے اسے توڑ دیا، تم نے مجھے توڑ دیا۔ مجھے اور کوئی ہرا نہیں سکتا۔"

"نوکری، گھر سب چھن جائے گا۔ وہ تمھیں قیدی رکھیں گے۔ ٹارچر کریں گے انفارمیشن کے لیے۔" رائج اس کے علم میں اضافہ کر رہا تھا۔

"سب قبول ہے، باہر نکلو۔"

"وہ پنکھ سے ٹارچر نہیں کرتے۔" اس نے زور دیا۔

"تم اب مجھے صحیح والا تپا رہے ہو۔ مانا کہ تم سوسائیڈل ہو، لیکن مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق نہیں ہے تمھیں؟"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رائج تھوڑا سا ہنس دیا۔ "ویل، داد دینی پڑے گی تمھاری ہمت کی، لیکن شاید تم نے مجھے سنا نہیں۔ یہ تب ہو گا جب تم کاکپٹ کا دروازہ توڑ کر اندر آؤ گے اور اس کے لیے تمھیں دس قدم چل کر مین راہداری تک جانا ہو گا، وہاں لورا سے مخاطب ہونا ہو گا۔ لیکن تمھارے لیے جو فاصلہ دس قدم ہے، وہ میرے لیے صرف ایک بٹن ہے۔"

اکائر کے ابرو ناسمجھی میں جڑے۔

"ظبیہ یمین کے آکسیجن سپلائی کا۔"

★★★

جگہ: پسنجر کیبن

AM02:30

ظبیہ نے گردن اکڑا کر سامنے دیکھنا چاہا۔ وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

اسے اچھا نہیں لگا تھا کس طرز و طریقے سے ان کی آخری گفتگو ہوئی تھی۔ اکائر ضرورت سے زیادہ حساس ہو گیا تھا، اور ظبیہ خلافِ معمول نر دئی۔ اس نے کمزور انگلیوں سے ماسک چھیڑا اور نظریں آس پاس دوڑائیں۔ مسافرین بے سکن و حرکت اپنی نشستوں پر ڈھے چکے تھے۔ ہلکی، دھیمی سانسیں۔ کوئی نہ کچھ کہتا تھا، نہ پوچھتا تھا۔ وجودیت کا تحفہ مزاحمت سے کئی زیادہ عقدس تھا۔

راہداریوں کے گرد چلتی فلائٹ اٹینڈنٹس نے بھی اپنی رفتار دھیمی کر لی تھی، اور ایک دو بار ظبیہ نے خود نوٹ کیا تھا کہ ان کی آنکھیں جھپکتے ہوئے بند ہونے لگی تھیں۔ وہ بیٹھ جاتیں، حواس بحال کرتیں، اور پھر واپس چلنا شروع کرتیں۔ کون کون سے تحفے تھے جو آج ان سے چھننے لگے تھے، اور کیا ان میں سے ایک سانسوں کا بھی تھا؟

ہر سو خاموشی تھی، ایسی خاموشی جیسی کبھی ختم نہ ہو۔ وہ آس پاس کے مناظر دیکھتی تو اسے اندازہ ہوتے اس کے پھیپھڑے تو واقعی کار آمد تھے، جو اب تک اس کے پانچوں حواس کو کھولے رکھے تھے۔ بیشتر لوگ خمار آلود آنکھوں سے چھت کو تکتے اپنے دماغ کے کسی غیر متعین حصّے کو تھکا رہے تھے۔ دماغ کے بھی حصّے ہوا کرتے تھے۔

اس کی ماں کی یادوں والا کون سا ہو گا؟ اور وہ کون سا ہو گا جو آج اور کل کی باتیں اسے بتائے؟ اور وہ کون سا تھا جو اسے غزار کو مارنے پر قاتلہ کے نعرے لگاتا تھا؟ اور وہ کون سا تھا جو اسے ہر بار کہیں نہ کہیں سے رابح آدم جیسے مرد کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ وہ حصّہ تو خراب تھا۔ کاش، وہ اسے نکال پھینک سکتی۔

عائشہ عبد الکریم اس کی سیٹ کے پاس سے گزری تو ظبیہ نے ذرا سا ہاتھ اٹھایا۔ "میرے ساتھ جو بیٹھے تھے۔۔۔" بولنا بھی مشکل تھا۔ اس کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ کیا اکائر ٹھیک تھا؟ کیا یہ کچھ غلط تھا؟ "وہ آگے گئے ہیں آپ کے پائلٹ سے بات کرنے۔ کتنی اور دیر لگے گی انھیں؟"

"اوہ۔" وہ کشمکش میں مبتلا ہوئی۔ "ٹھہریئے۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔" نرمی سے کہتے وہ آگے چل دی۔ پہلے وہ ایک سیٹ کے پاس رکی جہاں لورا ایک بوڑھی خاتون کو لمبی لمبی سانسیں لینے پر اکسا رہی تھی۔ ان کے آس پاس باقی لوگ بھی لورا کے احکامات پر عمل کرتے گہری سانسیں اندر کھینچ رہے تھے۔ اس نے اس سے پوچھنا چاہا، لیکن ٹھیک نہ سمجھا تو خود ہی راہداریوں کو پار کرتی فرنٹ ایریا تک جانے لگی۔

کیا ہی غلط ہو سکتا تھا؟

★★★

"ظبیہ یمین کے آکسیجن سپلائی کا۔"

ان دو دشوار لوگوں کے درمیان لمحہ وہیں سے جوڑتے ہیں۔ اکائر نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا، دھڑکنیں دھیمی تھیں، لیکن ایک اذیت اس کے انتر کاٹ چکی تھی۔ سانسوں کی کمی سے اس نے سر جھکایا اور آنکھیں موندیں۔

"کیا بک رہے ہو؟" اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

"وہی جو تم سن رہے ہو۔ ظبیہ یمین کا آکسیجن سپلائی میری پوروں تلے ہے۔ اسی کا نہیں، تم سب کا۔ اگر تم اتنے ہی ضدی ہوئے میرا راز فاش کرنے کے لیے، تو ظبیہ اپنی آخری سانسیں چین سے نہیں لے پائے گی۔" سفاک، صریح، ہر قسم کے جذبے سے عاری لہجہ۔ گناہ انسان کا دل سیاہ کر دیتا ہے۔

"تم اسے مارو گے؟" اکائر اچانک ہنس پڑا۔ یہ خوف تھا۔ یہ سب خوف تھا۔ "اور تم چاہتے ہو میں یقین کر لوں؟"

"شاید، تم اس کا نیلا اور مردہ منہ دیکھ کر بہتر یقین کر پاؤ۔" دوسری طرف ایک دو کلکس ہوئے۔ اکائر کا دل چھلنی چھلنی ہو گیا۔ وہ اچانک گھٹنوں کے بل بیٹھا، خود کو قدموں پر مجبور کرتے کھڑا ہوا۔ توازن بگڑا تو اس نے دیوار جکڑی۔

"نو، اسٹاپ!" اس بار آواز مقابلتاً تیز تھی۔ ڈراؤنی۔ وحشی۔ "خبردار! خبردار، میں تمھارا وہ حال کروں گا کہ کسی بھی عدل اور عدالت میں اسے جسٹی فائی نہیں کیا جا سکے گا۔"

"ظبیہ کی ڈیڈ باڈی کو کندھا دینے سے پہلے یا بعد؟"

"غارت ہو تم، رانج۔ تمھارا جو بھی خدا ہے، تمھیں غارت کرے۔ اللہ، بھگوان، یسوع سب تمھیں جہنم کی آگ میں جھونکیں۔" یہ غصہ نہیں تھا، نفرت تھی۔ نفرت سی نفرت۔

"میرا خدا مجھے پانچ سال پہلے غارت کر چکا ہے۔"

"پیشے کو پوجو گے تو یہی سبب پاؤ گے۔ اپنی کمیاں، زیادتیاں کبھی محبت میں کیوں نہیں ڈھونڈیں؟ کیا وہ لوگ کم تھے؟"

"تمھیں ڈھونڈ کر کیا ملا؟ ظبیہ ملی؟ نہیں ملی ناں۔ تم صرف ایک بینڈ ایڈ ہو اس کے زخموں پر۔ تم اپنا پورا وجود اس کی ایک خراش پُر کرتے گزار دو گے، اور وہ؟ وہ اپنی جلد کے ٹھیک ہوتے ہی تمھیں نوچ پھینکے گی۔"

اکائر نے جبڑا بھینچ لیا۔ اسے حیرت نہیں ہوئی اسے پتا چل چکا تھا۔ وہ حیرت اور تعجب کے سارے جذبات مار آیا تھا۔ اب صرف کرب تھا، کرب جو بے جانی کی اور دھکیل رہا تھا۔

"تم اسے مان سے دیکھتے ہو، اکائر۔" اس کی زبان کا زہر جیسے لمحے بھر کو زائل ہو گیا تھا۔ "تمھاری نظر میں اس کے لیے حیا ہے، احترام ہے، خیال ہے۔ لیکن تم نے آج تک ظبیہ کو اپنی طرف ویسے دیکھتے نہیں پایا۔ جانتے ہو کیوں؟"

اکائر خاموش رہا۔ یہ اذیت تھی۔

"مجھے جواب کے لیے تاکید کرنا پسند نہیں ہے۔" رانج نے بے لچک انداز میں کہا۔

"نہیں جانتا، نہ جاننا چاہتا ہوں۔ اس کا اپنا دل ہے، بے شک مجھ سے نہ لگے۔ اس سے میری نظر میں اس کی ویلیو کم نہیں ہو گی۔"

تم جانتے ہو۔ اپنی انا کے پیچھے چھپ رہے ہو۔" پائلٹ کی آواز متذبذب تھی۔

"تم یہ سننا چاہتے ہو وہ تم سے محبت کرتی ہے؟ تم اس کی موت کا اشتہار سر پر ٹانگ کر اس سے اعتراف چاہتے ہو؟" اکائر نے سینا دباتے ہوئے کہا۔ درد بڑھ رہا تھا۔

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ کرتی بھی ہے تو اسے قابو کرنا جانتی ہے۔ وہ جانتی ہے میں کون ہوں، کہ مجھ میں کتنا شر ہے۔ وہ میری آنکھیں پڑھ لیتی ہے۔ میں آنکھیں چرا سکتا ہوں، مگر وہ دل تک پہنچ جاتی ہے۔"

اچانک جیسے کچھ نو وارد ٹوٹ گیا تھا اس کے اندر۔

"تم اسے نہیں مار سکتے، رانج۔ اپنے آپ کو سنو۔ تم محبت کے آخری درجے پر کھڑے ہو۔ تمھاری محبت تو تمھاری ہے۔ کیوں اس معصوم کو سزا دے رہے ہو اپنے خسارے کی؟"

"یہ سزا نہیں، رہائی ہے۔ نجات ہے، سکون ہے۔ وہ جہاں جائے گی، اسے میرا خیال ستائے گا۔ یہی کہا تھا ناں تم نے؟ کہ میری وفاداری نے اسے توڑ دیا ہے۔ میں اسے جوڑ رہا ہوں۔ زخم زخم سی رہا ہوں۔" اس نے سانس لی۔ "اور جہاں تک رہی تمھاری بات، تو ظبیہ تم سے اس لیے محبت نہیں کرتی کیونکہ وہ تم میں خود کا عکس دیکھتی ہے۔"

اکائر جامد ہو گیا۔ بے سخن۔ بے حرکت۔

"تم اس کی زندگی میں بہار ہو، فرار ہو۔ امید ہو کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب افراتفری کے درمیان ایک لینڈ مارک ہو۔ وہ یہ میری زندگی میں بن چکی ہے، اور اس کا انجام جانتی ہے۔ اسے اس انجام سے ڈر ہے۔ وہ میں بننے سے خوف کھاتی ہے، اور تمھیں اپنا آپ بنتا دیکھنا اسے قبول نہیں۔"

"تم جھوٹے ہو۔"

"سو فیصد، لیکن یہ میری تھیوری ہے۔ سات ماہ سے تمھیں اس کے آس پاس دیکھ رہا ہوں۔ ظبیہ کو میں اکیس سال کی عمر سے جانتا ہوں۔ وہ محبت سے بھاگتی نہیں ہے۔ شفقت کی آبشار تلے وہ بار بار اپنا منہ دھو دے گی۔ اسے کوئی چیز روکے ہے، ورنہ تم برے نہیں ہو۔"

"ہمارا مذہب۔" اس نے آنکھیں بند کرتے کہا۔

"تم ظبیہ کے لیے چھوڑ نہیں سکتے؟ مجھے نہیں لگتا وہ اتنا بڑا مسلہ ہے۔" اس نے جیسے بات ہوا میں اڑائی۔

اکائر کی مٹھیاں تنگ ہوئیں، لیکن حرکت مشکل تھی۔ وہ حس لمس کھو رہا تھا۔

"میرا مذہب میرے لیے اہم ہے۔" تنگ عصاب سے چبا کر ادا کیے الفاظ۔

"اوہ ویل، افسوس۔" رابح نے جیسے ہاتھ جھاڑے۔ "تم جا رہے تھے شاید۔ جانا چاہتے ہو؟ ظبیہ کا آکسیجن لیول اکسٹھ فیصد ہے۔She's doing well."

اکائر ٹک گیا، ادھر ہی۔ "میں اسے بتاؤں گا، تم اسے مار دو گے۔ میں اسے نہیں بتاؤں گا، تم تب بھی اسے مار دو گے۔"

"غلط، تم اسے بتا ہی نہیں پاؤ گے۔ تمھارا منہ اس کے سامنے کھلا، تو اس کی سانس کی نالی بند۔"

"تو پھر میں تمھیں بتا دیتا ہوں۔" سیاہ لیدر جیکٹ والی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ "ظبیہ ماں نہیں بن سکتی۔ نہ آج، نہ کبھی آگے۔ اس کی کبھی کوئی اولاد نہیں ہو گی۔ اس کی زندگی میں اپنا کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ شوہر، نہ کوئی بہن بھائی۔" وہ سانس لینے رکا لیکن گلا سوکھ رہا تھا۔ اسے جلدی کہنا تھا جو کہنا تھا۔ "وہ

چائنہ جارہی ہے، اپنی خالہ کے پاس۔ وہ خالہ بھی آئی سی یو میں ہیں۔ ہو سکتا ہے انتقال کر جائیں۔ اس کا کوئی خواب نہیں ہے، نہ کوئی تھا۔ اگر تم آج اسے مار دو گے تو واقعی، یہ شاید اس پر احسان ہو۔"

رائج کی سفید انگلیاں کنٹرول یوک پر تھیں۔ ان میں لغزش واضح ہوئی۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی؟ اور کیا کہا تھا اکائر نے، اور اس نے کیوں نہیں سنا تھا۔ وہ سن ہی نہیں پایا تھا۔

"میں۔۔۔ میں چاہتا ہوں ظبیہ میرے بعد جائے۔ میں چاہتا ہوں وہ اپنی آخری سانس تک لاعلم رہے۔ کیا میں اتنا مانگ سکتا ہوں تم سے؟" وہ نم آواز سے پوچھ رہا تھا۔ مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔

"مانگو۔" رائج کی آواز بہت مشکل سے باہر آئی تھی۔

"میری موت کے عوض میں ظبیہ یمین کو لاعلمی دے دو۔"

"کیا یہ تمھاری آخری خواہش ہے؟" بے رحم مگر صریح استفسار۔

اکائر نے ٹھوڑی جھکائی۔ "ایک اور آخری۔"

"منظور ہے۔" وہ پر سکون تھا۔ اکائر چہرہ جھکا کر تھوڑا اور رونا چاہتا تھا، مگر آنسو نہیں تھے۔ اب وہ سانس کے ساتھ ساتھ آنسو بھی کسی سے بھیک مانگے؟

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

راہداری میں اسی پل ٹک ٹک کی آواز آئی۔ وہ سیدھا ہوا اور جلدی سے ماسک درست کیا۔ سرمئی آنکھوں کی سرخی جھپک جھپک کر مٹانی چاہی۔ ایک سایہ واضح ہوا اور پھر سیاہ حجاب۔

عائشہ عبدالکریم۔

"لیکن یاد رکھنا، میرے بہت سارے کان اور بہت ساری آنکھیں ہیں۔ ذرا سی بھی چوں چراں اور تمھارے پلک جھپکنے سے قبل ظبیہ یہ پلین اور تمھیں چھوڑ چکی ہو گی۔" رائج آخری بار تنبیہ کر رہا تھا۔

"آپ کی بات ہو گئی؟" اس کی آواز کی نرمی ویسی ہی تھی، البتہ لہجہ سست تھا۔ وہ بھی کمزور تھی۔ اکائر نے مٹھیوں کو بند کیا۔ اس کا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب کی زندگی بیچ کر، اس کی خرید لایا تھا۔

"جی۔" وہ فون دینے لگا تھا۔ "آپ کے کیپٹن نے سمجھا دیا ہے۔ ڈیسنٹ (نزول) شروع ہونے والا ہے بہت جلد۔"

"اسے ڈیوائس دو اور اچھی پیاری مسکراہٹ کے ساتھ چلتے بنو۔"

عائشہ کے سامنے تو وہ اسے کوئی القابات سے بھی نہیں نواز سکتا تھا۔ دل ہی دل میں تین زبانون کی گالیاں دہرائیں، اور سیاہ ڈبہ اس کی جانب کیا۔ اپنی نشست تک جاتے وہ بدل گیا تھا۔ یہ وہ اکائرز مورا نہیں تھا جو چند لمحات قبل اسی راہداری کو پار کر کے آیا تھا۔

"کیپٹن، سب ٹھیک ہے ناں؟" عائشہ نے رابطہ جوڑا۔ کاکپٹ میں بیٹھے رانج نے سر سیٹ میں پیچھے کیا۔ اس کی گردن کے پٹھے اکڑ رہے تھے۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" نرم آواز جو لکڑی تک پگھلا جائے، عائشہ کا دل تو پھر موم تھا۔ وہ تھوڑا سا چونکی، پھر مسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔

"جی۔ اور آپ؟"

رانج کی مسکان ادھوری تھی، مردہ۔ لبوں کے ایک کنارے سے پیچ تک پھیل کر وہ اس کی شکل کو ایک خوفناک تاثر دیتی تھی۔ یہ مسکان نہیں تھی۔ یہ مسکان نہیں ہو سکتی تھی۔

اس نے ہیڈ سیٹ کانوں پر لگائے، طیارچی ماسک کے پار ہیزل آنکھیں ہر چمک، ہر روشنی سے تہی تھیں۔

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔"

★★★

فلائٹ MH370

AM02:35

پسنجر کیبن

قدموں کی چاپ پر ظبیہ ٹھٹک اٹھی۔ غایت دھیرج سے چہرہ ایک طرف ڈھلکاتے اس نے گردن موڑ کر اکائر کو دیکھا جو سستی سے اپنی سیٹ تک لوٹ رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ آکسیجن ماسک پر سجائے، ٹوٹتی جڑتی سانسوں کے ہمراہ چل رہا تھا۔ ظبیہ کے دل کو گہری چوٹ پہنچی۔ اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب اور شدید ہو گئی تھی۔

بالائے سر بنی سرخ بتیاں اپنی مانوس روشنی قطرہ قطرہ ان دو وجود پر نچھاور کر رہی تھیں۔ ارد گرد ماحول میں ایک اجنبی سے بے سخنی تھی۔ ہر کوئی اپنی نشست میں بے حرکت، بے عقل، گنگ سا پذیر تھا۔

راہداریوں میں ٹہلتی فلائٹ اٹینڈنٹس بھی ایک سرے سے دوسرے تک پہنچنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھیں۔ عائشہ عبدالکریم ایک ستون کے ساتھ ٹکی ہوئی اپنی پیشانی تھامے تھی، لوراوڈس ان ظر کے زاویے میں نہیں تھی، مگر ظبیہ نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا تھا۔

"اکائر..." چند منٹ قبل ہوئی کُل بحث کو نظر انداز کرتے اس نے اسے پکارا۔ بھوری آنکھوں میں زمانوں کی بے کلی تھی۔ بھاری قدموں سے اس تک پہنچتے، اکائر نے پہلی مرتبہ گیلی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ سرمئی آنکھوں میں خوف زیادہ تھا یا رنج، ظبیہ یمین پڑھنے سے قاصر رہی۔ وہ نزدیک آیا تو اس کی نامکمل اور خستہ سانسوں کی مہک محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا تمھیں؟ تم۔۔۔" اس نے ہمیشہ چاہا تھا کہ کوئی وقت آئے اور ان کی دوستی میں، اکائر اس سے کچھ مانگے اور ظبیہ کو عنایت کرنے کا شرف حاصل ہو۔ پانچ سالوں بعد قدرت اسے یہ موقعہ دے رہی تھی، مگر اس کے پاس بخشنے کو کچھ نہیں تھا، سوائے اپنے آپ کے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ آواز اب آواز بھی نہیں تھی۔ اکائر کے الفاظ ایک بھرائی ہوئی سانس کے مترادف تھے۔ ظبیہ کو اپنی آنکھوں میں محرق نمی امڈتی محسوس ہوئی۔ اس نے آگے جھکتے اس کی عرق ناک انگلیاں اپنے ہاتھ میں لیں اور اسے سہارا دیا۔

"بیٹھو یہاں، اور خاموش رہو۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہوا وہاں؟ تم رانج سے بات کرنے گئے تھے ناں؟"
اس کا اپنا آکسیجن ماسک آنسوؤں سے تر ہونے لگا تھا۔ اکائر کی اس قدر بکھری صورت اس کی روح تک کو تاخت کر گئی تھی۔ اس نے اب تک اکائر کا ہاتھ تھاما تھا۔

وہ جواب دینا چاہتا تھا، مگر ہر لفظ پر سانس کا قفل بندھا تھا۔ اسے اپنے سینے کے گرد ایک غیر مرئی بندھن کستا محسوس ہو رہا تھا۔ گلا تنگ تھا اور سانس لینے کی ہر کوشش اسے درد دے رہی تھی۔

"اکائر، مجھے دیکھو..." آکسیجن ماسک کے پار اس کی آواز بھرا رہی تھی، اور کچھ اس کی اپنی سانسیں ادھڑی ادھڑی سی تھیں۔ سرمئی آنکھوں نے سمت موڑی، تو ان میں لپٹتی سرخ ڈوریاں واضح ہوئیں۔ اکائر کی آنکھیں بھیگی تھیں، چبھن سے، کرب سے۔

ظبیہ نے بے بسی سے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ "ہمت کرو، صبر کرو۔ تمھیں کچھ نہیں ہو گا۔" بھوری آنکھیں مارے خوف فراخ تھیں۔ اس کے چہرے کے گرد بندھا سیاہ حجاب ڈھیلا پڑ گیا، سلونی پیشانی پر گھنیری زلفیں پسینے سے شرابور تھیں۔

اس کی اپنے تنفس بگڑے تھے، مگر اس نے اپنی تمام استعداد اس کے لیے وقف کر دی۔ وہ جسے اس کی ضرورت تھی، وہ جو اس کی ضرورت رہا تھا۔

اکائر کو دمہ کے اٹیک کا شناسا انقباض اپنے وجود پر اترتا محسوس ہوا۔ آکسیجن کی حاجت سے یہ دباؤ پل پل ادھک کر رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کی کپکپاتی انگلیوں سے ماسک سدھارنا چاہا، لیکن سب بے سود معلوم ہوتا تھا۔ ہر ہر کوشش۔ اس کے گرد دنیا سستی سے بے نور ہو رہی تھی، آوازیں گھٹ رہی تھیں، سماعت میں تپش گھل چکی تھی۔

اس نے چہرہ ظبیہ کی جانب موڑا، آنکھوں سے رابطہ جوڑنا چاہا۔ شاید، وہ پڑھ لے۔ رانج نے کہا تھا وہ اس کی آنکھیں پڑھ لیتی تھی، کیا پانچ سالوں بعد اکائر یہ امید کر سکتا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی ظبیہ کے لیے قابلِ درک ہوں؟

ظبیہ نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھاما۔ "اکائر، پلیز۔۔۔ پلیز، اکائر۔ ہمت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سب ٹھیک کر دوں گی۔" وہ منت کر رہی تھی، بھیک مانگ رہی تھی۔ "تم بہت مضبوط ہو۔ تم نے کہا تھا تم مضبوط ہو۔ بس، سانس لو۔"

سرخ روشنی اس کے نم گالوں پر پھسل کر کسی خواب کی نہیں، بلکہ موت کی علامت بن گئی تھی۔ سرمئی آنکھیں اسے دیکھتے جل رہی تھیں۔ سیاہی اس کی بصارت کے کنارے کتر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کا دماغ تیز رفتار سے کسی ٹنل سے گزر رہا ہو۔ دیگر نشستوں پر براجمان مسافرین اس کے شعور سے چھٹ رہے تھے، ٹیڑھے میڑھے ماسک ان کے پسینے سے شرابور چہروں پر لٹکے تھے۔

ظبیہ نے خود کو اس کے نزدیک ہوتے محسوس کیا۔ سرخ روشنی ان کے درمیان تیسرا وجود تھی۔ اس کی سبکیاں غم کا غل مچاتے بھڑک رہی تھیں۔ وہ بے آس تھی، نراس تھی۔ اس نے نہایت باریکی سے اکائر کے گرد اپنے بازو لپیٹ لیے، چہرہ اس کے سینے پر رکھا۔ پانچ سال میں پہلی بار، شاید زندگی میں پہلی بار، اس نے اس شدت سے چاہا تھا کہ کسی کی روح کا تمام ملال، جسم کا سارا بوجھ اپنے اندر سمو لے۔

اکائر نے وہ لمس اپنے پورے وجود کا محاصرہ کرتا محسوس کیا تھا، اپنی بکھری، مٹتی صورت کو اس کی باہوں میں ادراک کیا۔

اس کی سانسیں ناکافی تھیں، ہر ہر جہد میں ٹیس اٹھتی تھی، مگر اس نے لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر تک بلند کیا۔ آخر کار، اکائر نے اپنی تمنائی انگلیوں کو اس کے سیاہ، گھنگریالی لٹوں سے گزرنے کی اجازت دی۔ ان کی نرمی کو اپنی پوروں تلے پھسلتا ہوا، ان کی مہک کو اپنے وجود میں گھلتا محسوس کیا۔

جس اظہار کی خواہش اس نے پوری حیات اپنے اندر کاٹ دی تھی، اب وہ سوکھی ریت کی مانند دانہ دانہ اس کے قلاب سے نکل رہا تھا۔ ظبیہ کے بالوں میں ٹھہرا اس کا ہاتھ حس لمس کھو رہا تھا، حرکت ترک کر رہا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ اپنے احساسات کی شدت اس تندی سے محسوس کی تھی، کہ گمان ہوا تھا اس کا دل خالی از فعلیت ہو گیا ہو۔ کئی راتیں بے خواب، کئی تصاویر بے آب، کائی کے آگے ان کہے الفاظ اور ہوش مندی کے آخری تقاضوں پر قائم وہ، بے نیاز۔ لیکن جو آج تھا، جو ابھی تھا، جو اس کی آغوش میں تھا، وہ اس سب سے قوی تھا۔ اس دفعہ، حقیقت آگاہی لے کر آئی تھی۔

اکائرز مورا برسوں سے اس محبت میں گھل رہا تھا جس کا اقرار اس کی زبان پر بھی مانع تھا۔

احساس اس کی بقیہ سانسوں کا سکون بھی چھین چکا تھا۔ گرد و نواح میں بکھرا سرخ رنگ اب صرف سرخ نہیں تھا۔ وہ مرض تھا، موت تھا، وہ ظبیہ تھی۔ اور وہ اسے لٹا آیا تھا۔

"ظبیہ..." اس نے سرگوشی کی، دل کی دردناک دھڑکنیں بھی ہم آہنگ ہوئیں۔ سرمئی آنکھوں نے بھوری گہرائیوں کو جانچا۔

وہ بلک رہی تھی، ٹوٹ رہی تھی۔ گرم، تپتے آنسو اکائر کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ اس کے، ظبیہ کے۔ "اکائر، لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ۔" وہ کہہ رہی تھی، اس کی سانس بھاری تھی۔ "اکائر، پلیز۔ بولو 'لَا اِلٰہَ اِلّا اللہ۔'" مسلسل اس کی سیاہ جیکٹ تھامے، بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائے تھی۔

اپنے نازک ترین حواسوں سے بھی وہ اس کی پاکیزگی اور خلوصِ دل پر مسکرا دیا۔ جو موضوع ان کے درمیان پانچ سالوں میں نہیں اٹھایا گیا تھا، موت کا اشارہ ان سے وہ بھی کہلوا گیا تھا۔ ظبیہ اس کے سینے سے ٹکی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسلسل منمنا رہی تھی۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللہ۔ اکائر، یہ کہو۔ میرے خاطر۔" اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا وہ کیا کہہ رہی تھی، کیوں کہہ رہی تھی، صرف ایک خوف تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین اثاثے کو خود سے دور نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ گھر سے نکلی تھی تو اس نے اکائرز مورا سے ممالک اور وقت کی دوری قبول کی تھی، لیکن اب قسمت اسے آزما رہی تھی۔ وہ اس قربانی کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ اسے سنتا رہا، اس کی سانسیں گنتا رہا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ ہر ہر سانس اس پر قرض تھی، لیکن دل میں اس عورت کے لیے محبت افزوں تھی۔ کاش، وہ کہہ سکتا جو وہ اس سے کہلوانا چاہتی تھی۔ لیکن ایمان کے فیصلے دل کی سن کر کیے جاتے ہیں، دل پر حکمرانی کرنے والوں کی نہیں۔

"ظبیہ..." اس نے دوبارہ اسے پکارا، آواز کمزور اور ناہموار تھی۔ اس کے آنسو زار زار بہہ رہے تھے، اکائر کی پیشانی پر امڈتی نمی میں گھل رہے تھے۔ وہ اتنا قریب تھی کہ وہ اس کی پلکوں کا ایک ایک بال الگ سے گن سکتا تھا۔ اکائر کو اچانک اپنی قسمت پر رشک آیا۔

دنیا بجھ گئی تھی۔ اکائرز مورا کے لیے صرف ظبیہ یمین وجود رکھتی تھی۔ اس نے ڈگمگاتی انگلیاں اس کی آنکھوں کے نیچے رکھیں اور ماسک کے اوپر آنسوؤں کی ایک پٹی صاف کی۔ ظبیہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ "شکریہ، شکریہ۔۔۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی سانس پھنس رہی تھی۔

ظبیہ کی آنسو تیز ہوئے، اس کی سسکیاں بلند ہوئیں۔ اس نے اپنے چہرے پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھاما۔

"نہیں۔" وہ بضد تھی۔ "نہیں، نہیں۔"

"دوبارہ محبت مت کرنا۔۔۔" اس نے بمشکل الفاظ جوڑے۔ ہاتھوں سے جان آزاد تھی، لیکن وہ اسے تھامنا چاہتا تھا۔ اس کے انگوٹھے نے ظبیہ کے گال کا خم چھوا۔ نمناک آنسو نیچے لڑھک گئے۔ وہ عریض آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی، بھنوؤں کے درمیان ایک لکیر تہ ہوئی، دل میں مروڑ اٹھی۔

محبت...؟

سیاہی اندھیرے میں گھل رہی تھی، خنکی بے جانی کی جانب چل پڑی تھی۔ اکائر کو اپنے اعضاء آہستہ آہستہ مفلوج ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے زبان کو حرکت دی، ایک آخری بار۔

"اس سے مت کرنا۔"

اس کا ہاتھ ظبیہ کے گال سے پھسل گیا۔ سرخ روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہو گئیں، تمام دنیا پر چھائیوں کی نذر ہوئی۔ ظبیہ کی چیخیں، اس کے آنسو، سب ماند پڑ گئے۔ آگاہی کے اختتامی مرحلے پر کھڑے اکائر زمورا نے آخری سانس میں بھی اس پر احسان کر دیا تھا۔

وہ بھی اپنی ناگفتہ، بن مدعو محبت کے ساتھ فنا ہو گیا تھا۔

★★★

بھوری آنکھوں کے آگے گہری دھول تھی، سیاہ، بھوری، پھر سفید۔

اس کے حواس ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے، سماعت اور بصارت کے درمیان قائم روک ہٹ رہا تھا۔ کہیں دور اسے سورج کی پیلی شعاعیں اٹھتی نظر آئیں، کان میں مدھم کلکاریاں گونج اٹھیں۔ اس کے قدموں تلے زمین تھی، ٹھوس لکڑی کے تختے نہ کہ جہاز کا ڈگمگاتا پُل۔ اُس منظر میں نیا پن تھا، تازگی تھی، خوشبو تھی۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"بیہ، ختم کرنا ہے کھانا۔ ادھر آؤ شاباش۔" نسوانی آواز اس کے سر کے عقبی حصّے سے اٹھ رہی تھی۔ وجود کو اپنے ننھے پیر اور تیزی سے بھاگتے محسوس ہوئے۔ دھم، دھم، دھم۔

"بہت شرارتی ہو گئی ہو، لڑکی!" اس کی ماں ڈپٹنے کے انداز میں کہہ رہی تھیں، لیکن لہجے میں ہلکی مامتا جھلک ہی آئی تھی۔ انھوں نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ "اچھا، ماما کہانی سنائیں گی۔ یہاں آ کر بیٹھو۔" شفقت سے اپنے برابر قالین پر رکھے تکیے تھپتھپائے۔ سات سالہ ظبیہ کو وہ آفر معقول معلوم ہوئی، اسی لیے گلابی تلوے اٹھا کر بن آواز پچھلی جگہ پر واپس آ گئی۔ ہلکے بھورے رنگ میں ٹمٹماتے بھرے بھرے گال،

گول، ہرنی جیسی سیاہ آنکھیں اور بھاگنے کے باعث غیر منظم سی گھنگریالی لٹیں۔ جامنی رنگ کا جمپ سوٹ پہنے وہ خاموشی سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اپنا من پسند ہرے رنگ کا گڈا تھا، جسے وہ 'گرینی' کہتی تھی۔

اماں نے اس کے ماتھے پر آتے پسینے کے ہمراہ بدحواس زلفیں بھی پیچھے ہٹائیں، پھر میز کی جانب راغب ہوئیں۔ کورین ثقافت میں ان چھوٹی میزوں کو 'soban' کہا جاتا ہے، اور یہ فلور ڈائننگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ دستر خوان کے اوپر شیشے کے سفید پیالے میں ادھ کھائے ناسی لمپاک رکھے تھے۔

اس پکوان میں سفید چاولوں کو ناریل کے دودھ میں پکایا جاتا ہے، جن سے چاول ملائی دار معلوم ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مرچوں، پیاز، لہسن اور املی کو پیس کر ان کے پیسٹ کے ساتھ سرو کیا جاتا ہے۔ حسب ضائقہ، ابلا ہوا انڈا، کھیرے یا مونگ پھلی بھی برابر رکھے جاسکتے ہیں۔ ملائیشیا میں یہ ڈش عام طور پر ناشتے میں کھائی جاتی ہے۔

"کچھ کھاتی نہیں ہو اسی لیے اتنی دبلی ہو رہی ہو۔" اماں نے نوالہ بناتے خفگی سے منہ بسورا۔ چمچہ اب کہ ظبیہ کے ہونٹوں کے پاس تھا۔ "جب ہم اپنے حصّے کا رزق چھوڑ دیتے ہیں، تو اللہ اس کا کوئی اور حقدار ڈھونڈ لیتا ہے۔ ہم سے زیادہ اہل، زیادہ مشکور۔"

"آہ!" اماں نے تلی ہوئی مچھلی کا ٹکڑا چاولوں کے درمیان چھپایا ہوا تھا۔

ظبیہ نے برا سا منہ بنا کر باہر نکالنا چاہا، جب مامتا کے جال کی پیچھے خطرناک، گھوری دیکھی۔ وہ دبک کر بیٹھ گئی۔ اسے مچھلی بالکل پسند نہیں تھی۔

"ماک، کہانی تو سنائیں۔" اس نے کھیر اچباتے وعدہ یاد کیا، تو اماں ٹھنڈی سانس بھرتی رہ گئیں۔ انھوں نے تو اسے پاس بلانے کے لیے لالچ دی تھی، لیکن یہ لڑکی کہاں کچھ بھولتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ یہ کہانی ماما کی فیورٹ ہے، اسی لیے غور سے سننا۔" وہ نرمی سے مسکرائیں۔ ظبیہ نے بڑی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ "یہ بھی کسی پرنسس کی کہانی ہے، ماما؟"

انھوں نے انڈے کا ٹکڑا اس کے قریب کیا۔ "اونھوں۔ یہ کسی پرنسس کی نہیں، بلکہ آپ کے جیسی ایک چھوٹی بچی کی کہانی ہے۔"

ظبیہ کو پرنسس کے علاوہ جن، بھوتوں اور جانوروں کی کہانیاں پسند نہیں تھیں، لیکن کیونکہ وہ اس کی ماں کی پسندیدہ کہانی تھی، تو وہ سن سکتی تھی۔ وہ سن لے گی!

"یہ کہانی ایک چھوٹی بچی کیرن کی ہے۔"

(ظبیہ نے اگلا نوالہ کھانے کے لیے منہ کھولا۔)

"کیرن ایک نہایت مفلس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جب اس کی ماما وفات پا جاتی ہیں، تو کیرن کو ایک امیر، بوڑھی خاتون گود لے لیتی ہیں۔"

(وہ بارش والی شام تھی، جس عصر میں آٹھ سالہ ظبیہ نے خود کو گھر کی دہلیز پر پایا۔ خاندان کے مرد اس کی ماں کا جنازہ اٹھائے گھر کی چوکھٹ پار کر رہے تھے۔ وہ خاموش آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔)

"جب اس کی ماں زندہ تھی، تو کیرن کے پاس پھٹے پرانے سرخ جوتوں کی ایک جوڑی تھی۔ لیکن، جب اس بوڑھی عورت کے گھر جا کر اس کی زندگی کے نئے دروازے کھلنے لگتے ہیں، تو وہ اس سے نئے سرخ جوتوں کی ضد کرتی ہے۔"

"سرخ جوتے؟" سات سالہ ظبیہ نے گھنی ابرو گڈمڈ کیں۔ اس کی ماں مسکرا دی۔

"ہاں، سرخ جوتے۔ یہ کہانی کا مین کردار ہیں۔ اب غور سے سنو۔" انھوں نے اسے کھیرے کا ایک ٹکڑا پکڑایا۔ "بوڑھی خاتون کو کیرن بہت پیاری تھی، اسی لیے وہ اسے سرخ جوتے فوراً لا دیتی ہے۔ کیرن کو وہ

سرخ جوتے اتنے پسند آتے ہیں، کہ وہ انھیں ہر روز چرچ پہن کر جاتی ہے۔" اماں نے اسے یہ بھی بتایا کہ چرچ کیا ہوتی ہے۔

(پندرہ سالہ ظبیہ رباب اور مرتضٰی کے نکاح پر گردن جھکائے دیگر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مرتضٰی نے مائیک پر 'قبول ہے' کہا، تو اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ ہال میں اٹھتی تالیوں کی گونج کے درمیان، ہیزل رنگی آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ اس نے شرما کر نظریں پھیر لیں۔)

"بوڑھی خاتون کیرن کو منع کرنے کی کوشش کرتی ہیں، کہ چرچ میں صرف سیاہ رنگ کے جوتے پہنے جاتے ہیں۔"

("پڑوس والوں کے گھر جانا ذرا کم کرو۔" سولہ سالہ ظبیہ نے چائے کی پیالی ابا کے سامنے رکھتے ان کا اعلان سنا تو گڑبڑا گئی۔

"مگر ابا میں بتا کر تو جاتی ہوں۔" اسے اس بلاوجہ کی پابندی سے چڑ ہوئی۔

"بتا کر بھی مت جایا کرو۔ وہاں تمھارے لیے اب کوئی نہیں۔ اُس رباب کی تو شادی ہو گئی۔"

"رباب کاک کی اماں، انھیں پسند ہوں میں۔ وہ اپنی بیٹی کے جانے کے بعد اکیلی ہو گئی ہیں۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ابا نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "چینی کم ہے۔")

"لیکن، کیرن کہاں سننے والی تھی؟ یہ تو نیا نیا جنون تھا، تازہ سا عشق تھا۔ یہ سرخ جوتے تو پرانے والوں سے بھی زیادہ آرمیدہ، زیادہ خوبصورت تھے۔ وہ اگلے اتوار پھر وہی جوتے پہن کر چرچ جاتی ہے۔"

(تیئیس سالہ رائج فلائٹ سے لوٹا تو گھر کے صحن میں اپنی ماں کے پاس ظبیہ کو گھٹنوں پر بیٹھے پایا۔ اس کا دل ایک پل کو بند ہوا اور وہ سوٹ کیس دور دھکیل کر پاس دوڑا۔

"کیا ہوا؟" اس نے ہانپتے ہوئے گھٹنے زمین پر ٹکائے۔ اماں کا ایک ہاتھ اپنے دست قید میں رکھا، اور پریشان ہیزل آنکھیں ظبیہ کے رخ کیں۔

"کچھ نہیں۔ گھٹنوں کا درد بڑھ گیا تھا۔ میں نے دوائی دے دی ہے۔" وہ مدھم سا مسکرائی۔ اماں نے جھک کر نرمی سے اس کے گال پر بوسہ دیا۔ رابح کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ بھی ظبیہ کو دیکھتے ہولے سے مسکرا دیا۔

"کال کر دیا کریں، یار اماں۔ حد ہوتی ہے۔" وہ نظریں پھیرتے بولا۔ اسے خدشہ تھا وہ زیادہ دیر ظبیہ کو دیکھتا رہا تو اس کی آنکھیں اس کے دل کا حال بیان کر دیں گی۔)

"ایک دن، چرچ کے باہر ایک سپاہی کیرن کو ملتا ہے۔ وہ اس کے جوتوں کو بڑے اشتیاق اور تعجب سے دیکھتا ہے۔ سراہتی ہوئی نگاہ۔ 'یہ جوتے رقص کے لیے اعلیٰ ترین ہیں! جتنا چاہو ناچو، یہ کبھی نہیں اتریں گے۔' وہ اس سے یہ کہتا ہے۔"

("رابح تمھیں پسند کرتا ہے؟" انیس سالہ ریٹا کا جبڑا مارے حیرت زمین کو چھو رہا تھا۔ ظبیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے اس کی آواز دبائی۔ اس کی اپنی رنگت کچھ گلابی، کچھ سرخ چمک رہی تھی۔ "یہ اس نے کہا؟" ریٹا نے درشتی سے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنے قریب کیا، لہجہ جاسوسی تھا۔

ظبیہ نے ایک ہاتھ سے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا، لیکن پھر بھی لبوں پر بکھرتا تبسم نمایاں تھا۔ وہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔

"رابح آدم ایک خواب ہے، ظبیہ۔ اگر وہ تمھیں زبان دے، تو تم اسے وفا دینا۔ تمھیں خود ہی اپنے لیے کچھ کرنا ہے، یاد ہے ناں؟ ورنہ بن ماں اور اکثر غیر حاضر باپ کی بچیاں بھلا دی جاتی ہیں۔"

"اس روز کیرن رقص کے لیے پہلے قدم اٹھاتی ہے۔۔۔"

("آئیس کچانگ (ice kacang) کھانے چلو گی؟"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"رائج، ابا پیٹیں گے مجھے۔" اس نے پسینے میں شرابور انگلیوں سے SMS کا جواب دیا، لیکن مانو یا نہ مانو، ایک عجب سی بے قراری اس کا سینہ گھیرے تھی۔ رائج آدم اپنے دفتری اوقات کے بعد، اسے زندگی میں پہلی بار آئیس کریم کھلانا چاہتا تھا.

"بلاوجہ پیٹیں گے! ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ ان کے لیے بھی ایک پکڑ لیں گے۔ کیسا؟" وہ اس کا میسج پڑھ کر ہنس دی۔ گھر خاموش تھا، گھڑی پر رات کے دس بجے تھے اور اس کا باپ پورا دن یہاں وہاں وقت ضائع کرنے کے بعد اب لمبا والا سوئے تھا۔ ظبیہ نے کھونٹی سے اپنی چادر اٹھائی پھر چابیاں لیے باہر نکلی۔

سیاہ رات میں سفید ہونڈا اوڈیسی میں رائج آدم مسکراتا چہرہ لیے اس کا منتظر تھا۔)

"جس بوڑھی عورت نے اسے گود لیا ہوتا ہے، وہ انتقال کر جاتی ہے، لیکن کیرن اپنے رقص و موسیقی کی دھن میں اس قدر جٹی ہوتی ہے کہ اس کے جنازے میں بھی شامل نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ماں کی تدفین کو چھوڑ، ناچنے چلی جاتے ہے۔"

"کیرن کو سرخ جوتے بہت پسند تھے، ماما؟" سات سالہ ظبیہ نے باورچی خانے میں ماں کا پیچھا کیا۔ اب وہ برتنوں پر باری باری جھاگ لگا رہی تھیں۔

"ہاں، اسے سرخ جوتے پسند تھے۔ لیکن پسند سے بڑھ کر، وہ اس کی حسرت تھے۔ اور جب حسرتیں پوری ہوتی دکھتی ہیں، تو انسان اندھا ہو جاتا ہے۔"

("میرے ابا میرے لیے رشتے دیکھ رہے ہیں۔" اس نے آہستگی سے رائج کے آگے اپنی بات رکھی، چہرے پر امید و فکر کے رنگ لانے سے گریز کیا۔ بلیک ٹی کی پیالی سے شغل کرتے رائج نے چہرہ اوپر اٹھایا، تو وہ بے آرمی سے نظریں پھیر گئی۔

"تم نہ کہو گی ناں؟" وہ بہت آس لیے پوچھ رہا تھا۔ ظبیہ نے دھڑکتے دل اور بے چین زبان کے اوپر خاموش رہنے کو فوقیت دی۔ وہ رابح کے علاوہ کسی کا تصور نہیں کرتی تھی، لیکن اس کے لیے یہ جاننا اہم تھا کہ وہ اس کی زندگی میں کہاں جگہ رکھتی تھی۔

آگے جھکتے رابح نے پہلی بار اس کا ہاتھ چھوا تھا۔ نہایت اطمینان سے اپنے دو ہاتھوں کے درمیان تھاما اور گہری آنکھیں اس کی جانب موڑیں۔ عقب میں موسلا دھار بارش رواں تھی۔ وہ گنگ سی اسے دیکھتی گئی۔

"تم مجھ سے دور جا سکتی ہو؟"

"اگر درمیان کوئی رشتہ نہ ہو تو سب سب سے دور چلے جاتے ہیں۔" وہ خشک ہوتی زبان سے گویا ہوئی۔

برابر بیٹھے مرد کے انگوٹھے نے اس کی انگلیوں پر لکیر کھینچی۔ "میں تمھاری جگہ کسی کو نہیں دے پاؤں گا۔ نہ آج، نہ مستقبل میں۔" خاموش، بے لچک لہجہ۔ ظبیہ تھم گئی، اس کا وجود جامد ہوا۔

"تمھارے علاوہ کوئی نہیں ہو گا، ظبیہ۔ تم مجھے ملو یا نہ ملو، یہ احساس اب کسی اور کے لیے نہیں جاگے گا۔")

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نشست سات سالہ ظبیہ بڑی آنکھیں اٹھائے ونٹیج شیشے میں اپنی ماں کا عکس دیکھ سکتی تھی۔ گھنے، گھنگریالے بھورے بال، کھڑی ناک اور اجلی، سپید رنگت۔ وہ اس کے بالوں سے ہیئر برش گزار رہی تھیں۔ "وہ ناچتی ہے، اور اس بار وہ رک نہیں پاتی۔ ایک فرشتہ اس کے پاس آتا ہے۔ وہ اسے خوب ملامت کرتے ہوئے فیصلہ سناتا ہے۔ 'تم مرتے دم تک، اور اس کے بعد، بھی ناچتی رہو! خدا تمھیں اس سے کبھی بری نہ کرے۔'"

ظبیہ کانپ سی گئی۔ "فرشتہ اتنا غصہ کیوں ہوا، ماما؟"

"کیونکہ کیرن اب عبرت کا نشان بن گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے ذریعے تمام بے گھر، یتیم بچوں کو سبق سکھانا تھا۔" انھوں نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ "ادھ پوری حسرتوں میں گم نہیں ہوا جاتا، ظبیہ۔ حسرتوں میں خود کو لٹایا نہیں جاتا۔"

("میری نہ ہے، ابا!" وہ آنسوؤں کے درمیان بلک رہی تھی۔ دوپٹے کا پلو مسلسل اس کے گالوں سے نمی پونچھ رہا تھا۔ اس کے سائے میں رخساروں پر سرخ لکیریں جنم لے رہی تھیں۔

"عقل کرو، لڑکی۔ عقل کرو!" یمین العطاس صاحب کئی روز بار پورے جوش سے دھاڑے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں پر پیچھے ہٹی۔ آج خالہ نہیں تھیں، ورنہ ابا کچھ لحاظ، کچھ مروت میں خاموش ہو جایا کرتے تھے۔

"اس لڑکے کے لیے کر رہی ہو ناں یہ سب تم؟ اپنی کیا اوقات ہے تمھاری؟ تمھیں لگتا ہے وہ تمھاری عزت کرے گا؟" وہ غرا رہے تھے۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے صوفے کا سرا تھاما۔

"یہ عشق عاشقی چار دن کا بخار ہوتا ہے۔ خود دیکھو گی تم، اسی منہ سے تھوکے گا ایک دن تم پر۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا، ظبیہ۔ کسی مضبوط مرد سے شادی کرو۔"

"مجھے رانج پسند ہے، ابا۔۔۔" وہ آنسوؤں سے منمنائی۔ اس کے ابا نے بدمزگی سے منہ چڑھایا۔)

"اب کیرن اپنی مرضی کے بغیر، اپنے جسم کے احکام مانتے ہوئے ہر وقت رقص کرتی ہے۔ اس کا دل بھاری ہوتا ہے، وہ ایسے نہیں جینا چاہتی، لیکن فرشتہ اس کے نصیب میں ابدی بربادی لکھ گیا تھا۔"

("تم رشتہ کب لاؤ گے؟" اس نے لمبی چوڑی گفتگو کے بعد تنگ موضوع چھیڑا تو رانج ٹھنڈی سانس بھرتے رہ گیا۔

"میرا ATPI اٹکا ہے، یار۔ بس اسے آنے دو، اگلے گھنٹے انیس مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ تمھاری دہلیز پر حاضری دوں گا۔"

وہ نرمی سی مسکرادی اور سر جھکالیا۔ رابح نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "کچھ ہوا ہے؟"

"نہیں، بس ابا ایک جگہ..."

"Oh God, is he back at it"?

وہ حیرانی سے خود کلام ہوا۔ "یہ پھر شروع ہو گئے؟"

"رابح، میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔" ظبیہ کے سینے میں ایک عجب ٹیس اٹھی تھی۔ "میری ماں نہیں ہے۔ وہ مجھے جلد از جلد بیاہ دینا چاہتے ہیں۔"

"تم کون سا راتوں رات ڈورین گرے کی تصویر بننے والی ہو؟ ایک دو سال صبر کر لیں گے تو ایک کیوٹ سا داماد مل جائے گا انھیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی جست میں تھا۔ ظبیہ نے بے کلی سے رخ تبدیل کر لیا۔

"لو، چپس کھاؤ۔ آپا نے ادا کی تصاویر بھیجی تھیں، دیکھو گی؟")

"پھر کیا ہوتا ہے، ماک؟" سات سالہ ظبیہ رخ پیچھے کرتی ہے تو کمرہ تہی پاتی ہے۔ نفاست سے رکھا سنگل بیڈ، ایک لمبی الماری اور چھوٹے پیلے بلب کی مصنوعی روشنی۔ اس کی ماں کہاں چلی گئی تھی؟ بڑی آنکھیں دائیں اور بائیں بھوری گھنی زلفوں کی پرچھائی تلاشتی ہیں، گلے میں گلٹی سے ابھرتی ہے۔

"ماک؟" اس کا عکس بھی اس کے ساتھ دہراتا ہے۔ تنہائی بھیانک تھی، المناک تھی۔

"ماک؟"

دھول چھٹ گئی تھی۔ بصارت سے ماضی کے مرغولے صاف ہوئے اور اس کی سماعت لمبی مسافت کے بعد دوبارہ دماغ سے ہم آغوش ہوئی۔ ایک چیرتی سانس کے ساتھ چھبیس سالہ ظبیہ اپنے حواسوں میں واپس لوٹی۔ ایک بار پھر، تنہا۔ ایک بار پھر، فلائٹ ایم ایچ تھری سیون زیرو میں!

★★★

AM02:40

فلائٹMH370

ظبیہ یمین کے پھیپڑے ہوا کے تمنائی تھے۔

وہ چیخ رہے تھے، چنگھاڑ رہے تھے، اپنے ہی حواسوں پر جبر کر کے ہوش مندی کی ڈور تھامے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سانس نہیں، تیز دھار چھریاں اپنے گلے کی نالی میں اتار رہی ہو۔ اس کے چہرے سے لپٹا آکسیجن ماسک، بے سود اور قاتل، اس کا سر کس رہا تھا۔ سرخ بتیوں کا رنگ جھپک کر گاڑھا ہو گیا تھا۔ خون جیسا لال، موت جیسا لال۔ راہداری کے درمیان وہ دھڑکنوں کے مترادف جل بجھ ہو رہا تھا۔

اپنے کم سے کم تر ہوتے حواسوں میں وہ بمشکل دور گنگناتے انجن کی آواز سن سکتی تھی۔ ہوا میں تانبے کی بااثر بھاپ اٹھ رہی تھی، جیسے مانو خون کی خوشبو۔ ہر سانس اس کا حلق جھلسا رہی تھی۔

اس نے ہلنے کی جرات کی، لیکن ہڈیاں بھاری اور بے جان سی اس کے اطراف میں گری رہیں۔ درد کی شدت اس کے وجود پر تار کی طرح لپٹی تھی۔ ہاتھ سیٹ کے ہتھے پر جا ٹھہرے، پسینے سے تر، اور وہ ایک طرف کو جھکی۔ برابر والی نشست میں جو تھا، وہ جا چکا تھا۔ ظبیہ نے بھیگتی، چھبتی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، اور فوراً ہی منظر بدل دیا۔ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کا دل پھٹ جانے کے در پر تھا۔ وہ چہرہ اس نے ہمیشہ بشاش اور تر و تازہ دیکھا تھا۔ اس پر موت ذرا نہیں بھاتی تھی۔

اس نے منہ کھولنے کی کوشش کی لیکن لب ایک دوسرے پر چسپاں تھے، آنکھوں کے ڈلوں میں محرق سی نمی بہہ رہی تھی۔

ریڈ لائٹس اور مضبوطی سے جھپکنے لگی تھیں، یا پھر اس کے دماغ کا فریب تھا۔ ان کی کڑوی سرخ بو دو سو سینتالیس جانوں پر قطرہ قطرہ بچھ رہی تھی۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"باقی دو؟" شعور کے کسی گوشے کو یاد رہا، مگر جواب اس کے پاس نہ تھا۔ جواب، کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ضبطی سے رواں تھیں، سرخ روشنیاں ان کی ہم آہنگ تھی۔ تنگ راہداری پر عجب سایہ چھایا تھا۔

اس کی بصارت پر خمار بکھرا ہوا تھا۔ بتیاں جھلملا رہی تھیں، ارد گرد پھیلے سائے موت اور حیات کے پُل پر ہیبت ناک نظر آتے تھے۔ بے میل سانچے، بگڑی ہوئی راہیں۔ اسے اپنے آپ پر تناؤ بڑھتا ہوا، اپنے حلق میں اترتا محسوس ہوا۔ جیسے سیاہی اسے اپنے ہمراہ کھینچ لے جانا چاہتی ہو۔

ٹھنڈے پسینے اس کی جلد پر نمایاں تھے، نمی کی ننھے قطرے اس کے تپش آلود چہرے پر واضح ہوئے۔

ہاتھوں میں لرزش برہم اور سنگین تھی، مگر اس نے بازو لمبا کر کے کچھ تھامنا چاہا۔ پسنجر کیبن چکرا رہا تھا۔ ہر چیز اپنے اطراف میں گھوم رہی تھی۔ سرخ روشنی اپنی عداوت میں اس کی توجہ توڑ رہی تھی۔

اس نے چیخنے کی کوشش کی، لیکن آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ آنسوؤں نے پھندا باندھا۔ اس کے ناخن گود میں رکھے ہینڈ کیری کے کپڑے میں جذب ہوئے اور چیرتے ہوئے باہر نکلے۔ پھیپھڑوں میں بستی چبھن اب ناقابلِ برداشت تھی، کھولتے لاوے جیسی تکلیف اس کے ہوش تباہ کر رہی تھی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اور تب ہی اس کے منظر میں اضافہ ہوا۔ دھند سے سیاہ سایہ، پھڑکتی ہوئی سرخ لائٹس کے درمیان نزدیک سے نزدیک ترین آتا وجود۔ آہستگی سے، سستی سے۔ ظبیہ کا دل تیز بھاگ رہا تھا، بے ہنگم دھڑکنیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی جہد کی، تاکہ اپنا انجام خود دیکھ پائے۔

نووارد کے آہستہ قدم کیبن میں پھیلی خاموشی میں ہتھوڑوں کی مانند گونج رہے تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک خلا تھی، اور ایم ایچ تھری سیون زیرو کے پار غیب۔ سرخ رنگ نے اسے اپنی آغوش

میں گھیرا، لیکن نظر میں کچھ شناسا نہ تھا۔ ظبیہ دھندلی آنکھیں اس جانب کی ہوئے تھی، چہرہ ایک جانب ڈھلکا ہوا اور حواس مہین ترین تھے۔

انچ با انچ، اس کا چہرہ نظر کے زاویے میں مظہر ہوا، اور ظبیہ کی آنکھوں میں بستا گیا۔ کئی لمبے لمحات کے لیے، اسے آکسیجن کی کمی محسوس ہونا رک گئی۔ اس کے کندھوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا، دماغ پر ہیبت کا اشتہار چلا تھا، اور دل میں عناد کا اشتعال بھڑکا تھا۔ بھیگی پلکیں اٹھائے ظبیہ یمین اپنے سامنے موجود مرد کو تک رہی تھی۔ اس کا انجام کار، اس کا قاتل، اس کا مجرم اور اس کا ظالم۔

کیپٹن رانج آدم اس کے روبرو تھا۔

سینے سے چسپاں یونی فارم کی شفاف، سفید شرٹ پر چند شکنیں نمایاں تھیں۔ نیلا کوٹ اب کہ اس کے وجود کا حصہ نہیں تھا۔ بکھری سی صورت پر آزاد ہوا کالر۔ گہرے بھولے بال گانٹھوں میں اٹکے تھے، پسینے کے ننھے دانے اس کی تیوری پر چمک رہے تھے۔ ہلکی شیو کے پیچھے چھپے گال پلین کے تناؤ سے سرخ دمک رہے تھے، لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔

ظبیہ نے چہرہ اوپر اٹھایا، لیکن مانوس تاباں ہیزل آنکھوں کے بدلے کچھ انجان اور دہشت انگیز اس کا منتظر تھا۔ رنگ تو اس کی ذات کے کسی حصے میں تھے ہی نہیں۔ کھوکلی، بے آب آنکھیں اس سے جڑیں، اور وقت تھم گیا۔ چودہ سالوں میں کئی بار ظبیہ یمین نے ان کی حفاظت میں رہ کر وقت روک دینے کی خواہش کی تھی، لیکن کون جانتا تھا جو دعا روح کی غذا بن گئی تھی وہ اُس وقت، اُس طرح پوری ہو گی؟

ایک آنسو اس کی آنکھوں کی حدت سے رواں ہو گیا۔

رانج اس کے سامنے اطمینان کُن انداز میں اکڑو بیٹھ گیا۔ اس کی موجودگی کا احساس ہی اس کی بقیہ سانسوں پر حاوی تھا۔ کمزور پڑتے اعصاب دھکیلتے اس نے سیٹ میں پیچھے ہونا چاہا، اُس ہائف صورت ابلیس سے

الٹے پاؤں واپس آنا چاہا، لیکن وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ سرخ جوتے اسے اس مقام تک لے آئے تھے جہاں سے خروج ناممکن تھا۔

ظبیہ کے دماغ کے پردے پر کئی سوالات چھائے تھے۔ وہ باہر کیسے نکلا، وہ ماسک کیوں نہیں پہنا تھا، کیا اسے معلوم تھا یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے؟ لیکن ان سب ادھ ادھوری تحقیقات پر فقط دو فقرے ہی اسے وہ سچ بتا چکے تھے، جس کا گمان تک اس نے نہ کیا تھا۔ اکائرز مورا کے آخری الفاظ، اس کا آخری احسان۔

"دوبارہ محبت مت کرنا، ظبیہ۔ اس سے مت کرنا۔"

نہایت مزاحیہ نقطہ تھا یہ کہ اس شخص کے منہ سے محبت ادا ہوئی، اور ظبیہ یمین کے دماغ کے پردے پر کوئی اور نہیں، مگر رانج آدم کی تصویر چھا گئی۔ شاید، اکائر بھی جانتا تھا کہ ظبیہ کا سب سے بڑا خسارہ اس کی محبت تھی۔ محبت کی حسرت جو اسے تنہائی، بربادی اور زخمی پاؤں دے گئی گی۔ آخر کار وہ وہی بھکاری رہی۔ تہی دامن، کھلے ہاتھ اور متوقع دل۔

رانج اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پلین میں سرسراتی ہوا کا ذرہ ذرہ ان کے درمیان قائم تپش میں دہک رہا تھا۔ وہ کافی دیر بعد بولا۔

"تم سن سکتی ہو ناں؟"

کرب سے جھلستی آنکھیں خودکارانہ طور پر پھڑ پھڑائیں۔ اسے نفرت ہوئی اپنی ذات سے۔ اس کا دل و دماغ، روح و بدن آج تک اس شخص کے تابع تھے۔

وہ مطمئن سا مسکرایا۔ مسکراہٹ، جو تباہی کی آمد دیتی ہے۔ ہیزل آنکھیں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتی رہیں، پھر وہ تھوڑا سا ہنس دیا۔ "تم مجھے ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔"

رانج نے نظر گھما کر آس پاس دیکھا۔ سنسان راہداریاں، بے ہوش مسافرین۔ "دیکھو، پرائویسی کے خاطر کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔" اس نے زبان سے دانت کھجائے۔ "مر گئے سارے۔"

ظبیہ کا دل فوت ہو کر زندہ ہوا۔ سرخ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے چہرہ واپس اس کی جانب موڑا، آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ "تمھارے ذہن میں سوالات ہوں گے۔ اچھی بات ہے، ہونے چاہیے۔ میں کون ہوں، میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں، میں نے ان لوگوں کو کیوں مارا؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"لیکن، ظبیہ۔۔۔ مجھے یہ سب خود نہیں پتا۔"

بھوری آنکھیں اسے دیکھتی رہیں۔ خوف و ہراس، بے چینی اور۔۔۔ ملال۔

"یہ سارے سوالات، یہ ساری تحقیقات، کیا اب واقعی یہ معنی رکھتا ہے؟ تم مر جاؤ گی، میں مر جاؤں گا۔ تمھارا دوست تو پہلے ہی..." اس نے گلے کے اوپر انگھوٹا پھیرا۔ "خیر، میں بتا دیتا ہوں، تمھیں اور کوئی شکوہ نہ رہ جائے کہیں مجھ سے۔"

"سب سے پہلے، مجھے یقین ہے تم جاننا چاہتی ہو گی کہ آکسیجن کو کیا ہوا، تو سنو۔ ایک جہاز میں ناں، ظبیہ، کئی بٹن ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سوئچ ہوتے ہیں ائیر کرافٹ کے باہر والے دروازوں کے۔ انھیں ہم outflow valves کہتے ہیں۔ اچھا، ان دروازوں کا بڑا مزے کا کام ہے۔ جب جہاز زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتا ہے تو یہ پلین کے اندر آکسیجن یعنی کہ ہوا کا بہاؤ کنٹرول کرتے ہیں۔ جب جہاز اوپر کی جانب سفر کرتا ہے، تو یہ خود بہ خود بند ہو جاتے ہیں، تاکہ کیبن پریشر ڈراپ نہ ہو، متوازن رہے۔ اور جب جہاز نیچے آتا ہے، تو یہ کھل جاتے ہیں، تاکہ ہوا جامد نہ ہو جائے۔ دونوں صورتیں انسانوں کے لیے خطرناک ہوتی ہیں۔" وہ ٹھہر کر اس کی شکل دیکھنے لگا، جو خمار آلود نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ رابح نے مسکرا کر کہنا دوبارہ شروع کیا۔

"اس میں ایک اور آپشن بھی ہوتا ہے، مینوول کا۔ میں نے اس ہی کا استعمال کیا۔ کیبن میں آکسیجن کم کرنے کے لیے، سب سے پہلے میں نے پلین کو اوپر لے کر جانا شروع کیا۔ پینتیس ہزار فٹ سے اوپر۔ اور اس کے بعد، میں نے آؤٹ فلو والوز کھول دیے۔ اب تم سوچ سکتی ہو کہ آگے کیا ہوا ہو گا۔" وہ سستی سے

سانس لیتے رہ گیا۔ "دوسرا سوال، کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟ ویل، اس کا جواب میں ذرا بعد میں دوں گا۔ تیسرے سوال کا جواب دیتا ہوں، کہ میں صحیح سلامت باہر کیسے ہوں۔"

"یہاں آنے سے پہلے، مطلب کاکپٹ سے نکلنے سے قبل، میں نے پلین کا descent شروع کر دیا تھا۔ جہاز واپس سے پینتیس ہزار فٹ پر آ چکا ہے اور آؤٹ فلو والوز بھی معمول کے مطابق کام کر رہے ہیں، لیکن تمھیں جو آکسیجن کی کمی ہو رہی ہے، وہ تھوڑے وقت تک رہے گی۔ اصل میں آکسیجن لیولز کو جب اتنا چھیڑا جاتا ہے، تو انھیں ٹھہرانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔" اس نے دو ہاتھوں سے آس پاس کی جانب اشارہ کیا۔ "یہاں کئی pressurised areas ہوتے ہیں، اسی لیے آکسیجن کو صحیح سے پھیلنے میں وقت لگ رہا ہے۔ جیسے اچانک سانس کی کمی سے کوئی مرتا نہیں، ویسے ہی فوراً آکسیجن کے بہاؤ سے کوئی بچتا نہیں۔"

اس نے رک کر اضافہ کیا۔ "اور مجھے یہ کمی کچھ وقت کے لیے اس وجہ سے محسوس نہیں ہو رہی کیونکہ کاکپٹ ایک مقابلتاً چھوٹی جگہ ہوتی ہے، جہاں آکسیجن بھی کم مقدار میں کافی ہوتی ہے۔ وہاں سے یہاں کے سفر میں، میرے پھیپھڑے جلدی اڈیپٹ (adapt) کر لیتے ہیں۔ اتنے سالوں سے یہی تو کر رہا ہوں۔ لیکن تمھیں طویل سانس کی کمی (hypoxia) کا سامنا کرنا پڑا ہے، اسی لیے تم خود کو کمزور محسوس کر رہی ہو۔"

اس نے ایک گہری سانس بھرتے اپنی بات ختم کی، پھر ظبیہ کو دیکھا۔ ساتھ ہی برابر گرے اکائر کو۔ "تم کیسے کوپ کر رہی ہو؟" آگے جھکتے اس کا ہاتھ تھاما اور ابرو سے اشارہ کیا۔

ظبیہ نے اپنے نازک ترین حواسوں سے اسے دور کھینچنا چاہا مگر رابح کی گرفت اٹل تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔

"اچھا لڑکا تھا اکائرز مورا۔ پیار کرتا تھا تم سے۔" اس نے وفقہ دیا تاکہ لڑکی کے تاثرات پرکھ سکے، مگر وہ گنگ سی بیٹھی رہی۔ آکسیجن ماسک اس کی پسینے میں تر پیشانی پر بھاپ اڑا رہا تھا۔

"پیار کرتا تھا اس لیے نہیں مارا، ٹرسٹ می۔" وہ ہنس دیا۔ "جب تمھارے حق حلال کے شوہر کو پانچ سال تک ہاتھ نہیں لگایا تھا، تو اس ناکام عاشق سے کیوں جلوں گا میں؟"

ظبیہ کو خوف آیا اس شخص سے، اس کے اس چہرے سے۔ وہ بھیانک تھا، وہ موت تھا۔

"اکائر کو لگتا تھا تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔ وہ کافی مطمئن تھا اس سے۔ بتاؤ ایسا ہی ہے کیا؟" وہ آگے جھکا، گہری سنہری آنکھوں میں تجسس تھا۔ ظبیہ نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ رائج مسرور سی مسکراہٹ سے پیچھے ہوا۔ "آہ، اب یہ مسٹری بھی مسٹری ہی رہ جائے گی۔ کس کس بھید کا جواب ڈھونڈیں گے میڈیا والے؟" اس کا قہقہہ زور آور تھا۔

"خیر، جانے والوں کی باتیں نہیں کرتے۔" وہ یہاں وہاں دیکھتے، گم سا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی طرف مڑا، سرخ روشنی اس کے دائیں گال پر واضح تھی۔ گھنیری پلکیں، کھڑی ناک کی ہڈی اور خمدار ٹھوڑی۔ "ظبیہ میں۔۔۔ میں بہت پریشان رہا ہوں پچھلے پانچ سال۔" وہ اجنبی تھا، اس کی ہر ہر ادا غیر تھی۔ "تم نہیں جانتی، تم جان ہی نہیں سکتی۔ پاگل پن دیکھا ہے تم نے؟ میں اس کے دہانے سے واپس آیا ہوں۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

تم واپس نہیں آئے، رائج آدم۔ تم اس ہی کنویں میں گر کر فنا ہو گئے ہو۔ الفاظ اس کی جلتی ہوئی زبان پر تھے۔ وہ کوئی بات بیچ سے جوڑ رہا تھا، جیسے ایک لمبی تقریر اس کے دماغ میں رواں ہو۔

"۔۔۔ پھر، کرنا ہی تھا تو میں نے سوچا، بڑا کام کرتے ہیں۔ کچھ ایسا جس سے یہ سارے ٹراما اٹیکس، یہ ساری اذیت، یہ چبھن، یہ انتظار ختم ہو جائے۔ تمھیں پتا ہے اچھے وقت کا انتظار کرنا کتنا دردناک ہوتا ہے، ظبیہ؟ اور یہ کہ، کوئی نہیں سمجھے گا۔ سب کو آپ کی زندگی آئیڈیل لگے گی۔ سب کو لگے گا آپ اپنی بہترین حالت میں ہو۔ لیکن ہر ہر دن، ہر نیا سورج ایک نئی ناامیدی لاتا ہے۔ پہلے میں ہر دن ایک اچھے دن کے انتظار میں اٹھتا تھا، سوچتا تھا ایک دن واقعی ایسا آئے گا کہ میں وہ سارا درد، سارا غم، سارا ٹراما بھلا کر آگے

بڑھ جاؤں گا۔ شادی کروں گا، فیملی اسٹارٹ کروں گا۔ اپنی بیوی کو اپنی ماں اور بہن کی کہانیاں سناؤں گا۔ اس سے باتیں کروں گا، اپنا غم بانٹوں گا۔ مرتضٰی نے کہا تھا میرا خاندان ختم ہو رہا ہے، تو بھاڑ میں جائے وہ۔" وہ بھیگی آنکھوں سے ظبیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں اپنا خاندان خود بناتا، ظبیہ۔ میں وہ سب کرتا جو مجھے کرنا تھا، جو اس حادثے سے پہلے میری تقدیر تھا۔"

اس نے رخ موڑ لیا۔ نم آنکھیں سرخ چمک اٹھیں۔ "لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اچھے دنوں کے انتظار نے مجھے گھائل کر دیا ہے، ظبیہ۔ میں وہ خسارے نہیں بھلا پایا، میں زندوں کے ساتھ نہیں جی پایا، میں صبر نہیں کر پایا، میں دعا نہیں کر پایا، میں نیا سفر شروع نہیں کر پایا!" وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ پورا پلین لرز پڑا۔ اس نے ایک ہتھیلی پسینے والے چہرے پر ملی، صورت بکھری ہوئی تھی۔ "گاڈ ڈیم اٹ، سب جھوٹ بولتے ہیں۔ سب جھوٹی امیدیں دیتے ہیں۔ نہیں رہا جاتا زندوں کے ساتھ زندہ۔ یہ لوگ چاہتے تھے میں زندہ رہوں۔ میرا سب اجاڑ کر، میری زندگی کا کونہ کونہ سیاہ کر کے مجھے امید کے رنگ دکھا رہے تھے۔ خدا کی قسم میرا دل کرتا تھا پوری دنیا کو آگ لگا دوں، ظبیہ۔ یہ سب خونی ہیں، ان سب نے میری جان لی ہے۔ ٹی وی کے پیچھے بیٹھا ہر انسان جس نے مجھ پر بنا ثبوت شک کیا، ہر انسان جس نے میرے خلاف افواہیں مشہور کروائیں، ہر وہ انگلی جو میرے خلاف اٹھی تھی۔" وہ بری طرح رو رہا تھا۔ اس نے ظبیہ کی طرف چہرہ اٹھایا۔ "میں کسی کو معاف نہیں کروں گا، ظبیہ۔ میں کبھی نہیں کروں گا۔ میں جہنم میں جاؤں گا، تو میرا انتظار ہو گا کہ یہ لوگ بھی میرے پیچھے آئیں۔ اگر خدا وجود رکھتا ہے تو یہ عدل کی آخری رسومات ہوں گی، کہ ایسے سنسنی کے متلاشی لوگ جو ایک انسان کی پوری زندگی اجاڑنے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے، یہ بھی میرے ساتھ جلتے رہیں۔ جی جی کر مریں، اور مر مر کر بھی فنا نہ ہوں۔"

اب وہ گریبان سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ ظبیہ کی ایک ہاتھ کی انگلیاں بہت سستی سے اپنے بیگ پر جا ٹھہریں۔ رانج نے نگاہیں اس کی طرف کیں اور بہت نرمی سی مسکرایا۔ مجروح، مردہ مسکراہٹ۔

"تمھارے لیے میں نے ہمیشہ بہت پاک جذبات رکھے تھے، ظبیہ۔ میری زندگی میں تم سے محبت کا اظہار اور وصول ہی شاید ایک خالص شہ تھی۔" وہ بے خودی کے عالم میں آگے جھکا، ایک ہاتھ ظبیہ کی گردن سے ہوتا اس کے سیاہ بالوں میں مقید ہوا۔ اس نے اپنی پیشانی اس سے ٹکرائی، اور ایک لمبے عرصے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ "تمھاری آنکھیں مجھے بہت یاد آئیں۔" وہ خاموش سا گویا ہوا۔

ظبیہ نے چہرہ ترچھا کیا۔ سرخ ڈوریں اس کی آنکھوں کی سفیدی میں شامل ہو رہی تھیں۔ نچلی پٹی دردناک، بے لگام آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ اسے ہٹا نہیں پائی۔ اس کا جسم سانس کی کمی سے بھاری تھا۔ رابح نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں، پیشانی اب بھی اس سے جڑی رہی۔ اس کی ناکافی، غیر متوازن سانسوں نے ان کے درمیان روک باندھا۔ دھیمی سپید روشنی کے درمیان، رابح کی نظروں نے گھنی پلکوں سے نمناک آنسوؤں کی لہر اس کی تیوری پر بہتی دیکھی۔

وہ ٹھہرا رہا، آنسو کاٹے کردہ سفر اس کی سنہری آنکھوں میں ہر لمحے محفوظ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دل پہلی بار کھل کر بند ہوا، چبھن کی ٹیس حد سے تجاوز کر گئی۔ کسی بھی جوش سے عاری، اس نے ایک ہاتھ سے اس کا گال تھاما، اور پھر انگوٹھے سے بھیگی ہوئی جلد صاف کی۔ نہایت باریکی، کُل اطمینان سے ظبیہ کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر اپنی آنکھوں تک راہ دکھائی۔ لڑکی کی آنکھوں میں کرب تھا، ملال تھا، وحشت تھی، درخواست بھی تھی۔ آج ظبیہ یمین کی آنکھوں میں سب تھا، سوائے محبت کے۔ اس نے اپنی روح کے دروازے بند کیے۔ زندگی میں پہلی بار اسے نفرت کے اصلی معنیٰ سمجھ آئے تھے۔

وہ نزدیک بڑھا اور ایک لمحے کے لیے، اس کے پاس ٹھہر سا گیا، جیسے وقت ان کے درمیان کھنچ گیا ہو۔ پھر اس نے بتدریج اپنا انگوٹھا اس کے آنسوؤں کی راہ پر رکھا، اور نرمی سے اس کی تیوری چھوئی۔ اس کی آنکھیں، وہ گہری، شکواہ کن آنکھیں اس کے چہرے کی پور پور کو اپنے حصار میں اتار رہی تھیں، گویا وہ پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہو۔ بے خودی تھی، بے خیالی تھی۔

ظبیہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھنے کی جرات کی، وہ الجھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ میں خم پیدا ہوا، مرکز ظبیہ کے ہونٹوں تک گیا۔ صرف ایک لمحہ تھا جب ظبیہ کو لگا تھا وہ آگے جھکا ہے، لیکن اگلے ہی پل وہ جھٹکا کھا کر دور ہوا۔ پلکیں کئی بار مچکاتے، وہ پھولی سانس لیے ایسے اسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کسی خواب سے جاگا ہو۔ اس نے کپکپاتا ہاتھ ظبیہ کے چہرے سے دور کر لیا، آنکھوں میں وزنی خمار تھا۔

پیشانی ظبیہ کی پیشانی پر ٹکاتے اسے اپنی پسلیوں کے درمیان کچھ چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نگاہیں نیچے پھیریں تو ایک لمبے لمحے کے لیے دنگ رہ گیا۔

ظبیہ یمین SIG SAUER گن کی نالی اس کے سینے پر جمائی تھی۔ سرخ ڈوروں میں لپٹی بھوری آنکھیں اسے دعوت دے رہی تھیں اور شہادت کی کانپتی انگلی گن کے سیاہ اٹکاؤ پر ٹھہری تھی۔

وہ پہلے تو اسے دیکھتا رہا، پھر گردن اٹھا کر ظبیہ کو۔ لب کچھ کہنے کو وا ہوئے۔ ایک لمبے منٹ بعد وہ آرام سے مسکرایا، پھر مسکراہٹ شیرینی ہنسی میں طے ہو گئی۔ نرمی سے آگے جھکا تو ظبیہ نے متنبہ کرتے ہوئے مزل سختی سے اس کے سینے میں گاڑا۔ آنسو اور آکسیجن کی کمی اس کی بصارت گمراہ کر رہے تھے۔

"ایک منٹ، ایک منٹ۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے نرمی سے بولا، اور جھک کر اس کی گن پر بنا سفیٹی سوئچ بند کیا۔ ہیزل آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ "کسی کو دھمکاتے وقت عموماً اسے آف رکھتے ہیں۔"

اس کے ہاتھ میں پستول کا وزن اس کی ہمت سے کئی گنا زیادہ تھا۔ وہ لرزتی انگلیوں سے اس کے اوپر تانے رہی۔ رانج نے اس کی مشکل دیکھتے اس کا ہاتھ تھاما۔ ظبیہ نے ایک کراہ نکالی ہی تھی کہ دیکھا وہ پستول کا مزل اپنے سینے کے بائیں طرف رکھ رہا تھا۔ ٹھیک دل کے اوپر۔

"لو، لگا دیا نشانہ۔ یہاں سے سیدھا جہنم پہنچوں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہہ رہا تھا، جیسے موت کوئی پرانی ساتھی ہو جس سے ہم آغوش ہونے کا خیال اسے مطمئن کر دیتا تھا۔ ظبیہ نے ابرو بھینچے، پلکیں جھپکیں، چکنی انگلیوں کے درمیان ٹرگر ڈھونڈا۔ رانج آرمیدہ انداز میں اسے تکتا رہا۔

اس کے ہاتھ بری طرح لغزش کر رہے تھے۔ انگلیوں نے گن کو سختی سے جکڑا، ہتھیلیوں پر امڈ ٹاٹھنڈا پسینہ اس کے ابرو سے بھی ٹپک پڑا۔ اسے نفرت تھی اس شخص سے۔ رابح آدم اس کی زندگی میں وہی سرخ جوتے تھا جس کی خبر اس کی ماں نے انیس برس پہلے ہی اسے کر دی تھی۔ وہ سرخ جوتے جو اسے عقل سے پھیر گئے، وہ سرخ جوتے جو ہر اپنے کو کھینچ لے گئے تھے۔

اس کے بند انگشت سفید ہوئے اور گرفت آہنی۔

وہ نہیں کر سکتی تھی، وہ یہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھولتی ہوئی سانس سے اس کا سینہ جل رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی، اس کا جبڑا اس برہمی سے بند تھا کہ اس کا حلق تک دکھ رہا تھا۔ ہوا گھٹی ہوئی تھی، سانس بند تھی۔

بھوری آنکھیں اس کی پر سکون نگاہ اور اس کے سینے پر قائم گن کے درمیان آگے پیچھے ہوئیں۔ دانت اس سختی سے اپنے ہونٹ میں دھنسے کہ اسے زبان پر خون کا مزہ گھلتا محسوس ہوا۔

اس نے ایک بھاری سانس باہر نکالی۔ رابح آدم اس کے منظر میں دھندلا رہا تھا۔ وہ موت اور شیطان سے بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن ظبیہ کے لیے وہ پھر سے وہی تھا، شاید ایک آخری بار۔ پانچ سال پہلے والا رابح آدم۔ اس کا رابح۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی تصاویر رقص کر گئیں۔ ماضی میں لٹائے پل، چاند تاروں سے زیادہ منور راتیں، خواب بنتی آنکھیں اور ساتھ جیے قہقہے۔ رابح آدم صرف ایک یاد نہیں، اس کی تمام اچھی یادوں کا مجموعہ تھا۔ وہ سیاہ ہونے سے قبل اس کے لیے قوس قزح بن کر اترا تھا۔ ظبیہ اس سے بے پناہ، نفرت کرتی تھی لیکن جو وہ اسے دے چکی تھی، وہ اس سے واپس نہیں چھین سکتی تھی۔

اس کی آنکھیں نووارد آنسوؤں سے چھلک پڑیں۔ آگاہی کی اذیت موت سے بھی زیادہ کٹھور تھی، اور رابح نے اس کے لیے وہی چنی تھی۔ وہ خونی تھا، اپرادھی تھا، گناہگار تھا، لیکن ظبیہ کی روح کو سن کرنے والی دھوکے کی آگ، خسارے کی چبھن، اس کی سمجھ بجھا رہی تھی۔

اس کا ہاتھ لڑکھڑا گیا، بندوق کا بیرل نیچے جھکا۔

رائج تمام حساسیت سے تہی اس کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں ایک عجب نرمی تھی، گویا دونوں فیصلوں سے متفق ہو۔ جیسے موت یا زندگی میں کوئی تفاوت تھا ہی نہیں۔

"کہہ دو تم نہیں کر سکتی۔" اس نے ہاتھ گن پر موجود ظبیہ کے ہاتھ پر رکھا۔ اس کی کمزور سے کمزور تر ہوتی گرفت سنبھالی اور نشانہ ٹھیک کیا۔ "تم یہ انسان نہیں ہو، ظبیہ۔ تمھیں اس کے لیے نہیں بنایا۔"

اس کا جسم لرز رہا تھا، ہر ہر پٹھا اکڑا ہوا تھا۔ آنسو اس کے بوسیدہ ماسک میں بوند بوند جذب ہو رہے تھے، مگر وہ ہل نہیں سکی۔ لاکھ کوشش کے بعد اس نے بھوری نگاہیں بلند کیں اور ہیزل آنکھوں کو کھوجا۔ اس نے درخواست کی، کسی بھی چیز کی، کچھ بھی جو اس لمحے کو توڑ کر آسان بنا دے۔ مگر رائج نے اس کے نصیب میں صرف اپنا انتظار لکھا تھا۔

وہ بھی ہمیشہ اس کا انتظار کرتا تھا، ارادۃً یا غیر ارادۃً۔

ایک سسکی کے ساتھ بندوق اس کی پسینے میں تر ہتھیلی سے آزاد ہوتے اس کی گود میں جا گری۔ جسم میں مانو بجلی نے غوطہ لگایا۔ بے کسی اس کا پور پور ڈس گئی۔

رائج نے ہمدردی سے اس کے تہی ہاتھ دیکھے، پھر ایک خستہ سانس باہر چھوڑی، جیسے اس نتیجے سے واقف ہو۔ ایک لمحے کے لیے وہ یونہی اسے تکتا رہا اور پھر کھڑا ہوا۔ پلین اپنے وزن پر قائم تھا، لیکن منزل غیر شافی تھی۔ البتہ اس کہانی کی منزل اب زیادہ دور نہیں۔

رائج نے دو انگلیوں سے اس کی لرزتی ہوئی، کمزور ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ وہ بھوری آنکھیں بمشکل کھولے تھی۔ اپنے چودہ سال آج اس کے سامنے تھے۔

"تُف ہے تمھاری قسمت پر، ظبیہ یمین۔" وہ اداس، زخمی سا مسکرایا۔ "آخر کار، تمھارے لیے رائج آدم غزار احمد سے بدتر ثابت ہوا۔"

کئی سفر طے ہوئے، کئی انتظار تمام۔ ہیزل آنکھیں بھوری آنکھوں کے نام۔ وہاں نہ رنج تھا نہ پچھتاوا، نہ ہی شوق۔ صرف اختیار۔ اور پھر، بے زبانی سے، اس کا ہاتھ بلند ہوا اور انگلیاں ظبیہ کے ماسک کے گرد گرفتار ہوئیں۔

اس کے عصاب کستے چلے گئے، آنکھیں حیرت سے عریض ہوئیں اور لب خاموش احتجاج میں وا ہوئے۔

رابح نے آہستگی سے اس کے چہرے کے گرد لپٹا ماسک اتار دیا۔

آکسیجن کی یکایک کمی سے ظبیہ کا سینہ کسی بھاری بوجھ سے نیست ہوا۔ اس نے گہری سانس لی، جسم نے ایک جھٹکا لگایا۔ سانس بھرنے کو منہ کھولا لیکن ہوا میں کچھ نہیں تھا۔ ہوا ہی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھے، پنجے خلا کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچے۔

پلین چکرا رہا تھا۔ اس کا سر، اس کا ہر ہر عضو خاموش تھا اور منظر ایک سرنگ۔ اس کی قوت کے آخری آثار بھی چھٹ رہے تھے اور پھیپھڑے آگ برسا رہے تھے۔ ہر ایک دھڑکن اس کے سینے میں کسی ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی، لیکن اس کا جسم انکاری تھا۔

اس کا ہاتھ پتھر ہوا اور دھول بنتے ڈھے گیا۔ انگلیوں نے رابح کے گھٹنے سے ٹکراؤ کیا اور آنکھیں پلکوں پر مقید ہو گئیں۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

رابح آدم آخر ظبیہ یمین کا تھا کون؟

محافظ، مخالف ملزم یا ظالم؟

محافظ، مخالف، ملزم اور ظالم۔

وہ اسے چھوڑ گئی، اور وہ دیکھتا رہا۔ خاموش، بے حرکت۔ کمرہ ٹھہر گیا تھا، تھم گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ادھر ہی مقیم رہا، اس کی آخری سانس کے چڑھاؤ سے بے نیاز۔ پھر ملائمت سے اس نے اپنی بیلٹ میں اٹکا چھوٹا (compact) ٹینک باہر کھینچا۔

رانج نے اس سے جڑا آکسیجن ماسک ادھیڑ کر آزاد کیا اور اپنے ناک اور منہ کے گرد لگایا۔ آکسیجن کی سسکاری سے اس کے پھیپڑے نئے سرے سے زندہ ہوئے۔ حالاں کہ اس کی سانسیں کافی تھیں، وہ منصوبے کے اختتام تک اپنی موت کا خدشہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ربڑ کے پٹے اس کے سر کے گرد ٹھہر گئے۔

اس نے ایک آخری بار ظبیہ ہمین کی بے جان صورت کو نظروں کے حصار میں لیا اور پھر، وہ مڑ گیا۔ کبھی نہ پیچھے دیکھنے کے لیے۔

اب کہ اس کی منزل کاکپٹ تھی۔

★★★

فلائٹ MH370

AM02:51

پسنجر کیبن خاموش تھا، اور خاموشی بھی ایک راز ہوتی ہے۔ جہاز کے سسٹم کی دھیمی گنگناہٹ اس انسان کی سماعت میں اتر رہی تھی۔ وہی جو تنہا تھا، وہ جو سب سے بلند تھا۔ اس کی دھڑکنیں سینے کی حدت میں گرج رہی تھیں۔ سیاہ لوفر ایک ایک قدم سے کاکپٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ مڑ چکا تھا، اس سے، ان سب سے۔ اس کا راستہ بے روک تھا، سفاک تھا، صریح تھا۔

لیکن پھر، ایک آواز۔ ایک دھیمی 'کلک' کی گونج۔

گولی کی آواز خاموش راہداریوں میں ایسے چیخی، جیسے صور کی پھونک۔ نوک دار، بے ہنگم۔ رانج کے بائیں بازو میں درد کی لہر چیرتی ہوئی اتری، جیسے تمام پارہِ گوشت جل رہا ہو۔ اس کا توازن بگڑا، جسم یہاں سے وہاں لہک گیا۔ گہری سانسیں آکسیجن ماسک کے پار اس کے منہ سے رواں ہوئیں اور دنیا سر سے پھسلتی قدموں میں جا ٹھہری۔ ایک ہی لمحے میں گرم، گاڑھا خون اس کی سفید ڈریس شرٹ میں جذب ہو گیا۔

ہیزل آنکھیں کھل کر نمایاں ہوئیں، دہشت، حیرت، چبھن۔

("زخم دکھائیں۔" اس نے نرمی سے درخواست کی۔

"کیا کرو گی؟" رابح کہے بنا نہ رہ سکا۔ ظبیہ نے اسے واضح طور پر گھورا تو وہ مسکرا کر اپنی آستین اوپر کرنے لگا۔

وہاں کی جلد سرخی میں دھیمی پڑ گئی تھی لیکن سوجن اب بھی ظاہر تھی۔ چوٹ کا رنگ بدل رہا تھا اگرچے جنبش میں اب بھی دقت پیش آتی تھی۔ ظبیہ نے اس کا ہاتھ آگے پیچھے کیا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگا اس سب کے دوران؟" رابح نے آنکھیں موڑیں۔ نازک ہیزل نور سورج کی روشنی میں بھورا دمک رہا تھا۔ لب خشک تھے اور زبان لوہا۔ ظبیہ نے پٹی اس کے اثر انداز ہاتھ کے گرد گھمائی، اس کی کہنی اور ہاتھ کو ہوا میں تحلیل رکھا۔ "اب لگ رہا ہے۔")

اس نے گمان کیا تھا، وہ مر چکی تھی۔ گمان غلط تھا۔ خاموشی راز تھی، اور راز دغا کو دعوت دیتے ہیں۔

دیوار سے ٹکتے اس نے چہرہ گھمایا۔

ظبیہ یمین اپنی سیٹ میں قائم تھی، جسم ایسے لٹکا تھا جیسے جان اسے چھوڑ گئی ہو۔ بے حرکت، بے سکن۔ Sig Sauer کی بندوق اس کی کانپتے ہاتھ میں جکڑی تھی، اور جب وہ زمین پر ڈھے گئی تو اس کی انگلیوں نے احتجاجاً کچھ نہ کیا۔ بھوری آنکھوں، یک وقت جنونی اور طیش سے لبالب، اب کونوں سے سرخ چمک رہی تھیں۔ ان میں تکان، پشیمانی اور غم گہرائیوں تک نمایاں تھے۔ آنسو اس کی گھنی پلکوں پر چسپاں، ڈھلتی بصارت کو مزید روند رہے تھے۔

("آپ کو کیا ہوا؟" آخر کار وہ آواز دوبارہ آئی۔ رابح نے واضح طور پر ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ سامنے کھڑی لڑکی کی آواز میں اتنا خلوص، اتنا درد تھا کہ وہ ایک پل کے لیے جم کر رہ گیا تھا۔ وہ اس سے اس کی حالت پوچھ رہی تھی، اس کے زخموں کا جواب چاہتی تھی۔ وہ پہلی تھی اور شاید، آخری بھی۔)

اس کے ہونٹ وا ہوئے، گویا کچھ کہنے کہ جست میں ہو، لیکن الفاظ نہ بن پائے۔ ظبیہ یمین کی سانسیں ناکافی تھیں، یک طرفہ تھیں۔ اس کا تنگ سینہ ہر کوشش کے ساتھ طغیانی چڑھ رہا تھا۔ اور پھر، ایک آخری پھونک کے آزاد ہوتے ہی، تنہا آنسو اس کے گال پر ٹوٹ گرا۔ بھیگی پلکوں پپوٹوں پر قید ہوئیں اور گردن ایک طرف کو ڈھے گئی۔

ظبیہ یمین اب ساکن تھی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ بندوق اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ خاموش اور وزنی تماشائی۔

رابح کاکپٹ کی جانب بڑھتی راہ میں تنہا کھڑا تھا، ایک ہاتھ سختی سے بائیں بازو پر قابض تھا۔ اسے خون کی تپش زخم سے رستی ہوئی اپنی کلائی پر بہتی محسوس ہو رہی تھی، اس کی انگلیوں کو سرخ لیپ رہی تھی۔ درد اب بڑھ چڑھ کر چنگھاڑ رہا تھا، اس کے حواسوں پر غالب آ رہا تھا۔ اس نے جبڑا سختی سے بند رکھا، لیکن ماسک کے پار سانسیں تیز تھیں۔

ظبیہ یمین نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، اور تقریباً کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ اگر اس کی بصارت دھندلی نہ ہوتی یا پٹھوں میں حرکت رواں ہوتی، تو رابح اس وقت زمین کی دھول چاٹ رہا ہوتا۔

اس نے بمشکل خود کو کاکپٹ کی جانب چلنے پر مجبور کیا۔ ایک پیر دوسرے کے پیچھے گھسیٹتے اپنا سفر ناپا۔ ہر قدم اس کے بازو میں تکلیف کی سرسراتی ہوئی لہر اچھال رہا تھا، ہر دھڑکن اس کے زخمی گوشت میں چبھ رہی تھی۔

کاکپٹ کے اندر پہنچ کر اس نے لڑکھڑاتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ یہاں آکسیجن بھاری تھی۔ ماسک اب اس کا دم گھونٹنے لگا تھا۔

اپنے عتاب کو غور میں لاتے، اس نے جلادوں کی طرح ماسک چہرے سے نوچ پھینکا۔ اجلی رنگت پر اس کے سرخ نشانات واضح تھے۔ رابح نے گہری سانس اندر اتاری، لیکن وہ پھنس رہی تھی، لرز رہی تھی۔

اس کی شرٹ خون میں نہا چکی تھی، اور سرخ کپڑا جلد سے چپک رہا تھا، نم اور لسلسا۔ "گاڈ ڈیم اٹ۔" اس نے کپکپاتی انگلیوں سے بٹن کھولنے شروع کیے اور تقریباً چیر کر شرٹ اپنے بدن سے آزاد کی۔

اس کا وجود اچانک ہی خنکی کے سپرد ہوا، مگر اس نے فکر نہ کرتے شرٹ کو چھوٹی کترنوں میں پھاڑنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ مسلسل کپکپا رہے تھے، کپڑا اس کی انگلیوں تلے پھسل رہا تھا۔ داں توں کو زور سے پیستے اس نے ایک کترن اپنے بازو کے زخمی گوشت کے گرد کس کر باندھی۔ زور اس قدر تھا کہ ایک سسکی اس کے ہونٹوں سے رواں ہو گئی۔ پٹھوں نے پٹی کے خلاف بھرپور احتجاج کیا، لیکن اس نے ایک نہ سنتے بینڈیج پر ایک اور گانٹھ لگائی۔

خون کا زور ہولے ہولے تھم رہا تھا۔

رانج نے کنٹرول پینل سے کمر ٹکائی اور آدھے ثانیے کے لیے آنکھیں موندیں، درد کی چبھن کے پار سانس لینا چاہی۔ اس کے جسم کا گوشہ گوشہ پسینے سے شرابور تھا، ہر بیتا لمحہ اسے چند لمحات قبل ہوئی انہونی کی یاد دلاتا تھا۔

اس کی انگلیوں نے پلین کا کنسول چھوا، خود کو فوکس کرنے کے لیے ڈپٹ کر مجبور کیا۔ خون اب کہ ننھے، گاڑھے قطروں میں اس کے جوتوں کے پاس بوند بوند جما ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے وہ وہاں ٹھہرا رہا، اپنے خون کی سرخ راہوں کو پرکھتا رہا۔ درد اس قدر تھا جیسے کوئی اس کے زخموں میں دانت گاڑ رہا ہو۔ رانج آدم کو چھ ماہ میں، پانچ سال میں، یا شاید زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ہار کے کتنا نزدیک تھا۔ ظبیہ یمین اس کی سوچ سے زیادہ قوی، اعتبار سے زیادہ مضبوط اعصاب اور توقع سے زیادہ نڈر واقع ہوئی تھی۔ اپنے آخری لمحات میں بھی وہ مضبوطی کی مثال قائم کر گئی تھی۔

ویسے بھی، وہ ہمیشہ سے اس سے مضبوط رہی تھی۔ لیکن اس بات کا اندازہ شاید اسے خود بھی کبھی نہیں ہوا تھا۔

لیکن ظبیہ جا چکی تھی۔

اور رائج اب بھی وہیں تھا۔

اس نے خود پر جبر کرتے اپنے آپ کو سیدھا کیا۔ کاکپٹ سپید بتیوں میں اجاگر تھی۔ اس کا بازو تلملا رہا تھا، ادھڑی ہوئی شرٹ کا بنا بینڈیج پوری طرح سے خون میں تر ہو چکا تھا۔ لیکن اسے آگے بڑھنا تھا۔

وہ پیچھے جانے کے لیے بہت آگے آ چکا تھا۔ رائج آدم نیچے جانے کے لیے بہت اوپر اڑ چکا تھا۔

★★★

فلائٹ MH370

جگہ: کاکپٹ

AM02:59

کاکپٹ خنکی میں ڈوبی تھی۔ خون کی فلزیاتی بو اس کی جلد پر اب بھی تازہ تھی۔ رائج نے سیٹ کے پیچھے ہاتھ لمبا کر کے اپنا یونی فارم کا کورٹ اٹھایا۔ کپڑا اکڑا ہوا تھا، اس کی پوروں تلے پھسل رہا تھا۔ اس نے پرواہ نہ کرتے اپنی پیٹھ پر پھیلایا، تو کالر اس کی گردن میں چبھنے لگا۔ کل مدھوں پر موجود کیپٹن کے درجے کی سنہری پٹیاں، یک وقت تعظیم اور توصیف کے حامل، آج صرف ایک بوجھ تھیں۔

گہری سانسوں کے ساتھ وہ کرسی پر ڈھے گیا، بازو میں درد ایک بار پھر سر نکالنے لگا۔ اس کا اوپری پٹھا پٹی کی تکلیف سے دمک رہا تھا اور اٹھتی ٹیس اسے اپنی حیات کی یاد دلاتی تھی۔ وہ زندہ تھا، کم از کم اب تک۔

کاکپٹ کی بتیاں دھیمے سے جل بجھ ہوتیں اور اس کے آس پاس پھیلی جگہ میں روشنی بکھر جاتی۔ پلین اس کے قدموں تلے گنگنا رہا تھا۔ اس کے سامنے موجود آٹو پائلٹ کے کنٹرول وقتاً فوقتاً جھپک رہے تھے۔

ہیزل آنکھوں نے اپنے سامنے موجود ڈسپلے اسکرین دیکھی، انسٹرومنٹل پینل کا ہر بٹن نظروں میں اتارا۔ اس کے لرزش کرتے ہاتھ کنٹرول یوک پر جا ٹھہرے، بند انگشت شدت سے سفید پڑ رہے تھے، انگلیوں

پر نمایاں خون اس کی گرفت ڈھیلی کر رہا تھا۔ اس نے اپنا قلاب تبدیل کیا، چھوٹی سے چھوٹی حرکت بھی اس کے بدن میں سوئیاں گاڑ رہی تھی، لیکن وہ ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ اب نہیں۔

برہمی سے دانت پیستے اس نے گرفت مضبوط کی۔

رابح آدم کا منصوبہ کامل تھا۔ اس نے اس فلائٹ کا ہر لمحہ، ہر تفصیل، ہر حرکت سوچ رکھی تھی۔ چھوٹی، ادھڑی ہوئی سانسیں اس کے سینے سے نکل رہی تھیں۔ اس نے سوئچز کھل بند کیے، تباہی کے دہانے پر کھڑے مرد کی انگلیوں کی ہر حرکت میں بھی مہارت کا اثر تھا۔ پلین کا مکمل قبضہ اب کہ اس کے پاس تھا۔ انجنوں نے جواباً آواز بلند کی اور اس کی آہنگ رابح کو اپنی ہڈیوں میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس کا دل بلندی کے سپرد تھا، ہر دھڑکن طیارے کے گھر میں بستی تھی۔ بلندیوں کے پیروکار رابح آدم کو اب صرف اور صرف زمین چاہیے تھی۔ پاتال، زوال اور۔۔۔ موت۔

کھڑکی کے باہر رات سیاہ تھی، روشنیوں سے دور دست۔ سمندر کا قالین اس کے نیچے بستار تھا، ان دیکھا مگر پوری طرح موجود، گویا اس کے زوال کا منتظر، گویا اس کی ذات کو ہڑپنے کے لیے مستعد۔ سفاک لہریں آج بھی اس کی چاہت میں تیرتی تھیں۔ کنٹرول پینل اندھیرے میں چمک رہا تھا، اس کے چہرے کی ایک طرف سائے کھینچ رہا تھا۔ چہرے پر واضح تکان کی لکیریں گوشت سے ہوتی روح تک تراش چکی تھیں۔ رابح کی شکل کسی بھیانک خواب کا تاثر دیتی تھی، جس سے جاگنا غنیمت ہو۔

وقت اپنا قلاب دھیما کر چکا تھا، گھنٹے کا ہر چکر ایک دوسرے میں رس رہا تھا، ہند سے یک دوجے کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ ایم ایچ تھری سیون کی نوک بادلوں کو چیرتے، آسمانوں کو دور ہٹاتے طیارے کو شمالی بحر الہند کی جانب دھکیل رہی تھی۔ وہ جگہ جہاں پانچ سال پہلے کیپٹن- نہیں، فرسٹ آفیسر رابح آدم کی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ وہ راتوں کی بوچھاڑ اور غموں کی بہار لائی تھی، جس میں خاموشیاں سنگین تھیں اور

سنگینی میں خون تھا۔ جہاں اسے اپرادھی مانا تھا، اس کی ذات کو دھتکارا تھا، اور اس کے اپنوں نے پشت پھیر لی تھی۔ بحر الہند، جہاں رائج اپنا سب لٹا آیا تھا، اس کی کہانی کا انت تھا۔

اس کا دماغ، دماغ کا حصہ حصہ یادوں کی پٹاری کھولنے میں مگن تھا۔ وہ غائب حواسوں سے طیارہ اڑا رہا تھا، اور اس کی سمجھ بوجھ اس کی پرانی ہستی کو کھوج رہی تھی۔ رائج آدم جو مرد تھا، اور رائج آدم جو مرد بن گیا تھا۔

پانچ سال قبل کوئی اسے ڈھیروں پیسہ دے کر بھی کہتا کہ وہ چند ماہ بعد ایک سوسائیڈل مرد کی زندگی گزارنے والا تھا، تو وہ منہ کھول کر اس پر ہنس دیتا۔ سوسائیڈ اور وہ؟ رائج آدم ایسی نچلی موت کے لیے تھوڑی ہی بنا تھا۔ بلندیوں کا پجاری، طیاروں کا محبوب، سارے جہاں کو ٹھوکر پر رکھنے والا مرد، خود کے لیے ایک ناقص موت چنے گا؟ کیوں، آخر کیوں؟ کیا کمی تھی اس کی حیات میں؟ خوشحال زندگی، مسرت خاندان، خوبصورت منگیتر، اپنے خوابوں کی پیروی کرتی نوکری۔

لیکن وقت اتنا ہی ساکن ہوتا ہے، جتنا سمندر میں اڈتی بچھتی لہریں۔ زندگی نے اسے وہ دکھایا جس کا گمان اس نے نہ کیا تھا۔ جب انسان خود کو اعلیٰ و باری سمجھ لیتے ہیں، تو ان کی حقارت کی تصویر خدا آپ انھیں دکھاتا ہے۔ اور رائج آدم، مضبوط مرد اور قابل پائلٹ، در حقیقت اس تصویر کے عکس سے خود کو کبھی جدا نہ کر پایا تھا۔

زندگی کی پہلی پرواز میں بادلوں کے درمیان رہنے کا خیال ہی اس کا خون دہکا گیا تھا۔ سیسنا طیارے کی ڈبل سیٹر کاکپٹ میں بیٹھ کر دنیا اتنی چھوٹی، اتنی غیر ضروری معلوم ہوتی تھی۔ اسے خود پر فخر محسوس ہوا تھا، خود سے قابلیت کی وہ خوشبو برآمد ہوئی تھی جو ایک کم متوسط گھرانے کے مرد کو شاید ہی نصیب ہو۔ اپنے خواب پالینا بھی تو ایک خواب ہوتا ہے۔

جیٹ فیول کی خوشبو اس کی نتھنوں میں اتر رہی تھی، انجن اس کے وجود تلے زندہ تھے، اور ستر اسالہ رابح آدم نے سوچا تھا، کہ ایک دن اس آسمان پر صرف اور صرف وہ راج کرے گا۔

لیکن اب؟

اب، یہ آسمان ہی تھے جو اس کا دم نکال رہے تھے۔ وہ ان گہرائیوں میں پھنس سا گیا تھا، جو ہر چڑھتے مرحلے کے ساتھ اسے زندگی، حقیقت اور مطلب سے دور کھینچ رہے تھے۔ ہر وقت کا کردہ فیصلہ اس کے حال کا انجام کار تھا۔ کاکپٹ اس کا مقبرہ تھی، اور اس کی جان سے عزیز کرسی، اس کا کفن۔ اس کی حیات کی ڈور انگلیوں کے درمیان پھسل رہی تھی، اور احساس گاڑھے، چپچپ دار تیل کی مانند تھا، جو اس کے قلاب سے بہت دور تھا۔

بازو میں ایک عصب پھڑ پھڑایا، اور درد کی ٹیس سر تا پا اس کو جھنجھوڑ گئی۔ اس نے ہاتھ سختی سے یوک پر جمایا اور جسم میں ابلتی ہوئی تکلیف سراسر نظر انداز کی۔ یونی فارم کا کوٹ اس کے زخم سے بار بار ٹکرا کر، خشک ہوتے خون سے چپکتے پٹی کے نیچے ادھڑی کھال کو نوچ رہا تھا۔ لیکن رابح نے درد کا گرم جوش استقبال کیا۔ وہ اسے ہوشمند رکھے تھے، زندہ رکھے تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

ایم ایچ تھری سیون زیرو کی کاکپٹ میں گھنٹے گزر رہے تھے۔ تکان اس کے منظر کے کنارے کتر رہی تھی، دھند کے گہرے بادل کی طرح اس کے سر پر سایہ کیے تھی۔ رابح نے کئی مرتبہ پلکیں کھل بند کیں، سر یہاں سے وہاں جھٹکا، خیالات ترک کرنے چاہے۔ کاکپٹ کے کنٹرولز نازک بتی تلے جھلملا رہے تھے۔ پلین اس کے نیچے گونج رہا تھا، ناگزیریت کی جانب، مسلسل رواں۔

رابح آدم اس کام میں ماہر تھا، کیونکہ دوسرے مواقع اور پسپائی نے اس کا ساتھ کبھی نہ دیا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں سستی سے چکر کاٹ رہی تھیں، ایک کے بعد ایک دائروں میں سفر کر رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر بندھی سیاہ رولیکس وقت دکھاتی جاتی، کبھی چار، کبھی پانچ۔ وہ اپنی کہاں میں پھر سے تنہا تھا۔ اس بار معنیٰ اسے خود کھوجنے تھے۔

مسافرین کو آکسیجن کی حاجت سے ختم کرنے کا منصوبہ اس کا ذاتی تھا۔ اس کے عقل و فہم کے مطابق وہ مقابلتاً ایک آسان موت تھی، بجائے اس کے کہ انھیں سمندر میں گھٹ گھٹ کر ضائع ہونا پڑے۔ ڈوبنے کا امر تکلیف دہ اور بے بس تھا۔ ویسے تو موت اپنے آپ میں ہی کٹھور تھی، لیکن رابح نے ان معصوم جانوں پر آخری احسان کرتے، اپنے مطابق سب سے پر سکون طریقے کا چناؤ کیا تھا۔ اپنے لیے وہ بدترین موت بھی لکھ سکتا تھا، کیونکہ ڈوبنا اسے پانچ سال قبل راس نہیں آیا تھا، لیکن بلندیوں سے گر کر فنا ہونا اس کی آخری خواہش تھی۔

فجر کے امڈتے ہی اس پر پہلی کرنوں کی بارش ہوئی۔ دائرہ نظر پر مشرق سے طلوع ہوتی سورج کی روشنی نارنجی تھی۔ شروع میں نہایت دھیمی، گویا چاندی کے ورقے میں سنہری روشنائی کے دو قطرے ٹپکا دیے گئے ہوں۔ بادل اس کے اوپر چھاؤں کیے تھے۔ لیکن وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ، وہ تاب و توان میں نمایاں ہوئی، اور کچھ ہی دیر میں افق کا گوشہ گوشہ صبح کی مدھم زردی مائل روشنی سے پر نور ہو چکا تھا۔ کاکپٹ کے کانچ سے چھن کر آتی دھوپ بوند بوند خون آلود ہاتھوں پر پھسل رہی تھی، اس کے اندر کی سیاہی اور روح کے خناس کو کھول کر واضح کر رہی تھی۔

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

اس کا سینہ کس رہا تھا، کچھ غیر شناخت شدہ سا اندر کروٹیں لے رہا تھا۔ افسوس؟ آرام؟ غم؟ تسکین؟ تفاوت رکھنا مشکل تھا۔ سورج کی چمکتی کرنیں نیچے پھیلے سمندر پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ نیلاہٹ تر و تازہ تھی، ایسی چمکدار جیسے آئینہ۔ اس کی لا انت زمین اس کے نیچے کھنچ کر لمبی تھی، گویا کسی بھوکے شیر کا دہانہ۔

بے حجابی سے تری ٹُوٹا نگاہوں کا طلسم

اک رِدائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

انجن اپنی روانی کھو رہے تھے، پہلے پہلے ایک ہلکی کھانسی اور فی البعد، گھنی اور لمبی لرزش جو طیارے کے گوشے گوشے سے ہم آہنگ تھی۔ ایم ایچ تھری سیون زیرو کا فیول تقریباً آٹھ گھنٹے بعد اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ رابح نے کنٹرول یوک پر اپنی گرفت تبدیل کی اور جہاز نے زوال کے پہلے مرحلے عبور کرنا شروع کیے۔ اس کی سانس اس کے سینے میں قید ہوئی اور اس نے پلین کی ناک شمال کی جانب موڑ کر اپنی راہ چنی۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

جہاز کا نزول دھیرے دھیرے طلوع ہوا۔ تبدیلی شروع میں معمولی معلوم ہوتی تھی، حتیٰ کہ نرم۔ لیکن جلد ہی، اس نے رفتار تھام لی، ہواؤں سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور نیچے کا راستہ کئی گنا تیزی سے ناپا۔ تیزی جو بے لگام ہوتی ہے، خون آشام ہوتی ہے۔ ہوا کی دھاڑ اس کے کانوں کو زخمی کر رہی تھی۔ کنٹرولز اس کے ہاتھوں تلے برہمی سے کانپ رہے تھے، سسٹم جھپک جھپک کر کئی بار اسے متنبہ کر رہے تھے۔ اُسے، جو انجام کار تھا۔ اُسے، جس نے موت چنی تھی۔

عشق کی اِک جَست نے طے کر دیا قصّہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

ایک ایک دھوم گرد و نواح میں گونج رہی تھی، اور طیارہ ہر بیتے لمحے کے ساتھ، پانیوں کی جانب خون خوار شتابی سے سفر کر رہا تھا۔ اس کا دل بھاگ رہا تھا، خون میں کچھ بہت لاعلاج، خود روسا سرائیت کر رہا تھا۔ پانچ سال میں، شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا دماغ خالی ہو چکا تھا، اور ہر حس ایم ایچ تھری سیون زیرو اور اس کے زوال کی شدت پر تھی۔

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارِ یہاے شوق

تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

سینے میں بے آرامی پھندا ڈال رہی تھی، اس کے بازو میں اٹھتا درد ماضی میں فراموش کر دیا گیا تھا۔ خوش رنگ، لمبی انگلیاں یوک پر اپنی پوری قوت سے لپٹ گئیں، اور مٹتی فجر کے نرم اجالے میں اس کے بند انگشت خون سے سرخ نظر آئے۔

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک

جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

کاکپٹ اس کے گرد شور مچا رہی تھی، جگہ جگہ سے لوہے کے چرچرانے، انسٹرومنٹ کے کانپنے کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں۔ شمال کا راستہ، اس کی شدت پوری توانائی سے اس کا سر چکرا رہی تھی، سانس لینا ضرورت سے زیادہ کٹھن بنا رہی تھی۔ اس کی بصارت ایک بار پھر دھندلا گئی، مگر اس بار وجہ تکان نہیں تھی۔ وجہ رفتار تھی، ہوا تھی، بلندی تھی، اور زوال کا حملہ تھی۔

رائج آدم کے دماغ میں ایک خیال نہ تھا، لیکن اس کا جسم ہر احساس ہزار گنا زیادہ جی رہا تھا۔

"When I am up there, it's like... I think of nothing, I feel everything ".

ماضی کی کسی کانفرنس میں کہے گئے اس کے اپنے الفاظ آج اسے وہاں، اس پل لوٹ کر یاد آئے۔ حافظہ بھی کیسے عجب کھیل کھیلتا ہے۔ ٹھنڈی، ساحلی ہوا اس کی جانب مرغولوں میں اٹھ رہی تھی۔ وہ آداب کر رہی

تھی یا اسے ارسال، جواب مشکل تھا۔ اس کے پھیپڑے آگ جیسی تپش سے کھول رہے تھے، ایک مکمل سانس لینا بھی آسائش بن چکا تھا۔ بایاں بازو اور اس کا زخم پلین کی پستی کے ساتھ دمک رہا تھا۔ رابح آدم، تمناؤں کا گڑھ، آج آخری بار اپنی ساری یادیں ایک ایک کر کے جی رہا تھا۔ سوالات، انتخابات، خسارے، پچھتاوے۔ سب کسی گزراں روح کی مانند، اس کے قلاب سے پہلے ہی پہنچ سے پھسل جاتے۔

('دھم' کی آواز کے ساتھ اس نے اپنا سر رباب کی گود میں رکھا اور کتاب پڑھتا گیا۔ بڑی بہن جو فون چلانے میں مگن تھی، بدذوق سی شکل بنا کر چلا اٹھی۔ "اماں!" جلد ہی معلوم ہو گیا، اماں نے آج اولاد فریادی کاؤنٹر بند کر رکھا تھا۔ وہ خود سے ہی اس کا سر ہلانے لگی۔ "بد تمیز، ہٹو! اتنی خشکی ہے تمھارے سر میں قریب مت آیا کرو میرے۔" رابح شاطر سی ہنسی ہنس دیا اور جاتے جاتے اپنا سر اس کی بھوری زلفوں سے ٹکرا کر گیا۔ رباب کو تو مانو گویا بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ "کمینے!")

قول ہے کہ سات اختتامی منٹوں میں انسان کی پوری زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے کسی ان دیکھی فلم کی مانند نمائش ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، لیکن جیسا فلم اور تھیٹر ہمیں سکھاتا ہے، ویسے نہیں۔ وہاں کوئی رنگین اور روشن عکس نہیں تھے۔ فقط ٹوٹتے جڑتے، بکھری صورت گوشے، گویا کسی نے کتاب کے درمیان سے صفحات کی ایک موٹی گڈی پھاڑ ڈالی ہو۔

("کل رات گئے تھے؟" وہ ٹائی پن فٹ کرتے ناشتے کی میز پر بیٹھا تو اماں کا سوال اسے چونکا گیا، گردن یکایک گرم ہوئی۔ گزشتہ رات وہ اور ظبیہ نائٹ مارکٹ میں اسٹریٹ فوڈ کھانے گئے تھے۔

اس نے کیتلی سے چائے نکالتے اماں کو دیکھنے سے گریز کیا۔ "خواب میں؟ یاد نہیں۔"

سر کا اسکارف ٹھیک کرتے اماں اس کے سامنے براجمان ہو گئیں۔ "مجھے الو مت بناؤ، اچھا؟ تمھارے مزاج ہی بدلے بدلے ہیں۔ کھانا بھی کم کھاتے ہو، باتیں بھی کم کرتے ہو۔ تمھارے علاوہ میرا ہے ہی کون اب، رابح؟ رباب بھی دبئی چلی گئی ہے۔"

"ارے بھائی، کیا کیا سوچ لیتی ہیں آپ؟ کھا تو رہا ہوں۔ ماشاءاللہ سے پیٹ نکل کر گرنے کو ہے، آپ اب بھی ناخوش ہیں۔"

لیکن مائیں کب کچھ سنتی ہیں۔ "کیا چکر ہے؟ کام پر کوئی مسلئہ ہے؟ چھوڑ دو یہ الٹی سیدھی ہوائی نوکری۔ اپنے ابا کی طرح وہ گھر دکھانے والا کام کر لو۔"

رائج چائے کا گھونٹ لیتے ہنس پڑا۔ "رئیل اسٹیٹ ایجنٹ بن جاؤں میں؟ پائلٹ سے۔" اب وہ نرمی سے مسکرا رہا تھا، آگے جھک کر ان کا ہاتھ سہلایا۔ "کام پر کوئی مسلئہ نہیں ہے، آپ بے فکر رہیں۔"

"اس کا مطلب کوئی اور مسئلہ ہے۔"

رائج نے اپنی زبان کو کوسا، ڈھیر سارا کوسا۔

"اماں، کوئی مسلئہ نہیں ہے یار۔ بڑا ہو گیا ہوں میں۔ بس پرسنلٹی تبدیل ہو جاتی ہے۔" وہ دعا گو تھا کہ اماں پکڑ نہ لیں، کہ اس کی 'پرسنلٹی' رباب کے نکاح والے دن سے تبدیل ہوئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اماں نے برا سا منہ بنایا اور ڈبل روٹی پر مکھن لیپنے لگیں۔ "رباب کا فرض تو پورا ہو گیا، اب تمھاری فکر ہے۔ بس اب تم شادی کر لو۔"

دو ہی پل میں ساری چائے اس کی ناک میں چڑھ چکی تھی۔ اس نے کھانس کر گلا صاف کیا۔

"جو بہتر لگے آپ کو۔"

اماں نرمی سے مسکرا دیں اور شفقت سے اس کے بال چھوئے۔

"اچھی سی گڑیا لاؤں گی تمھارے لیے۔"

"کیا ہو گیا ہے، اماں؟ اس عمر میں گڑیا سے کھیلوں گا میں؟"

شفقت بھرا ہاتھ اسے ایک دھپا رسید کر چکا تھا۔ وہ ہنس دیا۔)

یادیں ایک دوسرے سے تصادم میں تھیں۔

(اندھیری رات میں ہوا خنک تھی، نم گھاس کی تازہ خوشبو گردونواح میں سجے یاسمین کے پھولوں کی مہک میں شریک ہو رہی تھی۔ صحن کی پٹی کے ساتھ ہی گھنی جھاڑیاں نمایاں تھیں، اور ان کے نزدیک کیاری کی پگڈنڈی پر ظبیہ نشست تھی۔ اس کے سامنے ہی پلاسٹک کی کرسی پر رابح بیٹھا تھا، سفید اور نیلی دھاری دار بٹن شرٹ پر کریم رنگی پینٹس میں ملبوس۔

بقیہ لوگ پہلے ہی اندر جا چکے تھے۔ ادا کو نیند آ رہی تھی، مرتضی کو ٹھنڈ لگ رہی تھی، اور رباب بے وسیلہ ماں اور عاجز بیوی کی طرح پیچھے پیچھے ہولی تھی، ورنہ وہ تو محفل چھوڑ کر کبھی نہ جائے۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ظبیہ کے ارغوانی باجو کو رونگ کا دامن چھیڑ رہا تھا۔ ریشمی آستینوں میں قید بازو اس نے سامنے لپیٹے تھے اور بھوری آنکھیں رابح پر مرکوز تھیں۔ اس کی لمبی، سرخ و سفید انگلیاں گیٹار کی تاروں کو چھیڑ رہی تھیں، ساکن رات میں گیت پرو رہی تھیں۔

کولڈ پلے کا گانہ Fix You اور اس کی دھن خاموش رات میں ان کی ہم راز، ہم نواہ تھی۔ ظبیہ مسکرا رہی تھی، اس کی سیاہ، گھنی زلفیں عقب میں پھیلی تھیں۔ الفاظ خامی تھی۔ اس گھڑی انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے اس بوجھ کی ضرورت نہیں تھی۔

ہیزل آنکھیں اپنے ہاتھوں میں قید مارٹن ڈی ۲۸ کو تک رہی تھیں، لیکن وہ وقفے وقفے سے نظر اٹھا کر اپنی سامع کو بھی دیکھ لیتا۔

اس کی تبسم میں ڈھلتی کتھئی آنکھیں، گولائی میں خم ہوتے نرم گال۔ رابح کو اپنے سینے میں ایک عجب، ناقابل تشریح احساس سر چڑھتا غالب ہوا۔ آسودگی، اور کہیں نہ کہیں خواہش بھی۔

چاند کی روشنی ان دونوں وجود پر واضح تھی۔

ظبیہ ہلکا سا ترچھی ہوئی، چہرے پر پھسلتی ایک لٹ پیچھے اٹکائی، اور رابح کی آنکھوں نے سالوں، شاید صدیوں کے لیے وہ لمحہ اپنے حافظے کے سپرد کر دیا۔)

رائج کو اپنی زندگی کی پہلی بائیک نظر آئی، سرخ اور زنگ آلود۔ آہ، وہ کتنا خوش تھا اسے حاصل کر کے۔ ٹیڑھے آڑھے پیوں پر گلی کا چکر کاٹتا وہ اور اس کے پیچھے آیات الکرسی کا ورد کرتیں اماں۔ اسے دھندلی تصویر میں رباب کا عکس دکھائی دیا۔ وہ ہنس رہی تھی، وہ ہمیشہ ہنستی رہتی تھی۔ وہ امید تھی، راہ بھی۔ اور رائج ان دونوں شے سے ہی رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ ادا کے ننھے ہاتھ اس کے گال سہلا رہے تھے، اس کی سنہری آنکھیں ابی کو دیکھتے روشن تھیں۔ وہ کسی کی آنکھوں کی چمک تھا، وہ کسی کے نام کا غرور تھا۔ اسے ظبیہ کی مٹتی صورت بھی دماغ کے کسی گوشے سے برآمد ہوئی۔ سات سال قبل یا شاید آٹھ، وہ آنکھیں موندے اور سر پیچھے کیے کھڑی تھی۔ مسکراتی ہوئی۔ اس کے عقب میں ٹی ٹی ڈی آئی پر رات کا پہرا تھا۔ چہرے، کئی اشکال، فوکس کے دائرے سے اندر باہر ہو رہے تھے۔ کچھ دن کی طرح دوشن اور کچھ خستہ تصاویر جیسے دھندلے۔

وہ وہیں تھا، ایم ایچ تھری سیون زیرو کی کاکپٹ میں۔ اپنے انت سے لمحات، شاید چند سانسوں کے فاصلے پر، لیکن وہ کہیں اور بھی تھا۔ وہ حصہ حصہ تھا، زخم اور نشان تھا، ماضی اور یاد تھا، خسارہ اور کفارہ تھا۔ تتلیوں کے درمیان بھاگتے کسی اسٹرابری باغ میں، اندھیرا پارٹمنٹ میں تنہا نشست، آئینے میں نمودار ہوتی کھوکھلی ہیزل آنکھوں کو جانچتے ہوئے۔

رائج کا دل تکلیف سے دمک رہا تھا، لیکن کسی ایک یاد پر مغموم ہونے کے لیے وقت ناکافی تھا۔ اس کا آپ ناکافی تھا۔ کسی سیلاب کی طرح، وہ اس کی ہستی پر ابل رہی تھیں، وار پر وار، اچھا اور برا، سچا، جھوٹا اور وہ بھی جسے اس کا دماغ فراموش کر چکا تھا۔

وقت کھنچ کر طویل ہوا پھر گانٹھوں کی صورت لپٹ گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ناقابلِ فہم شے میں تشکیل ہو گیا۔ سات منٹ کسی کا پورا حین حیات ہو سکتے تھے، لیکن رائج آدم کے لیے وہ فقط اس کے خساروں کی یاددہانی تھے۔

اور پھر، جوں ہی سمندر اس سے ملن کے لیے طغیانی چڑھا، رابح نے اپنے اندر ایک نیا احساس اترتا محسوس کیا۔

ایک اجنبی سا قرار۔ قبولیت۔

ایک مرد، ایک قاتل، ایک پائلٹ۔

کاکپٹ اس کے گرد چنگھاڑ رہی تھی، سمندر اب کہ صرف چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ آسمان کی ٹوٹی تصویر، اب کہ سنہرے اجالے سے مکمل نہائی ہوئی، آخری شے تھی جو رابح آدم نے اپنی آنکھوں میں اتاری۔

اس کے بعد، سب سیاہ ہو گیا۔

اور پھر، عدم۔

★★★

۱۴ مارچ، ۲۰۱۴

کوالالمپور، ملائیشیا

(غیوب MH370 کے چھ دن بعد)

صبح سویر کا سورج بارش کے سیاہ بادلوں کے درمیان چھن کر شہر کوالالمپور پر برس رہا تھا۔ ہوا میں نمی اور تناؤ متوازی مقدار میں موجود تھے، جیسے سارا شہر ہی اپنا دم روکے ہو۔

ایک چھوٹی، دوڑ دھوپ میں مگن کافی شاپ کا سماہماری آنکھوں کے سامنے آہستگی سے واضح ہوتا ہے۔

سیرامیک کپ کے لڑکھڑانے کی آواز، گفتگو کی مدھم سرگوشیاں اور لکڑی کے فرش پر چلتے پھرتے قدموں کی چاپ سماعت میں گونج رہی تھی۔ کافی کے دانوں کی کڑوی مہک اور بارش تلے نم مٹی کی سگھں مد حس شامہ پر احسان جتا رہے تھے۔

کاؤنٹر کے قریب دیوار پر لگی ٹیلی ویژن کی اسکرین کسی نیوز چینل کی تصاویر سے جھپک رہی تھی۔ ٹی وی کی آواز اتنی بلند تھی کہ کیفے کے گوشوں تک سفر کر سکے۔ گاہکوں کی ایک ٹولی گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

نیوز اینکر کی آواز جذبات سے عاری، پیشہ ورانہ تربیت کی حامل تھی۔ "ملائیشیا ایئر لائن کی پرواز ایم ایچ تھری سیون زیرو (MH370) کو ریڈار سے غائب ہوئے چھ دن بیت چکے ہیں۔ سرچ اینڈ ریسکیو کی کارروائیاں جاری ہیں، لیکن فی الحال طیارے یا اس کے دو سو انتالیس مسافرین اور عملے کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ سراغ نہیں مل سکا ہے۔"

دھندلاتی تصویر بجھ کر کوالالمپور انٹرنیشنل ائیرپورٹ کا سما نظروں میں مقید کر دیتی ہے۔ گم شدہ مسافرین کے لواحقین اور اہل خانہ لاؤنج میں جما تھے، کچھ اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی تصاویر ہاتھوں میں دبائے، خوف اور غم سے چور تھے۔ اور کچھ دنیا و حال سے بے نیاز، کیمرے کی آنکھ کو خالی نگاہوں سے تک رہے تھے۔

کافی شاپ اب کہ مکمل خاموش تھے۔ اینکر نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ملائیشیا ایئر لائنز اور ملائیشیا کی حکومتی اہلکار باقاعدگی سے پریس کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں، ولیکن ٹھوس معلومات کے فقدان نے خاندانوں کو مایوس اور ناراض چھوڑ دیا ہے۔ میکانکی ناکامی سے لے کر دیدہ دانستہ طور پر کی گئی کارروائی تک کے نظریات کے ساتھ قیاس آرائیاں عروج پر ہیں، لیکن کسی بھی امر کی تصدیق نہیں کی گئی ہے۔"

اسکرین ایک بار جھپک کر منظر بدل لیتی ہے۔ پریس کانفرنس کا کمرہ شور و غل سے گونج رہا تھا، ملائیشیا ایئر لائنز کا نیلا اور سرخ لوگو عقب میں سفید دیواروں پر چمک رہا تھا۔ کافی شاپ کے گاہک متجسس نگاہوں سے

اسکرین تک رہے تھے، جہاں اب سوٹ میں ملبوس ملائیشیا ائیر لائنز کا کوئی ایگزیکٹو پوڈیم کی جانب بڑھ رہا تھا۔

باہر کی دنیا میں کوالالمپور کی سڑکیں دوادش سے زندہ تھیں، لیکن ہوا میں بستی تنگی تب بھی واضح تھی۔ وسیع ایل ای ڈی LED بل بورڈ جہاں عموماً کسی جیتی جاگتی، حسن سے بہر وور اداکارہ کا اشتہار چلا کرتا تھا، اب تلملاتی روشنیوں کے ساتھ گم شدہ ائیر کرافٹ ایم ایچ تھری سیون زیرو کے حوالے سے معلومات دان کر رہا تھا۔ اسکرین پر چلتی سرخ ٹیکسٹ کی پٹی چمکدار اسکرینز پر صاف نمایاں تھی۔ راہ گیر، چہروں پر لاکھوں تذبذب اور بے چینی لیے، اپنے سفر میں ٹھہر کر ہر تازہ خبر پڑھنے رک جاتے تھے۔

شہر کی کسی مرکزی شاہراہ پر نصب ہوا بل بورڈ تازہ ترین اپڈیٹس کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس پر درج الفاظ بے ساختہ مگر نااُمیدی سے لبریز تھے۔

"Search efforts continue for missing Flight MH370. No new information at this time".

نوجوانوں کا ایک مجموعہ اسٹریٹ سائن کے ٹھیک نیچے کھڑے پشیمان نظروں سے اسکرین تک رہا تھا۔ باریک آواز میں کی گئیں ان کی سرگوشیاں سنی جاسکتی تھیں۔ "ایسا لگ رہا ہے یہ طیارہ کبھی تھا ہی نہیں۔ ایسے کیسے غائب ہو سکتا ہے؟" متکلم کی بے کلی قابلِ لمس تھی۔

ایک نے اپنا سر جھٹکا۔ حیرانی تھی، پریشانی بھی۔ "اتنا بڑا جہاز۔۔۔ سینس نہیں بنتا۔"

کانفرنس روم کی حالت بھی ہم عناں تھی، فضا میں درماندگی اور سوگ کی کیفیت اتر چکی تھی۔ مالائی وزیر اعظم، نجیب رزاق، پوڈیم پر باہیں پھیلائے کھڑے تھے، ماتھے پر تکان تھی، اور آنکھوں کا تاثر سنگین۔ کیمروں کی جھپک بلند تھی، اور سفید بتیاں بار بار ان کے چہرے پر منور ہو رہی تھیں۔ وزیر اعظم نے خطاب شروع کیا، تو آواز میں ٹھہراؤ تھا، مگر لہجے میں روپوش عاجزی محسوس کی جاسکتی تھی۔

"ہم پرواز ایم ایچ تھری سیون زیرو کو تلاش کرنے کے لیے اپنی طاقت میں موجود ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔" ان کی نگاہیں کمرے پر مرکوز تھیں۔ "میں لواحقین کی درد اور پریشانی سے بخوبی واقف ہوں، لیکن اس وقت میں آپ کے صبر کا دعا گو ہوں۔ ہم تمام جوابات اور ثبوت تلاش کرنے کے لیے بین الاقوامی ماہرین کے ساتھ چوبیس گھنٹے کام کر رہے ہیں۔"

مجموعے میں موجود ایک مرد، تکان اور رنج سے برباد، چیخ اٹھا۔ "last known location کا کیا!؟ آپ وہ کیوں نہیں دیکھتے!"

نجیب رزاق ہچکچائے۔ ضبط کی تاریں چھڑ چکی تھیں۔ "تلاش کے علاقے کو آخری معلوم کوآرڈینیٹ کی بنیاد پر بڑھا دیا گیا ہے، لیکن وہ خطہ وسیع اور بے حد دشوار ہے۔ ہم نے امید نہیں چھوڑی ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔"

کیمرہ زوم ہو کر وزیر اعظم کے چہرے پر جما تھا۔ ان کی نگاہوں میں تیرتی بے چینی اور شکستگی اس نے جانچ لی تھی۔ "طیارے سے کوئی ملبہ یا سگنل ملنے کی تصدیق نہیں کی گئی ہے۔ ہم تمام امکانات کو کھوج رہے ہیں، لیکن ہمیں طریقہ کار ہونے کی ضرورت ہے۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

نجیب رزاق پس منظر میں بول رہے تھے، لیکن کیمرہ اب چکر کاٹ کر کمرے کے گرد بیٹھے لواحقین کے چہروں پر مرکوز تھا۔ کچھ دبے دبے آنسوؤں سے چہرہ جھکائے رو رہے تھے، سرخ گال اور خون ریز آنکھیں۔ کچھ گم نام سی خاموشی میں ڈوب رہے تھے۔

آگے کی قطار میں بیٹھی ایک عورت یکایک اچھل کر کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز میں درد عیاں تھا۔ "میرا شوہر اس فلائٹ میں تھا! آپ کو انھیں ڈھونڈنا ہو گا! حکومت ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتی، ہمیں سچ بتاؤ!" اس کے احتجاج سے باقی بھی دہک گئے تھے۔ شور بڑھ رہا تھا، آنسو بہہ رہے تھے۔

حکومتی سربراہان اسٹیج کی جانب خاموش کھڑے تھے، چہرے ہر قسم کے تاثر سے تہی تھے، گویا اہلِ خانہ کی ہر فریاد، ہر آہ و بکا بہرے کانوں پر پڑ رہی ہو۔

ملائیشیا ائیر لائنز کے سربراہ پھر پوڈیم کے جانب بڑھے، اور ہزار بار دہرایا جملہ ایک اور بار مائیک میں کہہ دیا۔ غیوب دو سو انتالیس، موت صفر۔ سوال دو سو انتالیس، جواب صفر۔

"ہم مزید معلومات حاصل کرتے ہی عوام کو اپڈیٹ کرتے رہیں گے۔" ان کی آنکھیں رپورٹرز اور خاندانوں کے سروں کے اوپر کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔ "ہماری ہمدردیاں اور دعائیں ایم ایچ تھری سیون زیرو میں سوار افراد کے اہل خانہ کے ساتھ ہیں۔"

منظر کے کناروں کو کترتی سیاہی، کیمرے کی پٹی کو دھندلا گئی تھی۔ اب صرف پس پشت ٹپکتی بارش کی گونج کوالالمپور کے گھروں کی کھڑکیوں پر سنی جا سکتی تھی۔ وہ شہر آگے بڑھنا سیکھ چکا تھا، لیکن ایم ایچ تھری سیون زیرو کا عکس وہ تصویر تھی جو حلق میں سانس کی طرح پھنسا تھا۔

ایک ایسی انہونی جو عنقریب ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالوں تک انھیں ڈستی رہے گی۔

★★★

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

سات سال بعد

۰۷ جنوری، ۲۰۲۱

نیویارک سٹی، امریکہ

نئے سال کی آمد کو ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ فضا میں نوکدار، گھنی ٹھنڈک گنگنا رہی تھی۔ ہوا کا زور ایسا تھا جیسے لباس کی تہوں کو چیر کر جلد کی پوروں میں بس جائے۔ ہڈیاں ہر قدم کے ساتھ چرچرا رہی تھیں۔ اسفالٹ کی سڑک ٹھنڈی تھی اور گلی محلے میں موجود دُکانوں پر بھنتے میووں کی مہک محسوس کی جا سکتی تھی۔

برف گِل اور مٹی کے ساتھ مل کر جگہ جگہ کیچڑ کی شکل اختیار کر چکی تھی، فٹ پاتھ اور سائڈ واک کی زمین برف کے ٹکڑوں کی بدولت ناہموار تھی۔ نیویارک سٹی میں ٹریفک کی دھیمی گونج اور ہارن کی چیخ دور بھی سنی جاسکتی تھی، ساتھ ہی نیچے سے اٹھنے والی سب وے ٹرینز کی غیر مسلسل گڑگڑاہٹ۔

راہ گیر مصروف، پُرعزم قدموں سے سڑکوں پر گامزن تھے۔ اپنے بدن کو دس طرح کے موٹے کپڑوں سے ڈھانپ کر وہ ایک نئے دن کی جانب رواں تھے۔ نیویارک ایسا ہی تھا۔ گہرے رنگ کے کوٹ میں ملبوس لوگوں کا مجموعہ زیبرا کراسنگ سے گزر رہا تھا، ان کی سانسیں ہوا کے ٹھنڈے مرغولوں میں منہ سے چھوٹ رہی تھیں۔

اسٹریٹ لائٹس کی دھیمی، عیب دار روشنی، بادلوں سے گھرے آسمان کے نیچے روشنی بکھیر کر بے ڈول، غیر ترتیب شدہ سائے کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے حسب مواقع جھونکے کرب کے ساتھ پڑے کاغذوں کو آسمان میں اڑا رہے تھے۔ ٹریش بن سے ابلتے ریپر اور بوتلیں آس پاس لڑکھڑا رہی تھیں۔

بے رج، بروکلین کے شمالی خطے پر بستار، ہرے بھرے درختوں سے آراستہ سڑکوں اور مصروف، آبادیاتی دکانوں کے ساتھ قائم ایک بستی ہے۔ تازہ کافی کی خوشبو اور بیکری میں تیار ہوتے پکوانوں کی من للاچائی مہک، ہوا میں موجود نمکینی میں گھل سی جاتی ہے۔ وہ علاقہ براؤن اسٹون عمارتوں اور لو رائز (low-rise) اپارٹمنٹس کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔ ان کے ابتری حصّوں پر سادہ اور خفیف سا کام کیا گیا تھا۔

جنوری کی بدولت، سائڈ واک پر جگہ جگہ برف کے نشانات جمے تھے۔ سورج کے چڑھتے ہی، اہلِ خانہ سڑکوں پر نکلے نظر آتے تھے، کبھی جاگ پر، کبھی واک پر۔ قریب ہی واقع پلے گراونڈ سے ننھے بچوں کے پرجوش قہقہے اور مسرت آمیز شور سنا جاسکتا تھا۔ روزمرہ کی زندگی میں R ٹرین کی گرج فاصلے پر گونجتی تھی۔

مرتضٰی عباس نے اپنے موٹے بھورے کوٹ کا کالر درست کیا۔ یخ جاڑے میں گرم کپڑا اس کی ہڈیوں کو آرام بخش رہا تھا۔ اس کے سیاہ عینک کے شیشوں میں سیاہی مائل آسمان کا منظر جانچا جا سکتا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے اپنی بلنڈنگ سے برخاست ہوا، ہاتھ میں بریف کیس اور چابیاں تھیں، دوسرا ہاتھ اس کی جیب کی گہرائیوں میں مقید۔

پچھلے آٹھ سالوں میں وقت نے اپنا کرتب اس کے چہرے کی جھائیوں اور تیوریوں کے نزدیک بڑھتی سفیدی سے دکھایا تھا۔ وہ آج بھی مضبوط تھا، آج بھی قابل تھا۔ لیکن ایک بار بکھر جانے کے بعد، انسان جما ہو سکتا ہے، جڑ نہیں سکتا۔

بھورے جوتوں میں مخفی پیر سب وے کے جانب اپنے سفر پر گامزن تھے، جب جیب میں رکھا اس کا فون زوں زوں کی آواز کے ساتھ تھرتھرایا۔ خاموش سانس کے ساتھ مرتضٰی نے اسے کوٹ سے باہر نکالا۔ سامنے نامعلوم ہندسے دیکھ کر اس کے ابرو ناسمجھی میں جڑے۔

"ہیلو؟" اس نے ہر ابٹن دباتے کہا، لہجے میں فکر عیاں تھی۔

رابطے کے دوسری جانب ایک لمبے عرصے کے لیے خاموشی تھی، ایسی ہچکچاہٹ جس نے اس کی گرفت سخت ہونے پر مجبور کر دیا۔

"ہائے، کیا آپ مرتضٰی عباس بات کر رہے ہیں؟ میرا نام لیسا بینٹ ہے۔ میں ایک پروڈیوسر ہوں، اور ہم ایم ایچ تھری سیون زیرو (MH370) پر ڈاکیومنٹری فلم بنا رہے ہیں۔"

اس نام کا تزکرہ، وہ نام جسے اس نے عرصوں، شاید صدیوں، اپنے سینے میں مدفن کرنے کے جتن کیے تھے، اس کی آنتیں مروڑ گیا تھا۔ مرتضٰی کی سانس حلق کے کسی گوشے میں پھنس گئی تھی، اور لمحے بھر میں اس کے گرد دنیا سوکھ کر پگھل چکی تھی۔ شہر کا تمام شور مل کر بھی اس کے ذہن میں چھایا سناٹا نہیں مٹا سکتا تھا۔

مرتضٰی نے جواب فوراً نہیں دیا۔ اس کا دماغ بھاگ رہا تھا، فرار کے لیے، قرار کے لیے۔ پرانے زخموں کے دھاگے اس برہمی سے چیر دیے گئے تھے کہ وہ بس ایک سانس بھر تا رہ گیا، اور خون اس کے دل سے رستا پیٹ میں جما بھی ہو گیا تھا۔ وہ درد جسے فراموش کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا، اس کے حافظے کے دریچوں پر دستک دے رہا تھا۔ کوالالمپور کی کبھی نہ ختم ہونے والی راتیں، سیاہ و سفید رنگوں میں گھرا وہ اور رائج آدم کی گمشدگی سے اس کے دل میں پیدا ہوئی مسلسل خلا۔ وہ سب پیچھے چھوڑ آیا تھا، دنیا کے ایک کونے سے بھاگ کر دوسرے تک آن پہنچا تھا، اور وہ اس کے پشت میں اپنے پنجے گاڑے ایک بار پھر اسے ڈھونڈ چکا تھا۔

"مرتضٰی؟" دوسری طرف سے اٹھتی آواز نرم گو تھی، تقریباً معذرت خواہ۔ "میں سمجھ سکتی ہوں یہ آپ کے لیے کتنا مشکل ہو گا، لیکن ہم واقعے کے مختلف نظریات اکھٹا کرنے کی جست میں ہیں۔ ہم آپ کے بہت، بہت شکر گزار ہوں گے اگر آپ اپنی کہانی۔"

"I'm not interested."

آواز جذبات کی رمق سے تہی تھی، سرد، سنگ۔ وہ اپنی ایڑھیوں پر مڑ گیا، جوتے سنگ ریزہ پر چلتے اپنے نیچے بے جان پتے کچل رہے تھے۔ خنک ہوا میں اس کی سانس بھاری تھی۔

"پلیز، سر۔ اگر آپ ایک بار۔"

"آئندہ کال کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔" اس نے امید کی تھی کہ اس کے الفاظ کا زہر لائن کی دوسری طرف سفر کر جائے گا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، خوف سے، عتاب سے۔ اپنے گرد قائم کی گئیں دیواریں مرتضٰی عباس کو دراڑوں سے آراستہ نظر آ رہی تھیں۔

"لیکن مرتضٰی، ہم۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

"کہاناں نہیں!" اس بار آواز ہنگم تھی، وہ تقریباً چیخ پڑا تھا۔ اسے اپنے زہریلے الفاظ اس گلی کی دیواروں سے ٹکراتے محسوس ہوئی جس میں وہ لاشعوری طور پر مڑ گیا تھا۔ وہ رک گیا، پاس بنی ٹھنڈے لوہے کی ریلنگ تھامی۔

اس کے بند انگشت گرفت کی سختی سے سفید پڑ گئے تھے۔

وہ سن سکتا تھا۔ پروڈیوسر کس طرح دنگ ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ مرتضٰی نے سانس لینے کی کوشش کی تو اس کا سینہ پھولنے لگا، لیکن ہوا اس کے پھیپھڑوں سے بار بار پھسل رہی تھی۔

اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔

"آئی۔۔۔ آئی ایم سوری، لیکن میں اس بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ میں نہیں کرنا چاہتا۔ پلیز، خدا کا واسطہ آپ کو، مجھے آئندہ کال مت کیجئے گا۔" اسی کے ساتھ اس نے کال کاٹ دی۔

کچھ ثانیے خالی خالی نگاہوں سے فون کی سیاہ اسکرین کو تکنے کے بعد اس نے انگوٹھا بلند کرتے نمبر پر رکھا، پھر فیصلہ کن انداز میں بلاک کا آپشن دبا دیا۔ سکون اسے تب بھی میسر نہ ہوا۔ بار بار اس کال کا خیال، اس کا اثر، کسی زہر کی طرح اسے ڈس رہا تھا۔

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

خیالِ ثانی کے بغیر ہی اس نے فون کے کنارے بنی سم ٹرے کھسکا کر کھولی اور کپکپاتی انگلیوں سے چھوٹی سم باہر نکالی۔ اس نے اسے زمین پر پھینکا، اور پھر جوتے کی مدد سے پیر کے نیچے کچل دیا۔ سم کو اسفالٹ کی سڑک میں پیس کر وہ ایک بھاری سانس کے ساتھ پیچھے ہوا۔

ٹھہر کر دونوں آنکھیں بند کیں اور اطمینان قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن آنسو اس سے قبل ہی اس کی آنکھوں کے گوشے تر کر گئے تھے۔ منظر دھندلا رہا تھا، اور عینک کے لینس کے پیچھے بصارت سلگ رہی تھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے چشمے کھینچ کر اتارے، انگلیاں بالوں سے گزاریں اور بھوری زلفیں سدھاریں۔

ایک گہری سانس کے ساتھ اس نے خود کو استوار کیا اور نم، اندھیرا انکھوں سے سیاہ آسمان کو دیکھا۔
سیدھا ہوتے اس نے چشمے واپس چڑھائے، کوٹ کی سلوٹیں صاف کیں اور دوبارہ چلنے لگا۔
اسے نہیں معلوم تھا وہ کہاں جا رہا تھا، لیکن فرار یقینی تھا, کیونکہ برسوں بعد، ماضی کے جن اس سے آن چمٹے تھے۔

★★★

"آج تم اتنے چُپ چُپ ہو۔"
بیڈروم نیم سنہری روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ بیڈ سائیڈ لیمپ سے اٹھتی نرم، پیلی بتیاں سمندری نیلی اور سفید دیواروں پر نقشے کھینچ رہی تھیں۔ زمل اپنے تکیے کے ساتھ لیٹی تھی، ہاتھ میں ہارڈ کوور والا کوئی انگریزی ناول تھا، لیکن الفاظ پر آنکھیں صرف ادھ ادھوری چل رہی تھیں۔ روئی کا موٹا، گلابی رنگ کا کمبل اس کے سینے تک پھیلا تھا، لیکن اس کے نیچے بھی اس کے حاملہ بدن کا چڑھاؤ نمایاں تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنے پیٹ پر دھرا تھا اور انگوٹھا دھیرے دھیرے شرٹ کے کنارے چھیڑ رہا تھا۔ رات ساکن تھی، اور نیویارک شہر کھڑکی کے باہر پرنور۔
دو ہزار تیرہ میں مرتضٰی عباس سے شادی کے بعد، وہ دونوں ملائیشیا سے امریکہ شفٹ ہو گئے تھے۔ اس کا پروموشن نیویارک سٹی کے ہیڈ آفیس میں ہو گیا تھا، اور زمل بھی اکثر کاروبار ادھر سیٹ کر چکی تھی۔ پچھلے چند سال انھوں نے اپنی الگ دنیا بسانے میں وقف کر دیے تھے، ماضی کی کمیوں سے دور، مستقبل کے رنگوں کے نزدیک۔ اپنی پہلی بیوی رباب آدم اور بیٹی ادا مرتضٰی کی اموات کے بعد، مرتضٰی عباس کو زندگی پر دوسرا موقع چاہیے تھا، اور زمل اس کے ساتھ کے خاطر ہر موقع گنوا سکتی تھی۔
کمرے کی وسط میں مرتضٰی یہاں سے وہاں ٹہلتے اپنی شرٹ تہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے میکانکی انداز میں الماری کھولی اور اندر جما کر رکھی۔ اس کی ہر حرکت نپی تُلی تھی، جیسے خیالات کے بھنور میں پھنسا ہوا ہو۔ زمل کی

نگاہوں نے اس کے کندھوں کے تنے ہوئے عصاب بغور ملاحظہ کیے، اس کی آنکھوں کی ویرانی دیکھی، گویا وہ کسی اور ہی دنیا میں ہو۔

اس کے سوال پر وہ ٹھٹک کر رکا۔ مرتضٰی کی پشت اب بھی اس کے سامنے تھی، جو کتاب بند کر کے برابر ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

"نہیں تو۔" اس نے الماری کا پٹ بند کرتے کہا۔ "بس، تھک گیا ہوں۔ آج آؤٹ ڈور کام بہت تھا۔"

زمل کی آنکھیں سکڑ کر اس میں نصب ہوئیں۔ اس کے لہجے کی تنگی وہ بخوبی بھانپ چکی تھی۔ آٹھ سالوں میں وہ اپنے شوہر کو اتنا تو جان ہی چکی تھی کہ اس کے سچ جھوٹ پکڑ سکے۔

"مرتضٰی..." اس نے خاموشی سے بلایا۔ "میری طرف دیکھو۔"

دو پل کے لیے وہ ہچکچایا، انگلیاں ہینڈل پر مضبوطی سے لپٹیں۔ پھر، سستی سے چہرہ اس کی جانب کیا۔ آنکھوں میں گہرا خمار تھا۔ خاموش حرکات سے اس کے برابر آکر بیڈ پر نشست ہو گیا۔

"مجھے کال آئی تھی آج..." اس کی آنکھیں زمل سے دور تھیں۔ "ایک پروڈیوسر سے۔ وہ ایم ایچ تھری سیون زیرو پر ڈاکیومنٹری بنا رہے ہیں۔"

زمل کے دل کو ایک گانٹھ لگی۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھاتے مرتضٰی کا بازو چھوا، بولنے پر آمادہ کیا۔

"ظاہر ہے، میں نے نہ کہہ دیا۔" وہ ہڑبڑا کر جلدی سے گویا ہوا۔ "میں نے کہا کہ نہیں، اور یہ کہ مجھے دوبارہ کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سم بھی نکال دی اپنی۔ اسی لیے آج لائن نہیں لگی ہو گی جب تم کال کر رہی تھی۔" اس نے چہرہ جھکاتے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کیں۔ اب کہ آواز رندھی ہوئی تھی۔

"زمل، میں ان سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ سب، وہ سب۔۔۔ بہت خراب ہے۔ سارا ماضی، اتنے سارے سال، یہ کسی بلیک ہول سے کم نہیں ہیں۔ اگر میں نے آج انھیں خود کو واپس لے جانے دیا، تو میں کبھی باہر

نہیں آسکوں گا۔ میڈیا، سوالات، وہ گلٹ۔۔۔ وہ سب واپس آجائے گا، زمل۔ میں نہیں کر سکتا، میں نہیں۔۔۔"

اس کے الفاظ کسی جانفشانی کرتے ڈیم کی طرح ابل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہڑبڑاہٹ میں لبوں سے آزاد ہو رہے تھے۔

"میں تمھیں وہاں نہیں لے جا سکتا، زمل۔ وہ سب سیاہ ہے، وہاں صرف اندھیرا ہے۔ ہم نے یہاں کچھ اچھا تعمیر کیا ہے، یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم خوش ہیں۔ ہم اسٹیبل ہیں۔ میں انھیں یہ خراب نہیں کرنے دوں گا۔ میں اپنی فیملی نہیں کھوؤں گا۔ ناٹ اگین۔"

آخر میں اس نے تمنائی آنکھوں سے زمل کی جانب دیکھا۔ اس کا جواب چاہا، اس کا حوصلہ چاہا۔ لیکن نرمی اور اطمینان کے بجائے، آج زمل کے چہرے پر سنجیدگی تھی، اور آنکھوں میں رنج۔ مرتضٰی کے دل کو گہری چوٹ پہنچی۔

"مرتضٰی۔۔۔" اس نے آہستگی سے اسے پکارا۔ "پچھلے آٹھ سالوں میں ہمارے تین مس کیرج (miscarriage) ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ چوتھی بار ہے۔" اس کا نرم، سپید ہاتھ مرتضٰی کی انگلیوں پر ٹھہرا۔ اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ آپس میں پھنسا لیے۔ "مجھے معلوم ہے، تم رانج کا گلٹ لے کر زندہ ہو۔ مجھے معلوم ہے، مرتضٰی، تم اس بوجھ تلے ہر دن پستے ہو۔ لیکن کیا تم نے کبھی یہ سوچا۔۔۔ کہ ہو سکتا ہے یہ مغفرت کا موقع ہو؟"

گہری بھوری آنکھوں سے وہ اسے دیکھتا رہا۔ سانس کہیں دور اٹکی تھی۔ "کیا کہنا چاہتی ہو، زمل؟"

ان کی نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا، اور بن مدعو آنسو زمل کی آنکھوں کی نچلی پٹی پر امڈ آئے۔ "تم نے ایک معصوم پر الزام لگایا تھا، مرتضٰی۔ تم نے گمان کر لیا تھا کہ رانج نے رباب کو مارا ہے، تمھاری بیوی کو مارا ہے، تمھاری بیٹی کو مارا ہے۔ تم نے میڈیا کے ساتھ مل کر کیا کچھ نہیں کیا تھا، مرتضٰی۔ لیکن وہ بے گناہ تھا، وہ وکٹم تھا۔

اور اس سے پہلے کہ تم چیزیں درست کر پاتے، معذرت کر پاتے، وہ چلا گیا تھا۔ تم سالوں سال شرمندگی میں جکڑے رہے اور وہ جہنم میں۔ اب وہ بری ہو گیا ہے، لیکن تمھارا گلٹ کم نہیں ہوتا۔" زمل نے ایک ہاتھ سے گال پر پھسلتا آنسو پونچھا۔ "اللہ جانتا ہے اس نے کیا کیا سہا ہو گا۔ میڈیا کی بھگدڑ، پبلک ججمنٹ۔۔۔ اس سب سے ہٹ کر اس نے کیا کیا کھویا ہو گا۔ شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ ہمیں سزا دے رہے ہیں۔ شاید، اسی لیے انھوں نے اب تک ہماری گود خالی رکھی ہے۔"

مرتضٰی نے سر یہاں وہاں ہلایا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ "نہیں، زمل۔ پلیز۔ ایسے مت سوچو، ایسا-" زمل نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر رکھتے نرمی سے اسے اپنی جانب موڑا۔ "کیا تم نے ایسے سوچا ہے، مرتضٰی؟ ہمیں بھی تو کچھ کھونا تھا ناں۔ اتنا کچھ غلط کر کے ہم کیسے اپنا ہیپلی ایور آفٹر (happily ever after) جی سکتے ہیں؟" اس کی آواز چیخ رہی تھی۔ "شاید یہی خدا کا طریقہ ہے۔۔۔ تمھیں دوسرا موقعہ دینے کا۔ چیزیں صحیح کرنے کا، اپنے ضمیر کو آزاد کرنے کا، سچ بولنے کا۔ ہمارے لیے، اس بچے کے لیے۔"

اس کے استقلال میں لغزش پیدا ہوئی، زمل کے کہے الفاظ کا وزن اس کے کانپتے دل پر پتھروں کی طرح برسا تھا۔ مرتضٰی کی آنکھیں نم ہوئیں، سالوں کی تکلیف، رنج، پچھتاوا آنسوؤں کی صورت اس کے بدن سے آزاد ہوا۔ زمل نے گیلی پلکیں لیے آگے جھک کر اسے سہارا دیا۔ وہ منہ جھکائے اس کے بازو پر سر رکھے رو رہا تھا۔

زمل نے اپنی پیشانی اس سے ٹکائی۔ "مرتضٰی، میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تم میرا گھر، میرا سکون، میرا سب کچھ ہو۔ اور مجھے پتا ہے یہ تمھیں دکھ دے رہا تھا، یہ سب تمھیں چیر رہا ہے۔ لیکن شاید، شاید، یہی راستہ ہمیں چننا ہے۔ تمھیں اسی پر چلنا ہے۔ صرف رابح کے لیے نہیں، بلکہ ہمارے خاطر، ہماری بچی کے خاطر۔"

Safar-e-Adab BEING THE STRING OF YOUR KITE

مرتضٰی نے اپنی آنکھیں میچ لیں، گرم، تپتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے لڑھک رہے تھے۔ سینے میں مدفن سالوں پرانے درد سے جدائی کا وقت آ چکا تھا۔ اس نے زمل کا ہاتھ تھاما، گرفت آہنی تھی، جیسے اس لمحے میں مقیم رہنے کے لیے اس کا لمس ضروری تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے، زمل۔" اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے اعتراف کیا۔ "مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر۔۔۔ اگر سب پہلے جیسا ہو گیا تو؟ اگر میں نے تمھیں بھی کھو دیا تو؟"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے نرمی سے کہا، چہرہ جھکاتے مرتضٰی کی پیشانی چومی۔ "میں ادھر ہی ہوں، ادھر ہی رہوں گی۔ جو بھی ہوا، ہم ساتھ جھیل لیں گے۔ میں کبھی تم سے دور نہیں جاؤں گی۔"

ایک لمبے عرصے کے لیے وہ دونوں خاموشی میں بیٹھے رہے۔ آنسو ان کے درمیان مسلسل پھسل رہے تھے۔ مرتضٰی اس کے کندھے پر سر رکھے تھا اور زمل نرمی سے اس کی لٹیں سلجھا رہا تھی۔ کمرے میں ان کی سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔

کافی دیر بعد، مرتضٰی نے ٹھوڑی اوپر کی، خمار آلود آنکھوں سے زمل کو ڈھونڈا۔ "اوکے..." آواز دھیمی تھی، تقریباً ناقابلِ فہم۔ "میں کروں گا۔ تمھارے خاطر، ہماری بیٹی کے خاطر۔۔۔ رابح کے خاطر۔"

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

زمل آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی اور اس کے تر چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیا۔ آگے جھکتے اس نے نرمی سے اس کے گال پر بوسہ دیا۔ پھر، پیشانی اس سے ٹکاتے، وہ دونوں بند آنکھوں سے کئی ثانیے، کئی گھنٹے، شاید کئی برس ایسے ہی بیٹھے رہے۔

★★★

کچن ٹیبل پر تنہا بیٹھا مرتضی ہاتھ میں تھامے فون کو غائب دماغی سے تک رہا تھا۔ اسکرین نیلی روشنی میں جگمگا رہی تھی اور سامنے پروڈیوسر کا نمبر کھلا تھا جس سے کل اسے اپنے فون پر رابطہ کیا گیا تھا۔ اس کی سم تو غارت ہو گئی تھی، اسی لیے زمل نے اسے اپنا فون دیا تھا۔

اس کی انگلی کال کے بٹن سے دو انچ اوپر ہوا میں لہک رہی تھی۔ شہری دوادش کھڑکی سے باہر بے رج کی سڑکوں پر رواں تھی، زور آور تھی۔ گہری بھوری لٹوں کو بن میں سمیٹتے زمل کچن کی چوکھٹ پر نمودار ہوئی، بھاری بدن اور صبح کی چمکتی تازگی میں اس کی رنگت سپید و گلابی ٹمٹمار ہی تھی۔

ایک نظر اپنی بیوی کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد، مرتضی نے چہرہ جھکاتے آنکھیں موند لیں۔ زمل ادھر ہی ٹک کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ آخری قدم پر صرف اس کا انتظار کر سکتی تھی، کیونکہ جگنگ مرتضی کی تھی۔

دل میں اٹھتی بے ربط دھڑکنوں کو آخر کار فراموش کرتے اس نے زبان خشک لبوں پر پھیری اور کال کا بٹن دبایا۔ فون کی اسکرین اس کے کان کی جلد کے برعکس ٹھنڈی تھی۔ دوسری جانب گھنٹی بج رہی تھی۔

"ہیلو؟ جی، میں مرتضی عباس۔" اس کی آواز ٹھہری ہوئی، مگر خاموش تھی۔ الفاظ ادا کرنے سے پہلے اس نے ایک نگاہ زمل پر ڈالی پھر اپنی تہی ہتھیلی پر۔ "میں تیار ہوں۔"

آنتوں میں کہیں پتھریلا اور کثیف پھنس گیا تھا۔ اس نے اعصاب پر چھاتی بے آرامی جھٹکنا چاہی اور دوسری طرف سے آتے احکام پر غور فرمایا۔

"جی، مناسب۔ میں کل آجاوں گا۔ آپ لوکیشن ٹیکسٹ کر دیجیے گا۔"

اس نے کال ختم کی ہی تھی کہ یاسمین کی دھیمی مہک اس کے چوگرد پھیل گئی۔ زمل نے اپنے نرم بازو اس کی کمر کے گرد پھیلائے اور چہرہ اس کے کندھے سے ٹکایا۔ اس نے رخ موڑا، تو وہ گردن اٹھائے، مدھم گلابی ہونٹوں پر ملائم سی مسکراہٹ سجائے اسے تک رہی تھی۔ آنکھوں میں تشکر تھا، امید تھی۔ اس نے سستی سے مرتضی کا کندھا چوما، چہرہ واپس وہیں رکھ دیا۔

"مجھے تم پر یقین تھا۔" وہ خاموشی سے کہہ رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔ بھوری آنکھیں اوپر کرتے اس نے بہت مان سے اسے دیکھا۔ "شکریہ اس سب کے لیے۔ شکریہ۔۔۔ ہمارے لیے۔"

مرتضیٰ نے اپنا ہاتھ اس پر سجاتے نرمی سے دبایا۔ اپنی ٹھوڑی اس کی پیشانی پر رکھتے اندر اندر ہی پلتے خوف سے بری ہونا چاہا۔ وہ جبرا مسکرا دیا، البتہ مسکان اس کے آنکھوں کے گوشوں سے دور رہی۔ آہستگی سے زمل کا گال سہلایا۔

"شاید، وقت آ گیا ہے۔"

زمل سر ہلا کر اسے لپٹی رہی اور وہ گلے میں ابھرتی خشکی کو پیتے اس کے بال سہلاتا رہا، نگاہیں حال سے دور، کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

★★★

پارکنگ لاٹ میں داخل ہوتے خنک ہوا اس کی جلد سے ٹکرائی۔ بالائے سر نصب انڈر گراؤنڈ سبز بتیاں مرتضیٰ کے چہرے کی لکیریں نمایاں کر رہی تھیں۔ اس کے اوپر شہر نیویارک رواں تھا، اپنے شور و غل سمیت، لیکن یہاں صرف خاموشی تھی۔ کوسوں تک پھیلی بے زبانی۔

اس کی قدموں کی چاپ ساکت کمرے میں ہتھوڑوں کی مانند گونج رہی تھی، جوتوں کے نیچے پارکنگ لاٹ کی تر اور ٹھنڈی زمین تھی۔ اپنی گاڑی کے جانب بڑھتے مرتضیٰ کے سر کے اوپر سبز بتیاں جل بجھ ہو رہی تھیں۔ برسوں کی عادت کے احترام میں اس نے بے خودی میں جیکٹ کھینچ کر سختی سے بدن کے گرد لپیٹی۔ سالوں سے خود کو روپوش کرنے کی کوشش، ماضی سے الگ ہو جانے کی خواہش نے یہ عادت اس کے شعور میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

سات سالوں تک اس نے گمنام کی سی زندگی گزاری تھی۔ دنیا سے دور، میڈیا سے دور۔ وہ زمل کو لے کر الگ ملک ہی نہیں، ایک الگ جہاں بسانا چاہتا تھا، جو پچھتاوے، رنجشوں اور غم سے پاک ہو۔ وہ ایک واحد راستہ تھا ماضی کے جنوں کے تعاقب سے خود کو باز رکھنے کا۔ لیکن، اب ان جنوں کو چھیڑ دیا گیا تھا۔

پروڈیوسر کی کال نے اس کے اندر اور باہر ہر فیصلے کو تبدیل کر دیا تھا، اس سے وہ مانگ لیا تھا جسے وہ ناممکن گمان کرتا تھا۔ ایک اعتراف، ایک قبولیت۔

ان قبروں کا راستہ جن سے وہ منہ موڑ چکا تھا، اس مٹی کی کھوج جسے اس نے خود اچھالا تھا، اس سوچ کے ساتھ کہ شاید، یہ سب مرتضیٰ عباس کو بھی اس کے گناہوں سے بری کر دے۔

شاید وہ کبھی نہ مانتا، شاید وہ کبھی اس خیال کو دم بھر کر ادراک بھی نہ کرتا، اگر زمل اسے نہ سنبھالتی، اگر وہ اسے نہ بہلاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ مرتضیٰ یہ قدم لے، اپنے لیے، اس کے لیے، ان کے مشترکہ مستقبل کے لیے۔ وہ بہت بھاگ چکا تھا، اب اسے قیام چاہیے تھا۔ وہ زمل کا مقروض تھا۔ ممکن ہو، اپنا بھی۔

لیکن اب، چمکتی دمکتی گاڑیوں کی قطاروں کے درمیان اپنی وولکس ویگن جیٹا کی جانب قدم بڑھاتے، وہ اپنے فیصلے کو سوچ رہا تھا۔ بھوری آنکھیں سیاہ فریمز تلے خیال سے بھاری تھیں۔ دماغ کی راہیں بے چینی اور قرار کے درمیان کھلی تھیں جب اسے اپنی گردن کی پشت پر ایک خلش آمیز احساس ابھرتا ہوا محسوس ہوا۔

مرتضیٰ کی رفتار غیبی طور پر آہستہ ہوئی، دل کی دھڑکنیں کئی میل ایک ثانیے کے حساب سے طے کر گئیں۔ اس کی باہوں پر پھیلے بال خودکارانہ طور پر کھڑے ہوئے۔ پارکنگ ایریا خاموش تھا، بے حرکت، بے سخن۔ نہایت بے سخن۔ اس نے نگاہوں کا زاویہ ترچھا کیا، سانس حلق کے کسی حصے میں ٹھہر سی گئی۔ اس نے دور تک پھیلے پارکنگ لاٹ کا جائزہ لیا، لیکن بھوری نگاہوں کے حصار میں صرف گاڑیاں اور بے ربط، اندھیر سائے تھے۔ دھیمی سبز روشنیاں منظر مزید پر اسرار تشکیل دے رہی تھیں۔

اس نے چلنا شروع کیا، اس بار رفتار متوازن تھی۔

لیکن احساس اسے نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ اعصاب سے چمٹا تھا اور حواسوں تک اتر چکا تھا۔ ہوا کا وزن بھاری تھا، کچھ غلط تھا۔ پھیپھڑوں میں ایک ایک سانس ثابت لوہے کے ستونوں کی مانند تھی۔ مرتضیٰ نے اپنی رفتار

بڑھادی، جوتوں نے ٹک ٹک کی آواز سے ساتھ دیا۔ جوں ہی اس کا ہاتھ گاڑی کے دروازے پر جا ٹھہرا، اس کی سماعت میں پہلی گونج واہوئی۔ عقب میں اٹھتی ایک خاموش آواز۔ قدموں کی چاپ کے لیے وہ آواز بہت نرم تھی، گویا کپڑے ایک دوسرے میں سرسرا رہے ہوں۔ شاید، اسے سرگوشی کہنا بھی مناسب نہ ہو، لیکن وہ کافی تھی۔

مرتضیٰ کے پاؤں الٹے گھومے، آنکھوں نے گھنے سائے چھاننے چاہے، اور تب ہی وہ اس کی نظروں میں بس گیا۔

سیاہی میں ڈوبا سانچہ۔ نامعلوم شخص کی کیپ اس کے چہرے پر خمیدہ تھی، اور سیاہ جیکٹ پس منظر میں دھندلا رہی تھی، گویا وہ بھی اسی اندھیرے کا حصّہ ہو۔ اس کے بوٹس گیلی زمین پر بغیر تکرار سفر کر رہے تھے۔ خاموش چاپ، خاموش حرکات۔ چھت پر نصب سبز بتیاں ایک بار پھر پھڑ پھڑائیں، اور اس بار روشنی کی بھیگی ہوئی، دھیمی پٹی میں بندوق کا چمکتا ہوا بیرل مرتضیٰ نے درسا لیا تھا۔

اس کا دل سینے میں لرز رہا تھا، چنگھاڑ رہا تھا، لیکن وقت یکایک اپنی گنتی فراموش کر بیٹھا تھا۔ ہر لمحہ بہت لمبا تھا، ہر گھڑی ساکت۔

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

فرار کا وقت میسر ہی نہیں تھا، جواب کا وقت اس سے لوٹ لیا گیا تھا۔

نامعلوم شخص کی حرکات میں ٹھہراؤ تھا، باریکی تھی۔ اس کی ہر ادا پانی کی سی بہتی تھی، تنکا برابر سانس بھی نپی تُلی تھی۔ رواں، گویا وہ سو سے زائد بار اس لمحے کی نمائش کر چکا تھا۔ جیسے وہ سب اس کے لیے معمول ہو۔ دستانوں میں قید تنہا ہاتھ ہوا میں لبریز ہوا، بندوق کی سیاہ چمک اسے فاصلے سے بھی دکھ گئی۔

گرفت مضبوط تھی، بے لچک۔

گولی کی چیرتی ہوئی آواز ان کے درمیان تیر گئی۔ بے سخنی کے راج پر حملہ زور آور تھا۔ مرتضیٰ نے تصادم حقیقت کے نزول سے قبل محسوس کیا۔ نوک دار، سفیدی میں گھلی جلن اس کی کھال سے گوشت تک سال

کر گئی تھی۔ سینے میں آگ کھول رہی تھی، جو ہر بیتے لمحے کے ساتھ اس کے دل پر قابض تھی۔ گولی کا زور اس کے قدم پھیر گیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا اور جسم مرجھاتے ہوئے اپنے آپ میں تہ ہو گیا۔ اس کی پنڈلی پنڈلی پگھل رہی تھی، سانسیں ادھڑی ہوئی تھیں۔

دنیا ایک پائے سے اپاہج ہو چلی تھی، سبز روشنیوں میں نہایا خنک فرش اب اس کے نیچے تھا۔ مرتضیٰ عباس اپنے ہی خون کے دریا میں لیٹا تھا۔

اس کی بصارت دھندلا گئی، اندھیر نیون بتیوں میں ٹمٹماتی چھت بھی کچھ کرنے کے لائق نہیں تھی۔ اس کا دل نہایت کمزوری سے دھڑک رہا تھا، سینہ بند تھا۔

اس کا دماغ کڑیاں ملانے کی کوشش میں تھا، لیکن اس لمحے، اس تصادم کی چبھن ہی اتنی تھی کہ اس کے اعضاء دھیرے دھیرے ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ حیرت اس کے کھلے زخموں میں جگہ بنا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پلکیں جھپکیں، دو بار، اور پھر گولی کی آواز ایک اور بار گرج اٹھی۔

اس مرتبہ ضرب حتمی تھا۔ بے باق۔

مزل سے چھوٹی سنہرے رنگ کی گیند ہر پُر معنی خیال کو گانستے ہوئے اس کے دماغ کے آر پار ہو چکی تھی۔

اس کا جسم سر تا پا جھنجھوڑ گیا، اور پھر سکوت اس کے روح و بدن پر غالب آ گیا۔

سیاہی میں مستعد وجود اس کے ٹھہرے ہوئے جسم کے برابر استادہ قائم رہا۔ مطمئن، آرام دہ۔ اس کے سیاہ بوٹس خون کی گاڑھی ندی میں نزاکت سے شامل ہوئے۔ سرخ مادہ پھیل کر وسیع ہوا اور پارکنگ ایریا کے فرش پر روشنائی کی مانند ترقی پا گیا۔ اس نے بندوق اپنی جیکٹ کی تہوں کے درمیان واپس سجائی، حرکت معمولی اور راحت بخش تھی۔

ایک لمبے لمحے کے لیے وہ ادھر ہی قائم رہا، گویا اپنے کام کی تصدیق ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کی ستھرائی پر آپ کو توثیق پیش کر رہا ہو۔ سبز روشنی مرتضیٰ کے سنسان بدن پر نقشے کھینچ رہی تھی۔ پس، ایک غیر مسموع سانس کے ساتھ اس نے بیس بال کیپ کے نیچے اٹکا ائیر پیس چھوا۔ دھیمی سرسراہٹ، مکمل بے تعصب۔

"Target eliminated."

اور جواب کی راہ دیکھے بغیر ہی، وہ خود کو حال سے جدا کر چکا تھا۔ نامعلوم شخص اندھیرے عکس میں جذب ہو گیا تھا، قدموں کی بے ضرر سی چاپ بھی خاموشی کی نذر ہوئی۔ اس کے عقب میں نم فرش اور ایک ایسے مرد کے سوالات اپنی گونج چھوڑ گئے تھے، جسے سچ سے بھٹکانے کے خاطر بے زبانی کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا۔

پارکنگ لاٹ کی دھیمی سبز روشنی میں مرتضیٰ عباس کا خون چکنے فرش پر رواں تھا، ایک ایسی گتھی کا آخری سراغ جسے دنیا شاید کبھی مکمل نہ کھوج پائے۔

ختم شُد

(ھبوط کے سفر میں جڑے رہنے کا شکریہ۔)

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

Click here

safareadab.com

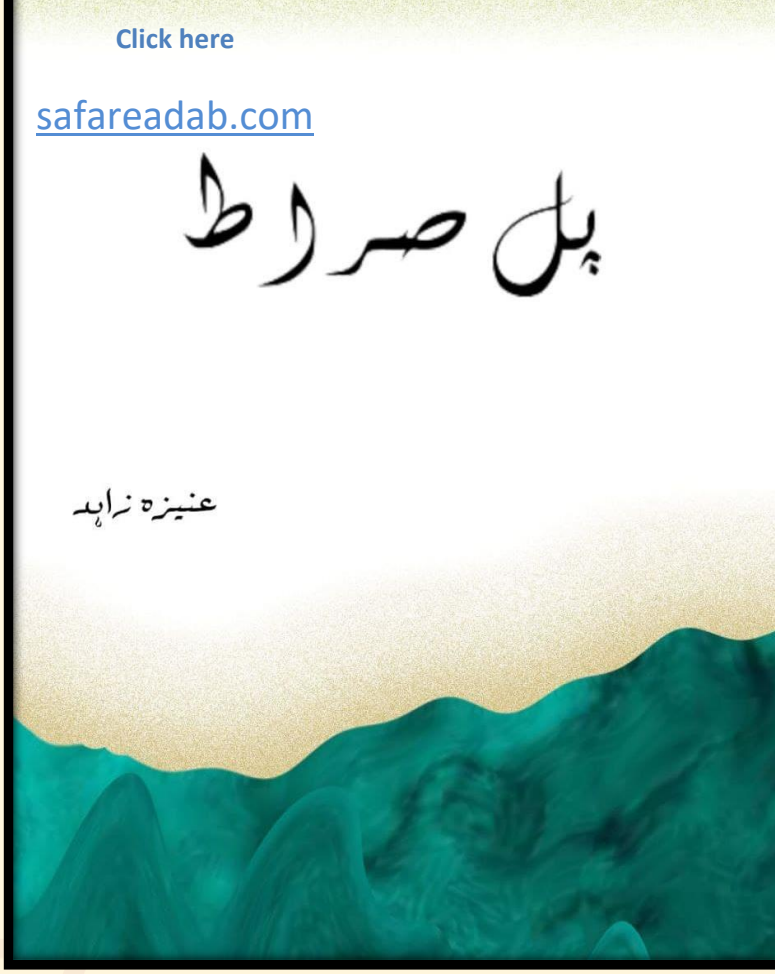

"تم مجھے ایک برا انسان سمجھتی ہو نا۔ مجھے پہچاننے میں تم سے ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میں صرف برا نہیں، ایک بدترین انسان ہوں۔" وہ گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔ شراب گلاس سے باہر گرنے لگی تھی پر اسے تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے وہ گلاس اٹھایا اور اسکی طرف دیکھا۔

وہ خوف سے اپنی جگہ پر سمٹی۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ اس وقت تمہارا کوئی موڈ نہیں ہے مجھ جیسے شرابی کے منہ لگنے کا؟" وہ خود سے سوال کرتا، خود سے جواب دیتا اس کے قریب بیٹھا۔ "اور یہ کہ میں نشئی ہوں؟ آج تمہیں بھی شراب کی لذت چکھاؤں گا۔" اس نے گلاس منال کے منہ کے قریب کیا۔

☆☆☆

'کبھی تو تو بھی محبت کرے گا۔'

فاران احمد نے محبت کی تھی!

'تو بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہے گا۔۔'

اس نے بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور پھر۔۔ پھر وہ تجھے چھوڑ جائے گی۔'

اور پھر وہ اسے توڑ گئی۔

'پھر میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور کہوں گا کہ دل پہ مت لے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا، کوئی اور آ جائے گی۔'

اسکے جانے کے بعد کوئی نہیں آیا۔ اس نے آنے ہی نہ دیا۔

Click here

safareadab.com

"یہاں دستخط کرو غازہ ! "کاغذ غازہ کے سامنے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو غازہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے اس اجنبی شخص کو دیکھا جس سے ابھی وہ چند گھنٹوں پہلے ملی تھی۔ ان چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس شخص کو اس کا مختار بنا ڈالا تھا۔ زندگی میں پہلی بار قلم پکڑتے ہوئے غازہ کے ہاتھ بُری طرح کانپے تھے۔ وہ تو باآسانی قلم تھام کر شفاف کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر بہت سارے خاکے بنا لیا کرتی تھی، کچھ دھندلے ہوتے تو کچھ میں پہلی ہی جست میں جان موجود ہوتی۔

"تم رشتے کھونے سے ڈرتی ہو غازہ ! "سبیکہ کا چند روز قبل کہا گیا جملہ کان کے پردے پر ابھرا تھا۔

"سچ کہا تھا تم نے میں رشتے کھونے سے ڈرتی ہوں سبیکہ ! اور یہ نیا ادھورا رشتہ بھی شاید میں کھونے کے لیے ہی بنا رہی ہوں۔" دل میں اس کے کہے کا جواب دے کر اس نے کاغذ پر قلم گھسیٹا تھا۔ عجیب بات تھی وہ ایک کاروباری شادی کے لیے دلہن بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری زندگی برباد کر کے تم یہاں سکون سے سو رہی ہو۔ شام سے مینو مجھے فون کر رہی ہے اور میں اس کا فون نہیں اٹھا رہا جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں اس سے بے وفائی کرنے پر بے حد شرمندہ ہوں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو چاہا ہے اور تم زبردستی ایک بزنس ڈیل کی طرح میرے سر پر آ گئی ہو۔" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا اپنے اندر کا سارا انتشار اس پر انڈیل رہا تھا۔ غازہ خاموشی سے بس اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے واقعی ہی اس شخص پر ترس آیا تھا جس کی محبت آباد ہونے سے پہلے ہی اس کے باپ نے اجاڑ دی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"میں بہت تلخ ہو چکی ہوں کلیج ! جانتے ہو کیوں؟" اس نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انتہائی آہستگی سے کہا تھا۔

"کیونکہ اس دنیا اور معاشرے کی سفاکی آپ کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اول تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے کمیٹڈ ہو اور بالفرض اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو تب بھی میں وہاں کچھ نہیں کر پاتی۔ میں یہ کاغذی تعلق تب بھی نہیں روک سکتی تھی۔ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں کلیج ارسلان ! بلکہ اپنے مجرم تم خود ہو۔ مینو کے مجرم تم ہو جو محض اپنے باپ کی لالچ کے ہاتھوں اپنی محبت پر ایک کاغذی سوتن لے آیا۔" وہ سینے پر بازو لپیٹے انتہائی تلخی سے کہہ رہی تھی جبکہ کلیج بس حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو میرے لیے اب محبت کیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو بمشکل روکے ہوئے تھی۔ "م جس سے (ال) مالک شروع ہوتا ہے، ح جس سے (ال) حلیم شروع ہوتا ہے، ب جس سے (ال) باری اور ت سے تمنا (وہ جو اللہ سے کی جاتی ہے) شروع ہوتی ہے۔۔ بس یہی ہے میرے نزدیک محبت!" وہ ضبط کی انتہا پہ تھی۔ "ایک وقت تھا تم میری تمنا تھے مگر اب صرف ایک ہی تمنا ہے میری۔۔۔ اللہ۔۔۔ بس اللہ۔۔۔!" وہ رکی اور گہرا سانس لے کر بولی۔ "ایک بار بھابھی نے کہا تھا کہ ایک بار جو چڑھ جائے رنگِ حبِّ الٰہی تو اترتا نہیں۔۔۔! ہاں وہی رنگ چڑھ گیا ہے مجھے۔" وہ زید کی خاموشی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اب ایک آخری جملہ رہ گیا تھا کہنے کو۔ وہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی کہ زید بولا۔ "تمنا تمہیں نہیں بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا تھا، اور تمہارا ہی رہوں گا۔ شوہر کی تمنا بھی ہوتی ہے بھلا کسی کو۔" وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوہر کے غیر محرم ہونے میں بس ایک دستخط کی دیر ہوتی ہے۔" وہ سنگدل ہو چکی تھی۔ دوسری جانب زید کو دھچکا لگا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سننے میں آیا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" اسے جھٹکا لگا کیا وہ جان گئے تھے۔ وہ ذرا بوکھلا گئی مگر جھوٹ وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"جی، مگر آپ سے کس نے کہا؟" اس نے لکھ ہی دیا۔

"وہ اہم نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" وہ کچھ مزید بوکھلائی۔ اب کیا کرے؟

"میں نہیں بتا رہی۔ ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ میں ایسے تو نام نہیں بتا سکتی نا؟" اسے یہی جواب ٹھیک لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ یہ تاثر دے گی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس نے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ اب جھوٹ ہے تو جھوٹ سہی۔ شرم سے تو بچ جائے گی نا۔

"ویسے تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔" وہ گھبراہٹ میں پگھل رہی تھی جلتی موم کی طرح۔

اچھا اتنے پُر یقین ہیں تو بتائیں نام؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ٹائپ کیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ہی پسند کرتی ہو، آئمہ۔" وہ دم بخود رہ گئی۔ آخر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ ور اگر وہ جانتے تھے تو کب سے جانتے تھے؟ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

"اگر تمہاری مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں موقع ملتا تو کیا تم حسن خان کو اپنا لیتی؟"

رقیہ الجھ سی گئی۔ "میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔"

وارث جان نے بہت سوچنے کے بعد سوال کا انداز بدل دیا۔ "تمہیں مجھ میں یا حسن خان میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو کسے چنو گی؟"

رقیہ وارث کے اس سوال پر ناراض ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔ یہ کیسا عجیب سا سوال ہے۔۔ آپ شوہر ہیں میرے اور وہ کوئی نہیں میرا۔ بس ساتھ پڑھتا ہے اور اچھا کلاس فیلو ہے۔ اس کا آپ سے کیا مقابلہ بھلا!!"

وارث جان ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ "رقیہ میں صرف اور صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حسن خان کے ساتھ کو پا کر خوش رہ سکتی ہو تو۔۔۔" اس کے باقی ماندہ الفاظ اندر کہیں دب کر رہ گئے تھے۔ رقیہ جو وارث جان سے کبھی اونچی آواز میں بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وارث جان کے گال پر زوردار تھپڑ مار دیا۔۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیسے اس کا ہاتھ وارث پر اٹھ گیا۔۔

☆☆☆

"امبر تم نے کہیں رقیہ کو دیکھا ہے۔ مجھے گیٹ سے پتا چلا کہ رقیہ آ چکی ہے۔" رقیہ کی حسن کی طرف بیک تھی۔ رقیہ مسکراتے ہوئے پلٹی اور حسن خان وہیں دل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ "اف۔۔ کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔" اس سے پہلے کہ حسن خان مزید کچھ اور کہتا رقیہ اس کی طرف بڑھی۔ حسن خان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ آج وہ رقیہ کو پا لینے کے جنون سے آیا ہے۔ حسن خان کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہوں نے رقیہ کے لیے تعریفی جملے کچھ اس طرح کہے۔ "بہت خوبصورت ہو تم اور آج تو بہت زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ جانتی ہو آج حسن مجھے کیوں لایا ہے اپنے ساتھ؟؟" ابھی وہ مزید کچھ کہتیں کہ رقیہ نے مسکرا کر حسن کو مخاطب کیا۔

"حسن ان سے ملو میرے ہسبنڈ۔ سردار وارث جان۔" حسن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں وہ بے اختیار بولا "کیا؟؟ کیا کہا ہے تم نے۔۔۔؟؟ کون ہے یہ؟؟۔۔۔ مطلب تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے ان کا؟؟؟"

ناول محبت بھیک ہے شاید کی ایک جھلک

"تم۔۔ یہاں؟ اس وقت؟ کیسے آئی ہو یہاں؟ اور کیوں؟ آج تو تمہاری مہندی۔۔۔" اسکے الفاظ ادھورے رہ گئے جب اس نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"سوال کرنے کا حق آپ کھو چکے ہیں پروفیسر سجیل علی صاحب۔۔۔" اسکے لہجے میں طنز صاف واضح تھا۔

دونوں کاریڈور میں کھڑے الجھ رہے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے گویا پھر سوال کیا تو وہ طنزیہ مسکرائی۔

"کہہ چکی ہوں آپ سے۔۔ سوال کرنے کا حق کھو چکے ہیں آپ۔۔ سوال تو مجھے کرنا ہے آپ سے۔۔ کیونکہ بھیک تو مجھے چاہیئے آپ سے۔۔ محبت کی بھیک۔۔" اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

سجیل نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روکا۔

"بس۔۔ بہت ہو گیا کھیل تماشا۔۔ بہت ہو گیا ڈرامہ۔۔ اب کیا آپ اپنی اداکاری سے باہر نکل آئیں

گے ؟؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا تو اسے مزید تشویش ہوئی۔

"سب جانتی ہوں میں۔۔ سب۔۔" وہ اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ تو وہ مزید گھبرا سا گیا۔

"جنت۔۔ گھر جاؤ واپس۔۔ پلیز۔۔ آخر اس وقت تم۔۔۔"

اس کے سوال پہ سوال کرنے کی عادت پہ آخر وہ زچ ہو کر اہم بات پہ آئی۔

"آپ ہوتے کون ہیں؟ اکیلے فیصلہ لینے والے؟ یہ محبت تو ہماری محبت ہے نا؟ تو پھر آپ نے کیسے؟؟" جس دکھ اور اذیت سے وہ بول رہی تھی، سجیل کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"جنت۔۔ پلیز۔۔ تم نہیں جانتی کہ میری کیا مجبوری۔۔" اس نے بولنا چاہا لیکن اس نے اسکی بات کاٹ دی۔

"مجبوری؟؟ اسی مجبوری کا تو میں نے سوچا تھا۔۔ تو پھر کیوں کہا کہ آپ مجھ سے محبت کا اظہار سننا چاہتے ہیں؟ کیوں مجھے امیدیں دلاتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا جنت۔۔ مجھ پہ بھروسہ رکھو جنت۔ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔۔ کیوں؟؟ آخر کیوں؟؟ دور تھی نا آپ سے؟ تو کیوں مجھے اپنے قریب کیا۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ بے بسی سے اسے سنبھالنے سے قاصر رہا۔

"خدا کے لیئے۔۔ مجھے چھوڑیں نہیں؟ خدا کے لیئے؟؟" اب کی بار اس نے کسی فقیر کی طرح اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تو اسکی روح کانپ اٹھی۔

"جنت۔۔ یہ کیا کر رہی ہو تم؟؟" اس نے اسکے جڑے ہاتھوں کو پکڑا۔

"شاید اسی سے آپکا دل پگھل جائے؟ میرے بس میں آپ کے بناء رہنا نہیں ہے۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھ رہے؟ دیکھیں۔۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔۔ میری خوشی کو ضرور اہمیت دیں گے۔۔ آپ ایک مرتبہ میرے ساتھ چلیں تو؟؟" اس نے اسکا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور اسے اپنے ساتھ لے کے جانے لگی۔

وہ اسکا ہاتھ پکڑے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے ٹی وی لاؤنج میں آئی ہی تھی کہ اس نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

Sabar-e-Addy
BEING THE STRING OF YOUR KITE

"یہ سب بچوں کا کھیل لگتا ہے تمہیں؟؟ کہانا۔۔ نہیں ممکن یہ۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔" وہ اس پہ جھنجھلایا تو وہ سہم کر رہ گئی۔

اسکی حالت پہ سجیل کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ لیکن اس نے اسے ذرا برابر بھی اپنی حالت محسوس ہونے نہ دی۔

بادل پھر سے گرجا لیکن دونوں کو اسکی پرواہ آخر کہاں تھی؟

"اگر یہ ممکن نہیں تو میرا یہاں سے جانا بھی ممکن نہیں۔۔ آپ کو لیئے بناء میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ سمجھے آپ۔۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"فائن۔۔ تو محبت چاہیئے نا تمہیں؟ تو ٹھیک ہے۔۔ کرو اپنے گھر والوں سے بغاوت۔۔ قسم ہے مجھے اسی وقت تم سے نکاح کروں گا۔۔" اسکی شرط سنتے ہی اسکی اوسان خطا ہو گئے۔

مکمل ناول فری میں پڑھنے کے لیے یہاں کلک کریں۔

safareadab.com

Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

سفر ادب کی جانب سے ناولوں کی پی ڈی ایف کاپی کو ہر غلطی سے ماورا بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کسی بھی طرح کی غلطی پائی جانے پر اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔ ہماری ٹیم کے تیار شدہ پی ڈی ایف کے تمام جملہ حقوق سفر ادب کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ کسی ادارے یا شخص کی جانب سے ہمارے کام کو اپنے آفیشل استعمال میں لانے کی کوشش کو غیر قانونی سمجھ کر سفر ادب کی جانب سے کاروائی کی جا سکتی ہے۔

- ٹیم سفر ادب